عمدہ ٹرانزسسٹر ریڈیو خریدتے وقت آپ کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں ؟

جواب سہل ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کیا یہ نام مشہور و معروف ہے ؟ کیا یہ فلپس ہے ؟ اور فلپس ہی کیوں ؟ فلپس اس لیئے کہ یہ نام صد فیصد لاجواب کارکردگی کی ضمانت ہے۔ فلپس اور ریڈیو دو جدا چیزیں نہیں کیونکہ فلپس کی لاجواب کوالٹی ریسرچ اور شہرۂ آفاق مقبولیت نے اس نام کو ۵۰ سال میں بامِ عروج تک پہونچایا ہے۔

فلپس کوالٹی :۔ ریڈیو کی ساخت میں فلپس کمپنی ایک نمایاں حیثیت کی مالک ہے ان کا پہلا ریڈیو ۱۹۲۷ء میں فروخت ہوا اس کے بعد سے آج تک فلپس کے ماہرین تکمیل فن کی مسلسل جد و جہد میں مصروف رہے ہیں اور یہی وجہ ہے وہ آج آپ کو دنیا کا جدید ترین اور لاثانی ٹرانزسسٹر ریڈیو پیش کرتے ہیں۔

فلپس ریسرچ :۔ فلپس کے ریڈیو لاثانی ہیں۔ کیونکہ ان کو ہر لحاظ سے یکتا اور مکمل بنانے کے لئے مسلسل تحقیق جاری رہی ہے۔ آج فلپس کی لیبارٹریز میں ۱۱۴۴ سے زائد سائنسدان اس مسلسل جد و جہد میں مصروف ہیں کہ فلپس کی مصنوعات بلحاظ ساخت و کارکردگی لاثانی ہوں۔ نئی نئی ایجادات اور معلومات سے تمام دنیا میں فلپس کی ریڈیو فیکٹریاں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اور اپنے ریڈیو کی برتری برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

فلپس برانڈ :۔ فلپس کا جانا پہچانا نشان آپ کے لئے عمدگی کی ضمانت ہے پاکستان اور تمام دنیا میں فلپس ریڈیو کی بڑھتی ہوئی مانگ اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے فلپس کی مصنوعات دنیا کے ۱۲۵ ممالک میں فروخت ہوتی ہیں اور لاکھوں لوگ صبح و شام ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں دنیا کا جدید ترین ٹرانزسسٹر ریڈیو آج ہی اپنے نزدیک ترین فلپس ڈیلر کے پاس دیکھئے۔

یہ نشان اس امر کی ضمانت ہے کہ فلپس کی مصنوعات فنی اعتبار سے بہتر۔ بلحاظ ساخت لاثانی۔ قیمت میں مناسب اور انتہائی دیرپا ہیں

PWT 65

منظور شدہ محکمہ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی ای / ٹی ڈی / ۳۲ ۰۰۵ ـ ۰۴۰ ـ ۶۰/۵۱ مورخہ ۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

اردو ادب کا ڈائجسٹ

مُدیر

شمس زبیری

سالانہ	قیمت
پندرہ روپے	ایک روپیہ پچاس پیسے

کاشانۂ اردو ۳۰۲ پوسٹ بکس کراچی ۲

فون نمبر ۷۰۱۵۶

ترتیب

شاہد بھائی

افسانے

منظومات

طنزیے

شمس زبیری

اک مغنی، ایک مفکر، ایک رہبر، اک ادیب

۱۹۶۷ء

حالات کی ستم ظریفی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ۷ مئی ۱۹۶۷ء کی رات کو یونائیٹڈ بنک کا مشاعرہ تھا۔ دو ڈھائی بجے تک تو شعر خوانی کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو ایک دوست بڑے اصرار سے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں چار بجے تک محفل جمی رہی۔ وہاں سے اُٹھا تو تھکا ماندہ دفتر ہی میں آکر سو گیا۔ صبح آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی سے آنکھ کھلی دوسری طرف سے جمیل صاحب بول رہے تھے۔ خلافِ معمول جالبی صاحب کی آواز میں اُداسی اور گھبراہٹ تھی بڑے عجیب لہجے میں انہوں نے کہا شاہد بھائی کا انتقال ہوگیا ـــــ شاہد بھائی کا انتقال ہوگیا یہ سُنکر ایسا محسوس ہُوا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو اور ہر چیز بالکل ساکت ہوگئی ہو۔ شاہد صاحب رُخصت ہو گئے ـــــ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھرتا رہا اور اس کے ساتھ ہی یادوں کا ایک پورا سلسلہ میرے ذہن میں اُبھر آیا۔

غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے میری نوعمری کا زمانہ تھا اور میں دہلی ٹراموے کمپنی میں ٹریفک انسپکٹر تھا۔ ان دنوں میں نیا نیا بس سروس سے تبدیل ہوکر ٹراموے میں آیا تھا۔ ایک شام ٹرام فتحپوری سے حوض قاضی ہوتی ہوئی جامع مسجد جارہی تھی کہ ایک صاحب کٹرہ بڑیاں سے فرسٹ کلاس میں سوار ہوئے لیکن اصول کے مطابق کنڈکٹر ان کے پاس ٹکٹ دینے نہیں گیا۔ میں نے کنڈکٹر سے بازپرس کی کہ فرسٹ کلاس میں جو صاحب سوار ہوئے ہیں انہیں ٹکٹ کیوں نہیں دیا۔ کنڈکٹر نے کہا ان صاحب کے پاس پاس ہے اور پرانے پاس ہولڈروں سے اگر پاس دکھلانے کو کہا جائے تو وہ بُرا ملنتے ہیں۔ میں خود ان صاحب کے پاس گیا اور پاس دکھلانے کی درخواست کی ان صاحب نے پہلے بڑی خاص نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پاس دکھایا۔ پاس پر لکھا ہوا تھا "شاہد احمد دہلوی" نام سے تو میں پہلے ہی واقف تھا صورت آشنا نہ تھا۔ یہ تھی شاہد بھائی سے پہلی ملاقات جو مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی۔

انہیں دیکھنے کا ہر چند یہ پہلا اتفاق تھا لیکن وہ نقش آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ ترکی ٹوپی، تازہ استری کی ہوئی شیروانی، پاس نکالنے کے لئے بٹن جو کھولے تو گلے میں بیل لگا ہوا کرتا نظر آیا۔ چھوٹی موری کا پاجامہ اور پاؤں میں پمپ۔ اس وقت سے ان کی زندگی تک میں نے شاہد بھائی کے لباس میں صرف ایک تبدیلی دیکھی۔ بعد میں ترکی ٹوپی کی بجائے وہ جناح کیپ اوڑھنے لگے تھے۔ باقی لباس وہی رہا اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے دلّی میں انہیں متعدد بار دیکھا لیکن تفصیلی ملاقات کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ وقت گذرتا گیا۔ پاکستان کی نئی مملکت وجود میں آگئی۔ ہم لوگ دلّی سے ترکِ وطن کرکے کراچی آگئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ شاہد صاحب نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی ہے ۱۹۴۸ء میں سید ذوالفقار علی صاحب بخاری کی مہربانی سے مجھے ریڈیو پاکستان میں فنکاروں کا تلفظ درست کرنے کی جگہ مل گئی۔ وہاں پہلے ہی روز

شاہد صاحب سے ملاقات ہوئی ابتدا میں تو انہوں نے مجھے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا لیکن پھر ایسی گھٹی کہ انہیں میرے بغیر اور مجھے ان کے بغیر نہیں آتا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ۲۷۔ مئی ۶۷ء کی رات کو انہوں نے ایسی بے اعتنائی برتی جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

شاہد بھائی کا قیام پیر الٰہی بخش کالونی میں تھا اور میں ان دنوں جہانگیر روڈ کے ایک کوارٹر میں مقیم تھا۔ ریڈیو اسٹیشن یہاں سے کالے کوسوں تھا اس لئے روزانہ صبح ہم دونوں سائیکلوں پر سوار ہو کر ریڈیو اسٹیشن جاتے اور یہی واپسی میں ہوتا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم لوگوں نے ایک پُرانی موٹر سائیکل خرید لی۔ شاہد بھائی پیچھے بیٹھتے اور میں موٹر سائیکل چلاتا۔ اس سلسلے میں دو واقعات اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں ایک بار یہ ہوا کہ مجھے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ پیچھے کی سیٹ خالی ہے۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو شاہد صاحب سیٹ پر نہیں تھے میں فوراً پیچھے مڑا تھوڑی دُور جا کر دیکھا تو شاہد بھائی فٹ پاتھ پر بیٹھے ہنس رہے تھے ہوا یہ تھا کہ میں نے سامنے سے ایک دم آجانے والے دو بچوں کو بچانے کی کوشش کی تھی اس جھٹکے میں شاہد بھائی نیچے گر گئے اور مجھے کوئی خبر نہ ہوئی۔ لیکن شاہد صاحب نے اپنے گرنے کو ہنسی میں ٹال دیا اور مجھ سے کچھ نہ کہا۔ اسی طرح ایک دن ہم دونوں بندر روڈ سے گذر رہے تھے کہ بہت موٹی سی بلی سامنے آگئی۔ میں نے بلی کو بچانے کی کوشش کی اور وہ سامنے سے بھاگی لیکن سامنے ہی سے محمد علی ٹراموے کی بھاری بس آرہی تھی جو اسے کچلتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ گئی شاہد بھائی یہ واقعہ کئی دن تک ریڈیو اسٹیشن پر لوگوں کو سناتے رہے اور کہتے رہے۔ بیچاری کی جان مفت میں چلی گئی۔

شاہد بھائی کی قربت کے ساتھ ساتھ میں ساقی سے بھی قریب تر ہوتا گیا لیکن یہاں میں ایک بات خاص طور سے اور زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ قربت کے باوجود شاہد صاحب پرچے کی ترتیب میں کسی قسم کی مداخلت گوارہ نہیں کرتے تھے۔ وہ خود پرچہ مرتب کرتے تھے اور خود ہی کاپیوں کی تصحیح کرتے تھے اس کے بعد کا سارا کام میرے ذمہ تھا۔

دنیا کا دستور بہت عجیب ہے میں نے بارہا یہ دیکھا کہ جب کوئی نیا آدمی رسالہ نکالنے کا ارادہ کرتا ہے تو پُرانے لوگ یا تو اس پر ہنستے ہیں یا اس کی ہمت شکنی کرتے ہیں ایک بار شاہد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ جب انہوں نے ساقی نکالنے کا ارادہ کیا تھا تو ان کے خاندان کے ایک صاحب نے جن کا ایک رسالہ پہلے سے شائع ہوتا تھا انہیں روکا اور کہا۔ "میاں کیا کرو گے رسالہ نکال کر؟" انہوں نے جواب دیا کہ دلی سے ایک اچھا ادبی پرچہ نکلنا چاہئے۔ ان کے عزیز نے کہا کیا یہ ادبی پرچہ نہیں ہے۔ میاں شاہد احمد اگر تمہیں شوق ہی پورا کرنا ہے تو اسی میں لکھ لیا کرو۔ شاہد بھائی یہ سُن کر خاموش تو ہو گئے لیکن انہوں نے ساقی نکالنے کا ارادہ ترک نہیں کیا اور انہی میں میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ اگر کوئی شخص رسالہ نکالنے کے سلسلے میں ان سے مشورہ کرتا تو وہ اسکی حوصلہ افزائی کرتے تھے لیکن اُسے تاریکی میں نہیں رکھتے تھے بلکہ صحافت کے نشیب و فراز پوری طرح واضح کر دیتے تھے! وراں ہی بزرگ عزیز کا اب بھی یہ حال ہے کہ بھائی کے پاس تعزیت کیلئے پہنچے تو فرمایا "آپ اب ساقی بند کر دیجئے۔"

میں نے اور اسلم نے ۱۹۵۰ء میں نقش جاری کرنے کا ارادہ کیا تو شاہد صاحب نے نہ صرف ہماری ہمت بندھائی بلکہ ہمیں ضروری مشورے بھی دیئے مئی ۱۹۵۱ء میں نقش کا پہلا شمارہ شائع ہوا جس کی ادارت میں ان کا نام بھی شامل تھا۔

شاہد بھائی کے مزاج میں بڑی بے نیازی تھی دوسرے ایڈیٹروں کی طرح وہ اشتہارات کے لئے تگ و دو نہیں کرتے تھے۔ ساقی کے اشتہارات کے لئے میں اپنی مرضی سے کسی کے پاس چلا جاؤں یا کوئی اشتہار بھیج دے تو غنیمت جانا تھا۔ لیکن مشتہرین سے ملنا شاہد صاحب نے کبھی گوارا نہیں کیا میں کبھی کبھی کہتا بھی تھا کہ شاہد بھائی فلاں جگہ سے اشتہار مل سکتا ہے اگر ایک دفعہ آپ وہاں ہو آئیں تو اشتہار مستقل ہو جائے تو وہ بڑی صاف گوئی سے جواب دیتے کہ ساقی اور شاہد احمد دونوں نہیں تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھیک مانگنے نکلوں جب تک چل سکے گا چلاؤں گا ورنہ بند کر دوں گا۔ کہنے کو تو یہ کہہ دیتے تھے لیکن کڑی سے کڑی مشکل میں بھی انہوں نے ساقی بند کرنے کا ارادہ نہیں کیا اسی قناعت پسندی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ بڑے صاف گو تھے کسی بڑے افسر یا صاحب ثروت کی ہاں میں ہاں ملانا ان کے بس کی بات نہیں تھی

سی محفل میں اگر کوئی ایسی بات ہوتی جس سے وہ متفق نہ ہوتے تو عام طور پر وہ خاموشی اختیار کرتے اور اگر کوئی ان کی رائے پوچھ لیتا تو وہ جھجک کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر دیتے اور کبھی کبھی انہیں اس صاف گوئی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔ چنانچہ اسی کی وجہ سے ایک دفعہ ریڈیو سے انکی ملازمت بھی ختم ہوگئی۔

شاہد بھائی کو اپنی ادبی خدمات پر کوئی غرور نہیں تھا وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں ہم نے کونسا تیر مار لیا ہے جو لوگ ہمیں یاد رکھیں گے لیکن آنکھوں دیکھی بات تو یہ ہے کہ ملک کے باشعور طبقے میں ان کی بڑی اہمیت تھی اور ہر مکتبۂ خیال کے لوگ ان کی بات مانتے تھے یہاں میرے ذہن میں ایک واقعہ آتا ہے۔ رائٹرز گلڈ کے قیام کے سلسلے میں مصنفوں کا ایک کنونیشن منعقد ہوا تھا اس کے صدر استقبالیہ خود شاہد بھائی تھے ضروری کارروائیوں کے بعد انتخابات شروع ہوئے۔ باہر سے آنے والے تمام نمائندے خود اپنے لئے یا اپنے دوستوں کے لئے کوشاں تھے لیکن کراچی کے تمام ادیبوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کراچی کے سلسلے میں انتخابات نہیں ہوں گے اور شاہد صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے نام منتخب کر کے اعلان کر دیں۔ شاہد بھائی نے بہت اصرار کیا کہ ہم سب بیٹھ کر آپس میں طے کئے دیتے ہیں لیکن کوئی شخص اس پر تیار نہیں ہوا اور شاہد بھائی ایک طرف جا کر نام لکھنے لگے اتنے میں ایک بہت بڑے شاعر جھومتے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور فرمانے لگے کہ میں کچھ مشورہ دوں اتنے میں کراچی کے تمام ادیبوں نے شور مچایا کہ ان صاحب کو ہٹایئے اور شاہد بھائی نے بھی تیوری بدل کر انہیں اشارہ کیا کہ آپ دوسری طرف تشریف لے جائیں اور وہ عظیم شاعر اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے آئے۔

فہرست مکمل کرنے کے بعد شاہد صاحب نے کہا کہ پہلے سب لوگ اس فہرست کو دیکھیں لیکن سب لوگوں نے نعرہ لگایا کہ دیکھنے کی ضرورت نہیں آپ کا فیصلہ ہمارا فیصلہ ہے چنانچہ شاہد بھائی نے کراچی ریجن کی طرف سے ناموں کا اعلان کر دیا اور کراچی کے تمام ادیبوں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

شاہد بھائی پہلی ملاقات میں کچھ خشک اور مغرور نظر آتے تھے اور نئے ملنے والے ان کی سنجیدہ اور مختصر گفتگو سے کوئی اچھا تاثر لے کر نہ اٹھتے میرا خیال یہ ہے کہ وہ نئے آدمیوں سے ملتے ہوئے گھبراتے تھے اور گھبرانا بھی چاہیے۔ صبح سے شام تک پچاسوں آدمی ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ کوئی دیوان پر دیباچہ لکھوانے کوئی افسانے پر اصلاح کرانے اور کوئی صرف انہیں دیکھنے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کوئی بھی انسان نئے آنے والوں سے سنجیدہ اور مختصر گفتگو ہی کر سکتا ہے لیکن دوستوں کی محفل میں وہ سراپا بہار تھے اور ان کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ خود بھی فقرے کستے اور دوسروں کے دلچسپ فقروں کی داد بھی دیتے اور اگر ان کا کوئی چھوٹا بھی ان پر اچھا فقرہ چست کر دیتا تو وہ مزہ لیتے تھے۔

مہمان نوازی شاہد صاحب کی خاندانی میراث تھی باہر سے آنے والے ادیب اور فنکار کو اپنے گھر بلانا اور دعوت کرنا گویا شاہد صاحب کے فرائض میں داخل تھا۔ ان دعوتوں میں کچھ اور لوگ بھی شریک ہوتے تھے لیکن جمیل صاحب، اسلم اور میری شرکت ضروری تھی۔ کھانے کے بعد گانے کی محفل بھی جمتی اور بعض اوقات تو ایسی یادگار محفلیں منعقد ہوتیں جس میں بیک وقت دو ڈھائی سو آدمی شریک ہوتے ادیبوں اور شاعروں کی دعوت میں کھانے کے بعد گفتگو ہوتی رہتی لیکن شعر و شاعری کا سلسلہ نہیں ہوتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ شعر کے معاملے میں شاہد صاحب بڑے باذوق تھے فارسی اور اردو کے بیشمار شعر انہیں یاد تھے۔ اور شعر فہمی کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔ لیکن وہ شعر سنتے ہوئے بہت گھبراتے تھے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر نے شاہد صاحب کو اپنے شعر سنانے شروع کر دیئے اور ہم لوگوں نے تفریح کی خاطر اشعار پر داد دینی شروع کی اس وقت تو شاہد صاحب مروت میں کچھ نہ کہتے تھے لیکن بعد میں وہ اپنی برہمی کا اظہار ضرور کرتے تھے اور کہتے اسے شعر سنانے کے لئے میرے علاوہ کوئی اور نہیں ملا تھا۔

ذہن کے سامنے پے در پے یادوں کا ایک سلسلہ ابھرتا چلا آرہا ہے سمجھ میں نہیں آتا کسے لکھوں اور کسے نہ لکھوں بیس سال کی رفاقت کے یہ نقوش شاید میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں آج سوچتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاہد صاحب کی تمام خوبیوں سے قطع نظر ان کی یہ خوبی کس طرح بیان کروں کہ وہ دراصل پارس پتھر تھے جو چھو گیا کندن بن گیا۔ وہ نہیں رہے لیکن ان کا نام اور کام دونوں ہمیشہ انکی یاد تازہ رکھیں گے۔ اور پھر اس نقش میں بھی انہی کے نام سے رنگ ثبات دوام جھلکنا شروع ہوا۔ کاش یہ رنگ اور گہرا ہو جائے۔

شاہد احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہیں اوّلیں

ساقی کراچی (ستمبر ۱۹۴۸ء) کا پہلا اداریہ

الحمد اللہ کہ ساقی کی صورت دوبارہ دکھائی دی ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

پورے ایک سال کے بعد ساقی کے چھپنے کا موقع آیا۔ اس تمام عرصے میں ساقی جاری رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن ناسامد واقعات نے ہمیشہ مایوس کیا۔ دلّی کے چھٹنے اور اثاث البیت کے لٹنے نے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا لیکن وقت کے ساتھ تعطّل و جمود رفع ہوا۔ اپنی بربادی پر صبر آ گیا ہمت مردانہ نے دُور سے آواز دی ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

اور جرأت رندانہ نے بیدار ہو کر ایک بار پھر دُنیائے عمل میں لا کھڑا کیا۔ چاروں طرف تباہی و بربادی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن اُمید کی ننھی سی کرن جگمگا رہی تھی اور سرگرم عمل ہونے کا اشارہ کر رہی تھی گزشتہ زندگی ایک حسین خواب بن چکی تھی اب نہ جائداد تھی، نہ کاروبار تھا اور نہ بنک کا روپیہ تھا۔ آمدنی کے سلسلے ذرائع مسدود ہو چکے تھے احباب مدد فرمانا چاہتے تھے لیکن مجھے تو دولتِ پاکستان سے اپنی روزی آپ پیدا کرنی تھی جس نے ہزاروں جھمیلوں میں سے نکال کر مجھے لاہور پہنچایا تھا وہی آئندہ بھی میرا کفیل ہو گا اور بفضلہ مجھے ہر طرح کی آسائش مل گئی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ مل گیا پاکستان مل گیا تو سب کچھ مل گیا۔ نفسا نفسی کے عالم میں کسی سے بے مروّتی کی شکایت بے جا ہے تاہم ان دوستوں کی محبت ساری عمر یاد رہے گی جنہوں نے ڈھارس بندھائی۔ اگر ان کی اعانت مجھے حاصل نہ ہوتی تو شاید ساقی اب بھی چھپنے نہ پاتا۔

میں نے لاہور کو اپنا وطنِ ثانی بنایا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر مجھے کراچی منتقل ہونا پڑا اور یہیں سے ساقی جاری ہو رہا ہے یہ پہلا پرچہ عجلت میں تیار کیا گیا ہے تاہم اپنے سابقہ معیار سے ساقط نہیں سمجھا جا سکتا۔ اُمید ہے کہ آئندہ شمارے بہتر سے بہتر ہی ہوتے جائیں گے۔

ساقی جنوری ۱۹۳۰ء سے جاری ہوا تھا جو مشکلات اُس وقت پیش آئی تھیں اُن سے کچھ زیادہ ہی اس وقت پیش آ رہی ہیں۔ میرے پاس سوائے جذبۂ خدمت کے اب اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے ساقی کو زندہ رکھنا آپ کا کام ہے پچھلا سارا اندوختہ انقلاب عظیم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس نئے دورِ حیات کو آپ اس طرح قائم رکھ سکتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ساقی کی اشاعت بڑھائیں خود خریدیں اور دوسروں کو اس کی خریداری پر مائل کریں۔ ساقی کی آمدنی پر نہ تو پہلے دارومدار تھا اور نہ اب انحصار ہے۔ اس کی آمدنی اسی کی بہتری پر صرف ہوتی ہے گزشتہ انیس سال میں ساقی نے جو کچھ پیش کیا سب آپ کے سامنے ہے اسی سے اندازہ کیجئے کہ ساقی آئندہ کیا ہو گا قدر دانی شرط ہے انشاء اللہ پچھلے دَور سے بھی بڑھ چڑھ کر شائع ہو گا۔ ہم اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ آپ اپنی ذمہ داری کو نہ بھولئے سب کام سدھ ہو جائیں گے۔

شاہد احمد دہلوی

مغل بادشاہوں کا آفتاب جلال غروب ہو رہا تھا۔ دلی کے لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع جھلملا رہی تھی۔ بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ فرنگیوں سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ ان کے بعد تاج و تخت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مگر ہاتھی مرے پیچھے بھی سوا لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ اس مردہ حالت میں بھی تیموری جاہ و جلال کا دفر بہت کچھ باقی تھا۔ لال حویلی تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی، اور شہر بہت کچھ اجڑ جانے پر بھی علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بھانت بھانت سے لوگ کھنچے چلے آتے اور اپنی مرادیں پاتے۔ شہر آبادی کے یہی شب و روز تھے کہ سات سال کا ایک لڑکا تحصیلِ علم کے شوق میں بجنور سے دلی آیا اور پنجابی کٹڑے کی مسجد کے طالب علموں میں شامل ہو گیا۔ دوسرے طالب علموں کی طرح یہ لڑکا بھی محلے کے گھروں سے روٹی مانگ لاتا اور روکھی سوکھی جو بھی میسر آتی خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتا۔ رات کو کڑکڑاتے جاڑوں میں مسجد کی صفوں میں لپٹ کر سو جاتا۔ اگر کسی دن جلدی آنکھ نہ کھلتی تو مسجد کا ملا ایک لات رسید کرتا اور لڑکا لڑھکتا ہوا چلا جاتا اور ساتھ کے ساتھ صف بھی بچھ جاتی۔ دن بھر اور رات گئے تک اس لڑکے کو بس پڑھنے سے کام تھا۔ علم کی لگن میں صبر و شکر سے تمام سختیوں کو جھیلتا رہا۔ غریب کا بچہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ شوق اور ذہانت کے پر اسے اڑائے لئے چلے گئے۔ مکتب سے نکل کر دلی کالج میں پہونچا اور یہاں سے سند لینے کے بعد ترقی کی راہیں اس پر کھل گئیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر جا پہونچا۔ اس زمانے میں یہ آخری بڑا عہدہ تھا جو فرنگی راج میں کسی دیسی آدمی کو مل سکتا تھا۔ اتنے ہی میں سر سالار جنگ نے انھیں جانچ کر حیدرآباد بلا لیا اور یہ صاحب اپنی اعلیٰ کارکردگی کے باعث اونچے سے اونچے مرتبوں تک پہونچے۔ اللہ نے عزت بھی دی اور بے تحاشا دولت بھی۔ اخلاقی اور مذہبی کتابیں لکھنے کی وجہ سے نیک نامی اور شہرت بھی ملی۔ اب سمجھے بھی یہ کون بزرگ تھے؟ یہ تھے ڈپٹی نذیر احمد جن کی کتابیں اور ترجمۂ قرآن گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔

ان ڈپٹی نذیر احمد کے اکلوتے بیٹے تھے بشیر الدین احمد جن کی ابتدائی تعلیم خود شفیق باپ کے سایہ میں ہوئی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد میاں بشیر بغرض ملازمت دکن چلے گئے اور اول تعلقداری سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ بھی اپنے نامی گرامی والد کی طرح بہت بڑے مصنف اور مورخ تھے۔ ادبی اور اخلاقی کتابوں کے علاوہ دو ضخیم جلدوں میں تاریخ بیجاپور اور تین بڑی جلدوں میں تاریخ دہلی لکھی۔ یہ ان کے دو بڑے تحقیقی کارنامے ہیں۔ جب تک زندہ رہے ان کے ہاتھ سے کبھی قلم نہیں چھوٹا۔

میاں بشیر کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں دلی کے ایک معزز خاندان میں ہو گئی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ مگر

پندرہ سال تک کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ میاں بیوی تو اس محرومی پر بھی مطمئن و قانع تھے مگر خاندان میں کھسر پھسر ہونے لگی اور منہ جڑنے لگے ۔ پھر نذیر احمد کے کان میں بھی صدائیں پڑنے لگیں ۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں نکاح ثانی کے وہ خلاف تھے مگر جب چاروں طرف سے ان پر عزیزوں کا دباؤ پڑا اور انھوں نے خاندان کا چراغ گل ہوتے دیکھا تو وہ بھی پسیج گئے ۔ بیٹے اور بہو میں بڑا پیار دلار تھا ۔ بیٹے سے کیسے کہیں کہ اپنی چہیتی بیوی پر سوکن لے آ ؟ میاں بشیر کی والدہ سے کہا کہ تم سمجھاؤ ۔ انھوں نے بیٹے کو چمکار پچکار کر رضامند کیا ۔ اور غریب مگر شریف خاندان کی ایک سیدانی سے چپ چپاتے ان کا نکاح پڑھوا دیا ۔ اللہ کی شان کہ ان سیدانی سے بھی دس سال تک اولاد نہیں ہوئی ۔ بڑی دلہن کی بن آئی اور انھوں نے طعنوں تشنوں سے جان ضیق میں کر دی ۔ جب معاملہ تنت پر پہنچ گیا تو چھوٹی دلہن کی کوکھ ہری ہوئی ۔ خاندان کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ۔ اللہ نے چاند سا بیٹا دیا دونوں اس کی خوشی منائی گئی ۔ ڈپٹی صاحب نے پوتے کا نام مسند احمد رکھا ۔ اس کے بعد تو خدا کی دین ایسی ہوئی کہ یکے بعد دیگرے تین لڑکے ہوئے ۔ منجھلے کا نام بشیر احمد اور سنجھلے کا شاہد احمد رکھا گیا ۔ اب ان سنجھلے صاحب زادے میاں شاہد احمد کی سرگزشتِ حیات سنیئے اور خود انہی کی زبانی سنئے ۔

میں ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء کو دلی میں ، اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا ۔ چار سال کی عمر سے پہلے کی باتوں کا مجھے ہوش نہیں ہے ۔ ایک خواب کا سا خیال ہے کہ ابا جب حیدرآباد سے دلی آتے تو سب سے پہلے ہمیں دادا ابا کی خدمت میں لے جاتے ۔ ابا دادا ابا سے بغل گیر ہو کر رونے لگتے اور ہم حیران ہو کر انھیں تکتے رہتے ۔ پھر دادا ابا ہمیں ایک ایک اشرفی دیتے اور ہم چپکے سے وہاں سے کھسک لیتے بس اور کچھ یاد نہیں ہے ۔

جب میں چھ سال کا ہوا تو چھوٹی بہن صفیہ حیدرآباد میں پیدا ہوئی ۔ انہی دنوں ابا کو کسی ضروری کام سے دلی جانا پڑا ۔ اِدھر ابا دلی روانہ ہوئے اُدھر اماں کی طبیعت ایکا ایکی خراب ہوئی ۔ اس کی اطلاع فوراً بذریعہ تار ابا کو دی گئی ۔ وہ الٹے قدموں دلی سے لوٹے ۔ مگر جب حیدرآباد پہونچے تو اماں کا جنازہ صحن میں رکھا پایا ۔ اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے یہ کیا ہوا ؟ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ کسی نے لپک کر انہیں تھام لیا ابا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے ۔ آنسو پیتے رہے ۔ اماں کو سپرد خاک کرنے کے بعد آنسوؤں کا سیلاب ضبط کے بند کو بہا کر لے گیا ، اور وہ ہم بچوں کو گلے لگا کر روتے رہے ۔ اس سے ان کے دل کی بھڑاس نکل گئی ۔ مگر ساری عمر جب بھی انھیں اماں کا خیال آ جاتا تھا رونے لگتے تھے ۔

ماں کی کمی پوری کرنے کیلئے ابا نے ہم پر یورپین اور اینگلو انڈین گورنسیں رکھیں اور ہمیں اچھے سے اچھے کانونٹ اسکولوں میں تعلیم دلائی گھر پر بھی ماسٹر پڑھانے آتے اور ابا خود بھی ہمیں انگریزی اور اردو پڑھاتے تھے ۔ پھر ایک دفعہ ابا دلی آئے تو مطبع مجتبائی میں مولوی عبدالاحد کے ہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر ضیاء الدین سے ہوئی ۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں مشورہ دیا کہ بچوں کو علی گڑھ میں داخل کر دیا جائے ۔ ۱۹۱۶ء میں ہم تینوں بھائیوں کو ایم ۔ اے ۔ او اسکول علی گڈھ میں داخل کر دیا گیا ۔ اس زمانے میں بچوں کا بورڈنگ ظہور وارڈ تھا ۔ تقریباً تین سال ہم نے علی گڈھ میں پڑھا ۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا اور مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم کیا ۔ ابا نے ہمیں علی گڈھ سے اٹھا لیا ۔ وہ حیدرآباد سے پنشن لے کر دلی آ گئے تھے ہمیں عربک اسکول میں داخل کر دیا ۔

۱۹۲۲ء میں دلی سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے لاہور جا کر ایف ۔ سی ۔ کالج میں داخلہ لے لیا ۔ وہاں سے ایف ، ایس ، سی (میڈیکل) پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہوا ۔ سڑی ہوئی لاشوں پر کام کرنے سے طبیعت اس قدر مکدر اور اعصاب بیزار ہوئی کہ ایک سال ہی میں وہاں سے بھاگ لیا ۔ دلی آ کر میں نے انگریزی ادبیات میں بی ۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی ۔

اس سے ایک سال پہلے ابا کا انتقال فالج میں ہو گیا تھا۔ وہ ہمارے لئے پچاس پچاس ہزار روپے نقد اور دو دو سو روپے ماہانہ کی جائداد چھوڑ گئے تھے۔ اس لئے کمانے دھمانے کا ہمیں کوئی فکر نہیں تھا۔ میں نے فارسی ادبیات میں ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ میرے ایک رشتے کے بھانجے ہیں انصار ناصری، جو میر ناصر علی صاحب "صلائے عام" کے پوتے ہیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ دلی سے ایک عمدہ ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔ اپنی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی اور بغیر کسی تجربے یا مشورے کے جنوری ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ "ساقی" جاری کر دیا۔ کوئی چار پانچ سال کی الٹا بلٹی میں اس پرچے نے اپنی جگہ تو بنالی مگر میرے ماموں نے جو اس پرچے کا اہتمام کرتے تھے، مجھے بتایا کہ اس پرچے پر پچیس تیس ہزار روپیہ ضائع ہو چکا ہے، اور اگر یہی روش رہی تو باقی روپیہ بھی یونہی نکل جائے گا۔ ادھر بھائیوں نے بھی لعنت ملامت کی تو آنکھیں کھلیں۔ پرچے کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا اور ہمعصر ادیبوں کی کتابیں چھاپنی شروع کیں ڈوبتا ہوا کاروبار ترگیا اور ۱۹۴۷ء میں ساقی بک ڈپو کی مالی حیثیت دو لاکھ کی تھی اور پندرہ ہزار روپیہ ادیبوں اور شاعروں کی طرف بطور پیشگی باقی تھا۔ محاسبۂ نفس بڑی مشکل چیز ہے اور میرے لئے خودستائی اس سے بھی زیادہ مشکل۔ لہٰذا ایک کرم فرما کے دو خطوں کے اقتباس درج کرتا ہوں تاکہ آپ کو میرے کچھ وہ حالات بھی معلوم ہوں جنھیں میں خود بیان نہیں کر سکتا۔ یہ خطوط راجہ مہدی علیخاں کے ہیں، جو حال ہی میں موصول ہوئے ہیں۔

"ہزاروں سال پہلے جب آپ دلی سے کھو گئے تھے، اور آپ کی زندگی کے بارے میں خدانخواستہ بُری بُری افواہیں پھیل رہی تھیں، یہاں کے بہت سے دوست آپ کے لئے بے حد متفکر اور دست بدُعا تھے۔ بہت عرصے بعد ایک دن معلوم ہو گیا کہ آپ بفضل خدا خیریت سے ہیں اور پاکستان میں ہیں۔ اس کے بعد میں مست اور بے فکر ہو کر فلمی دنیا کی مصروفیات میں بہت بری طرح کھو گیا۔ اور اس وقت بھی کھویا ہوا تھا۔ جب مجھے عزیز دوست منٹو کی خبر موصول ہوئی مجھے بے حد شرمندگی تھی کہ اس دوران میں میں نے منٹو کو بھی صرف دو ایک خط لکھے، اور وہ بھی اس کے خطوں کے جواب میں۔ سالہا سال گزر گئے لیکن میں نے پاکستان یا ہندوستان کے کسی شاعر یا ادیب دوست کو کوئی خط نہ لکھا۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل "بستر مرگ" پر میری ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ پچھلے پرچوں میں سے کون سے زندہ ہیں کون سے مر گئے۔ اسی جستجو اور تلاش کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ کراچی سے "ساقی" شائع ہوتا ہے۔ میرا حافظہ ٹھیک نہیں رہا۔ میرا قیاس ہے کہ ایک خط میں نے آپ کو بھی لکھا تھا۔ اس کے بعد میں پھر بھول گیا۔ ایک مرتبہ ایڈیٹر نقش کو بھی خط لکھا۔ نقش میرے نام جاری ہو گیا۔ شاید آپ ہی نے جاری کرایا ہو۔ یہ پرچہ اب بھی باقاعدگی سے میرے نام موصول ہوتا ہے، اور اپنی اعلیٰ ظرفی اور میری کم ظرفی کا احساس مجھے دلاتا رہتا ہے۔ ایک دن نقش میں نقوش کے سلسلے میں آپ کا مضمون پڑھا تو حافظہ مجھے کئی سال پیچھے کی طرف لے گیا۔ دلی کی دوسری پرانی یادیں تازہ ہونے کے علاوہ وہ گھڑیاں آنکھوں میں پھر گئیں جو کبھی آپ کے پاس گزری تھیں۔ اور یکایک خیال آگیا کہ جس طرح بعض دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے آپ کام آیا کرتے تھے، میری زندگی کا رُخ بدلنے میں بھی خدا کے بعد آپ ہی کا ہاتھ تھا — مجھے فلم انڈسٹری میں داخلہ آپ کے صرف ایک خط سے مل گیا، جو آپ نے میرے لئے منٹو مرحوم کو لکھا تھا۔ اسی قسم کے ایک سفارشی خط کی درخواست میں نے اپنے ماموں جناب حامد علی خاں صاحب سے بھی کی تھی، اگرچہ انھیں ریڈیو میں لانے والا میں ہی تھا، مگر انھوں نے مجھے سفارشی خط دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ ہی میرے کام آئے۔ آج میں

جو کچھ ہوں۔ وہ سب کچھ آپ کے طفیل سے حاصل کیا ہے۔ آپ کے اس احسان کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا۔

• اتنے عرصے کے بعد آپ کا گرامی نامہ موصول ہوکر بے حد مسرت کا باعث ہوا۔ لیکن جب آپ کے اور ساقی کے حالات معلوم ہوئے تو میری یہ تمام خوشی رنج و غم میں بدل گئی۔ بہت دیر تک بلکہ بہت دنوں تک میں پریشان و مغموم رہا، اور اس وقت بھی ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی کوئی ادیب کسی بہت بڑی مالی پریشانی میں مبتلا ہوا، بھاگا ہوا آپ کے دروازے پر پہونچا اور ہنستا ہوا واپس آ گیا کہ میں اپنا مسودہ شاہد صاحب کو دے کر پیسے لے آیا ہوں ___ شاہد احمد کا ایک ایسا در تھا جس سے ہر وقت ضرورت مند ادیبوں کی ضرورتیں خدا پوری کر دیا کرتا تھا۔ آہ وہ "بنک" لُٹ گیا۔ وہ "خزانہ" پامال ہو گیا۔

مجھے وہ زمانہ بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں دہلی ریڈیو پر اسٹاف آرٹسٹ تھا۔ ایک مرتبہ میرے پاس کپڑے ختم ہو گئے تھے، کچھ مقروض بھی تھا۔ میں "مضراب" کا مسودہ لے کر آپ کے پاس [illegible] گیا۔ آپ نے پوچھا "کیا چاہیئے؟" میں نے کہا "میری ضرورتیں اس وقت تین سو روپے میں پوری ہو جائیں گی۔" ایک منٹ کے توقف کے بغیر آپ نے تین سو روپے لا کر مجھے دے دیئے۔ بحیثیت ایک پبلشر اور کاروباری آدمی کے آپ کو مجھ سے کہنا چاہیئے تھا کہ بھائی دو سو لے لو، ڈھائی سو میں سودا ہو جاتا۔ لیکن آپ نے مجھے فوراً وہ رقم دے دی۔ جب میں نے کہا "رسید؟" آپ نے کہا "پھر دیکھا جائے گا۔" اور آپ نے مجھ سے کبھی اس رقم کی رسید تک لینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ آج سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے تین سو کی رقم اتنی حقیر نہیں سمجھی جاتی تھی جتنی آج کل۔ یہ رقم میرے بہت سے کاموں میں صَرف ہوئی۔

غرض کہ سینکڑوں ادیبوں کیلئے شاہد احمد کا در برس ہا برس تک درِ حاتم بنا رہا۔ وہی شاہد احمد آج خود ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ ہے، اور صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار پا رہا ہے۔ حالانکہ ایسے کئی ساڑھے چار سو ہم لوگ اس سے چھین کر لے جایا کرتے تھے۔ زندہ باد شاہد احمد! جو کبھی دلّی کی رونق تھا، دلّی ادب کا گہوارہ تھا، دلّی کا "دربار" تھا، دلّی کا بادشاہ تھا۔ ہر شاعر ہر ادیب کے لبوں پر اس کا نام تھا۔ اس طرح رہتا تھا کہ نام لینے والے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

ہم لوگوں کی یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ دونوں ملکوں کا یہ صاحب طرز انشا پرداز، واحد زباں داں آج اس طرح گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے، اور ہم لوگوں کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی کہ شاہد احمد کا "مشغلۂ روزگار" موسیقی کی تعلیم ہے۔ مجھے بالکل یوں معلوم ہوتا ہے جیسے برنارڈ شا ریوڑیاں بیچ رہا ہو، یا شیکسپیئر نے "نان اور کباب" کی دوکان کھول لی ہو۔

میوزک کوئی گھٹیا چیز نہیں، نہ میوزک سے دلچسپی لینا گھٹیا پن ہے۔ (میں خود میوزک ہی سے کماتا ہوں) لیکن

میوزک کے جاننے والے تو ملک میں اور لوگ بھی ہیں۔ شاہد احمد ہندوستان اور پاکستان میں صرف ایک ہے۔ اس "صرف ایک" کی ہم صحیح قدر نہیں کر رہے۔ اس "صرف ایک" کو ہم نے نہیں پہچانا۔ اس "صرف ایک" سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس "صرف ایک" کی عظمت سے ہم واقف نہیں۔

خیر ہیرا یا موتی کسی بہت ہی خوبصورت الماری میں رکھا ہو یا کسی معمولی طاق میں اس کی قدر و قیمت یا اس کی عظمت میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی ہزاروں لوگ ایسے ہیں جن میں خود راجہ مہدی علی خاں جیسی حقیر ہستی بھی شامل ہے، جو شاہد احمد سے مصافحہ کر لینا بھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں بلکہ میری تو خدا سے دعا ہے کہ اسے خدا اگر تو مجھے شاہد احمد جیسے عظیم الشان، نیک دل، خدا ترس انسان کے قدموں کی خاک کا درجہ بھی عطا فرما دے تو میں سمجھوں گا مجھے عمر بھر کی عبادت کا حد سے زیادہ صلہ مل گیا۔

آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں فلم انڈسٹری میں آیا، موٹریں خریدیں، بے شمار دولت کمائی، نام پیدا کیا، اور مجھ خود غرض انسان نے کبھی آپ کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ مجھ میں اور شاہد احمد میں کتنا فرق ہے!۔

میری خدا سے دعا ہے کہ مرنے سے پہلے میں شاہد احمد جیسے بلند انسان کو پہلے سے بھی زیادہ "اونچی بلندیوں" پر دیکھ لوں۔ "بلندیوں" سے میرا مطلب دنیوی بلندیاں ہیں۔

شاہد صاحب میں آپ کے ان دوستوں میں سے ایک ہوں جو آپ سے بہت کم ملے جو آپ کی صحبتوں میں بہت کم ×ا۱۱ ہوئے لیکن ہمیشہ دل و جان سے آپ کے گرویدہ رہے۔

شاہد بھائی، یقین مانئے آپ اپنی بہت سی قیمتی چیزیں تو یہاں چھوڑ گئے لیکن آپ کی ایک نہایت ادنیٰ سی چیز بھی یہاں رہ گئی جس کا شاید آپ کو خیال تک نہیں۔ وہ چیز ہے راجہ مہدی علیخاں۔ کاش اس آدمی کو پھر آپ کے قدموں کا قرب حاصل ہو سکے۔

آپ کا گرامی نامہ پڑھ کر مجھ پر رقت طاری ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اور کیا لکھوں۔

"مضراب" کے حقوق لوٹانے پر اگر رسمی شکریہ ادا کروں گا تو آپ کے عظیم الشان اخلاق کی توہین ہو جائے گی۔

آپ کے خط نے مجھے PUZZLED اور مخبوط الحواس کر دیا ہے۔ خط لکھتے لکھتے کبھی نروس ہو جاتا ہوں جی چاہتا ہے کہ لکھتا ہی جاؤں لیکن رقت اور افسوس کے جذبات پریشان کئے دے رہے ہیں۔

یوں معلوم ہو رہا ہے جیسے ایک فقیر جلاوطن بہادر شاہ ظفر کو خط لکھ رہا ہے۔

دلی کا سارا کاروبار ۱۹۴۷ء کے گشت و خون کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آں و فتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد۔ ہمیں بیک بینی و دوگوش دلی سے نکلنا پڑا پرانے قلعہ میں تین دن پناہ لینے کے بعد ریل سے لاہور روانہ ہوئے۔ رات کو پٹیالہ کے علاقہ میں ریل پر حملہ ہوا آدھی ریل کٹ گئی ہم سخت جان بچتے بچتے بچ گئے۔ بہرے حال بانکے دھیانٹے لاہور پہونچے۔ یہاں کی فضا راس نہ آئی۔ دس مہینے بعد کراچی آ گئے۔ ساقی دوبارہ جاری کیا۔ مگر اب اسکا نقصان کہاں سے بھرا جاتا؟ اسی تردد میں تھا کہ ریڈیو پاکستان نے میوزک سپروائزر کی خدمت پیش کی۔ شکریہ کے ساتھ اسے قبول کیا خدا جانے موسیقی کا شوق کہاں سے مجھے لگا۔ مولویوں کا خاندان، دور دور تک گانے بجانے کا چرچا نہیں مگر سنتے آئے ہیں کہ اولیا کے گھر بھوت پیدا ہو جاتے ہیں، شاید یہی بات ہو۔ سولہ سال کی عمر سے کلاسیکل موسیقی اچھے استادوں سے سیکھنی شروع

کی تھی۔ خاندان والے ناراض تھے کہ یہ کیا بیہودہ شوق لگایا ہے؟ میں خود بھی کبھی کبھی سوچتا تھا کہ موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے آخر حاصل کیا ہوگا؟ اب اندازہ ہوتا ہے کہ اگر میرے پاس یہ موسیقی کا علم و فن نہ ہوتا تو خدا جانے یہاں میرا حشر کیا ہوتا۔ وہاں تو ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشنوں سے کلاسیکی موسیقی نشر بھی کرنی شروع کر دی تھی۔ مگر ایس احمد کے نام سے پاکستان آنے کے بعد یہ راز بھی راز نہ رہا۔ ؎

گجا ماند آں رازے کز و سازند محفلہا ؟

اب ہمارا شمار ادب کے علاوہ موسیقی کے استادوں میں بھی ہو سکتا ہے ؎

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا!۔

میری زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ادب اور موسیقی میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی دونوں کے علم و فن کی بڑی بھل خدمت کی اور خدا کے فضل سے ——— نیک نامی کے ساتھ اسی خدمت کی بنیاد پر یونیسکو نے جب اپنے ممبر ملکوں کے لیے گشتی مقررین کی اسکیم منظور کی تو پاکستان کے دانشوروں میں سے سب سے پہلے مجھے ۱۹۵۹ء میں منتخب کیا کہ تھائی لینڈ اور فلپائن میں پاکستان کے کلچر پر ان ملکوں کے مشہور اداروں اور شہروں میں لکچر دوں۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اس خدمت کو انجام دیکر اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت سے دور افتادہ ملکوں کو متعارف کیا۔ ۱۹۶۱ء میں خیر سگالی کا ایک ثقافتی وفد ہندوستان گیا تھا اس میں بھی میں نے پاکستانی ادب و موسیقی کی نمائندگی کرنے کا فخر حاصل کیا۔ لسانی، ادبی، اور موسیقی کے مذاکرات میں مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں جگہ مجھے شریک ہونے کا موقع اکثر دیا جاتا ہے۔ میں اسے نہ صرف اپنے لئے باعثِ عزت سمجھتا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت حتی المقدور ان ذرائع سے کرنا اپنا فرض اور اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں۔

میری ساری عمر ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے گزری۔ ۱۹۵۹ء کے اوائل میں جن آٹھ ادیبوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کا سنگِ بنیاد رکھا ان میں سے ایک میں بھی ہوں بلکہ مجھے کنونشن کے داعی اور صدر ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

بہت گئی تھوڑی رہی۔ اللہ توفیق دے کہ بقیہ عمر بھی اسی طرح بسر ہو جائے۔ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

شاہد احمد دہلوی

گنجا نہاری والا

شاہجہاں بادشاہ نے آگرہ کی جھلسا دینے والی گرمی سے بچنے کیلئے دلّی کو حکومت کے صدر مقام کے لئے پسند کیا اور جمنا کے مغربی کنارے قلعہ معلیٰ کی نیو پڑی۔ یہاں ہو کا عالم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جمنا کے کنارے کنارے ہلالی شکل میں شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ ہزاروں مزدور قلعہ کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے بال بچے کنبے قبیلے والے سب مل کر ڈیڑھ لاکھ آدمی ہوں گے ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے سودا سلف بیچنے والے بھی آ گئے۔ گھاس پھوس کی جھونپڑیاں اور کچے مکانات کی آبادی میں خاصی چہل پہل رہنے لگی۔ لال قلعہ کے پہلو میں دریا گنج کے رُخ متوسلین شاہی اور امیر امرا کے محلات، ڈیوڑھیاں اور مکانات بننے شروع ہو گئے ادھر قلعہ کے سامنے پہاڑی پر جامع مسجد ابھرنی شروع ہوئی شہر کے بازاروں کے نقشے بنے۔ جہاں اب پریڈ کا میدان ہے یہاں اُردو بازار، خانم کا بازار اور خاص بازار تھا۔ چاندنی چوک بھی تھا اور قلعہ کے چوک پر ختم ہوتا تھا جا بجا نہریں اور باغات سے شہر کو سجایا گیا تھا۔ جب قلعہ مکمل ہوا اور بادشاہ نے اس میں نزولِ اجلال فرمایا تو شاہجہاں آباد سج سجا کر دلہن بنا۔ پہلا دربار ہوا تو شاہجہاں نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ مغل شہنشاہوں کی بے انتہا دولت پانی کی طرح بہائی گئی اور رعایا فارغ البال اور مالا مال ہو گئی۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق بازاروں میں دنیا زمانے کی چیز موجود، اس کے علاوہ فرمان ہوا کہ روزمرّہ سودا گلی گلی اور کوچے کوچے پھیری والے آواز لگا کر بیچیں۔ چنانچہ دلّی میں آج تک یہی دستور چلا آتا ہے کہ گھر بیٹھے ایک پیسے سے لیکر ہزار روپے کی چیز پھیری والے سے بازار کے بھاؤ خرید لو۔ اصل میں پردہ نشین خواتین کی آسائش بادشاہ کو منظور تھی کہ جس کا جی چاہے اپنی ڈیوڑھی پر ضرورت کی چیزیں لے لے آج بھی دلّی کی عورتیں بیٹی کا پورا جہیز گھر بیٹھے خرید کر جمع کر لیتی ہیں۔ تمباکو، کنجڑے، کسیرے، قلعی گر، بڑھئی، کھٹ بنے، بزاز، منہیار، فصل کا میوہ اور رت کا پھل بیچنے والے حد تو یہ کہ پھول والے تک بڑی دلکش آواز لگاتے ہیں اور گلی گلی سودا بیچتے پھرتے ہیں۔ کسی نے آواز لگائی "ریشم کے جال میں ہلایا ہے نکتیا بنا قدرت کا جلیبا کھالو" ایک تو بول دلکش، اس پر ترنم غضب، جی اوبدا کے یہی چاہتا ہے کہ سودے والا خالی نہ جانے پائے۔ گنڈے دمڑی کی اوقات ہی کیا جھٹ اسے آواز دی۔ دمڑی میں ڈھیر سارے شہتوت دے گیا۔ دلّی کے دل والے سدا سے چٹورے ہیں۔ شاید اس زبان کے چٹخارے کے ذمہ دار بھی چٹ پٹے پھیری والے اور ان کی سُریلی آوازیں ہیں شاید ہی کوئی سودے والا ہو جو کسی شوم کے گھر سے خالی جاتا ہو۔ دھیلی پاؤلا ہر گھر سے مل جاتا ہے۔ باہر والے یہ طور طریقے دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں پھٹتی ہیں۔ شاہی ۱۸۵۷ء کے ساتھ ختم ہوئی مگر دلی والوں کا زبان کا چٹخارہ شاہ خرچیاں ابھی تک باقی ہیں۔

زبان کے چٹخارے کا ذکر آیا ہے تو اس شہر والوں کے ایک اسی پہلو کو لیجئے دلّی والوں کو اچھا کھانے اور طرح طرح کے کھانوں کا شوق ہے یہ شوق انھیں ورثہ میں ملا ہے۔ اگلے دلّی والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بادشاہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ نہ ہو بادشاہ کی دولت میں سے

حصہ بہ رسد سب کو پہنچتا تھا۔ سستا سماں تھا روپے پیسے کی طرف سے فراغت۔ ایک کماتا دس کھاتے تھے، بےفکری سے کماتے اور بےفکری سے اٹھاتے۔
امیروں کی طرح کھانے پینے میں بھی قلعہ والوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہر قسم کے کھانے درکابداروں اور باورچیوں سے پکوائے جاتے اور ان میں بھی
نت نئی اختراعات کی جاتیں۔ بخت ریزی کرنے والوں کے علاوہ، بادشاہ سے لیکر ٹکے کی اوقات والے تک، ہر ایک کو خود بھی اپنے ہاتھ کا کمال دکھانے
کا شوق تھا۔ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی کئی اختراعیں ہیں جن سے مرچوں کا ذکر بہت مشہور ہے۔ غریبوں میں اب بھی کسی کسی کے ہاں ظاہری ایسی پکتی ہے
کہ بریانی اس کے آگے ہیچ ہے اور کہیں ماش کی دال ایسی مزیدار ہوتی ہے کہ کوئی اور لگادے اس سے لگا نہیں کھا سکتا۔ گھر کے علاوہ بعض بازار والوں
نے کسی ایک چیز میں ایسا نام پایا کہ آج تک ان کی مثال دی جاتی ہے، مثلاً گھنٹے والا حلوائی، جھٹیا والا کبابی، اسری والوں کا کھیر والا، پائے والوں کا چچا
کبابی، قابل عطار کے کوچے کا حلوہ سوہن والا، شاہ گنج کا تو ہے تلی والا، فراش خانے کا شابو بھٹیارہ، لال کنوئیں کا نان بائی اور چاندنی چوک کا گنجا نہاری
والا۔ یہ وہ نام ہیں جو دلی میں زبان زد عام ہیں ورنہ شاید ہی کوئی محلہ ایسا ہو جس میں ان سب سودے بیچنے والوں کی دکانیں نہ ہوں۔ مشہور دکانداروں
کے ہاں سودا صاف ستھرا، نفیس اور ایک خاص ذائقہ ہوتا ہے۔ پشتہا پشت سے ان کے ہاں یہی کام ہوتا چلا آتا ہے ان کے خاندانی نسخے ان کے سینوں میں
محفوظ ہیں اور کہا جاتا ہے ہر تجارت کی طرح ان کے بھی چند بھید ہیں۔ عوام کے اس نظریئے نے اتنی شدت اختیار کی کہ طرح طرح کی روایتیں اور افواہیں
شہر میں پھیل گئیں۔ چچا گولے کے کباب ایسے بناتا تھا کہ سارا شہر اس پر ٹوٹے پڑتا تھا۔ پائے والوں کے رخ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر روزانہ شام کو اس کی
کھٹری لگتی تھی۔ اس کٹھیئے پر ان کی سات پشتیں گذر گئی تھیں۔ چچا کو اس پر بہت ناز تھا کہ ان کے باپ دادا کے کباب بادشاہ کے دستر خوان پر جایا کرتے
تھے۔ شہر میں آج تک مشہور ہے کہ چچا کے دادا جیسے کباب نہ تو کسی نے بنائے اور نہ بنائے گا۔ ان میں کچھ ایسا سلونا پن ہوتا تھا کہ کھانے والا ہونٹ چاٹتا
رہ جاتا تھا۔ پھر چپکے سے ایک بزرگ کہتے "سمجھے بھی یہ سلونا پن کاہے کا ہوتا تھا؟ میاں آدمی کا گوشت کھلاتا تھا، آدمی کا۔ جب وہ پکڑا گیا ہے اور اس
کی تلاشی ہوئی ہے تو سینکڑوں کھوپڑیاں اس کے گھر میں نکلیں۔" ظاہر ہے کہ یہ ایک لغو و مہمل قیاس ہے اصل میں اجزائے ترکیبی کے صحیح و خاص تناسب کی
وجہ سے ایک مخصوص ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر ذائقہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بھلا کھیر ایسی کونسی انوکھی چیز ہے گھر گھر پکتی ہے مگر مسری
والوں کی دکان کے پیالے کھلیئے تو جانئے۔ وہی دودھ چاول اور شکر کا آمیزہ ہے مگر تناسب اور ذائقہ ہی تو ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت کی چاٹنے
لگا رہے ہیں۔ شابو بھٹیارے کے ہاں کا شوربہ مشہور ہے ان کا کہنا ہے کہ "ہمارے ہاں بادشاہی وقت کا شوربہ ہے۔" "ارے بھئی یہ کیسے؟" "جی
حضرت یہ ایسے کہ ہم شوربے میں سے ایک پیالہ بچا لیتے ہیں اور اگلے دن کے شوربے میں ملا دیتے ہیں یہ دستور ہمارے ہاں سات پیڑھی سے چلا آتا ہے یوں
[illegible] شوربہ شاہی زمانے سے چلا آتا ہے۔" حاجی نان بائی کے ہاں یوں تو شادی بیاہ کے لئے خمیری، کلچے اور شیرمال تیار کئے جاتے اور ایسے ملائم کہ ہونٹوں
سے توڑ لو مگر ان کا ہنر دیکھنا ہو تو جو آپ کا جی چاہے فرمائش کرکے پکوائیے۔ لیجئے روٹیوں کے نام ہی سن لیجئے۔ روغنی روٹی، بری روٹی، قیمہ بھری روٹی
[illegible] روٹی، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، باقرخانی، بادام کی روٹی، پستے کی روٹی، چاول کی روٹی، گاجر کی روٹی، مصری کی روٹی، خمیری روٹی، تنکی، پنیر،
[illegible] گلزار، نان تنکش، روے کے پراٹھے، میدے کے پراٹھے، گول، چوکور، تکونے۔ غرض روٹی کی کوئی شکل اور ترکیب ایسی نہیں ہے
جو ان کے تنور میں تیار نہ ہو سکتی ہو۔

حاجی نان بائی کا ذکر آیا تو بادش بخیر میاں گنجے نہاری والے یاد آ گئے۔ اصل میں نہاری والے نان بائی ہی ہوتے ہیں بھٹیارے نہیں
ہوتے۔ نہاری تو جاڑوں جاڑوں کھائی جاتی ہے گرمیوں اور برسات میں نہ کھائی جائے نہ پکائی جائے۔ ان دنوں میں نہاری والے اپنا تنور
گرم کرتے ہیں اور روٹی پکانے پر ان کی گذر اوقات ہوتی ہے۔ دلی میں اب تو تقریباً ہر محلے میں ایک نہاری والا موجود ہے لیکن اب
سے کچھ سال پہلے صرف چار نہاری والے تھے انہوں نے شہر کے چار علاقے کھونٹ بانٹ رکھے تھے۔ گنجے کی دکان چاندنی چوک میں نیل کے کٹرے
کے پاس تھی۔ شہر میں اسی کی نہاری سب میں مشہور ہوتی تھی۔ دلی سے باہر اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ نہاری کیا ہوتی ہے اور بعض مقامات پر

یہ لفظ کچھ اور معنوں میں مستعمل ہے مثلاً بچہ پالیوں کو خصوصاً گھوڑوں کی تقویت کے لئے ایک گھولا پلایا جاتا ہے جسے نہاری کہتے ہیں۔ بعض جگہ پالیوں کو نہاری کہا جاتا ہے۔ دلّی میں ایک خاص قسم کا سالن ہوتا ہے جو بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیا جاتا ہے اور بازار میں فروخت ہوتا ہے اسکے پکانے کا ایک خاص طریقہ ہے اور اس کے پکانے والے بھی خاص ہوتے ہیں۔ نہاری کی آج سے نہیں غدر کے پہلے سے دلّی کے مسلمانوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے یوں تو گھر میں بھی اور باہر بھی سینکڑوں قسم کے قورمے پکتے ہیں مگر نہاری ایک مخصوص قسم کا قورمہ ہے جس کا پکانا سوائے نہاری والوں کے اور کسی کو نہیں آتا اس کی پخت وپز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری رات پکائی جاتی ہے اور پکنے کی حالت میں ہمہ وقت اس کا تاؤ مساوی رکھا جاتا ہے، اس کام کے لئے بڑی مشق و مہارت کی ضرورت ہے تیسرے پہر سے اس کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ دکان کی دہلیز کے پاس زمین پر گڑھا کھود کر ایک گہرا چولہا یا بھٹی بنائی جاتی ہے اور اس میں ایک بڑی سی دیگ اس طرح اتار کر جما دی جاتی ہے کہ صرف اس کا گلا باہر نکلا رہ جاتا ہے چولہے کی کھڑکی باہر کے رخ کھلتی ہے اور اس میں سے ایندھن ڈالا جاتا ہے۔ جو دیگ کے نیچے پہنچ جاتا ہے۔ آگ جلانے کے بعد جیسے قورمہ کا مسالہ بھونا جاتا ہے گھی میں پیاز داغ کرنے کے بعد دھنیا، مرچیں، لہسن، ادرک، نمک نہاری کا مسالہ بھونا جاتا ہے جب مسالے میں جالی پڑ جاتی ہے تو گوشت کے پارچے خصوصاً اور ڈال کر انہیں بھونا جاتا ہے اور اندازے سے پانی ڈال کر دیگ کا منہ ڈھک دیا جاتا ہے۔ پکانے والے کو جب دھ گلے گوشت کا اندازہ ہو جاتا ہے تو دیگ کا منہ کھول کر اس میں پچیس بھیجے اور اتنی ہی نلیاں یعنی گودے دار ہڈیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ شوربے کو گاڑھا بنانے کے لئے پانی میں آٹا گھول کر ڈالا جاتا ہے اور یہ آلن کہلاتا ہے۔ اب دیگ کا منہ آٹا لگا کر ڈھکنے سے بند کر دیا جاتا ہے یہ دیگ ساری رات پکتی رہتی ہے اور اس کا تاؤ دھیما رکھا جاتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے پکنے کے بعد جب علی الصباح دیگ پر سے ڈھکنا ہٹایا جاتا ہے تو دور دور تک اس کی اشتہا انگیز خوشبو پھیل جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس میں سے بھیجے اور نلیاں نکال کر الگ برتن میں رکھ لی جاتی ہیں اور پھر گاہکوں کا بھگتان شروع ہوتا ہے، یہ کھانا چونکہ دن شروع ہوتے ہی کھایا جاتا ہے اس لئے اس کا نام نہار کی رعایت سے نہاری پڑ گیا۔

ہاں تو ذکر تھا گنجے نہاری والے کا۔ دلّی والوں کے علاوہ قرب و جوار سے بھی لوگ نہاری کھانے آیا کرتے تھے، خصوصاً علی گڑھ کالج کے لڑکے اتوار کے اتوار دھاوا بولتے تھے، اسی سلسلے میں ہمیں بھی چند بار گنجے کی نہاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ان کی دکان صبح دم کھلتی تھی اور کھلنے سے پہلے گاہک موجود ہوتے کسی کے ہاتھ میں پتیلی، کوئی بادیہ لئے، کوئی ناشتہ دان سنبھالے سردی میں سکڑا سوں سوں کرتا ٹہل رہا ہے۔ یہی تو ایک دیگ پکتی اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی۔ ذرا دیر ہوئی پہنچے تو میاں گنجے نے معذرت کے لہجے میں کہا "میاں اب کل بھیجئے گا اور ذرا سویرے آئیے گا۔" نہاری کے مسالوں کا وزن اور پکانے کا طریقہ اوروں کو بھی معلوم ہے مگر وہ ہاتھ اور نگاہ جو استاد گنجے کو میسر تھی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اکثر لوگ ان سے دریافت کرتے تھے کہ "آخر استاد بات کیا ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کی پکی نہاری میں یہ لذت نہیں ہوتی؟" تو وہ ہنس کر یہ کہہ دیا کرتے "میاں بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ اور حضرت سلطان جی کا فیض ہے ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا؟"

استاد گنجے کے کردار پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کا سراپا بھی بیان کیا جائے۔ گنجے کے نام سے خواہ مخواہ ذہن میں ایک کراہت سی پیدا ہوتی ہے، نازک خیال اور نفیس مزاج لوگ تو گنجے کے ہاتھ کا پانی بھی پینا گوارہ نہیں کر سکتے لیکن استاد کو تو سرے سے گنج کی بیماری ہی نہیں تھی۔ اصل میں ان کی چندیا کے بال جھڑ گئے تھے اور ٹانٹ صاف ہو کر تامڑا نکل آیا تھا اور اس کے تین طرف چار انگل چوڑی بالوں کی ایک جھالر سی تھی۔ دلّی کی چلبلی طبیعت والے بھلا کب چوکنے والے تھے۔ گنجے کی پھبتی ان پر کسی اور یہ ایسی جمی کہ چپک کر رہ گئی۔ گندمی رنگ کا گول چہرہ خشخاسی داڑھی بڑی بڑی چمکدار مگر حلیم آنکھیں۔ باوجود نہاری فروشی کے ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا لٹھے کا شرعی پاجامہ، نیچا کرتا، کہتے پر بہت صوفیانہ چھینٹ کی نیم آستین، سر پہ صافہ، کسرتی اور بھرا بھرا جسم، انہیں کوئی دیکھے تو سمجھے کہ بڑے خرانٹ ہیں، بات بات پہ کاٹنے کو دوڑتے ہوں گے۔ مگر ان کی طبیعت اس کے بالکل برعکس تھی، بالعموم نامی دکاندار بڑے بد مزاج اور غصیل ہوتے ہیں جیسے چچا کبابی کہ بڑے ہتھ چھٹ تھے اور مار پیٹ تک نہیں چوکتے تھے۔ استاد گنجے بڑے خلیق اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اور ہم نے کبھی نہیں سنا کہ انہیں غصہ آیا ہو یا کبھی ان کے منہ سے کوئی ناشائستہ

کا کلمہ نکلا ہو۔ ہر گاہک سے چاہے دو آنے دو آنے کا ہو چاہے روپے دو روپے کا بڑی نرمی سے بات کرتے اور مستقل گاہکوں کو تو یہ مہمان سمجھتے تھے

استاد گنجے کے کردار میں سب سے نمایاں چیز ان کا حلیم اور انکسار تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے جنہیں دلّی والے سلطان جی کہتے ہیں استاد گنجے کو بڑی عقیدت تھی اور یہ انہی کا روحانی تصرف تھا کہ استاد گنجے کا دل گداز ہو گیا تھا اور وہ اپنی ساری کمائی غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی امداد کرنے میں صرف کرتے تھے۔ سلطان جی کی سترھویں میں اپنی دکان بڑے اہتمام سے لے جاتے تھے اور سارے دنوں میں درگاہ کی حاضری ہر جمعرات کو باقاعدہ ہوتی تھی۔ روپے پیسے سے خوش تھے مگر دل سے سلطان جی تک ہر موسم کے اعتبار سے محتاجوں کو کپڑا تقسیم کرتے، ہر مہینے گیارھویں کی نیاز ان کے ہاں بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ دن بھر لنگر جاری رہتا۔ جمعرات کو ان کی دکان پر فقیروں کی لنگار لگی رہتی اور سب کو پیسہ ٹکا ملتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دکانداری شروع ہونے سے پہلے ادھر دیگ کھلی ادھر انہوں نے اللہ کے نام کا حصہ نکالا۔ اگر کوئی محتاج موجود ہوا تو پہلے اسے کھلایا ورنہ نکال کر الگ رکھ دیا۔ پھر دیگ میں سے بھیجے نلیاں نکال کر طباق میں رکھیں۔ تار اور رونق کو ایک بڑے بادیئے میں الگ نکال لیا اور اس کے بعد دکانداری شروع ہوئی۔ دکان میں بیسوں پتیلیاں، دیگچے اور برتن رکھے ہیں۔ کسی میں دو روپے کسی میں روپیہ، کسی میں بارہ آنے، کسی میں آٹھ آنے پڑے ہیں۔ شوقین اور قدردان رات ہی کو اپنے اپنے برتن اور پیسے دے گئے ہیں مایوس نہ ہونا پڑے۔ سب سے پہلے انہی برتنوں کی طرف استاد کی توجہ ہوتی ہے بڑی تیزی اور پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہیں۔ ادھر گاہکوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں، ان کی آسائش کا بھی خیال ہے گاہک بھی جانتے ہیں کہ جن کے برتن پہلے آ گئے انھیں پہلے ملے گا کسی باہر والے نے جو یہاں کے قاعدے قرینے نہیں جانتا جلدی مچائی تو استاد نے بڑی انکساری سے کہا "حضور ابھی دیتا ہوں۔ جو پہلے آیا ہے اسے اگر پہلے نہ دوں گا تو شکایت ہوگی"۔ یہ برتن پورے ہوتے تو گاہکوں کا بھگتان شروع ہوا۔ دو روپے سے دو پیسے تک کے خریدار موجود اور سب کو حصہ رسد ملتا ہے۔ تین گھنٹے میں دو ڈھائی سو گاہکوں کو نہاری دی اور دیگ سخی کے دل کی طرح صاف ہو گئی۔ اب جو کوئی آتا ہے تو بڑی سماجت سے کہتے ہیں "میاں معافی چاہتا ہوں۔ میاں اب کل دوں گا انشاء اللہ۔ اللہ خیر رکھے کل کھائیے گا"۔ سبحان اللہ کیا اخلاق تھا اور کیسی وضعداری۔ آگ اور مرچوں کا کام، اور اتنے ٹھنڈے اور میٹھے اور مردوں کو دیکھ لیجئے۔ گالی گلوچ دھکا مکی اور لپاڈگی کی نوبت رہتی ہے۔

استاد گنجے کے یہاں دو قسم کے گاہک آتے تھے ایک وہ جو خرید کر لے جاتے تھے اور ایک وہ جو وہیں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر کھانے والوں کیلئے دوکان کے اوپر کمرے پر نشست کا انتظام تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ تھا جس میں چٹائیاں بچھی رہتی تھیں۔ اس میں ایک ایک دو دو آدمی بھی کھاتے تھے اور دس دس کی ٹولیاں بھی۔ استاد سے جتنا اور جو جو سودا کہا جائے اتنا ہی دیتے تھے۔ اپنی طرف سے اس میں اضافہ یا ترمیم نہیں کرتے تھے مستقل گاہکوں کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ بڑے مزاج شناس اور غضب کی یادداشت تھی۔ صورت دیکھتے ہی کہتے "فرمایئے حکیم صاحب کیا حکم ہے"۔ "کیوں میاں سودا کیا پیش کروں"۔ "ڈپٹی صاحب، ارشاد"۔ میاں گنجے کی نہاری دلّی کے سب شرفاء کے ہاں جاتی تھی۔ ان کی سات پشتیں اسی دلّی میں گذری تھیں۔ سارا شہر ان کو جانتا تھا۔ اور یہ بھی دلّی کی دائی بنے ہوتے تھے۔ غدر پہلے اور غدر بعد کے سارے خاندان اور ان کے سردار افراد انھیں ازبر تھے کبھی موج میں ہوتے تو بڑوں کی خیر سلا بھی پوچھ لیتے۔ "کیوں میاں، بڑے ڈپٹی صاحب تو اچھی طرح ہیں نا؟ جی چاہتا ہے کہ انھیں بھی ایک دن تحفہ نہاری کھلاؤں۔ اللہ نے چاہا تو اب کے وہ نہاری کھلاؤں کہ چلتے کے جاڑوں میں پسینہ آ جائے۔ اچھا میاں تو آپ کیلئے کیا بھیجوں؟" "استاد کرے پر چھ آدمیوں کیلئے نہاری"۔ بس اس سے زیادہ آپ کو کہنے کی اور انھیں سننے کی ضرورت نہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ آپ کی نہاری کا کیا لوازمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آپ کے ساتھی بھی آپ کے ہم مذاق ہوں گے۔ فی کس پاؤ بھر نہاری کے اندازے سے انھوں نے تار اور لبد هڑا ایک بڑے سے بادیئے میں نکالا۔ گھی تو صاف فی کس کے حساب سے داغ کرنے انگیٹھی پر رکھ دیا۔ اتنے گھی تیار ہوا انھوں نے چھ بھیجے تو صاف صوف کر نہاری میں ڈال دیئے اور بارہ نلیاں بھی اس میں جھاڑ دیں۔ ادھر سے کڑکڑاتا گھی ڈال طباق سے ڈھک دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر نیچے خمیری روٹیاں اور چپاتیاں اوپر بھیجا۔ اس نے کھونٹی پر سے گھی کا بڑا سا گول دستر خوان نکال کر بیچ میں بچھایا اور اس میں غوریاں

چمٹا دیا۔ پھر لپک کر نیچے آیا اور نہاری کا بادیہ احتیاط سے اوپر پہنچا آیا۔ اتنے اس نے ہاتھ دھلائے دو صوافیاں تنی کی تنی خمیری نان اور ایک طباخ میں گرم مصالحہ اور نمک کی ہوائیاں ہری مرچیں اور کتر کر گیا۔ سب دسترخوان پر جو بیٹھے تو دہی نہاری دہرد ہوتی جلتی انگیٹھی ایک ہنڈی میں قریب رکھ گیا۔ لا کر روٹی سینک سینک کر دیتا جاتا ہے۔ گرم اور تنوری نوالوں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ دوستوں کے قہقہے اور چہچہے ہوتے جاتے ہیں۔ گھی نے نہاری کی لذت بڑھانے کے علاوہ مرچوں کا دف بھی مار دیا ہے۔ ذرا نہاری ٹھنڈی ہوئی اور فوری انگیٹھی پر رکھ دی۔ یہ لیجئے میاں گنجے نے آپکے دوستوں کیلئے ایک خاص تحفہ بھیجا ہے۔ تنور میں سے گرما گرم روٹیاں نکال کر گھی میں ڈال دیں اور وہ گھی پی کر ایسی خستہ اور ملائم ہو گئی ہیں جیسے روغنی کے گلے، واہ دلی کیا مزاج دانی اور ادا شناسی تھی! جب ہی تو آج تک گنجے نہاری والے کو دلی والے یاد کرتے ہیں۔ یہ تو خیر امیروں کے چونچلے تھے۔ اصل میں نہاری غریب غربا کا من بھاتا کھاجا ہے۔ کاریگر دستکار اور مزدور صبح صبح کام پر جانے سے پہلے چار پیسے میں اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ دو پیسے کی نہاری اور دو پیسے کی دو روٹیاں ان کے دن بھر کے سہارے کو کافی ہوتیں۔ گھر میں علی الصباح چار پیسے میں بھلا کیا تیار ہو سکتا ہے۔ وہ سستے اور بابرکت سمے تھے، ایک پیسے میں چار سودے لے آتے تھے۔ ایک کماتا اور دس کھاتے تھے۔ اب دس کماتے ہیں اور ایک کو نہیں کھلا سکتے۔ وہ وقت نہیں رہا۔ میاں گنجے نہاری والے بھی گذری ہوئی بہاروں کی ایک چٹپٹی کہانی بن کر رہ گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

"عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"

ارسکن کالڈویل

شاہد احمد دہلوی

چڑھتے سورج کی پرستش

لوئی کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ کلم کی بات اُسے یاد آ گئی۔ اور اُس نے اپنی دھاردار ٹھوڑی پر سے گھبرا کر ہاتھ اٹھا لیا۔ اُسے اب یہ محسوس ہونے لگا کہ یہاں کھڑے رہنا جرم ہے۔ آرچ گنارڈ کو بھلا وہ اپنا منہ کیسے دکھا سکتا تھا؟

سہ پہر کو تیل کے پمپ کی طرف آتے ہوئے راستے میں اُس نے کلم سے کہا تھا: "مجھے راشن کی سخت ضرورت ہے۔" سڑک پر پڑے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر سے اڑا کر کلم نے کہا تھا۔ "اگر تم کچھ دن اور آرچ گنارڈ کی ملازمت کرتے رہے تو تمہاری ٹھوڑی اتنی تیز ہو جائے گی کہ اپنے تابوت کے تختے خود اسی سے پھاڑ لو۔"

تیل کے پمپ کے پاس ایک خالی بکس پر لوئی جا بیٹھا۔ اور سوچنے لگا۔ کاش کلم کی طرح آرچ گنارڈ سے میں بھی اتنا نہ ڈرا کروں۔ کلم بھی حبشی ہی تھا، مگر جب اُسے کھانے کی ضرورت ہوتی تو راشن مانگنے میں ذرا نہ جھجکتا۔ اور جب اُسے اور اُس کے گھر والوں کو پیٹ بھر کر کھانا نہ ملتا تو وہ نڈر ہو کر آرچ سے شکایت کرتا۔ آرچ اس وقت تو کچھ نہ کہتا۔ مگر بعد میں اُسے گالیاں دیتا اور کہتا "ذرا مجھے موقع مل جائے میں اُسے بستی سے نکال کر ہی دم لوں گا۔"

لوئی کو پلٹ کر دیکھے بغیر معلوم تھا کہ تیل گھر کے ایک سرے پر کلم چند اور حبشیوں کے ساتھ کھڑا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں لوئی میں اُس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔

آرچ گنارڈ دھوپ میں بیٹھا اپنی لمبی سی چھری کو جوتے پر رگڑ کر تیز کر رہا تھا۔ اُس نے دو ایک دفعہ کنکھیوں سے لوئی کی شکاری کتیا نینسی کی طرف دیکھا۔ یہ کتیا سڑک کے بیچ میں پڑی انتظار کر رہی تھی کہ لوئی گھر چلے تو ساتھ ہو لے۔

"یہ تمہاری کتیا ہے لوئی؟"

لوئی خوف سے اُچھل پڑا۔ اور اُس کا ہاتھ خود بخود اُس کے دبلے چہرے کو چھپانے لگا۔ کیونکہ اس کے دکھلانے سے آرچ پر کم خوراک دینے کا الزام آتا تھا۔

آرچ نے چٹکی بجائی اور کتیا کھڑی ہو کر دُم ہلانے لگی کہ بلایا جائے تو آگے بڑھے۔

"مسٹر آرچ! یہ تو ـــــ"

آرچ نے کتیا کو آواز دی۔ کتیا نے پیٹ کے بل اس کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ اور آرچ کی ہر چٹکی پر ننھی سی دم ہلا دیتی

جب چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تو زمین پر چت لیٹ گئی۔ اور اُس کے چاروں پنجے ہوا میں معلق ہو گئے۔

ڈڈلے سمتھ اور جم دیور تیل گھر کے پاس ٹہلتے پھر رہے تھے۔ دیوار کا سہارا لیے دونوں ہنسنے لگے۔ پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ آرچ کیا کرنے والا ہے دونوں سیدھے کھڑے ہو گئے۔

آرچ سے اپنے جوتے پر تمباکو کا لعاب اور تھوکا اور چھری کو پھر تیز کرنے لگا۔

"ارے لونی یہ تو بتا، کس قسم کی شکاری کتیا ہے یہ! مجھے تو دوغلی لگتی ہے۔"

لونی کو محسوس ہو رہا تھا کہ کلم کی نظریں پیچھے سے اُس کے سر میں گھسی چلی جا رہی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ کتیا جیسے چٹکیاں بجا بجا کر آرچ گنارڈ بلا رہا تھا اور دوغلی بتا رہا تھا، کلم کی ہوتی تو وہ کیا کرتا۔

کسی نے لونی کے پیچھے سے قہقہہ لگا کر کہا۔ "بڑے شکار یا پرندوں کا شکار کرنے والی نسل کی تو ہے نہیں۔ اس کی دُم بہت لمبی ہے — ہے نا آرچ!"

اس پر سب نے ٹھٹھا لگایا۔ اور آرچ بھی ہنسا۔ سب کی نظریں لونی پر لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں وہ آرچ کو کیا جواب دیتا ہے!

آرچ نے پھر چٹکی بجائی، اور پوچھا "کیا یہ دوغلی کتیا ہے لونی؟"

"مسٹر آرچ، میں —"

"اگر اس میں کوئی علامت پرندوں یا بڑے جانوروں کے شکار کرنے والے کتوں کی نہیں ہے تو اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے لونی۔ ہر شخص کو اپنے گھر پر شکاری کتا رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ خرگوشوں اور سوروں کو جلدی پکڑا جا سکے۔ دوغلا شکاری کتا تو بڑا معزز جانور ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی کبھی دوغلا کتا تھا اور مجھے اس پر بڑا فخر تھا۔"

سب ہنسنے لگے۔

آرچ گنارڈ نینسی کی دُم جھپٹ کر پکڑنے کی فکر میں تھا۔ لونی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سر گھما کر دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ تیل گھر کے ایک سرے پر لمبے ستم کی ایک جھلک دکھائی دے گئی۔ کلم اس کی طرف گھور رہا تھا۔ اور بلاشبہ اُس کی نظریں وہی بات کہہ رہی تھیں جو اس نے سویرے کہی تھی، کہ جو شخص آرچ گنارڈ کا کام کرے اُسے کم راشن نہیں لینا چاہیئے۔ لونی نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ وہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی حبشی میں خود اس سے زیادہ ہمت کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسے موقعے اکثر آئے کہ کلم کی سی ہمت اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے وہ سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہو گیا تھا۔

"یہ جو تمہاری کتیا ہے لونی، اس کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ اس کی ٹانگوں میں اتنا دم نہیں ہے جتنا اس میں وزن ہے۔ دیکھو نا یہ دوغلی کتیا ہے۔ اگر اسے ذرا ہلکا کر دیا جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

لونی کو اب کلم کی بات یاد آئی۔ اُس نے کہا تھا کہ اگر آرچ گنارڈ نے کبھی کتیا کی دُم اُڑانے کی کوشش کی تو سے اس کا مزا چکھا دوں گا۔ لونی جانتا تھا۔ اور کلم جانتا تھا۔ اور ہر شخص جانتا تھا کہ آرچ کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں ہے تاکہ اپنی سی کر گزرنے کا ایک بہانہ اس کے ہاتھ آ جائے۔ وہ تو بس اس فکر میں تھا کہ کلم ہنری صرف ایک انچ اپنی حد سے آگے بڑھ آئے، یا اُلٹ کر جواب میں صرف ایک لفظ کہہ دے تو پھر اپنی من مانی کر گزرے۔ مقصد آرچ کا یہ تھا کہ کلم ٹیٹ کر بھاگے نہیں۔ بلکہ ذرا اڑ جائے تو اس سے نمٹ لیا جائے۔ کلم کو اس آبادی میں رہتے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ اور اس بات میں کلم نے کبھی کسی کو پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔

آرچ نے ہاتھ بڑھا کر نینسی کی دُم پکڑ لی۔ اور لونی سوچتا رہا کہ دیکھے کلم کیا کرتا ہے۔ نینسی سمجھی کہ آرچ اُس سے کھیل رہا ہے۔ وہ لیٹے

وہ بھی ہنسانے والی حرکتیں کرنے لگی۔ اُس نے مڑ کر چاہا کہ آرچ کا ہاتھ چاٹنے لگے۔ آرچ نے اُس کی ناک پر چھری کا دستہ مارا۔

"لوتی، بڑی کھلنڈری کتیا ہے یہ تو۔" اتنا کہہ کر اُس نے دم کو اور بھی نیچے سے پکڑ لیا۔ "مگر اس ڈیل کی کتیا کے لیے اتنا بڑا دُم کا ڈنڈا نہیں ہونا چاہیئے۔ خصوصاً جبکہ کتیا دوغلی ہو۔"

لوتی کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ بمشکل تھوک نگل کر بولا۔ "مسٹر آرچ، بہت اچھی کتیا ہے۔ خرگوش پکڑ لیتی ہے۔ میں ـــ"

"بہشت لوتی۔" آرچ نے کہا۔ اور کتیا کی دُم پر چھری کو دھار دینے لگا۔ "میں نے عمر بھر میں خرگوش کا شکار کرنے کے لیے کسی کتے کی اتنی لمبی دُم نہیں دیکھی۔ معمولی لینڈی دوغلی کتیا کے لیے یہ دُم ضرورت سے زیادہ لمبی ہے۔"

لوتی نے پر امید نظروں سے ڈھیلے سہمے اور دوسروں کی طرف دیکھا۔ مگر کسی نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ آرچ کو باز رکھنے کی کوشش بے سود تھی۔ کیونکہ جب آرچ دل میں ٹھان لیتا کہ یہ کام کرنا ہے تو پھر کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ لوتی جانتا تھا کہ اگر ذرا بھی خفگی یا ناراضگی کا اظہار کیا تو سوچ وڈنے سے پہلے ہی آرچ اُسے نکال باہر کرے گا۔ وہاں صرف کلم ہنری ایک شخص ایسا تھا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔ مگر کلم ....

سفید آدمی اور کالے آدمی سبھی تیل گھر کے دونوں سروں سے یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ لوتی اب کیا کرتا ہے۔ سب کو توقع تھی کہ اپنی کتیا کے پیچھے لڑ پڑے گا۔ اگر ایک دفعہ کوئی ہمت کر کے آرچ گنارڈ کو کتوں کی دُمیں کاٹنے سے روک دے تو آئندہ کے لیے دُمیں کاٹنے کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے۔ مگر وہ تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بٹائی پر کام کرنے والا لوتی اپنے مالک آرچ کے آگے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ شاید کلم ہنری ہمت کر جاتے تو کر جاتے۔ صرف کلم ہی ایک ایسا آدمی تھا جو آرچ کو باز رکھنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ چاہے اس کوشش میں خود کسی مصیبت میں پھنس جائے۔ اور یہ بات بھی سب جانتے تھے کہ آرچ کلم کو بستی سے نکال کر ہی دم لے گا یا اُس کے جسم میں سیسہ بھرے بغیر نہیں مانے گا۔

آرچ نے کہا۔ "بس تو میں یہ سمجھوں کہ تم نے اسے تسلیم کر لیا۔ کوئی اعتراض میرے سننے میں نہیں آیا۔"

کلم ہنری کئی قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔

لوتی کی شکل دیکھ کر آرچ نے قہقہہ لگایا اور دُم کو جھٹکا دے کر کتیا کو کھڑا کیا۔ کتیا تکلیف اور تعجب سے چیخنے لگی۔ لیکن آرچ نے اُس کے پیٹ میں لات مار کر اُسے خاموش کر دیا۔

لوتی کی آنکھیں جھپک گئیں۔ کسی کا اُس کی کتیا کے اس طرح لات مارنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

"مسٹر آرچ، میں ـــ"

اُس کا گلا بھنچ گیا اور سانس لینے کے لیے اُسے منہ پھاڑ کر خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔ اِدھر اُدھر جو سفید آدمی کھڑے تھے وہ بھی خاموش رہے۔ کسی کتے کے پیٹ میں یوں لات مارنا کسی کو اچھا نہیں لگا۔

تیل گھر کے دوسرے سرے کو لوتی نے کنکھیوں سے دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ دو حبشی پیچھے کلم کی طرف بڑھے اور اس کے دامن کو پکڑ کر کھینچنے لگے۔ کلم ٹانگیں کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کیلیے کوشش نہیں کی اور زمین پر تھوک کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

آرچ نے تھوک کر کہا۔ "چونکہ کوئی اعتراض میں نے نہیں سنا اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں ٹھیک ہے اور سب معاملات ڈانا چاہیے۔"

لوتی کی گردن آگے بڑھ گئی اور اسے صرف تیتی کی پچھلی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ تو کچھ موٹا جوتا ملاقع یا پھونک یا

یا بھوسہ مانگنے آیا تھا۔ اب اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ گھر والے چاہے بھوکوں مر جائیں وہ راشن مانگنے پر کسی طرح اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔

آرچ نے کہا "میری یہ عادت ہے کہ میں پہلے پوچھ لیتا ہوں۔ اگر کسی کو اعتراض ہو تو میں آگے نہیں بڑھتا کہ خواہ کسی کتے کی دُم اُڑا دوں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہو سکتی نا۔ نہیں صاحب، معاملہ صاف اور کھرا ہونا چاہیے۔"

آرچ نے کتیا کی دُم کو اوپر نیچے سے پکڑ لیا۔ اور جڑ سے دو تین انچ اوپر چھری کا پھل ٹکا دیا۔ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے منہ میں پانی بھر رہا ہے۔ کیونکہ تمباکو کا لعاب اُس کے ہونٹوں کے کنارے سے ٹپکنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنا منہ پونچھا۔

ایک شور مچاتا ہوا مٹیلا سرخ خاک اُڑاتا سڑک پر سے گزرا۔ سب کی نظریں اُس کی طرف یہ دیکھنے کے لیے اُٹھ گئیں کہ اسے کون چلا رہا ہے۔

لونی نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اُس پر ڈالی مگر اپنی آنکھیں اونچی نہ کر سکا۔ اس کا سر اور بھی لٹک گیا یہاں تک کہ اسے اپنی تیز ٹھوڑی سینے میں چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس پر اُسے خیال آیا کہ آرچ نے بھی یہ دیکھ لیا یا نہیں کہ اس کا چہرہ کس قدر دبلا پڑ گیا ہے۔

"یں دو تین دو غلے کتے اپنے گھر پر رکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر آرچ نے کتیا کی دُم پر چھری کو اس طرح تیز کرنا شروع کر دیا جیسے چوٹے پر نائی اُسترے کو تیز کرتا ہے۔ اُس کی اسی حرکت پر وہ مسکرانے لگے جو اُسے گھیرے ہوئے تھے۔

"مگر میری سمجھ میں یہ مصلحت نہیں آئی کہ دوغلے شکاری کتے کی آخر اتنی لمبی دُم کیوں ہو؟ جب میں کھانے کے لیے خرگوش یا کوئی جانور شکار کرنے کے لیے اپنے کتے چھوڑتا ہوں تو لمبی دُم اُن کے دوڑنے میں اڑنے لگتی ہے۔"

بائیں ہاتھ سے کھینچ کر اور دائیں سے دھکیل کر آرچ گنارڈ نے کتیا کی دُم اس پھرتی سے اُڑا دی جیسے کسی چراگاہ سے گائیں گھر کی طرف ہنکانے کے لیے بید مجنوں سے ایک شاخ تراش لی جائے۔ دُم سے چھٹکارا پاتے ہی کتیا جست کر کے بھاگی اور اس قدر زور سے چیخنے لگی کہ میلوں تک اُس کی آواز سنائی دے رہی ہو گی۔ بنیسی ذرا رکی اور اُس نے مڑ کر آرچ کی طرف دیکھا۔ اور پھر سڑک کے بیچ میں کود کر اُچھلنے اور چکر کاٹنے لگی۔ اور سارے وقت چیختی اور خون بہتی دُم پر منہ مارتی رہی۔

آرچ کرسی میں ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ میں کٹی ہوئی دُم کو گھماتا رہا۔ اور دوسرے سے چھری کے پھل کو اپنے جوتے کے تلے پر رگڑ کر صاف کرتا رہا۔ سامنے اُسے لونی کی کتیا سرخ خاک میں چک پھیریاں کھاتی دکھائی دے رہی تھی۔

کسی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ لونی اپنی کتیا کی تکلیف نہ دیکھنے کے لیے نظر چرا رہا تھا۔ اور جبر کر کے کلم ہنری کی طرف بھی اپنی نگاہیں اُٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے وہ سوچنے لگا کہ آرچ گنارڈ کی کھیتی باڑی پر کیوں اتنے سال ضائع کیے۔ بٹائی پر راشن بھی کم ملتا رہا۔ اور روز بروز ہڈی سے چمڑا لگتا گیا۔ کلم سچ ہی تو کہتا ہے کہ آرچ کے ساجھیوں کے چہرے اس قدر دھاردار ہوتے جا رہے ہیں کہ خود اپنے تابوت کے تختے ان سے چیر لیں گے۔ بے خیالی میں اس کے دونوں ہاتھ اپنی ٹھوڑی پر پہنچ گئے۔ جبڑوں کی ہڈیوں اور اُبھرے ہوئے پٹھوں کو چھونے کے بعد ہاتھ خود بخود گود میں گر پڑے۔

اس وقت اسے جتنی بھوک لگی ہوئی تھی اس سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر آرچ نے اب اسے کچھ راشن نہ دیا تو ایک ہفتہ میں فاقے پڑنے لگیں گے۔ اس کی بیوی ہٹی کھیتوں پر کام کر کر کے بھوک اور تھکن سے ادھ موئی ہو چکی تھی۔ اور اس کا باپ مارک پیو مچ میں

سال سے بھرا پتھر تھا۔ یکساں پوچھے جاتا تھا کہ اتنی غذا ہمیں کیوں نہیں ملتی کہ ایک وقت تو پیٹ بھر کر کھائیں۔ لوئی کا سر اور بھی لٹک گیا اور اُسے ایسا لگا کہ آنکھیں بھیگ چلی ہیں۔

سینے میں اُس کی دھار دار ہتھوڑی نے کھُب کر اُسے اس قدر بے چین کیا کہ تکلیف سے بچنے کے لیے اُسے اپنا سر اونچا کرنا ہی پڑا۔ سر اُٹھانے کے بعد سب سے پہلے جو اُس کی نظر پڑی تو آرچ گنارڈ پر پڑی جو بیٹھا بائیں ہاتھ سے غنیسی کی دم گھما رہا تھا۔ آرچ گنارڈ کے پاس گھر پر کتوں کی دموں سے بھرا ہوا ایک بکس رکھا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے دُمیں کاٹتا چلا آ رہا تھا۔ سالہا سال میں اُس نے بیشمار دُمیں جمع کر لی تھیں۔ اور اس عجوبہ سرمایہ پر اُسے اس قدر ناز تھا کہ بکس کو ہمیشہ مقفل رکھتا اور اُس کی کنجی اپنے گلے میں ڈالے پھرتا۔ اتوار کی سہ پہر کو جب پادری آتا یا سامنے کے پورچ میں لوگ گپ شپ کے لیے جمع ہوتے تو آرچ اُنھیں ایک ایک دُم دکھاتا۔ اور یادداشت سے ہر کتے کا نام بھی اس طرح بتاتا جاتا جیسے اُس دُم پر کتے کے نام کا پرزہ لگا ہوا ہو۔

کلم ہنری تیل گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ اور کھیتوں کی طرف جو سڑک جاتی تھی اُس پر جا رہا تھا۔ آرچ کی کوٹھی کے قریب حبشیوں کے کچھ گھروں کے جھنڈ میں کلم ہنری کا بھی گھر تھا۔ اور اپنے گھر پہنچنے کے لیے اُسے لوئی کے گھر کے آگے سے گزرنا پڑتا تھا۔ لوئی بھی اُٹھ کر چلنے ہی والا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ آرچ اُسے گھور رہا ہے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ آرچ اُس کے دبلے چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ وہ اُٹھ کر کلم کے ساتھ سڑک پر جاتا ہے یا نہیں

چلنے کا خیال آتے ہی اُسے یاد آیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ رات کے کھانے سے پہلے آج ہی اُسے کچھ راشن مل جانا چاہیے تھا۔ چاہے کتنا ہی کم ہو۔

"مسٹر آرچ، میں ——"

آرچ ٹھٹک کر اُس کی طرف یوں گھورنے لگا۔ جیسے کسی عجیب و غریب انجانی آواز کو سننے والا ہو۔

لوئی اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ اور سوچنے لگا کہ شاید آرچ کہنے والا ہے کہ تم کس قدر دبلے ہو گئے۔ اور کتنے بھوکے دکھائی دیتے ہو۔ مگر آرچ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اُس نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ اور زور کا قہقہہ لگایا۔

آرچ نے غنیسی کی دُم لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ حبشیوں کے دمیں ہوتیں تو کتوں کی دُموں کے بدلے میرے پاس حبشیوں کی دُموں کا ایک ڈھیر ہوتا۔ پھر ذرا کشائی بھی زیادہ ہوتی"

کچھ لوگ جو پیچھے کھڑے ہوئے تھے، وہ اور دوسرے آہستہ ذرا سے ہنس کر رہ گئے۔ جیسی اچانک یہ ہنسی شروع ہوئی اسی طرح اچانک ختم ہو گئی۔

جن حبشیوں نے آرچ کی یہ بات سن لی تھی وہ خاک میں کھسٹر کھسٹر کرتے پیچھے ہٹ گئے۔ چند منٹ میں تیل گھر سے سب جا چکے تھے۔ سڑک پر سرخ لکڑی کی عمارت کے پیچھے سب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

آرچ نے کھڑے ہو کر انگڑائی لی۔ سورج نیچا ہو رہا تھا۔ اور اکتوبر کی ہوا اب خوشگوار نہیں رہی تھی۔ آرچ نے کہا "اب گھر چل کر کھانا کھانا چاہیے"

آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا وہ سڑک کے بیچ میں پہنچ گیا۔ اور رُک کر غنیسی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو تالاب کے پاس دبکی دبکی جا رہی تھی۔ آرچ نے کہا "آج کوئی میرے ساتھ نہیں چل رہا۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا لوئی؟ گھر جا رہے ہو کھانا کھانے، ہے نا؟"

"مسٹر آرچ، میں......"

لوئی کو معلوم ہوا کہ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے اُسے خیال آیا کہ مونے چھوٹے ناخ۔ اور بھوک اور بھوسے کے لیے آرچ سے کہے، شاید کچھ جَو اور بھوسہ مل جائے۔ مگر جب اُس نے منھ کھولا تو الفاظ نے نکلنے سے انکار کر دیا۔ وہ کئی قدم آگے بڑھا۔ اور اپنا سر ہلاتا رہا

"نہیں، سن کر نہ جانے آرچ کیا کہے؟"

"ہٹی تمھارا انتظار کر رہی ہوگی۔"

یہ کہہ کر آرچ منھ پھیر کر چلدیا۔

آرچ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر غنیسی کی دُم نکالی اور اُسے گھماتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈڈلے اسمتھ تیل گھر کے اندر چلا گیا۔ اور باقی آدمی بھی وہاں سے چل دیے۔

جب آرچ کئی سو قدم چلا گیا تو لوئی گیس پمپ کے پاس پھر اسی کیس پر مایوس ہو کر بیٹھ گیا جس پر وہ آرچ سے بات کرنے کیلیے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اُس کا دل ڈوب رہا تھا۔ کندھے جھکے ہوئے تھے اور پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان اُس کے ہاتھ لٹکے ہوئے تھے۔

لوئی کو کچھ خبر نہیں ہوئی کہ کب تک اس کی آنکھیں بند رہیں۔ لیکن جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو اُس نے دیکھا کہ غنیسی اُس کے قدموں میں پڑی ہوئی اپنی کٹی ہوئی دُم کو چاٹ رہی تھی۔

جب وہ اُسے دیکھ رہا تھا تو اسے پھر محسوس ہوا کہ دھار دار کلھوڑی اُس کے سینے میں گھسی جا رہی ہے۔ اتنے ہی میں اس کے پیچھے سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ ایک منٹ بعد اس نے ڈڈلے اسمتھ کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ تیل گھر سے اپنے گھر جا رہا تھا۔

(۳)

لوئی کئی گھنٹے بے چین نیند سوتا رہا۔ پھر یکایک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اور نیند اڑ گئی۔ ہٹی نے اُسے پھر ہلایا۔ اُس نے کہنی کے سہارے اُٹھ کر کمرے کے اندھیرے میں دیکھنا چاہا۔ صحیح وقت جانے بغیر اُس نے اندازہ کر لیا کہ ابھی سورج نکلنے میں دو گھنٹے باقی ہیں۔

رات کی سرد ہوا میں کانپ کر ہٹی نے پھر کہا۔ "لوئی تمھارے ابا گھر میں نہیں ہیں۔"

لوئی بستر پر سیدھا ہو بیٹھا۔

پوچھنے لگا۔ "تم نے کیسے جانا وہ گھر میں نہیں ہیں؟"

"جب سے میں یہاں سونے کو لیٹی ہوں برابر جاگ رہی ہوں۔ اور میں نے اُن کے باہر جانے کی آواز سنی تھی۔ جبھی سے وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔"

لوئی نے پلٹ کر کمرے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ کر کہا "شاید وہ کچھ دیر کے لیے باہر چلے گئے ہوں۔"

ہٹی نے کہا۔ "لوئی میں جانتی ہوں میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تمھارے ابا کو باہر گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔"

کئی منٹ تک دونوں خاموش بیٹھے سنتے رہے کہ شاید مارک نیوسم کی کوئی آواز سنائی دے۔

لوئی نے اُٹھ کر لیمپ جلایا۔ قمیض، پتلون اور جوتے پہننے میں وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ مدھم روشنی میں اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے جوتوں کی ڈوریاں باندھنے میں اُس نے گرہیں لگا لیں۔ کھڑکی کے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ اور اکتوبر کی سرطوبہ ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔

ہٹی نے کمبل اتار دیے اور اُٹھتی ہوئی بولی۔ "میں جا کر ڈھونڈتی ہوں۔"

لوئی نے اُسے دھکیل کر پھر لٹا دیا۔ اور کمبل اُڑھا کر خود بھی لیٹ گیا اور بولا۔

"ہنی! تم تھوڑی دیر سو رہو۔ ساری رات تمھیں جاگنا نہیں چاہیے۔ میں جاکر ابا کو ڈھونڈ لاؤں گا۔"
ہنی کے پاس سے اُٹھ کر اُس نے لیمپ پھونک مار کر بجھا دیا۔ اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اندھیرے کمرے میں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ جب دروازے پر پہنچ گیا تو اب بھی اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ کان لگائے سنتا رہا۔
ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیوں پر سے اُتر کر وہ احاطے میں آیا۔ وہاں سے نکل کر مکان کے سرے پر ٹھہر کر سننے لگا۔ پھر زور زور سے آوازیں دیں۔ "ابا! ابا!"
اپنے کمرے کی کھڑکی کے نیچے رُک کر اُس نے سوچا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ پھر اپنے اوپر خفا ہو کر بولا۔
"ارے یہ تو بڑی حماقت کی بات ہے کہ میں یہاں کھڑا پکار رہا ہوں۔ ابا تو بجلی کا کڑکا بھی نہیں سن سکتے۔"
کمرے میں سے بستر کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ ہنی نے کھڑکی میں سے آواز دے کر کہا۔
"اُنھیں تو گئے ہوئے اتنی دیر ہو گئی کہ چور راہے یا اس سے بھی آگے نکل گئے ہوں گے۔"
لونی نے کہا۔ "دیکھو تم لیٹی رہو، اور کچھ دیر سونے کی کوشش کرو، میں انھیں لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔"
گھر میں ہنسی کے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ مارک کے تلاش کرنے میں مدد دے سکے۔ دُم کٹنے کی تکلیف اور دہشت دِنوں میں جاکر دُور ہو گی۔
ہنی خاموش نہیں رہ سکی۔ بولی۔ "اُنھیں گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔"
لونی نے کہا۔ "اس کا کچھ ڈر نہیں۔ میں دیر سویر اُنھیں تلاش کر ہی لوں گا۔ ابھی تم سے کہا ہے ہنی! تم کچھ دیر سو رہو۔"
لونی سناٹے پر کان لگائے کھلیان کی طرف چلا۔ کوٹھی کی طرف سے اُسے سوروں کے ڈکرانے اور شور مچانے کی آوازیں آرہی تھیں اس کا جی چاہا کہ ان کا شور بند ہو جائے، تاکہ دوسری آوازیں سنائی دے جائیں۔ رہ رہ کر آرچ گنارڈ کے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ مگر روزانہ رات کو وہ اتنا ہی بھونکتے تھے اور اُس کے کانوں کو ان کے شور کی عادت ہو گئی تھی۔
لونی کھلیان پر پہنچ کر اُس کے باہر اور اندر نظریں دوڑانے لگا۔ کھلیان کے چکر کاٹ کر کھیت میں اس سائبان تک گیا جہاں روئی رکھی رہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بیکار سی بات ہے۔ مگر ٹھہر ٹھہر کر باپ کو آواز دیتا رہا۔
تاریکی کو چیرنے کی کوشش کر کے وہ پکارتا۔ "ابا!"
وہ کھیت میں اور آگے بڑھ گیا۔
"سمجھ میں نہیں آتا، ابا کہاں چلے گئے؟" وہ رک کر سوچنے لگا۔ اب اُنھیں اور کہاں تلاش کرے۔
جب وہ سامنے کے احاطے پر واپس پہنچا تو پہلی بار اُسے کچھ بے چینی سی ہوئی۔ مارک کی جو کیفیت رہتی تھی اس میں پچھلے دنوں فرق نہیں آیا تھا۔ ہاں، یہ بات ضرور تھی کہ آرچ گنارڈ جس طرح ہاتھ کھینچ کر ناکافی راشن دے رہا تھا، اُس پر مارک برہم نظر آتا تھا۔ مارک نے یہ بھی کہا تھا کہ جس مقدار میں ہمیں غذا دی جا رہی ہے اس سے تین مہینے کے اندر ہم سب فاقوں سے مر جائیں گے۔
لونی نے احاطے کو چھوڑا اور حبشیوں کے کچّے گھروں کی طرف جانے والی سڑک پر چلنا شروع کیا۔ جب وہ کلم کے گھر پہنچا تو مڑ کر اندر اس پگڈنڈی پر ہولیا، جو دروازے پر جاتی تھی۔ اُس نے کئی دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا۔
کلم کی آواز بستر میں سے آتی سنائی دی۔ "کون ہے؟"

لونی نے کہا۔ "میں ہوں، مجھے تم سے ایک منٹ کے لیے بات کرنی ہے۔ کلم! میں یہاں ہوں سامنے کے احاطے میں۔"

وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کلم کپڑے پہن کر باہر آئے۔ اس مدت میں وہ کان لگائے سنتا رہا کہ شاید کوئی آواز سنائی دے۔ کوٹھی کی طرف کھیتوں کے اس پار سے منڈلاتے ہوئے سوروں کے ڈکرانے اور چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

کلم باہر آیا، اور دروازہ بھیڑ کر سیڑھی پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بیوی بستر میں تھی۔ اس سے آواز دے کر بولا۔ "ابھی آتا ہوں ـــــ تم پریشان نہ ہونا ـــــ"

کلم اتر کر احاطے میں آیا، اور بولا ـ "کون ہے بھئی ـ ؟"

لونی نے اٹھ کر اسے آدھے راستے ہی میں جا لیا۔

کلم نے اپنے لبادے کے بٹن لگاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا پریشانی ہے ـ ؟"

لونی نے کہا۔ "ابا گھر میں نہیں ہیں ـ اور ہنی کہتی ہے کہ گھر سے گئے انھیں ساری رات ہو گئی۔ میں کھیت میں دیکھ آیا۔ اور کھلیان کے چکر بھی لگا آیا۔ مگر ان کا کچھ پتہ نشان نہیں ملا۔"

کلم نے بٹن لگا لیے۔ بعد کاغذ اور تمباکو نکال کر سگریٹ بنایا۔ اور آہستہ آہستہ نیا پر چل کر سڑک پر آ گیا۔ ابھی خوب اندھیرا تھا اور صبح کی روشنی پھیلنے میں کم سے کم ایک گھنٹہ باقی تھا۔

کلم نے کہا۔ "شاید انھیں اتنی بھوک لگی ہو کہ وہ لیٹے نہ رہ سکے۔ جب میں نے کل انھیں دیکھا تو وہ کہہ رہے تھے کہ میں اس قدر سوکھ گیا ہوں ـ اور کمزور ہو گیا ہوں کہ شاید زیادہ دن نہ جی سکوں گا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی ہڈی اور چمڑا اب اس سے زیادہ سکڑ نہیں سکتا۔"

"رات کے کھانے کا وقت گزر جانے کے بعد میں نے کل رات کو آرچ سے کچھ راشن مانگا تھا۔ موٹا جھوٹا اناج یا بھوک ہی سہی۔ اس نے کہا تھا کہ آج صبح کو وہ مجھے کچھ راشن دے سکے گا۔"

کلم نے کہا۔ "تم اس سے کیوں نہیں کہتے کہ یا تو پورا راشن دے یا بالکل ہی نہ دے۔ اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ تمھیں راشن بالکل نہیں ملے گا، تو تم یہاں سے کہیں اور جا سکتے ہو۔ اور کسی بہتر آدمی سے بٹائی پر معاملہ کر سکتے ہو۔ کیوں ہے نا ؟"

لونی نے کہا۔ "آرچ گنارڈ کی وفاداری کرتے ہمیں مدت ہو گئی۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ اسے ایک دم سے چھوڑ کر ہم کہیں اور چل دیں۔"

کلم نے لونی کی طرف دیکھا، مگر اس وقت کچھ نہیں کہا۔ دونوں مڑ کر اس سڑک پر ہو لیے جو کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ جاڑے میں بند کیے سور اب بھی ڈکرا رہے تھے۔ اور آرچ کا ایک شکاری کتا لپک کر آیا۔ اور ان کے جوتوں کو سونگھنے لگا۔

کلم نے کہا۔ "ان سوروں کو کھانے کو اتنا ملتا ہے کہ موٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک بھی ان میں سے ایسا نہیں ہے جو اس وقت سات سو پونڈ وزن سے کم ہو اور دن بدن موٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کھانے کو انھیں جو کچھ ملتا ہے وہ تو کھا ہی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرغی کے چوزے جو دانہ دنکا چگنے باڑے میں آ جاتے ہیں انھیں بھی چٹ کر جاتے ہیں۔"

کوٹھی کی جانب دونوں چلتے رہے اور لونی سوروں کی آوازیں سنتا رہا۔

لونی بولا "میری رائے میں یہ بہتر ہوگا کہ ابا کو تلاش کرنے میں آرچ سے مدد لی جائے۔ مجھے نفرت ہے اس سے، مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں ابا راستہ بھٹک کر دلدل کی طرف نکل گئے ہوں۔ پھر ان کا واپس آنا ممکن نہیں۔ انھیں تو بجلی کی کڑک بھی نہیں سنائی دیتی۔ اگر وہ دلدل میں اتر گئے تو ہمیں نہیں ملیں گے۔

کلم آپ ہی آپ کچھ بڑبڑایا۔ اور سؤروں کے باڑے کی طرف بڑھا۔ اور لونی سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ پلٹ کر لونی سے بولا "یہاں آؤ جلدی سے۔"

لونی سوروں کے باڑے کی طرف لپکا۔ اور لکڑی اور تار کے بنے ہوئے جنگلے پر چڑھ کر اُس کے اندر جھانکنے لگا۔ شروع میں تو اُسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ مگر بعد میں کچھ فاصلے پر اُسے موٹے موٹے سور پھرتے دکھائی دینے لگے۔ وہ ایک دوسرے پر اس طرح جھپٹ رہے تھے جیسے کسی خرگوش پر شکاری کتے جھپٹ رہے ہوں۔

لونی کسی نہ کسی طرح جنگلے کے اوپر پہنچ گیا۔ لیکن کلم نے اُسے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا۔

"سوروں کے باڑے میں اس طرح مت جاؤ۔ یہ سور بہت خوفناک ہیں۔ تمھارے ٹکڑے اُڑا دیں گے۔ کسی چیز پر لڑ رہے ہیں۔"

دونوں دوڑ کر جنگلے کے اس رخ پر پہنچے جہاں سؤر لڑ رہے تھے۔ زمین پر اُن کے کھروں کے نیچے ایک کالا سا ڈھیر پڑا ہوا تھا، جو کہیں کہیں سے سفید دکھائی دے رہا تھا۔ لونی نے اُس کی طرف ایک جھلک دیکھی۔ اور پھر سوروں نے اس ڈھیر کو روندنا شروع کر دیا۔

کلم نے اپنا منہ کئی دفعہ کھولا۔ اور بند کیا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ اُس نے لونی کا بازو زور سے پکڑا۔ اور اُسے جھنجھوڑ کر بولا

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی ہیں تمھارے ابا۔ قسم خدا کی مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔"

لونی کو اس پر یقین نہ آیا۔ اُس نے جنگلے پر چڑھ کر سوروں کی طرف لاتیں چلائیں، تاکہ وہ ڈر کر ہٹ جائیں۔ مگر انھوں نے لونی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

لونی جنگلے پر چڑھا ہوا تھا۔ اتنے میں کلم اصطبل کی طرف دوڑ گیا۔ اور اندھیرے میں وہاں کسی نہ کسی طرح دو ڈنڈے اُٹھا لایا۔

لونی کی نظریں سوروں پر جمی ہوئی تھیں۔ کلم نے ایک ڈنڈا اُس کی طرف بڑھایا، تو چونک کر اُس نے ڈنڈا لے لیا۔

کلم جنگلے پر سے پھاند کر باڑے کے اندر پہنچ گیا۔ اور سؤروں کی طرف ڈنڈا گھمانے لگا۔ لونی بھی پھسل کر اندر پہنچ گیا۔ اور کلم کے پاس کھڑے ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ ایک سور لونی پر جھپٹا۔ مگر کلم نے اُس کی گدی پر زور سے ڈنڈا مار کر وقتی طور پر اُسے لوٹا دیا۔

لونی کی بے خبری اب دور ہوئی اور اُسے معلوم ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ سوروں کے غول کی طرف لپکا اور اپنے بھاری سخت جوتوں سے انھیں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اور لوہے کی شام والے ڈنڈے سے اُن کے سروں پر ضرب لگانے لگا۔ یکایک اُس کی ٹانگ میں سخت درد ہوا۔ اور جب اُس نے نیچے جھک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سؤر نے اُس کے ٹخنے کو اپنے منہ میں لے رکھا ہے۔ اُسے اتنا وقت مل گیا کہ ڈنڈا مار کر سور کو بھگا دے، ورنہ وہ اس کا پاؤں چبا جاتا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کی پتلون کا پائچہ نیچے سے غائب ہو چکا ہے۔ کیونکہ اُس کے زخمی ٹخنے پر رات کی سرد ہوا لگ رہی تھی۔

کلم نے آگے بڑھ کر سوروں کو پیچھے ہٹا دیا تھا کچھ اور کیا بھی نہ جا سکتا تھا سوروں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ اور اُن پر جھپٹ رہے تھے۔ اس لیے یہ دونوں اُن سے بچے رہنے کے لیے اپنے ڈنڈے گھمائے جا رہے تھے۔ موقع ملتے ہی لونی نے جھک کر مارک کی ٹانگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور کلم کی مدد سے وہ اپنے باپ کو اُٹھا کر جنگلے تک لایا۔ اور دونوں نے مل کر مارک کو جنگلے کے باہر پہنچا دیا۔

اس کام میں اُن کا سانس پھول گیا۔ اور کچھ دیر کے لیے دونوں بات نہ کر سکے۔ سنسناتے ہوئے سؤر جنگلے کی لکڑی اور تاروں کو کاٹ رہے تھے۔ اور زیادہ شدت سے ڈکرا رہے تھے۔

لونی اپنی جیبوں میں دیا سلائی ٹٹولنے لگا۔ کلم نے اپنی جیب سے ڈبیا نکال کر دی۔ سلائی جلائی اور مارک نیوسم کے سر کو جھک کر دیکھنے لگا۔

دونوں کے دونوں آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے اور انھیں یقین نہ آتا تھا۔ پھر اندھیرے میں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ زبانیں دونوں کی گنگ تھیں۔

کلم وہاں سے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور پھر پلٹ کر لوئی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور بولا۔

"وہی ہیں، کوئی شبہ نہیں وہی ہیں۔" یہ کہہ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

لوئی نے کہا۔ "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس وقت اور کیا کہے۔

مارک کی لاش کی طرف کلم بیٹھ گیا۔ اور دوسری طرف لوئی۔ اور دونوں لاش کو تکتے رہے جب سے انھوں نے اسے اٹھایا تھا، اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی تھی۔ سوروں نے اس کا چہرہ، گلا اور پیٹ سارا کھا لیا تھا۔

کچھ دیر بعد کلم نے کہا۔ "تم جا کر آرچ گنارڈ کو جگا دو تو بہتر ہے۔"

لوئی نے پوچھا۔ "اس سے کیا ہوگا؟ اب وہ ہماری مدد کیا کرے گا۔ اب کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

کلم نے کہا۔ "کوئی ہرج نہیں ہے، جا کر اسے جگا دو۔ آ کر دیکھ تو لے یہ کیا ہوا ہے۔ اگر تم صبح ہونے کا انتظار کرو گے تو شاید وہ کہہ دے کہ سوروں نے یہ کام نہیں کیا ہے۔ اسی وقت جا کر اسے جگا دینا چاہیے تاکہ وہ دیکھ لے کہ اس کے سوروں نے کیا کیا ہے؟"

کلم نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ تاریک آسمان کے پس منظر پر کوٹھی کا مدھم ہیولیٰ دیکھ کر وہ بھی جھجکا۔

"وہ شخص جو اپنے کارندوں کو کم راشن دیتا ہو اسے چاہیے کہ آ کر دیکھے کہ یہ کیا ہوا ہے۔ اور جب تک اسے دفنا نہ دیا جائے بیٹھا اسے دیکھتا رہے۔"

لوئی نے سہمی ہوئی نظروں سے کلم کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ کلم کا کہنا ٹھیک ہے۔ مگر ایک گورے آدمی کے لیے ایک کالے حبشی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر وہ سہم رہا تھا۔

لوئی نے کہا۔ "آرچ کے بارے میں تمھیں ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ وہ اپنے بستر میں پڑا سو رہا ہے۔ اس بات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جس طرح اس بات کے ہونے میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔"

کلم کو ہنسی آ گئی۔ اور اس نے ڈنڈے کو اپنے پیروں کے بیچ میں زمین پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈنڈے کو پھر اٹھا لیا۔ اور زمین پر مارنے لگا۔

لوئی آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کلم کا اس طرح کا طرزِ عمل اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا سمجھے۔ کچھ کہے بغیر وہ آرچ کو جگانے کے لیے اندھیرے میں کوٹھی کی طرف چل دیا۔

(۳)

آرچ کو جگانا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ اور جاگ جانے کے بعد بھی آرچ کو بستر سے نکلنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ لوئی اس کی خوابگاہ کی کھڑکی کے قریب باہر کھڑا تھا۔ اور دو تین گز دور آرچ اپنے بستر پر دراز تھا۔ لوئی کو اس کے بڑبڑانے اور غصے سے کروٹیں بدلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

آرچ نے خفگی سے کہا۔ "کس نے کہا تم سے کہ آدھی رات کو آ کر مجھے جگا دو۔؟"

"جی حضور کلم نے کہا تھا۔ وہ ادھر باہر کھڑا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ اس معاملے کو شاید جاننا چاہیں گے۔"

آرچ نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور تکیے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔

"تم کلم ہنری سے کہہ دو کہ میں نے کہا ہے کہ کسی دن کوٹ کے آستین کی طرح وہ اپنے آپ کو الٹا ہوا پائے گا۔"

لوئی انتظار میں جا کھڑا رہا۔ وہ جانتا تھا کلم کا یہ کہنا ٹھیک تھا کہ آرچ کو اُٹھ کر یہاں باہر آنا چاہیے۔ اور اسے دیکھنا چاہیے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟

باڑے واپس جا کر کلم سے یہ کہتے ہوئے لوئی ڈر رہا تھا کہ آرچ نہیں آ رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوگا۔ مگر اُسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کلم خوابگاہ میں گھس کر آرچ کو باہر گھسیٹ لائے گا۔ ایسی کسی بات کے ہونے کا خیال اُسے ناپسند تھا۔

آرچ نے آواز دے کر پوچھا۔ "لوئی کیا تم ابھی تک باہر کھڑے ہو؟"

"میں تو بالکل یہیں ہوں۔ مسٹر آرچ میں ——"

"اگر میں اس قدر نیند میں نہ ہوتا تو میں ایک بیدے کر ... نہ جانے کیا گزرتا۔"

آرچ پچھلے زینے سے اُتر کر لوئی کے پاس آیا۔ اور اُس کے ساتھ سوروں کے باڑے کی طرف چلا۔ راستے میں اُس نے لوئی سے کوئی بات نہ کی۔ آرچ جھومتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ لوئی آ رہا ہے یا نہیں۔ آرچ کے ہاتھ میں جو لالٹین تھی اُس میں زرد رنگ کی شعاعیں زمین پر پڑ رہی تھیں۔ اور جب یہ وہاں پہنچے جہاں کلم مارک کی لاش کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ تو رات کے اندھیرے میں حبشی کا چہرہ اس طرح چمکا جیسے مل کا پھل چمکتا ہے۔

آرچ دونوں کی طرف دیکھ کر چیخا۔ "میرے سوروں کے باڑے میں رات کے وقت مارک کیا کر رہا تھا؟"

نہ تو کلم نے جواب دیا اور نہ لوئی نے۔ کئی دفعہ آرچ نے ان دونوں کی طرف گھور کر دیکھا۔ مگر اس کی نظریں اچٹ کر بار بار اپنے قدموں میں پڑی ہوئی مارک بوسم کی کٹی پھٹی لاش پر جم جاتیں۔

آرچ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس وقت کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ تب گورکن کو بلایا جا سکے گا" یہ کہہ کر وہ چند قدم چلا۔ اور پھر رک کر بولا۔ "کیا صبح تک تم ٹھہر نہیں سکتے تھے جو مجھے جگا کر تمھیں کیا حاصل ہوا؟ ذرا عقل سے کام نہیں لیتے۔"

اُس نے پلٹ کر کلم کی طرف دیکھا۔ کلم نے اُٹھ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

آرچ نے کہا۔ "تمھیں کیا چاہیے کلم ہنری؟ کس نے تم سے کہا کہ آدھی رات کو میری کوٹھی کے گرد منڈلاتے پھرو؟ جب تک میں نہ بلا بھیجوں، میں کسی کالے کا یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔"

کلم بولا۔ "میں یہ کھڑا دیکھ نہیں سکتا تھا کہ سور کسی کو کھا جائیں اور میں کچھ بھی نہ کروں۔"

آرچ نے کہا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو۔ اور جب تم مجھ سے بات کرو تو پہلے ادب سے اپنی ٹوپی اتارو، سمجھے! ورنہ اس کا خمیازہ تمھیں بھگتنا پڑے گا۔ تم لوگ جس طرح ٹھیک کیے جاتے ہو اس طرح تمھیں ٹھیک کرنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔"

لوئی دبک کر پیچھے ہٹ گیا۔ عجب طرح کی بے چینی نے انھیں اس وقت گھیر لیا تھا۔ کلم اور آرچ میں ہمیشہ اسی طرح جھگڑا شروع ہوتا تھا۔ لوئی نے بیسیوں دفعہ یہی منظر دیکھا تھا۔ کلم اگر پلٹ کر چلا جاتا تو خیریت گزرتی۔ مگر کبھی یہ بھی ہوتا کہ وہ جم کر کھڑا ہو جاتا اور اس طرح جواب دیتا رہتا جیسے وہ خود بھی گورا آدمی ہو۔

لوئی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس وقت کلم اڑ نہ جائے۔ آدھی رات کو جگائے جانے پر آرچ جھنجلا رہا تھا۔ اور لوئی خوب جانتا تھا کہ جب آرچ کسی حبشی سے خوش یا ناخوش ہوتا تھا تو اپنے آپے میں نہیں رہتا تھا۔ کسی نے اُسے کالے آدمی کو قتل کرتے تو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آرچ کہا کرتا تھا کہ میں ہلاک کر چکا ہوں، اور آئندہ بھی ہلاک کرنے سے نہیں ڈرتا۔

کلم نے آرچ سے نظریں ملا کر کہا۔ "آپ جانتے ہوں گے کہ اُسے سوروں نے کیوں بھنبھوڑ ڈالا۔"

آرچ طیش میں گھوم کر بولا۔ "ارے تو مجھ سے زبان چلا رہا ہے ..... ؟"

کلم نے کہا۔ "میں نے آپ سے دریافت کیا ہے۔"

آرچ نے چیخ کر کہا۔ "غارت ہو جا کمینے۔"

یہ کہہ کر اُس نے کلم کے سر پر لالٹین گھما کر ماری۔ کلم نے غوطہ کھا کر سر بچا لیا۔ مگر لالٹین اُس کے کندھے پر لگی۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ تیل ہوا میں اُڑا جو جلتی ہوئی بتی سے اُس میں آگ لگ گئی۔ کلم خوش نصیب تھا کہ اُس کے چہرے اور کپڑوں پر تیل نہیں گرا۔

کلم نے کہا۔ "دیکھیے صاحب ......"

"ارے کمینے حبشی!" کہہ کر آرچ اُس کی طرف جھپٹا "جواب دینے کا مزا میں تجھے چکھاتا ہوں۔ اب تو اپنی کھال میں نہیں رہتا۔ بہت میں نے ٹالا، مگر اب نہیں ٹال سکتا۔"

لوئی نے کہا۔ "مسٹر آرچ میں ....." اور جھکتا ہوا ان دونوں کے درمیان آگیا۔ مگر کسی نے اُس کی بات نہیں سنی۔

آرچ رک کر اس تیل کو جلتے دیکھتا رہا جو زمین پر گرا تھا۔

کلم نے کہا۔ "آپ خوب جانتے ہیں کہ سنڈیا تر ہوتے سوروں نے اسے کیوں کھا لیا۔ وہ اس قدر بھوکا تھا کہ آدھی رات کو اُسے یہاں آنا پڑا۔ تاکہ اُسے کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔ شاید وہ سوروں کے راستے گھر تک پہنچنا چاہتا ہو۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے دوسرے کارندوں کی طرح مارک کو بھی برائے نام راشن ملتا تھا۔ اور وہ اس قدر بڈھا تھا کہ کہیں اور سے کچھ کھانے کو نہیں لا سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے سوروں کے راستے گھر کا رخ کیا۔ یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیوں اور کیسے اس اندھیرے میں بھٹک کر سوروں کے باڑے تک پہنچ گیا۔"

تیل کی آگ بالکل بجھ چکی تھی۔ جب اُس کا آخری شعلہ بھڑک کر بجھا تو آرچ نے لپک کر وہ ڈنڈا اُٹھا لیا جو لوئی کے ہاتھ سے زمین پر گر پڑا تھا۔

آرچ نے ڈنڈا اپنے سر سے اونچا کر کے پوری قوت سے کلم کے سر پر مارا۔ کلم نے اُس کی ضرب سے بچ کر وار خالی دیا۔ لیکن آرچ نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر کلم کی کہنی سے اوپر ایک اور وار کر دیا۔ اور کلم کو سنبھلنے کا بھی موقع نہ دیا۔ کلم کا ہاتھ اس طرح لٹک گیا جیسے اس میں بالکل جان نہ رہی ہو۔

آرچ نے چیخ کر کہا۔ "کمینے لعنتی حبشی، کالے حرامزادے۔ آ گیا تیرا وقت۔ بہت دنوں سے میں اس موقع کے انتظار میں تھا کہ تجھے تیری گستاخیوں کی سزا دوں۔ ایسے کے میں نے تجھے ایسی سزا دی ہے کہ تو بھی یاد رکھے گا!"

کلم نے زمین کو اپنے پیروں سے ٹٹولا۔ یہاں تک کہ دوسرے ڈنڈے کا اُسے پتہ چل گیا۔ اُس نے جھک کر ڈنڈا اُٹھا لیا۔ ڈنڈے سے اُس نے آرچ پر وار نہیں کیا مگر اسے اس طرح اوپر اُٹھائے رکھا کہ اگر آرچ اُس کے سر پر ضرب لگانی چاہے تو اُس سے بچ سکے۔ وہ اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہا۔ ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا۔

آرچ نے کہا۔ "پھینک دو اس ڈنڈے کو۔"

کلم نے شکایت کے انداز میں کہا۔ "میں یہاں کھڑا آپ سے اسی طرح پٹتا نہیں رہوں گا۔"

آرچ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ "یہ مجال، میں جو یہی سننا چاہتا تھا۔ قسم خدا کی تیرا وقت آ پہنچا، حبشی۔"

یہ کہہ کر اُس نے کلم پر ایک اور وار کیا۔ لیکن کلم پلٹ کر باڑے کی طرف بھاگا۔ آرچ نے چند قدم اُس کا پیچھا کیا، اور رُک گیا ڈنڈا اُس نے ایک طرف پھینکا اور پلٹ کر اپنی کوٹھی کی طرف بھاگا۔

لوتی جنگلے کے پاس گیا، اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ وہ جانتا تھا کہ کلم کھلا وہ کسی حبشی کی طرف داری نہیں کرسکتا تھا حالانکہ کلم نے اُس کی مدد کی تھی۔ جی میں تو وہ یہی چاہتا تھا کہ جس طرح کلم نے آرچ سے بات کی اسی طرح وہ خود کرسکتا لیکن کلم کے اس طرح اڑنے کے بعد اس کی حمایت کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ آرچ ایک گورا آدمی تھا۔ اور اُس سے اپنی جان بچانے کے لیے چاہے کچھ ہو جائے وہ آرچ کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا۔

اتنے ہی میں کوٹھی کی ایک کھڑکی میں سے روشنی پھوٹ پڑی۔ اور آرچ کی آواز اُسے سنائی دی۔ جو اپنی بیوی کو جگانے کے لیے چیخ رہا تھا۔

جب اُس نے آرچ کی بیوی کو ٹیلیفون کی طرف جاتے دیکھا تو لوتی سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ پڑوسیوں اور آرچ کے دوستوں کو خبردار کر رہی تھی۔ جب اُنھیں معلوم ہوگا کہ کیا ہونے والا ہے تو رات کو اُٹھنا اُنھیں ناگوار نہیں گزرے گا۔

دُور باڑے کے پیچھے سے اُسے کلم آواز دے رہا تھا۔ احاطے میں سے نکل کر لوتی اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا اُس کی طرف چلا۔

کلم کے قریب پہنچ کر بولا "کیا بات ہے کلم؟"

کلم نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ میرا وقت آپہنچا ہے۔ جب آرچ گنارڈ غصے سے دیوانہ ہو جاتا ہے تو اس کا لہجہ یہی ہوتا ہے جب جم موفن کو وہ گھیر کر دلدل کی طرف لے گیا تھا تو اس وقت اس کا یہی لہجہ تھا۔ اور جم پھر واپس نہیں آیا۔"

لوتی نے گھبرا کر کہا۔ "آرچ تمھارے ساتھ ایسا نہیں کرے گا، کلم۔" مگر دل میں وہ جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔

کلم کچھ نہیں بولا۔

لوتی نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ تم دلدل کی طرف نکل جاؤ۔ جب اُس کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو وہ اپنا ارادہ بدل دے گا۔ تمھاری بات ٹھیک ہوسکتی ہے کلم۔"

لوتی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کلم کی آنکھیں انگاروں کی طرح اُسے داغ رہی ہوں۔

کلم نے کہا۔ "کوئی عقل کی بات تو ہوگی نہیں۔ اگر تم میری مدد کرو۔ اچھا تم میرا ساتھ دو گے؟"

کلم کے سوال کا مطلب جب اُس کی سمجھ میں آیا تو لوتی لرز گیا۔ اُس کی پیٹھ باڑے کی طرف تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے کالی اور سفید چادریں سی گزرنے لگیں۔ اور سہارا لینے کے لیے وہ باڑے سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کلم نے پھر پوچھا۔ "تم میرا ساتھ دو گے؟"

لوتی نے رک رک کر کہا۔ "نہ جانے اس پر آرچ کیا کہے؟"

کلم کئی قدم دُور چلا گیا تھا۔ لوتی کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ رک کر اُس نے کھیتوں کے اُس پار کنہ گمردوں کی طرف دیکھا جہاں اس کا گھر تھا۔ کلم نے لوتی کی طرف پلٹ کر کہا۔ "وہ جو ایک ذرا سا جنگل ہے، میں اس میں جا کر اس وقت تک چھپا رہوں جب تک وہ تھک کر مجھے تلاش کرنا نہ چھوڑ دیں۔"

لوتی نے بے چینی سے کہا "تمھارا چلا جانا ہی بہتر ہوگا۔ میں آرچ گنارڈ کو جانتا ہوں۔ جب وہ کسی کام کو کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اُسے اس سے باز رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ میں اُسے ایک لمحے بھی نہیں روک سکتا۔ کلم یہ بہتر ہوگا کہ تم اس علاقے ہی سے نکل جاؤ۔"

کلم نے کہا " اپنے بال بچوں کو کھیت کے اس طرف چھوڑ کر میں چلا جاؤں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا "

" اگر تم نہیں جاؤ گے تو وہ تم کو ڈھونڈ لے گا "

" اگر تم ایک ذرا میری مدد کر دو تو اس کو میرا پتہ نہیں چلے گا۔ مجھے کچھ دیر وہاں اس جنگل کے ٹکڑے میں جا کر چھپنا پڑے گا۔ اتنا تو تم میری خاطر کر سکتے ہو نا، دیکھو میں نے تمہارے ابا کو سوٴروں کے باڑے میں تلاش کرنے میں تمہاری مدد کی تھی "

لونی نے سر ہلا دیا۔ اس کے کان ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو کوٹھی میں سے آ رہی تھیں، کلم جب تک کھڑا اس کے وعدے کا انتظار کرتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔

کلم نے کہا " اگر تم ایک ذرا میرا ساتھ دو گے تو مجھے صرف جنگل میں پہنچ جانا ہے اور اس وقت تک چھپے رہنا ہے۔ جب تک ان کا ارادہ نہ بدل جائے، تم انھیں یہ نہ بتانا کہ میں کہاں ہوں بس یہ کہہ دینا کہ میں دلدل کی طرف بھاگ گیا ہوں بغیر شکاری کتوں کے وہ میرا پتہ نہیں چلا سکیں گے "

لونی کے کان کوٹھی پر لگے ہوئے تھے کہ آرچ کب کوٹھی سے نکلتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آرچ آ کر اسے باڑے کے پیچھے کھڑا پائے۔ ورنہ وہ کہے گا کہ تم کلم سے باتیں کر رہے تھے۔ کلم سے بولا " ہاں یہ ٹھیک ہے "

جواب پاتے ہی کلم پلٹ کر بھاگا اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ لونی اس کے پیچھے چند قدم اس طرح چلا جیسے اپنا ارادہ بدل دیا ہو اور کہہ دینا چاہتا ہو کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ مگر اتنی دیر میں کلم اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔

لونی چند منٹ تک کھڑا سنتا رہا۔ کلم جھاڑیوں میں سے ہو کر جنگل کی طرف بھاگا جا رہا تھا جو پاؤ میل دور تھا۔ جب کلم کی آوازیں آنی بند ہو گئیں تو کھلیان کا چکر کاٹ کر وہ آرچ کی طرف چلا۔

آرچ اپنے گھر میں سے اس طرح نکلا کہ ایک ہاتھ میں دونالی بندوق تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک لالٹین جو ٹمٹما کر جل رہی تھی، دونوں جیبوں میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔

آرچ نے پوچھا " کہاں ہے وہ حرامی حبشی؟ لونی، کدھر گیا وہ؟"

لونی نے اپنا منہ کھولا مگر کوئی لفظ اس کے منہ سے نہ نکلا۔

" تمہیں معلوم ہے وہ کدھر گیا۔ ہے نا؟"

لونی نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ آرچ کی طرف دیکھ کر سر ہلا رہا تھا۔

" مسٹر آرچ ہیں ..... "

آرچ نے کہا " بس بس ٹھیک ہے۔ مجھے بس یہی معلوم کرنا تھا۔ ڈڈ لے اسمتھ، ٹوم ہاکنز، فرینک اور دے وی ہاورڈ اور باقی سب منٹ بھر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ تم یہیں ٹھہرو تاکہ ہمیں بتا سکو کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے "

لونی نے کچھ کہنے کی دیوانہ وار کوشش کی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر آرچ کی آستین پکڑنی چاہی مگر آرچ وہاں سے جا چکا تھا آرچ بنگلے کا چکر کاٹ کر جلدی سے آگے کے احاطے میں پہنچا اتنے ہی میں ایک کار تیزی سے سڑک پر آتی دکھائی دی۔ اس کی روشنی میں سوٴروں کا باڑا اور اس کے آس پاس کی تمام چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ لونی نے دل میں کہا ہو نہ ہو یہ ڈڈلے اسمتھ ہے، کیونکہ اس سمت میں سب سے پہلا بنگلہ صرف آدھے میل پر اسی کا تھا جب وہ آرچ کے بنگلہ کی طرف مڑا تو سڑک پر کئی اور کاریں لونی کی طرف کو آتی دکھائی دیں۔

لونی کانپنے لگا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اب آرچ اس سے پوچھے گا کہ بتاؤ کلم کس طرف بھاگ کر روپوش ہوا ہے؟ اس نے کلم سے وعدہ کیا تھا کہ یہ بات نہیں بتائے گا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ کتنی ہی کوشش کر لے اس سے یہ بات چھپ نہیں سکے گی۔ کلم کے پکڑے جانے پر آرچ گنارڈ بہت کرے گا تو اس کے کوڑے لگائے گا۔ بس اس سے زیادہ تو اور کچھ نہیں کرے گا۔

کلم نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی کہ اسے اذیت ناک موت کی سزا دی جائے۔ اس نے کسی گوری عورت کو بے عزت نہیں کیا تھا کسی گورے آدمی پر گولی نہیں چلائی تھی، اس نے صرف یہی تو کیا تھا کہ آرچ کو جواب دیا تھا، اور تعظیم کیلئے ٹوپی نہیں اتاری تھی مگر آرچ تو اس قدر جھلایا ہوا تھا کہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ بھی کر سکتا تھا کہ کلم کو موت کے گھاٹ اتار دے۔

لونی ابھی پوری طرح سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے چاروں طرف آنے والوں کی بھیڑ لگ گئی اور آرچ نے اس کا بازو پکڑ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"مسٹر آرچ ہیں۔۔۔"

صبح کی ملگجی روشنی میں لونی نے ان میں سے ہر شخص کو پہچان لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جتھہ رات بھر لومڑی کے شکار میں سرگرداں رہا ہے اور خون کی پیاس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنی بندوقیں اور طمنچے سنبھال رکھے تھے تاکہ شکار کے نظر آتے ہی اسے داغ دیں۔

آرچ نے ان کے کان میں چیخ کر کہا "تجھے کیا ہو گیا لونی؟ ہوش میں آ اور بتا کہ کلم کدھر جا کر چھپا ہے؟ دیر ہو رہی ہے اسکی خبر لینے میں۔"

لونی کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ فرینک ہوورڈ اپنی بندوق میں چھرے ڈال رہا ہے اور اس کی طرف کان لگائے ہوئے ہے کہ کلم کا پتہ چلائے۔

لونی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "مسٹر آرچ، آپ کلم کو مار تو نہیں ڈالیں گے؟"

ڈڈلے اسمتھ نے کہا "مار ڈالیں گے؟ ابے تو کیا ہم دل لگی کرنے کو یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ کالیا جب سے یہاں آیا ہے اسی وقت سے اپنی موت کو بلا رہا ہے۔ بڑا حرامزادہ حبشی ہے۔ وقت آپہنچا اس کا۔"

لونی نے کہا "قصور دراصل کلم کا نہیں تھا۔ اگر بابا بھٹک کر سوروں کے باڑے میں نہ پہنچتے تو کلم کا اس بات سے کوئی واسطہ نہ ہوتا اس نے تو صرف میری مدد کی ہے بس۔"

کسی نے چیخ کر کہا "بکواس بند کر لونی۔ تو اس قدر بوکھلایا ہوا ہے کہ تجھے اپنے سر پیر کا بھی ہوش نہیں ہے۔ نہ جانے کیا بکے جا رہا ہے۔"

لوگوں کا گھیرا اس قدر تنگ ہو گیا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس لینے کیلئے اسے ہوا کی ضرورت تھی مگر بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

لونی نے اپنی آواز تو سنی مگر اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"بابا بھوکے تھے۔ کچھ ڈھونڈنے نکلے تھے تو بھٹک گئے۔ انھیں تلاش کرنے میں کلم میرے ساتھ ہو گیا تھا۔"

چیخ کر پھر کسی نے کہا "بکواس بند کر لونی۔ حرامزادے منہ بند کر۔"

آرچ نے اونچی آواز میں کہا "ادھر دیکھ لونی! معلوم ہوتا ہے کہ تو ہوش میں نہیں ہے جو یوں کھلم کھلا کالوں کی حمایت

میں لوٹے جا رہا ہے۔"

لونی نے سر سے پاؤں تک لرز کر کہا "ٹھیک ہے، میں اس طرح بات کرنی پسند نہیں کرتا۔"

آرچ نے اس کا شانہ چھوڑ دیا تھا مگر لونی کو اب بھی یہی محسوس ہو رہا کہ آرچ کی مضبوط انگلیوں نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

ڈڈلے اسمتھ نے پوچھا "کلم دلدل کی طرف گیا ہے، لونی؟ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

لونی نے اپنے سر کو جنبش دینے کی کوشش کی۔ سر ہلا کر اس نے ہاں کہنا چاہا۔ آرچ کی انگلیوں نے اس کی پتلی سی گردن کو بھینچنا شروع کیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے لونی لوگوں کو دیکھنے لگا۔

آرچ نے اس کی گردن کو اور بھی زور سے دبوچ کر کہا "کہاں چھپا ہے کلم، لونی؟"

لونی کھایان کی طرف تین چار قدم چلا۔ جب وہ رکا تو پیچھے سے لوگوں نے اسے دھکیلا۔ لونی نے دیکھا کہ لوگ اسے دھکیل کر کھایان سے آگے لئے جا رہے ہیں۔

آرچ نے کہا "ہاں لونی۔ اب کس طرف؟"

لونی نے جنگل کے اس ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا جہاں کھاڑی تھی، دلدل دوسری سمت میں تھی۔

لونی بولا "وہ جو کھاڑی کے کنارے جنگل ہے۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ جا چھپے گا۔ میں سمجھتا ہوں وہیں ہوگا وہ۔"

لونی کو لوگ دھکیلے لئے جا رہے تھے۔ ناہموار زمین پر ٹھوکر کھا کر گرتا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوتا تاکہ ریلے میں کچلا نہ جائے۔ کوئی بھی نہیں بول رہا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے سب پنجوں کے بل چل رہے ہیں، صبح کی روشنی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ دبکے دبکاتے جنگل کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

جب وہ جنگل کے قریب پہنچے تو بھیڑ چھٹ کر پھیل گئی، اور لونی کو معلوم ہوا کہ وہ خود بھی لوگوں کے اس گھیرے میں شامل ہے جو کلم پر تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

لونی اکیلا تھا اور اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا، لیکن اس میں آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کی ہمت نہیں تھی۔ اب اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے کیا حماقت کی ہے۔

سامنے جنگل میں کلم شاید کسی درخت پر چڑھا بیٹھا ہوگا اور لوگوں نے اب اسے گھیرے میں لے لیا تھا، اگر اس نے گھیرے کو توڑ کر بھاگنے کی کوشش کی تو اسے جنگلی خرگوش کی طرح بندوق کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔

لونی لکڑی کے ایک گٹھے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے۔ چند منٹ میں سورج نکل آئے گا اور ہانکا کرنے والے کھاڑی اور کلم کو گھیر لیں گے۔ اتنی ساری بندوقوں اور ٹمٹموں سے بچ نکلنا اس کیلئے ممکن نہ ہوگا۔

آس پاس کی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے دیا سلائی جلائی، سگریٹ کی بو لونی کی ناک میں آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید کلم کو بھی جنگل میں سگریٹ کی بو پہنچ رہی ہوگی۔

لونی کے چاروں طرف سناٹا تھا اور وہ جانتا تھا کہ آرچ گنارڈ اور اس کے ساتھی سورج نکلنے کا انتظار کر رہے تھے، کوئی دم جاتا ہے کہ مشرق میں سورج طلوع ہوا چاہتا ہے۔

اب اتنی روشنی ہو گئی تھی کہ ناہموار زمین، الجھی ہوئی جھاڑیاں اور چیڑ کے درختوں کی چٹخی ہوئی چھال دکھائی دینے لگی تھی۔

لوگوں نے دبکے دبکے آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا اور ان کی بندوقیں یوں تنی ہوئی تھیں جیسے شکار اب نکل کر سامنے

آنے ہی والا ہو جنگل زیادہ بڑا نہیں تھا اور لوگوں کا گھیرا جس رفتار سے آگے بڑھ کر تنگ ہوتا جا رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ چند منٹ میں ہانکا ختم ہو جائے گا اب بھی یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید کلم اس گھیرے میں سے سٹک گیا ہو۔ مگر لونی کا دل کہتا تھا کہ نہیں، وہ اب بھی وہیں موجود ہے اسے محسوس ہونے لگا کہ کلم اس جنگل میں، اس لئے موجود ہوگا کہ خود میں نے اسے اس جنگل میں چھپایا ہے تاکہ اس کے شکاریوں کو آسانی سے مل جائے۔

لونی نے خود کو تنگ ہوتے ہوئے گھیرے میں پایا۔ اسے چاروں طرف مدھم روشنی میں شکاریوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے اور ایک ایک چیڑ کے درخت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

لونی نے خشک گلے سے آواز دی "بابا ـــــ بابا"

اس نے چند قدم آگے بڑھ کر جھاڑیوں میں جھانکا اور چیڑ کے درختوں میں نظر دوڑائی۔ اور جب اس کی نظر اور لوگوں پر پڑی تو اسے یاد آیا کہ اس کے باپ مارک نیوسم کو تلاش نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ کلم کو ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس بات کو کیسے بھول گیا۔

دبے دبے قدم آگے بڑھنے کی حرکت لونی کے جسم میں بھی سرایت کر گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ خود بھی پنجوں کے بل آگے جھکا ہوا چل رہا ہے۔ یہ حرکت ایسی تھی جیسے بندوق پاس نہ ہو تو شکاری خرگوش کو ہاتھوں سے دبوچنے کیلئے آگے بڑھتا ہے۔

وہ پھر بھول گیا کہ جنگل میں کس لئے آیا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ اس کے پیروں کے جست میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آگے کی طرف وہ اس قدر جھکا ہوا تھا کہ اپنی انگلیوں سے زمین کو چھو سکتا تھا۔ اب وہ رو کے نہیں رک سکتا تھا۔ وہ بھی شکاریوں کے گھیرے میں شامل ہو گیا تھا۔

پندرہ شکاریوں کا گھیرا سمٹتا چلا آ رہا تھا۔ اتنی روشنی پھیل چکی تھی کہ گھڑی کا وقت دیکھ لیا جاتے۔ سورج کی کرنیں اوپر آسمان پر دمکنی شروع ہو گئی تھیں۔

لونی ان سب میں آگے تھا۔ وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکتا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی قوت آ گئی تھی کہ وہ ان پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔

اس نے اتنی مدت سے اپنی بندوق کیلئے کارتوس نہیں خریدے تھے کہ شکار کا شوق بھی کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔

شکاریوں کے دبے دبے قدم اس طرح اٹھ رہے تھے کہ لونی کے کان میں ان کی آواز ایک خاص آہنگ سے آ رہی تھی۔

کسی نے چیخ کر کہا "یہ رہا، مزہ!" اور پھر جھاڑیوں کو کچلتے پھاندتے قدموں کا شور سنائی دیا۔ لونی بھی بھاگ کر وہاں پہنچا اور اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔

اس نے دیکھا کہ سب نے بندوقیں آسمان کی طرف تان رکھی ہیں اور ایک چیڑ کے درخت کی پھننگ سے کلم چپٹا ہوا ہے۔ ابھرتے سورج کی روشنی میں وہ صاف نظر آ رہا ہے۔

لونی کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ کس نے پہلے بندوق چلائی۔ مگر باقی سب نے بندوق چلانے میں دیر نہیں کی۔ بندوقوں اور طمنچوں کے ایک ساتھ چلنے سے اتنا شور برپا ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور درخت کا تنہ دھوئیں میں چھپ گیا۔ لونی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ دوبارہ درخت کی پھننگ پر نظر ڈالے۔ بندوقیں مسلسل چلتی رہیں کلم پوری قوت سے درخت سے چمٹا رہا اور پھر ایک تڑاخے کے ساتھ درخت کی پھننگ اور کلم ٹوٹی ٹہنیوں سے الجھتے دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ کلم کے جسم کے چیتھڑے ہو گئے تھے اور

اس کے گرنے کے دھماکے سے ایک لمحہ کے لیے لونی کا دل رک گیا۔

بندوقیں پھر دھائیں دھائیں چھوٹنے لگیں۔ لونی ایک درخت کا سہارا لے کر سنبھلا۔ کلم کی چھلنی لاش بریاڈھ کے ساتھ لڑھکتی جاتی تھی۔ مالک کے چہیتے کتے بھی ایک طرف سے لاش میں گھستے کبھی دوسری طرف سے۔ زمین سے خاک کا بادل اٹھتا اور سروں پر منڈلانے لگتا اور ملی جلی ہوئی بارود کی بو سے دم گھٹنے لگتا۔

لونی کو یاد نہیں رہا کہ کتنی دیر تک بندوقیں چلتی رہیں۔ وہ دیوانہ وار بھاگتا پھر رہا تھا۔ کبھی اس درخت کے پاس کبھی اس درخت کے پاس۔ اور گرتا پڑتا وہ کھلی زمین پر جا پہنچا۔ آسمان کا رنگ مٹیالے سے بدل کر سرخ ہو گیا تھا۔ ہل چلے ہوئے کھیت کے ڈھیموں سے ٹھوکریں کھاتا، سامنے گھر پر نظریں جمائے وہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔

ایک دفعہ ٹھوکر کھا کر ایسا گرا کہ دوبارہ اٹھنے کی ہمت اس میں نہ رہی۔ بڑی کوشش کے بعد وہ گھٹنوں پر کھڑا ہو سکا تو اسکے سامنے گول سرخ سورج تھا۔ اس کی گرمی سے جسم میں اتنی توانائی آئی کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ وہ کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتا تھا جس کے کہنے کا تصور کبھی پہلے بھی اسے نہ ہوا تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو احاطے میں ہٹی کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے جنگل میں بندوقیں چلنے کی آواز سنی تھی اور کھیت میں سے لونی کو گرتے پڑتے آتے بھی دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ سورج کی طرف رخ کئے دوزانو کھڑا ہے، وہ دوڑ کر لونی کے پاس پہنچی یہ معلوم کرنے کیلئے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ خوف سے اس کے جسم میں لرزہ تھا۔

اپنے احاطے میں آجانے کے بعد لونی نے مڑ کر ایک نظر جنگل کی طرف دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ آرچ گنارڈ کے جنگلے پر سے لوگ چڑھ کر بنگلے کے احاطے میں آ رہے ہیں، اور آرچ کی بیوی سیڑھیوں پر کھڑی ان سے باتیں کر رہی ہے۔

ہٹی نے کہا "تمہارے بابا کہاں ہیں لونی؟ اور یہ جنگل میں بندوقیں کیسی چل رہی تھیں؟"

لونی لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور اپنے گھر کی سیڑھیوں پر گر پڑا۔

ہٹی نے گھبرا کر کہا "لونی لونی! اٹھو، مجھے بتاؤ تو آخر یہ ہوا کیا ہے؟ میں نے کبھی ایسی باتیں دیکھی نہیں"

لونی نے کہا "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا"

"اچھا اگر کچھ نہیں ہوا تو بڑے بنگلے پر جا کر تم ایک پارچہ کیوں نہیں مانگ لاتے؟ ہمارے پاس پکانے کو کچھ بھی نہیں ہے اور رات بھر گھومتے رہنے کے بعد تمہارے بابا کو اور بھی زیادہ بھوک لگ رہی ہوگی۔"

لونی کے منہ سے نکلا "کیا؟" اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"لو، میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بڑے بنگلے پر جا کر ایک پارچہ مانگ لاؤ۔ اور تو کچھ نہیں کہا، لونی"

لونی نے اپنی بیوی کے کندھے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور چیخ کر بولا "گوشت؟"

وہ حیران ہو کر پیچھے ہٹی اور بولی "ہاں۔ کیا تم آرچ گنارڈ کے پاس جا کر ایک پارچہ نہیں مانگ سکتے؟"

لونی اپنے گھر کی سیڑھیوں پر ڈھیر ہو گیا اس کے پاؤں پھیلے ہوئے اور ان کے درمیان لٹکے ہوئے تھے اور اس کی تھوڑی سینے میں گھسی جا رہی تھی۔

آہستہ سے بولا۔ اتنے آہستہ کہ سنائی بھی نہ دے۔

"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے"

پی آئی اے
کی پروازیں
بنکاک
استنبول
فرینکفرٹ
نیروبی
بغداد
روم
جاتی ہیں

علی عباس حسینی

نقوش۔ لاہور

ڈگمگاتے قدم

شاکرہ بیگم ابھی نہاہی رہی تھیں کہ ظہورن نے حمام کے دروازے کے پاس آکر کچھ ہانپتی آواز اور کچھ سرگوشی کے انداز میں کہا۔ کہ چھٹن نواب آئے ہیں۔ وہ کچھ بوکھلائی سی لگتی تھی۔ اس بوکھلاہٹ کی خاص وجہ تھی۔ مالکن اور ملازمہ کے درمیان ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ شیطان کی طرح آ دھمکے۔

ظہورن ابھی ابھی شاکرہ بیگم کا سر دھلا کر اور ان کے گورے گورے پنڈے میں خوشبودار اُبٹن مل کر اور اسے بیسن لگا لگا کر خوب رگڑ رگڑ کر دھو کے نکلی تھی۔ ایک حمام میں سب ہی ننگے ہوتے ہیں۔ یعنی مالکہ اور ملازمہ میں بہت سی چھپی ڈھکی باتوں پر بھی گفتگو ہونے لگتی ہے۔ اکثر ماما دائیاں اس خدمت کی انجام دہی کے سلسلے میں سہیلیوں کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں۔

بیگم کا کندنی رنگ جب ظہورن کے کھُردرے ہاتھوں کی رگڑ سے شہابی ہو گیا تھا۔ تو ظہورن کو بے ساختہ ان پر پیار آنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ ان کو کلیجہ میں سمیٹ کر ان کی پور پور چوم ڈالے۔ ظہورن کا سن وہ تھا کہ جب اعصاب کے ہیجان کو، طوفانی شکل اختیار کرنے کے لیے ایک معمولی بہانہ کافی ہوتا ہے۔ اور یہاں اس کی آنکھوں کے سامنے سب سے بڑے صنم تراش کے کمالِ صناعی کا ایک شاہکار موجود تھا۔ رنگ روپ، ناک نقشہ، اعضا کا تناسب تو بہ شکن، حسن کی ہر چیز شاکرہ بیگم میں مکمل طور پر پائی جاتی تھی۔ بیگم تھیں تو تیس کے پیٹے میں اور دو لڑکوں کی ماں بھی۔ مگر سوائے پیٹ پر دو ہلکی سپید سلوٹوں کے جسم بھر میں کوئی ڈھیلا پن تھا، نہ کوئی شکن تھی۔ اور نہ کوئی داغ تھا۔

دوشیزہ کالی ہو کہ گوری، بھینگی ہو کہ ہونٹ کٹی، کبھی بھی دو بچوں کی ماں کو اپنے سے زیادہ حسین اور خوبصورت نہیں سمجھتی۔ مگر شاکرہ بیگم کا حسن ہی ایسا تھا۔ کہ ظہورن خود بخود بڑبڑا اٹھی تھی۔ "اللہ جانے ہمارے نواب کی آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے۔" شاکرہ بیگم کو نواب پر الزام لگانے میں جو اُن کی تعریف پوشیدہ تھی۔ وہ شہد سے زیادہ شیریں لگی۔ انہوں نے ظہورن کو گردن گھما کر مسکراتی آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ "کیوں کیا بات ہوئی ہرن جیسی بڑی بڑی تو ماشاء اللہ سے ہیں۔"

ظہورن بولی۔ "ہونہہ، ہوں گی۔ مگر انہیں یہ کیوں نہیں دکھائی دیتا۔ کہ آپ کی خاک کے برابر بھی تو وہ موئی مشتری نہیں۔"

بیگم کی دلی مسرت اور بڑھی۔ اپنے مقابلے میں سوکن کی مذمت نے ظہورن کے فقرے کی چاشنی چوگنی کر دی۔
انہوں نے مصنوعی بھولے پن سے کام لے کر ظہورن کو اور اکسایا۔ وہ بولیں۔ "ارے تم جو کہتی ہو اگر یہ سچ ہوتا۔ تو نواب دس برس

سے اُسے گلے میں لٹکائے کیوں پھرتے۔"

وہ بولی: "سچ کہتی ہوں سرکار، دس برس پہلے وہ جیسی بھی رہی ہو مگر اب تو خاصی بھینس ہے۔ بھوری بھینس! اور چلتر ایسے کہ بیسوا بھی اس کے آگے پانی بھرے۔"

بس پھر سارے بندھن لوٹ گئے۔ بات چل نکلی۔ نواب ماشاءاللہ سے ہمیشہ کے دل پھینک تھے۔ ماما دائیاں، رنڈیاں، منڈیاں ہر کالے سر والے کو وہ نوازتے پھرتے تھے۔ مگر سب ہوتی تھیں وقتی دل بہلاوا۔ بہت ہوا تو چھ مہینہ سال بھر چلیں۔ پھر پرانی جنتری نئی جنتری سے بدل گئی۔ مگر یہ مشتری تو گویا دوسرا محل بن کر بیٹھ گئی تھی۔ شاکرہ بیگم خود بھی خاندانی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ شاہی کے زمانے میں ان کے پرکھوں کے دس بیس محل ہوتے تھے۔ مگر اس بیسویں صدی میں، اور وہ بھی جب ریاست بال بال مقروض ہو چکی ہو، اس مشتری کو تعویذ کی طرح باندھے پھرنا۔ اس کے لیے ایک محل نما کوٹھی خرید دینا، اس کے پاندان کا خرچ شاکرہ بیگم سے بھی زیادہ مقرر کرنا، اور اس کے ہر آن کے نکتوڑے اس طرح توڑنا کہ جیسے وہی ان کے دو چاند جیسے بیٹوں کی ماں ہے، یا وہ واقعی حسن و جمال میں بیگم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور اس پر نظر پڑتے ہی نواب کی آنکھیں چکا چوند کرنے لگتی ہیں۔ سینہ پر انگارے کی طرح جلاتا تھا۔ "ارے مالزادی والاشان کے پاس جب آئی تھی جب ہی اس کا ایک خاصا سیانا سانڈ جیسا لونڈا پہلے خصم سے تھا۔ لوگ کہتے ہیں اس زمانے میں چہرے مہرے سے ذرا غنیمت تھی۔ پر اب دس بارہ برس بعد کیا رہ گیا ہوگا، اس میں؟ البتہ سُنا ہے کھلائی پلائی سے خوب چربیائی ہو گئی ہے۔ یہ بھی سنتی ہوں کہ ایسی ہرجائی ہے کہ نوکروں تک پر بند نہیں۔"

"اے حضور اس کے کرتوت تو شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ بنا مرد کے اکیلی کوئی رات نہیں کاٹ سکتی۔ نواب صاحب بھی جم گیارہ بجے آئیں، بارہ بجے آئیں، پر سرکار کھانا یہیں کھاتے ہیں۔ آرام بھی یہیں کرتے ہیں۔"...... "ہاں بی بی، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اتنی بات ابھی تک باقی ہے۔ وہ چاہے کہیں ہوں، کسی حال میں ہوں۔ کتنی ہی رات کو آئیں، مگر سوئیں گے حویلی ہی میں!...... مگر ایسے سونے کا فائدہ!"...... "اے سرکار، اللہ رکھے کیا ہم لوگ دیکھتے نہیں!......"

نواب والاشان جھومتے لڑکھڑاتے گیارہ بجے رات کو حویلی میں آتے۔ ماما دائیوں میں سے جو جاگتی ہوتی وہ دسترخوان لگا دیتی۔ شاکرہ بیگم بھی آنکھ ملتی پاس آ کر بیٹھ جاتیں۔ وہ خود آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دونوں بچوں کے ساتھ خاصا نوش کر لیتیں، اس لیے محض دسترخوان کا پھول بنی رہتیں۔ والاشان کی قسمت میں ٹھنڈا پالا کھانا ہوتا۔ آخر کب تک باورچن چولھا گرمائے بیٹھی رہتی۔ نواب دو تین پوریاں کباب اور بالائی سے، دو چار لقمے پلاؤ کے یا بگھرے باسمتی چاول کے قورمے سے کھا لیتے۔ اور میٹھے میں برفی کی دو ڈلیاں، چلو چھٹی ہوئی۔ کلیاں کیں، بیسن سے ہاتھ دھویا۔ تخت پر بچھے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ظہورن نے مسہری کے پاس رکھی سہارنپوری تپائی پر خاصدان رکھ دیا۔ شبراتن نے حقہ بھر کے نَے جھکا کر منہ نال لبوں سے آہستہ سے لگا دی۔ نواب نے ایک گلوری پان کی کھائی، حقہ کے دس بیس کش لیے اور ناک بولنے لگی۔ ان کو جو کچھ گلچھرے اڑانے ہوتے وہ کوٹھی ہی میں اڑا کر تھکے ماندے آتے، ایسا معلوم ہوتا بڑا رن مار کر آئے ہیں۔ بس بیوی کی حویلی امن و امان کی جگہ ہے چین کی نیند سونے کی جگہ۔ پہلے تھوڑی تھوڑی افیون کھاتے تھے۔ اب ادھر شراب بھی منہ سے لگ گئی تھی۔ شاکرہ بیگم کو اس کی بو سے متلی آتی تھی چنانچہ کئی سال سے جب سے یہ بلا نواب کے منہ کو لگی تھی۔ نواب کے بلانے پر بھی شاکرہ بیگم ان کے بستر کے قریب بھی نہ گئی تھیں۔

اور ادھر مشتری نواب کے حویلی جانے کا بھی انتظار نہ کرتی۔ اور جب سے کہ چھٹن نواب کا آنا جانا ہو گیا تھا۔ نہ دن کا پردہ تھا نہ رات کا۔ چھٹن والاشان کا حقیقی بھانجا تھا۔ بچپن سے ہی ماموں کے قدم بہ قدم چلا تھا۔ والاشان بودے تھے۔ وہ بلا کا نڈر جس پر نظر پڑی، دن دھاڑے اٹھا لایا۔ شہر کے مشہور غنڈے ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ "چھوٹی قوم" کی بیاہی ہو کہ کنواری، کوئی بھی اس سے محفوظ نہ تھی۔ ان کے مردوں میں کسی کی ہمت نہ تھی۔ کہ چوں کر سکے۔ پیدل نکلتا تو موٹا سا تیل پلایا ہوا ڈنڈا ہاتھ میں اور غنڈوں کا غول ساتھ۔ گھوڑے پر سوار نکلتا تو بڑا سا نہ

ہاتھ میں۔ جیب میں ہر وقت ریوالور ڈالے رکھتا۔ وہ شورہ پشتی تھی۔ کہ الامان والحفیظ! اب یہی چھٹن نواب مشتری سے ماموں کے پیسے وصول کر رہا تھا۔ والاشان کو سب معلوم تھا۔ مشتری کے ہاں اندر جانے سے پہلے ہمیشہ چپکے سے دریافت کر لیتے کہ وہاں چھٹن نواب تو نہیں بیٹھا ہے ان کا بھی چھٹن کے نام سے دم نکلتا۔ سب کچھ جانتے سنتے ہوئے وہ اس غم و غصہ کو بھی جام پر جام میں ڈبو دیتے۔

شاکرہ بیگم اور ظہورن میں اسی چھٹن نواب کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ اور یہی چھٹن نواب تھوڑی دیر بعد آدھمکا۔ ظہورن کی بوکھلاہٹ کی وجہ یہی تھی۔ شاکرہ بیگم نے حمام کے اندر سے قدرے متانت سے یہ تو ضرور کہا کہ "انہیں لے جا کر صدر دالان میں بٹھاؤ۔ میں نہا چکی، آ رہی ہوں۔"

مگر ان کے افعال و حرکات بھی اضطراری ہونے لگے۔ انہوں نے صندل کی چوکی پر بیٹھے بیٹھے ذرا کانپتے ہاتھوں سے پائپ کا فوارہ بند کیا۔ اور گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ پھر بڑے تولیے سے سر کے بال اور پنڈے کا پانی پونچھتی ہوئی حمام کی دیوار میں لگے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا منہ دیکھنے لگیں۔ پانی کی خنکی نے غزالی آنکھوں میں لال لال ڈورے ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے جسم بھر میں ایک خاص قسم کا کیف محسوس کیا۔ وہ کسمسائیں۔ ان کی آنکھیں کچھ اور نشیلی ہو گئیں۔ انہوں نے تولیے سے جسم کو زور زور سے اس طرح رگڑا کہ اکثر اعضا کی جلد سرخ ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے پہننے لگیں۔

ظہورن نے باہر سے آواز دی۔ "سرکار میں نواب صاحب کو بٹھا آئی۔ وہ کہتے ہیں اگر سرکار کے برآمد ہونے میں دیر ہے تو وہ اس وقت چلے جائیں، پھر کبھی حاضر ہوں گے۔"

وہ بولیں! "نہیں نہیں، ان سے کہو میں آ رہی ہوں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ حسبِ معمول ظہورن کو حمام میں بلا کر اس سے تلوے کچھوائیں وہ خود ہی اپنے ہاتھ سے یہ فریضہ انجام دے کر جوتی میں آدھا پاؤں ڈال کر اسے کچھ گھسیٹتی حمام سے باہر نکل آئیں۔

چھٹن نے سمندر کے کنارے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب جیسے چہرے کو دیکھا۔ پہلے تو ایک لالچی کی طرح زبان پھرائی۔ پھر بڑا نیک خورد بن کر جھک کر سلام کیا۔ وہ سر یہ ممانی کے رشتے سے فائدہ اٹھا کر یوں بھی شاکرہ بیگم کو چھیڑا کرتا تھا۔ اس رشتے میں متانت و سنجیدگی، بزرگی و احترام سے زیادہ ایک لطیف طرح کی بے تکلفی ہوتی ہے۔ جو مزاح سے آگے مذاق تک کو روا جانتی ہے۔ دیہاتی مثل ہے۔ "آدھی مامی آدھی جوئے، پَد لگائے سگری ہوئے"۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ جیسے چھٹن ایک جھوٹی ممانی کو ناپ تول کر اب سچی ممانی کی پیمائش کرنے کو تیار ہے اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں وہ خاص جنسی کشش پیدا ہو گئی۔ جو سدا سے لیلاؤں کو مجنوں بناتی آئی ہے۔

شاکرہ بیگم نے ایک جھرجھری سی لی۔ وہ تخت کے چوکوں پر بچھی ہوئی مسند پر آ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے دوپٹہ سے ہی گردن و سینہ نہ چھپایا بلکہ بڑا تولیہ بھی اس پر سے لپیٹ کر ظہورن سے مڑ کر کہا۔ تم چھوٹے تولیے سے خوب رگڑ رگڑ کر بال سکھا دو۔ وہ چھوٹا تولیہ لیے حکم کی منتظر ہی کھڑی تھی۔ اس نے تولیے سے بھیگے بال سکھانا شروع کیا۔ دفعتہً ایک لٹ شاکرہ کے سامنے آ گئی۔ سیاہ بالوں میں ایک سفید بال جھلک گیا۔ تاریک بادلوں میں جیسے کوندا لپک گیا۔ بیگم کے پنڈے بھر میں جیسے کسی نے برف کی ایک لکیر کھینچ دی۔ چھٹن کی نظر سے جو جسم میں گرم گرم لہریں اٹھ رہی تھیں وہ ایک ٹھنڈی سانس بن کر منہ سے نکلی۔

وہ گھبرا کر اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ چھٹن سے بولیں: "نواب تم جانا نہیں۔ میں ابھی آئی۔"

وہ تولیہ اور دوپٹہ سنبھالتی اوٹ کے پیچھے جانے لگیں۔ جسم میں چپکی ہوئی گلابی جالی دار قمیض میں سے پیٹھ کے گورے گورے رنگ نے تاک جھانک لگائی۔ پھر پتلی کمر پر پھیلے ہوئے کولھے کی لچک نے ہوا میں برقی تموّج پیدا کیا۔ کرنٹ چھٹن نواب تک پہنچا۔ اس نے انگڑائی لی۔ اور داہنے ہاتھ کی انگلیاں تخت پر دبا کر چٹخائیں۔ ظہورن نے اپنی بیگم کے پیچھے جاتے جاتے اسے پلٹ کر دیکھا۔ چھٹن نے مسکرا کر آنکھ مار

دی۔ اس نے بیگم کی آنکھ بچا کر چھٹن کو ٹھینگا دکھا دیا۔ اور کولھا مٹکا کر بیگم کے ساتھ اوٹ کے پیچھے چلی گئی۔

شاکرہ بیگم اپنے انوکھے جذبات سے الجھتی ہوئی ظہورن کو جھڑک کر بولیں۔ "نہیں اب تمہاری ضرورت نہیں۔ تم بھیگے تولیے سوکھنے کو پھیلا دو۔" یہ کہہ کر انہوں نے بڑا تولیہ بھی ظہورن کی طرف بڑھا دیا۔ جسم سے تولیہ ہٹتے ہی اس کی ساری رعنائیاں چمک اٹھیں۔ ظہورن نے ایک رشک بھری نظر ان پر ڈالی۔ اور تولیے لیے ہوئے وہ عمداً چھٹن نواب کے پاس سے ہو کر گزری۔

اس نے ہونٹوں کا غنچہ اس طرح بنایا جیسے وہ ظہورن کے گالوں پر پیار کر رہا ہے۔ اس نے چھٹن کو ہمہ سپردگی کے انداز سے دیکھا۔ اور بڑا تولیہ اس طرح ہلایا۔ کہ اس کے ایک کونے نے چھٹن کے گالوں کو چھو لیا اور جلدی جلدی قدم رکھتی ہوئی وہ بھاگ گئی۔ چھٹن نواب کے مُنہ سے بے ساختہ ایک سیٹی سی نکل گئی۔

شاکرہ بیگم جو اپنے بالوں میں کنگھی کرنے میں بار بار لٹوں میں سے چاندی کے تار اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک رہی تھیں سیٹی کی آواز سے چونک پڑیں۔ انہوں نے اوٹ کے پیچھے سے اچک کر جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ ان کے قد سے کہیں اونچا نکلا۔ جب ناکام رہیں تو انہوں نے اوٹ کے کپڑے کا ایک کونہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ چھٹن نواب ٹکٹکی باندھے اوٹ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر انہیں ایک اکتاہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے بولیں۔

"نواب گھبرانا نہیں میں ابھی آئی۔"

وہ بولا۔ "ارے تو کسی طرح ختم بھی کیجیے اپنا سولہ سنگار۔ ہم چھوٹوں پر بجلی گرانے کے لیے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھیراتی ہوئی دہیں سے بولیں۔ "چپکے بیٹھے رہو۔ زیادہ تیزیاں نہ دکھاؤ۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "بہت اچھا مومانی جان! بہت اچھا۔"

اس کے ممانی کی جگہ مومانی اور صاحبہ کی جگہ جان کا لفظ استعمال کرتے انہیں پھر گدگدایا۔ انہوں نے جلدی جلدی ڈھیلا ہی جوڑا باندھا۔ کس کر باندھنے میں کالی رات میں تاروں کے جھلکنے کا ڈر تھا۔

جب وہ بن سنور کر نکلیں تو چھٹن نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں۔

بیگم نے ہنس کر پوچھا۔ "یہ کیا مسخرا پن ہے؟"

وہ لمبا سا منہ بنا کر بولا۔ "اپنے بس کی بات تھوڑے ہے۔ آنکھیں خود بخود چکا چوند کرنے لگیں۔"

وہ ہنستی ہوئی مسند پر بیٹھ گئیں۔ پھر وہ بولیں۔ "سنتی ہوں کہ تم اب بڑے ڈھیٹ ہو گئے ہو۔ بزرگوں کے مال پر بھی ہاتھ ڈالتے میں نہیں جھجکتے۔"

وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر بولا۔ "بھلا ان ہاتھوں میں اتنا دم کہاں؟" اور اُس نے بڑی جسارت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی کے نشانوں پر اپنی کلمے کی انگلی کے ناخن سے لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔

"البتہ یہ بات ہے۔ باوجود اپنی نزاکت کے جیسا مال چاہے کاٹ لائے۔ جس کا دل چاہے اچک لے۔"....

شاکرہ بیگم کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"پھر وہی بدتمیزی۔ کیا مجھے بھی مشتری سمجھ رکھا ہے۔"

چھٹن ذرا اور قریب کھسک کر بولا۔ "سچ کہتا ہوں مجھے بعض اوقات ماموں جان کی بینائی پر شبہ ہوتا ہے جس کے گھر میں اللہ کا دیا ایسا تر مال موجود ہے۔ وہ سڑی دال کی جھوٹی ہانڈی کیوں چاٹتا رہتا ہے ....."

وہ تو رمال کے فقرے پر ہنس دیں اور چھوٹی ہانڈی کی مثال سے لذت لے کر بولیں "چل لڑکے تجھے باتیں بنانا خوب آتی ہیں"
وہ ذرا اور قریب کھسکا۔ اس کے لباس کی خوشبو، اس کے جسم کی مردانہ بو میں مل کر ان میں سرخوشی کی کیفیت پیدا کرنے لگی۔ انکی سانس گرم ہونے لگی۔

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "ناقدروں کے ہاتھ میں خدا کسی کی قسمت نہ دے"
وہ لمبی سانس لے کر بولیں "اب تو دے ہی دی اس نے ایک ناقدرے کے ہاتھ میں!"
وہ شیطانی انداز سے آنکھیں جھپکا کر بولا "مگر قسمت بدلی بھی تو جاسکتی ہے .... اور نہیں تو، بدلہ تو یقینی لیا ہی جاسکتا ہے ...."

ان کے نتھنوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ وہ خشمگیں آواز بنا کر بولیں "تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو چھٹن نواب!"
وہ سرگوشی کے انداز میں بولا "شاید کو آنچ نہیں مومانی جان! کوئی بری بات ہوتی تو ماموں جان آپ ہی کی طرح دل کو گڑھائے نہ بیٹھے رہتے! وہ تو ہیں کہ ایک مشتری ہی نہیں روز نئی نئی ...."

بیگم کے روئیں روئیں ابال سا آنے لگا۔ وہ شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر آنے والے پتے کی طرح تھر تھرانے لگیں۔
چھٹن نے ان کے تمتماتے گالوں پر آنکھیں گڑا کر انھیں اپنی آغوش میں سمیٹنے والے انداز سے ہاتھ بڑھایا۔ ان کے بھی ہاتھ کچھ بےبسی سے اس کی طرف بڑھنے لگے .....

دفعتاً پانچ برس کا منجھو نواب دوڑتا ہوا آیا۔ "امی! امی مجھے کنکیا ڈور منگا دیجئے۔ میں بھی پتنگ اڑاؤں گا۔"
شاکرہ بیگم نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بیٹے کو گود میں زور سے سمیٹ لیا۔ لڑکا جو پھڑپھڑایا تو ان کا جوڑا کھل گیا۔ کالے بالوں میں پھر کوندا لپکا۔ وہ منجھو کا منہ چوم کر چھٹن سے بولیں۔
"نواب اب تم سدھار سکتے ہو!" اور جب وہ جوتا پہن رہا تھا تو انھوں نے ہونٹ چبا کر کہا۔
"اور یاد رکھنا اس گھر میں اس طرح کی شوخیاں نہیں پسند کی جاتیں!" اور ان کی آنکھوں کا رنگ ان دہکتے کوئلوں جیسا تھا جو راکھ سے ڈھک گئے ہوں۔

قرۃ العین حیدر

بانو۔ دہلی

بڑے آدمی

ڈپٹی صاحب کی کوٹھی کے آنگن میں ذکیہ بیگم نواڑی پلنگ پر بیٹھی دولہن کے دوپٹے پر گوٹا ٹانکنے میں بے طرح مصروف تھیں۔ جب ماما نے انھیں آواز دی، تو وہ جلدی سے تلے دانی لپیٹ کر باورچی خانے کی طرف لپکیں۔ ڈپٹی صاحب کے گھر کی بیبیاں دعوت کا سارا انتظام ذکیہ بیگم کے سپرد کر کے مزے سے برآمدے میں چاندنی کے فرش پر بیٹھی بھنبھیریوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔

"اے ذکیہ، بٹیا ذرا آ کے بھیا کو چپ کرا جاؤ" چبوترے پر سے چھوٹی بھاوج نے آواز دی۔ "تم سے اتنا ہل گیا ہے بھیا، مجھ سے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔"

ذکیہ چند منٹ بعد باورچی خانے سے نکل کر چبوترے پر پہنچیں کھری پلنگڑی پر ٹک کر بچے کو گھٹنوں پر بٹھایا اور بہلانا شروع کیا "آغوں غوٹے، ماموں موٹے ممانی موٹی" بچہ روتے روتے فوراً چپ ہو گیا اور بیٹ بیچنے کی مانند آنکھیں جھپکا کر ذکیہ کے خوبصورت چہرے کو تکنے لگا۔

"اللہ ذکیہ جس گھر میں جائے گی اُجالا کر دے گی" برآمدے میں بیٹھی ایک مہمان بی بی نے ڈپٹی صاحب کی بڑی بہو سے کہا۔

"کہیں بات لگی ہے؟" دوسری بی بی نے قریب کھسک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ رازدارانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"اے بٹیا بنٹ ٹانک دی ـــ؟" دور سے ڈپٹیائن نے آواز لگائی۔

"ٹانک دی ـــ" "آغوں غوٹے، ماموں موٹے ـــ" ذکیہ نے چبوترے پر بڑی محویت کے ساتھ اپنا وظیفہ جاری رکھا۔

"اے کہاں بہن" برآمدے میں ڈپٹی صاحب کی ساس نے ناک کی پھننگ پر عینک رکھ کر چہرہ اونچا کرتے ہوئے مہمان بیوی کو جواب دیا "آج کل لڑکے جہیز میں موٹریں مانگ رہے ہیں۔ وکیل صاحب دکھیا کے پاس کیا رکھا ہے۔ اور تعلیم بھی کچھ نہیں، آجکل تو بی آ، ایم آ کی مانگ ہے۔"

اتنے میں ذکیہ بچے کو چھوٹی بھاوج کے حوالے کر کے دوپٹہ سر پر ڈالتی برآمدے میں آئیں تو لڑکیوں بالیوں نے انھیں گھیر لیا "اللہ ذکو بجیا ہمارا بلاؤز تراش دیجئے" "بھئی ذکیہ تم بڑی بے مروت ہو وعدہ کیا تھا ہمارے لئے لیس بُن دو گی، بجھا سے میگن نہ لائیں ہمارے لئے" ذکیہ ہنس ہنس کر یا جھلا کر سب کو جواب دیتی رہیں کہ ابھی بہت کام پڑا ہے، فرصت ملی تو تمہارا کام بھی کر دوں گی۔ پھر انھوں نے ڈپٹیائن سے کہا "اللہ ڈپٹیائن چچی، ہمیں گودام کی کنجی دے دیجئے تو چاول تُلوا لیں۔"

ڈپٹیائن نے کنجیوں کا گچھا انھیں تھمایا اور وہ خراماں خراماں گودام کی طرف چلی گئیں۔

ڈپٹیائن سے ذکیہ بیگم کا کوئی رشتہ نہ تھا، مگر اس معاشرے میں وضع داری کی بنا پر سب ایک دوسرے کو کسی نہ کسی رشتے سے یاد کرتے تھے۔ ذکیہ بیگم کو یوں بھی اپنے سے اونچے رتبے والوں سے رشتے جوڑنے کا خاص شوق تھا۔ اور ڈپٹیائن ایک تعلقہ دار کی بیٹی تھی۔ ویسے بھی ڈپٹی صاحب کے گھرانے کے علاوہ شہر کے دوسرے بہت سے کنبوں میں ذکیہ اپنے سگھڑاپے اور ملنساری کی وجہ سے بہت مقبول تھیں، ہر تقریب یا دعوت کا انتظام دو منٹوں میں سنبھال لیتیں

عقیقے بسم اللہ، گیارہویں شریف، بیاہ برات بارہ مہینے ان کی جان کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگا ہی رہتا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ ذکیہ کا جی اپنے گھر میں کبھی نہ لگا۔ اس نگوڑے ڈھنڈار مکان کے برآمدوں تک میں گھاس اُگ آئی تھی۔ کمروں کے اینٹوں کے فرش کو دریاں تک نہ جڑی تھیں، قالین تو چھوڑیئے۔ بیٹھک میں وکیل صاحب کبھی کبھار آ بھٹکنے والے موکلوں کے انتظار میں پڑے حقہ گڑگڑایا کرتے، اندر اماں گاؤں سے آئی ہوئی دقیانوسی رشتے دار بڑھیوں سے سر کھپاتیں۔ باتیں کیا ہوتی تھیں وہی گاؤں کے کھیت تھے کہ میتا چچا کو تیرہ تیزی کے مہینے میں کھنڈسال سے اتنا نفع ہوا ـــ اور وہ مولوی شبّن کا لڑکا تھا نا؟ وہ بمبئی بھاگ گیا اور میراں جی اور شاہ مدار کے مہینوں میں چھبّن کی بہو پر ادبدا کے شیخ سدو سوار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو انگریزی مہینوں کے نام تک تو نہیں آتے تھے۔ اور اماں کا یہ حال تھا کہ ان کے نزدیک بائیسکوپ کی موئی تصویریں جادو کے زور سے بولتی تھیں۔

وکیل صاحب کانگریس اور خلافت کے چکر میں برسوں جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد پریکٹس جمی نہیں۔ دمے کے مریض تھے۔ گاؤں سے تھوڑا بہت غلہ آ جاتا تھا، سستا زمانہ تھا سفید پوشی سے گزر ہو رہی تھی۔ ذکیہ بیگم کیلئے حسب حیثیت جہیز تیار ہو چکا تھا۔ وہ اکلوتی لڑکی تھی کسی شریف غریب پیغام کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اونچے طبقے کے لڑکے بھلا اس کھنڈر مکان کا رخ کیوں کرنے لگے۔

وکیل صاحب بے چارے نے ذکیہ کو اسکول میں پڑھوایا۔ وہ پیدائشی سلیقہ مند تھیں۔ کروشیا، کشیدہ کاری، سلائی، کھانا پکانا ہر چیز میں طاق تھیں، پڑھنے میں البتہ جی نہ لگتا۔ اس لئے آٹھویں کے بعد گھر بیٹھ گئیں۔ ڈپٹی صاحب کی کوٹھی پڑوس میں تھی۔ زیادہ تر وہیں رہتیں، قبول صورت اور نیک دل لڑکی تھیں۔ نماز روزے کی پابند۔ ناول پڑھنے کی چاٹ انھیں ڈپٹی صاحب کے گھر ہی پڑی۔ پردہ کلب لائبریری کے سارے رومانی ناول گھول کر پی گئیں۔ اکثر خود کو کسی محل میں رہنے والی ہیروئن تصور کرتیں اور طرح طرح کے سہانے خواب اپنے مستقبل کے متعلق دیکھا کرتیں۔ شام کے وقت اپنی شکستہ کوٹھی کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ناول پڑھتے پڑھتے جانے کہاں کہاں پہنچ جاتیں۔ اتنے میں کسی موکل کا یکہ کھڑ کھڑ کرتا سامنے آ کر رکتا اور سارا طلسم ٹوٹ جاتا۔ چونکہ بہت معصوم تھیں، اس لئے اتنے ناول اور افسانے پڑھ لینے کے باوجود انھیں خود رومان لڑانے کی کبھی نہ سوجھی، مگر جب ان کی سہیلیاں اپنے رشتے کے بھائیوں سے در پردہ رومان لڑاتیں تو ذکیہ ان کی ہمدرد اور ناصح بنتیں، ان کے معاشقوں کی کامیابی کی دعا مانگتیں اور ناکامی کی صورت میں آنسو بہاتیں۔

چاول تلوا کر ذکیہ جب گودام سے نکلیں تو ایکدم غل مچا "لیڈی صاحب آگیئں ـــ لیڈی صاحب آگیئں" ڈپٹیائن پائنچے سنبھالتی ان کے استقبال کیلئے باہر لپکیں۔

باہر ایک طویل موٹر میں سے تین بے پردہ بیبیاں اتریں۔ دو ترشے ہوئے بالوں والی لڑکیاں تھیں، ایک ان کی اماں تھیں۔ سب بڑی تمکنت سے آگے پچھلے برآمدے میں مسند پر بیٹھ گئیں۔

افراتفری میں چھوٹی بھاوج نے ذکیہ کو ان لوگوں سے ملوایا تک نہیں مگر کھانے کے بعد آفتابہ اٹھا کر مہمانوں کے ہاتھ دھلاتے وقت ذکیہ نے خود ہی لڑکیوں سے بات چیت شروع کر دی۔ یہ دونوں گلنار اور یاسمین سر اعجاز اور لیڈی احمد کی لڑکیاں تھیں۔ سر اعجاز حال ہی میں اس شہر میں آکر رہے تھے۔ ہم عمر لڑکیوں میں پل کے پل میں دوستی ہو جاتی ہے، چنانچہ ذکیہ اور گلنار اور یاسمین میں بھی فوراً بہناپا قائم ہو گیا۔ لیڈی صاحب نے ذکیہ کو آئندہ ہفتے اپنے یہاں میلاد شریف کے لئے مدعو بھی کر ڈالا۔

گھر لوٹ کر ذکیہ نے بے حد مسرت کے ساتھ وکیل صاحب کو بتایا کہ "انھیں سر اعجاز احمد کے یہاں مدعو کیا گیا ہے اور سر اعجاز بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"انگریز کے پٹھو ہیں!" وکیل صاحب نے مختصراً کہا اور خلال کرنے میں مشغول رہے۔ لیکن اماں دل میں بہت خوش ہوئیں کہ بڑے گھرانے سے ملاقات ہو گئی شاید اسی وسیلے سے کہیں اچھا رشتہ لگ جائے۔

بہت جلد ذکیہ لیڈی اعجاز کے گھرانے میں بھی رل مل گئیں۔ ہفتے میں ایک آدھ بار تو ضرور ہی ان کے وہاں پھیرا لگا آتیں۔ ایک روز ڈپٹی صاحب کی بہو نے طعنہ دیا "بڑے آدمیوں سے دوستی ہو گئی ہے۔ شاید اسی لئے اب ہمارے یہاں نہیں آتیں ذکیہ۔"

"نہیں یہ بات نہیں، توبہ کرو بھابی!" ذکیہ نے شرمندہ ہوکر کہا۔ مگر واقعہ یہی تھا کہ ڈپٹیاین کے گھر کے فرسودہ ماحول کے مقابلے میں قصر اعجاز کی رومینٹک فضاؤں میں ذکیہ کا جی بہت زیادہ لگتا تھا۔ سر اعجاز کا اکلوتا لڑکا ولایت سے میم لے آیا تھا اور کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ گلنار اور یاسمین سینئر کیمبرج کرنے کے بعد اب شادی کے انتظار میں گھر پر بیٹھی تھیں اور "میوزک اینڈ پینٹنگ" سے شغف کر رہی تھیں اور انگریزوں والے کلب جاکر بیڈمنٹن کھیلتی تھیں۔ وہ دونوں بہت ہی معمولی شکل کی لڑکیاں تھیں، گلنار بہت ہی بھدی تھی اور یاسمین کے داہنے پاؤں میں خفیف سا لنگ تھا۔ اسی وجہ سے باپ کی بے اندازہ دولت اور بڑے نام کے باوجود رشتے نہیں آرہے تھے۔

گلنار اور یاسمین کے لئے ذکیہ بیگم اپنے سلیقے کی وجہ سے بڑی کارآمد سہیلی ثابت ہوئیں۔ وہ ان کے کپڑے سیتیں، ان کے دوپٹے نہایت نفاست سے چنتیں، ان کی پارٹیوں کا انتظام کرتیں اور لیڈی صاحب کے اصرار پر رات کو بھی اکثر وہیں ٹھہر جاتیں۔ چونکہ ان کے گھر میں کوئی جوان مرد نہ تھا، اور سر اعجاز بزرگ آدمی تھے اسلئے وکیل صاحب نے بھی ذکیہ کے قصر اعجاز میں راتیں گزارنے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

قصر اعجاز کا ماحول بے حد ناولانہ تھا۔ اس لئے ذکیہ خود کو اب باقاعدہ ایک رومانی کردار سمجھنے لگی تھیں۔ اب وہ گلنار اور یاسمین کی طرح سر اعجاز اور لیڈی صاحب کو ڈیڈی اور ممی کہتیں اور لیڈی اعجاز بھی ان سے بڑی محبت کا سلوک کرتی تھیں۔ وہ اکثر کہتیں "مجھ کو تو تمہارے ایک پی پلائی سگھڑ بیٹی دے دی میری لڑکیاں تو دونوں بالکل نکمی ہیں" ذکیہ یہ سن کر باغ باغ ہوجاتیں مگر بڑی صدق دلی سے گلنار اور یاسمین کی طرفداری کرنے لگتیں۔

ایک شام کو ذکیہ حسب معمول سائیکل رکشہ پر پردہ بندھوا کر قصر اعجاز گئیں تو معلوم ہوا کہ لیڈی صاحب اور دونوں لڑکیاں کلب جاچکی ہیں، سر اعجاز وائسرائے سے ملنے دہلی گئے ہوئے تھے۔ ذکیہ اطمینان سے باغ میں ٹہلتی رہیں کہ اتنے میں ایک کار آکر رکی اور ایک بڑا خوبصورت نوجوان نیچے اترا۔ ذکیہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں گلاب کی کیاری کے پاس کھڑی بہت دلکش معلوم ہو رہی تھیں۔ نووارد ان کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پھر چند لمحوں بعد کھنکار کر ذرا گھبراتے ہوئے اس نے کہا "معاف کیجئے گا ــــــ سر اعجاز تشریف رکھتے ہیں؟"

ذکیہ نے چونک کر نوجوان کو دیکھا اور بڑی سادگی اور اخلاق سے جواب دیا، "جی نہیں۔ ڈیڈی تو دلی گئے ہوئے ہیں ــــ ممی ابھی کلب سے آتی ہی ہونگی، تشریف رکھئے۔"

نوجوان جس کا نام ظفر احمد تھا، ان کو تکتے تکتے جھینپ کر گھاس پر بچھی کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔

"چائے پیجئے گا یا شربت؟" ذکیہ نے پوچھا۔

ذکیہ فوراً اندر گئیں اور چند منٹ بعد چاندی کی ٹرے پر شربت کا گلاس رکھ کر باہر لائیں اور بڑی شائستگی سے گلاس مہمان کو پیش کیا۔

کیا سادگی اور معصومیت ہے" ظفر احمد نے کھڑے ہوکر گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے سوچا "اتنے بڑے آدمی کی لڑکی، اور بیرے کو آواز دینے کے بجائے خود شربت لے کر آگئی۔ کمال ہے۔"

"آپ یہیں کالج میں پڑھتی ہیں؟" ظفر احمد نے دریافت کیا۔

"جی نہیں" ذکیہ نے دوسری کرسی پر ٹکتے ہوئے جواب دیا "میرا دل" انھوں نے ذرا جھینپ کر کہا "خانہ داری میں زیادہ لگتا ہے" یکایک انھیں احساس ہوا کہ وہ ایک اجنبی نوجوان سے اس قدر بے تکلفی سے باتیں کر رہی ہیں۔ گلاب کی کلی کی طرح سرخ ہوکر انھوں نے گلابی کی ایک پنکھڑی توڑ دی۔ چند لمحوں تک بڑی گمبھیر خاموشی چھائی رہی۔ جس میں باغ کے درخت اور پھول شام کی ہوا میں سرسرایا کیئے۔ ظفر احمد بھی بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ شربت ختم کرکے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور گھڑی دیکھ کر بولے، "اب اجازت دیجئے۔ دل تو بہت چاہ رہا ہے کہ کچھ دیر اور یہاں بیٹھوں مگر نہ رستہ کی ٹھیں بکڑتا ہے۔ لیڈی صاحبہ نہ جانے کس وقت تک یہاں آئیں گی، میری ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، میں دراصل اس شہر میں آج ہی آیا ہوں، آپ کے ڈیڈی سے ایک ضروری کام تھا، میں ان سے بھی پہلے کبھی نہیں ملا ہوں۔ افسوس ہے کہ آج بھی ملاقات نہ ہوسکی۔"

"ممی تو بلڈ پریشر کی وجہ سے کہیں آتی جاتی نہیں ہیں، مگر آج گلنار اور یاسمین کا بیڈمنٹن میچ تھا اس لئے چلی گئیں۔"

"گلنار اور یاسمین کون ہیں؟ آپ کی چھوٹی بہنیں؟"

"جی ـــــ جی ـــــ" ذکیہ نے ایک دم بے حد سراسیمہ ہو کر کہا۔ کیونکہ ظفر احمد ان کی کرسی کے بالکل قریب آ کر بے حد دلچسپی اور جذبے کے ساتھ انکو دیکھ رہے تھے۔ ذکیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر پھاٹک کی طرف نظریں گھمادیں۔

"اب مجھے واقعی چل دینا چاہیئے" ظفر احمد نے گہری آواز میں کہا "اچھا آداب عرض۔"

"اللہ حافظ" ذکیہ نے سادگی سے جواب دیا۔ ظفر احمد کا دل اس ادا پر شدت سے دھڑک اٹھا۔ اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے کار کی طرف چلے گئے۔ چند لمحوں بعد کار پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

ظفر احمد الہ آباد کے ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے، لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہے تھے اور شادی کے ارادے سے وطن واپس آئے تھے۔ مگر سر اعجاز کے یہاں وہ شادی کے ارادے سے نہیں آئے تھے۔ وہ کسی اونچے گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی سے بیاہ کرنا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ برسوں لندن میں رہنے کے بعد بھی وہ ایک ٹھیٹھ ہندوستانی لڑکی کو شریک حیات بنانے کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی سیدھی سادی اور غریب گھرانے کی لڑکی کو بیاہ کر اپنے ساتھ لندن لے جائیں۔ مگر اس وقت ذکیہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ ایسی بھولی بھالی اور نیک طبیعت لڑکیاں بھی اس اونچے اور فیشن ایبل طبقے میں موجود ہیں۔ تو اگر ڈھیر ساری دولت بھی مل جائے تو کیا حرج ہے۔؟

کوئی دس روز کے بعد الہ آباد سے ظفر احمد کی والدہ کا خط لیڈی اعجاز کے پاس آیا۔ اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرانے کے بعد انھوں نے لکھا تھا۔ آپ کے دولت خانے پر آپ کی بڑی صاحبزادی سے میرے لڑکے نورچشمی ظفر احمد سلمۂ کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ بہن صاحبہ، آپ جانتی ہی ہوں گی کہ آجکل کے لڑکے نئی وضع کی لڑکیوں کے ذکر ہی پر کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ مگر آپ کی صاحبزادی بلند اقبال کے حسن صورت و سیرت سے عزیزی ظفر احمد بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ یہ یقیناً آپ کی اور سر اعجاز کی دی ہوئی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کی بیٹی آجکل کی ماڈرن لڑکی معلوم ہی نہیں ہوتی ـــــ وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں لکھا تھا کہ ظفر احمد سلمۂ شادی جلد از جلد کر کے اس مہینے کے آخر میں اللہ رکھے دلہن کے ساتھ واپس ولایت جانا چاہتے ہیں۔

لیڈی اعجاز یہ خط پڑھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ خط میں جس تاریخ کا ذکر تھا، اس کو تو گلنار اور یاسمین گھر پر ہی نہیں تھیں۔ اور حسن صورت و سیرت؟ یا مظہر العجائب!

ٹھیک اس وقت لیڈی صاحبہ نے دیکھا کہ ذکیہ بی بی گلنار کا سوئیٹر بنتی خراماں خراماں سامنے سے چلی آرہی ہیں، لیڈی صاحبہ نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"بیٹیا، جس روز گلنار اور یاسمین کا کلب میں میچ تھا، تم یہاں کس سے ملی تھیں؟"

"کوئی ظفر احمد صاحب تھے ممی۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ڈیڈی سے ملنے کوئی صاحب آئے تھے۔ میں نے ان کو شربت لا کر دے دیا تھا چائے کے لئے وہ ملنے ہی نہیں۔"

"اوہ ـــــ" لیڈی اعجاز کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔

پیغام فی الفور منظور کر لیا گیا ـــــ اور گلنار مایوں بٹھادی گئی۔ اگلے ہفتے جب دولہا والیاں الہ آباد سے چل کر آئیں تو ان سے کہہ دیا گیا کہ ہمارے یہاں نکاح سے پہلے لڑکی دولہا کی ماں بہنوں تک کو نہیں دکھائی جاتی۔ ظفر احمد کی والدہ اتنے اونچے گھرانے میں بیٹے کا رشتہ ہو جانے سے اس قدر خوش تھیں کہ انھوں نے لڑکی دیکھنے پر مطلق اصرار نہ کیا۔ سر اعجاز ایک نہایت شریف اور راست باز انسان تھے اس لئے لیڈی صاحبہ نے ان کو یہ بالکل نہیں بتایا کہ ظفر احمد سلمۂ دراصل بے چاری خستہ حال ذکیہ پر عاشق ہوئے تھے۔

بیاہ کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ ذکیہ بیگم جی جان سے انتظامات میں جٹ گئیں۔ اس قدر دھوم دھام کی شادی تھی کہ بس دیکھا ہی کیجیے۔ ذکیہ نے

۹ اپنی اماں کو بھی پہنا اڑھا کر لا کے پچھلے دالان میں ایک طرف بٹھا دیا تھا اور پانوں کا انچارج انھیں بنا دیا گیا۔ وہ بے چاری بہت گھر کی اس رونق سے مرعوب اور متحیر تخت پر بیٹھی مشین کی طرح گلوریوں پر گلوریاں بناتی رہیں۔

بیاہ کے روز ذکیہ ملازموں پر جھنجھلاتی پھر رہی تھیں کہ برات آگئی اور کچھ دیر بعد زنان خانے میں شور مچا" دولہا آگیا ــــ دولہا آگیا۔ ہائے کتنا شاندار ہے۔ بالکل شہزادہ !" مہمان لڑکیوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی ،" گلنار کی صورت دیکھو اور یہ دولہا !" بلکہ ڈپٹیائن کی مونہہ پھٹ بھتیجی تو چپکے سے اپنی سند سے یہ تک کہا "عجب تری قدرت عجب ترے کھیل ! دوسرا مصرع کیا ہے بجیا ؟ مجھے یاد نہیں آرہا !" اور ڈپٹیائن کی لڑکی نے ہونٹ دبا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا " اللہ بھابی اب چپ رہو۔"

" اے آرسی مصحف کس وقت ہوگا ؟ ڈپٹی صاحب کی ساس نے سامنے سے گذرتی ہوئی ذکیہ سے دریافت کیا جو پھولوں کی ٹوکری اٹھائے دلہن کے کمرے کی طرف بھاگی جا رہی تھیں۔

" گلنار بے چاری کے سر میں سخت درد ہے خالہ جان۔ ممی نے کہہ دیا ہے کہ آرسی مصحف نہیں ہوگا۔ وہ بیٹھ تک تو سکتی نہیں غریب۔ سر مونہہ لپیٹے پڑی ہے۔" ذکیہ نے جلدی جلدی جواب دیا اور جھپاک سے اندر چلی گئیں۔

لیکن ذکیہ کو دولہائی کا جوتا چرانے کا بڑا ارمان تھا۔ سمدھیانے والوں کے اصرار پر دلہن کو اس کی ایک لیڈی ڈاکٹر دوست اور دوسری سہیلیاں سہارا دیکر ہال میں لائیں اور مسند پر بٹھا دیا۔ اس کا چہرا تو بھاری سہرے میں چھپا ہوا تھا۔ گٹھری سی بن کر وہ گاؤ تکیئے کے سہارے لیٹ رہی۔ اردگرد عورتوں اور بچوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ شگون کے لئے آئینہ اور قرآن شریف بھی لاکر پاس رکھ دیا گیا۔ پھر دوبارہ غل مچا اور ظفر احمد حسن کا چہرہ تمتمارہا تھا سہرے میں چھپے وقار سے چلتے اندر آکر مسند پر بیٹھے اور آہستہ سے کہا " اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو آپ اس ہنگامے میں آکر کیوں بیٹھ گئیں ؟ آپ بھی حد کرتی ہیں جائیے جاکر لیٹ رہیئے ۔"

دلہن یہ سنکر اور زیادہ دوہری ہوگئی۔ اتنے میں یاسمین اور دوسری لڑکیاں جوتا چرانے کیلئے لپکیں۔

چند منٹ پہلے ذکیہ کو باورچی خانے میں اطلاع پہنچی تھی کہ دولہا اندر آنے والا ہے، اور وہ فوراً ہال کی سمت روانہ ہونے والی ہی تھیں مگر عین اسی وقت لیڈی اعجاز ان کے پاس پہنچیں اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی ان کو زینے پر لے گئیں۔ " بیٹا کیا غضب کرتی ہو ؟ تم یہاں باورچی خانے میں گھسی بیٹھی ہو۔ اور اوپر جہیز کا سامان کھلا پڑا ہے۔ سب کی سب اتر کر دولہا کو دیکھنے چلی گئیں۔ تم فوراً جاؤ اوپر۔ ایک منٹ کو وہاں سے نہ ہلنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ غضب خدا کا ؟ بہن کے ہزاروں روپے کے زیور کھلے پڑے ہیں اور تم یوں بے پرواہ گھوم رہی ہو !"

" ابھی جاتی ہوں ممی۔" ذکیہ نے جواب دیا اور جوتا چرانے کا ارمان دل میں لئے لئے اوپر جہیز کے کمرے میں جاکر زیورات کے شوکیس کے پاس بیٹھ گئیں جس میں تیز برقی قمقمے جل رہے تھے۔ " واقعی ممی مجھے اپنے سگے عزیزوں سے زیادہ سمجھتی ہیں " انہوں نے دل میں کہا اور بیٹھی جہیز دکھاتی رہیں۔

کچھ دیر بعد رخصتی کا وقت آیا نیچے لان پر سے پولیس بینڈ کی آواز بلند ہوئی۔ ذکیہ نے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا رشتہ داروں کے جمگھٹ میں گھرا ہوا دولہا گلنار کو سہارا دیکر کار میں بٹھا رہا تھا۔ وہ اسی طرح گٹھری بنی ہوئی تھی۔ ذکیہ کو رنج تھا کہ اس وقت نیچے جاکر اپنی پیاری سہیلی کو خدا حافظ نہ کہہ سکیں مگر یہ اطمینان بھی رہا کہ اس کھڑکی میں سے رخصتی کا سارا جگ مگ کرتا نظارہ انہیں بہت اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

برات دلہن کو لیکر روانہ ہوگئی۔ ذکیہ بیگم جہیز کا کمرہ لیڈی اعجاز کی خالہ کے حوالے کرکے " کاہے کو بیاہی بدیس " گنگناتی خوش خوش نیچے اتریں اور رات کی دعوت کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

دوسرے دن، دستور کے مطابق لیڈی اعجاز نے گلنار کے سارے گنوار پتے کے زمانے کے کپڑے اسکی منہ بولی بہن ذکیہ کو دیدیئے۔

قرۃ العین حیدر

سیپ کراچی

فوٹوگرافر

موسمِ بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد دلفریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آجاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گزرتی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹوگرافر اپنا ساز و سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گمنام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقہ میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہِ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آپہنچتا ہے تو فوٹوگرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتہ ہے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لیے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹوگرافر کو اشارہ کر دیتا ہے۔ اور جب ماہِ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹوگرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔ فوٹوگرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے اور کہیں جاکر اپنی دوکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبہ کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز سفید سولا ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے جغادری عہدے دار، ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔

رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے پچھلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے۔ پھر ملک کو آزادی ملی، اِکا دُکا سیاح آنے شروع ہوئے یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا کلاکار، ایسے لوگ جو تنہائی چاہتے ہیں، ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کو جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی تھے جس کا زندگی میں وجود نہیں کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے، فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آوک جاوک جاری ہے۔ فوٹوگرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہِ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے، لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے۔ وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا، اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا" نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا، جس کا رُخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی سرخ چھتری اور اوور کوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا۔

"اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔
"اچھا۔" لڑکی دونوں چیزیں اُٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارا سا تھا۔ کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آرہے تھے جو ایک سیڑھی اُٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔
ایک بیرا لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا۔ اور دریچوں کے پردے برابر کرکے باہر چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کرکے سٹنگ روم میں آگئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتہً اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹوگرافر جو اب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا اُس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا۔ لیکن سماعت سے عاری تھا۔
کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اُٹھی تھیں۔
اس وقت تک ایک یوروپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ چند پکچر پوسٹ کارڈ اُس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔
یہ اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساری میں ملبوس ایک پُر اسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ "بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے" لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔
کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آگئے۔ نوجوان اب اُسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتہً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اُس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔
"اب سونا چاہیئے۔ تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا۔" نوجوان نے فکر سے کہا۔
"ہاں۔ شب بخیر۔" لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی۔ پیچھے گلیارے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کمرہ بے حد پرسکون خنک اور آرام دہ تھا۔ زندگی بے حد پرسکون اور آرام دہ تھی۔ لڑکی نے کپڑے تبدیل کرکے سنگھار میز کی دراز کھول کے دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سا سامنے کھڑا تھا۔
"مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اُٹھ رہی ہے۔" اُس نے کہا۔
"اچھا۔!" لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اُسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پر گر گیا۔ اُس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔
صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گلدان برآمدے سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیے گئے تھے۔ اور تازہ پھولوں کے انبار اُن کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا۔ اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پر اُڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔
"مالی نیچے کھڑا ہے۔ اُس نے یہ گلدستہ تمھیں بھجوایا ہے۔"
اُس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے ایک شگوفہ اُٹھا کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں لگا لیا۔ اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

"ایک فوٹوگرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے" اُس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمھارے متعلق دریافت کیا کہ کیا تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟" نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی۔ مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا۔ مگر اُسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یوروپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔ اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے۔ اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹوگرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری۔ اور ذرا جھک کر کہا۔

"فوٹوگراف لیڈی؟"

لڑکی نے گھڑی دیکھی۔ "ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی؟"

"لیڈی ــــ" فوٹوگرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا، اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "باہر کارزار حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دیکھیے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ ادھر آئیے!"

"بڑا لسّان فوٹوگرافر ہے۔" لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا، دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا۔ اور لپک کر ایک اور گلدستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اور اُس کا ساتھی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آرہی تھی اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کلک۔ کلک۔ تصویر اتر گئی۔

"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی۔ تھینک یو لیڈی۔ تھینک یو سَر" فوٹوگرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اُس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کُہرا گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آبیٹھے۔ نہ جانے وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے۔ اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹوگرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی جب بیرے نے اندر آکر ایک لفافہ پیش کیا۔ "فوٹوگرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے" اس نے کہا۔

"اچھا، اس سامنے والی دراز میں رکھ دو۔" لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتے کے بعد سامان باندھتے ہوئے اُسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہا اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی نیچے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹوگرافر نے پلیا پر سے اُٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے اتر گئی۔

وہ وارس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر ـــ اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی پہ بیٹھا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے، جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایرپورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آکر پھاٹک میں داخل ہوئی اس میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں۔ اور ٹھٹھک کر انھوں نے فوٹوگرافر کو دیکھا جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی۔ اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گلدان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے۔ اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے۔ نووارد خاتون درمیانی بیڈ روم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں۔ اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آکر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں۔ اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اُٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارا ابھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آکر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ پھر آکر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کو اُٹھ کر انھوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونا نظر آیا۔ جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہ سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آگیا۔ انھوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافہ میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی، جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم صم اس تصویر کو دیکھتی رہیں۔ اور پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایرپورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اُس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

"کمال ہے پندرہ برس میں کتنی بار اس سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی۔ مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔" پھر اُن کی آواز میں جھلاہٹ آگئی۔ "اور یہاں کا انتظام اتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ ہیں۔"

فوٹوگرافر نے چونک کر ان کو دیکھا، اور پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر الم سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں ـــ اُن کی تو آواز بھی بدل چکی تھی۔ چہرے پر درشتی اور سختی تھی۔ اور انداز میں چڑچڑا پن اور بے نیازی۔ اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

"میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا۔ میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کو یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے نا یہ جگہ راستہ میں پڑتی ہے۔"

"اور ـــ اور ـــ آپ کے ساتھی ـــ؟" فوٹوگرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوچ نے ہارن بجایا۔

"آپ نے کہا تھا نا کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔"

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔
"اور اُن کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ اچھا خدا حافظ۔"
خاتون نے بات ختم کی۔ اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔
والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر پھاٹک کے نزدیک جاکر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔
زندگی انسان کو کھا گئی۔
صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔

Esso
Happy Motoring!
ایسو گیسولین
ایسو ایکسٹرا موٹر آئل
ایسو معیاری سروس

بلونت سنگھ

شمع۔ دہلی

گوری چلی سسرال

ابھی ایک پہر رات باقی تھی، جب کہ دلہن کی ماں نے بھاری بھرکم ہانڈی میں دہی بلو کر نہ صرف مکھن نکال لیا، بلکہ گھی میں لَس لَس کرتے چوڑے چوڑے پراٹھے بھی تیار کر لیے۔

دلہن، کرتار کور کی نظر چاند سے ہٹ کر دالان سے پرے جا پہنچی۔ جہاں اونچی کچی دیوار کے زیر سایہ دولہا گھوڑے پر زین کس رہا تھا۔ دھندلی روشنی میں متحرک وہ بلند و بالا ہیولیٰ اسے بڑا پُر اسرار لگ رہا تھا۔ لمبی دیوار پر رکھے ہوئے اُپلے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے بیسیوں بھوسے قطار در قطار بیٹھے اونگھ رہے ہوں۔ خط دیوار کو حقارت سے نیچے چھوڑ کر دیو قامت پیپل کی شاخیں آسمان کی جانب اشارے کر رہی تھیں۔

یہ آج سے نصف صدی پہلے کا ذکر ہے، جب کہ لڑکیوں کی چھوٹی عمر میں شادیاں ہو جایا کرتی تھیں۔ کرتار کور نو برس کی تھی جب اسکی رن جودھ سنگھ سے شادی ہوئی، وہ دلہن بن کر اور ڈولی میں بیٹھ کر سسرال گئی۔ وہاں دو دن ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیل کود کر مائیکے لوٹ آئی۔ اس سے تین برس بڑا اس کا دولہا مارے شرم کے اس سے دُور دور رہا ــــ اور اب سات سال کے بعد مکلاوہ (گونا) کا موقعہ آن پہنچا تھا۔

رن جودھ سنگھ گھوڑے کو تیار کر کے لَوٹ آیا۔ وہ اونٹ کی طرح گردن اٹھائے منہ کھولے کھڑا تھا نہ جانے ناک سے سانس لے رہا تھا یا منہ سے اس کا سینہ چھاج کی طرح پھیلا ہونے پر بھی اس کے بدن میں گوشت کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ گال سپاٹ، کندھے چوڑے لیکن گوشت سے معرا، پسلیاں بھوکے بھیڑیئے کی سی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی ویران آنکھوں میں شکرے کی سی تیزی اور چمک۔

ساس نے بڑے فخر سے اپنے داماد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے پراٹھوں کے ساتھ ڈلیوں اور سہانجنے کا اچار پوٹلی میں باندھ دیا ہے۔ تم تیار ہو تو ....."

رن جودھ سنگھ نے بلندی سے پستی کی طرف جھک کر ساس کے پاؤں چھو لیے۔ آشیرواد پایا۔ بہت سے رشتہ دار اور دوسرے لوگ انھیں رخصت کرنے کیلئے وہاں جمع تھے۔ رواج کے مطابق جہیز تو سات برس پہلے دولہا کے ساتھ بھیجا جا چکا تھا، اور اب باقی سامان، کپڑے چاولوں کے لڈو، چوکور مٹھائیاں، بڑے بڑے مٹھڑے بھیجنے کا انتظام یہ تھا کہ دن چڑھے کہار بہنگیوں میں سب کچھ سنبھال کر کرتار کور کے سسرال کے گاؤں کو روانہ ہونے والے تھے۔

سب سے رخصت ہو کر رن جودھ سنگھ گھوڑے کی لگام تھام کھڑا ہو گیا۔ دلہن اور دیگر عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخوں سے ستارے لرز

اٹھے، پھر دلہن کو گھوڑے پر بٹھا دیا گیا۔ گاؤں سے دو فرلانگ پر ایک رہٹ تک رشتہ دار انھیں الوداع کہنے آتے۔
جب تپی تپتی تہارہ گئے تو رن جودھ سنگھ اُچک کر دلہن کے آگے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ جب گھوڑا دلکی چال چلا تو اس کی ٹاپوں
سے شبنم کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر کرتار کور کی گوری اور چکنی پنڈلیوں پر گرنے لگے۔ خنک ہوا کے جھونکے اس کے چہرے کی بلائیں لینے لگے۔ مٹی اور
تر و تازہ پودوں کی مہک سے اسے ہلکے ہلکے نشے کا احساس ہونے لگا۔
وہ دونوں چُپ تھے، کبھی کبھی کرتار کور رن جودھ سنگھ کی داڑھی کے بالوں میں بار بار اُلجھنے والے کانوں کے مُندروں اور اس کی
گردن میں لٹکے ہوئے کنٹھے کے سونے کے منکوں کو ایک نظر دیکھ لیتی اور کبھی اس کے موٹے سے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے لٹکتے ہوئے رنگ
برنگے پھندنے دلہن کے ابروؤں کو چومنے لگتے۔
یہ بار کا علاقہ کہلاتا تھا، سنسان اور ویران، گھنی جھاڑیوں کے پیچھے بھیڑیوں کے غول، یا چپ چاپ رینگتے ہوئے ناگ۔ کہیں کہیں
پیڑوں کے جھنڈ دُور تک پھیلے دکھائی دیتے تھے ــــ ڈھائی تین کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پیڑوں کے ایک پھیلے ہوئے جھنڈ میں
پہنچ کر رن جودھ سنگھ نے گھوڑا روک لیا اس نے ہاتھ پیچھے کی طرف گھما کر دلہن کو ایک بازو کے حلقے میں لیا اور پھر زمین پر اتار دیا۔ کرتار کور
سمجھی کہ وہ خود بھی اُترے گا لیکن جب وہ آگے بڑھنے کو آمادہ ہوا تو اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پل بھر کو شوہر کے چہرے پر گاڑ دیں، وہ
سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی تھی۔ آخر اس سنسان مقام پر اسے اکیلی چھوڑ کر وہ کہاں جا رہا تھا؟
رن جودھ سنگھ اس کی سوالیہ نظر کا مطلب سمجھ گیا۔ اور بھاری آواز میں بولا۔ میں تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔ گھبراؤ مت
اگر کوئی تمہارے زیوروں پر ہاتھ ڈالے بھی تو اسے بتا دینا کہ تم کس کی عورت ہو۔ پھر وہ تم سے کچھ نہیں کہے گا۔
کرتار کور کو اپنے اناڑی خاوند کی یہ بات جچی نہیں، لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ پاتی رن جودھ سنگھ کا گھوڑا ایک جست آگے
بڑھ گیا، اور کچھ ہی دیر میں اونچی اونچی دُھندلی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ دلہن ایک بڑے پیڑ کے بھاری تنے کے ساتھ دبک کر کھڑی
ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ آج تک رات کے اندھیرے میں بالکل اکیلی کہیں آنے جانے کا اسے کبھی
اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کے اناڑی دولہا کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کبھی کبھی سارے زیور دے کر بھی ایک خوبصورت جوان لڑکی کو اپنی
آبرو بچانا ناممکن ہو جاتا ہے ـــ کبھی جھاڑیوں میں عجیب سی سرسراہٹ کا شور سنائی دینے لگتا اور کبھی دُور سے گیدڑوں کی ہوا ہو کی پکار
اُٹھنے لگتی۔
آسمان پر دُھلے دُھلائے ستارے بڑے دلکش لگ رہے تھے اس کا جی چاہا کہ پیڑ تلے سے نکل کر کھلی جگہ میں بیٹھ جائے، لیکن
ڈر کے مارے وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ جب کبھی پیڑ پر کسی نیم خوابیدہ پرندے کی چوں چوں سنائی دیتی تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا۔
وقت گزرتا گیا!... اس کے ساتھ ہی کرتار کور کی پریشانی بڑھتی گئی۔ پھر معاً دور کا شور سنائی دیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کے شور
سے فضا گونج اٹھی۔ کرتار کور فوراً پیڑ کی اوٹ میں چُھپ گئی، وہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ گھوڑ سوار کوئی اجنبی تو نہیں تھا۔
نہیں.... وہ دولہا ہی تھا، لیکن اس کے پیچھے ایک اور آدمی بھی سوار تھا.... وہ کوئی اجنبی تھا!
رن جودھ سنگھ کو دلہن دکھائی نہ دی تو وہ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا۔ کرتار کور
پیڑ کی اوٹ سے نکل آئی۔ اس اثناء میں اجنبی زمین پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ بیوی کو صحیح سلامت دیکھ کر رن جودھ سنگھ گھوڑے سے اُترا
اور اس کی لگام ایک چھوٹے سے پیڑ کے دبلے پتلے تنے سے باندھ دی۔
نیا آدمی اگر اتنا موٹا نہ ہوتا تو رن جودھ سنگھ سے بھی زیادہ قد آور دکھائی دیتا۔ اس کا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا، اور چہرہ

چیچک کے داغوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ اس کی ناک بے ڈول بینگن کی مانند تھی، اور مونہہ کا دہانہ مینڈک طرح اس کان سے اس کان تک پھیلا ہوا تھا۔ بائیں گال پر ناک کے پاس بڑا سا کالا مسّہ تھا۔ بئے کے گھونسلے کی سی داڑھی تھی اور اس نے پگڑی کو موٹے رسّے کی طرح سر پر لپیٹ رکھا تھا۔

اجنبی کو نئے حالات سے مانوس ہونے میں کچھ وقت تو لگا، پھر اس نے دلہن پر اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد رن جودھ سنگھ کی طرف دیکھا۔ کچھ تامّل کے بعد بولا "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم مجھے پولیس کے چنگل سے اس طرح چھڑا لاؤ گے۔ تم نے سارا کام بڑی پھرتی سے کیا۔ ایک تو تم نے اپنا چہرہ پگڑی کے شملے سے ڈھانپ رکھا تھا، اور دوسرے سارا کام اتنی تیزی سے ہوا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے.... پاگورد! پاگورد! اگر ایک بار میں شہر کے تھانے میں پہنچ جاتا تو پھر بھرار ہونا ناممکن تھا۔ مجھے اسی طرح راستے ہی میں بچایا جا سکتا تھا...."

وہ بولے جا رہا تھا اور رن جودھ سنگھ چپ چاپ گھوڑے کی زین پر کہنی رکھے ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ آخر اجنبی نے ابروسے دلہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ تمہاری عورت ہے؟"

رن جودھ سنگھ نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اجنبی نے اپنی کمر سے صافی کھول کر اپنے دیسی جوتے جھاڑتے ہوئے کہا "اب کے مجھے پھانسی کے تختے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا، تم نے سچ مچ کمال کر دکھایا۔"

رن جودھ سنگھ نے جذبات سے خالی آواز میں کہا "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ جس سے میری خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہے اسے میں نے پولیس کے چنگل سے کیوں چھڑایا؟"

اجنبی نے اپنے چھدرے میلے اور بڑے بڑے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے جواب دیا "یہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا کہ تم نے میری جان بچائی ہے۔"

".... اور میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ میرے بھائی کا خون تمہاری گردن پر ہے...."

اجنبی کے چہرے پر اضمحلال کے آثار پیدا ہوئے، پھر بولا "لیکن اب تو معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے...."

"نہیں معاملہ جوں کا توں ہے۔"

اجنبی کا انگوچھے والا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ وہ گدلی آنکھوں سے رن جودھ سنگھ کی جانب دیکھنے لگا۔

رن جودھ سنگھ نے گھوڑے کی ایال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اگر تم میرے ہاتھ سے مرنے کی بجائے پھانسی پا جاتے تو میں سنسار میں کسی کو مونہہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

اجنبی کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ لمحہ بھر دم بخود رہنے کے بعد وہ بولا "دیکھو رن جودھ! عمر میں تم میرے لڑکوں کے برابر ہو۔ آج تم پہلی بار دلہن کو لا رہے ہو۔ جو ہوا سو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ چپکے سے گھر جا کر اطمینان سے رہو۔ آج سے میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے...."

اس کی بات ادھوری رہ گئی، اس نے دیکھا کہ رن جودھ سنگھ دو لاٹھیوں پر برچھیاں چڑھا رہا ہے۔

اجنبی کے کانوں پر اُگے ہوئے بال کھڑے ہو گئے اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ اس نے جذبات سے کانپتی اور کھکھلی آواز میں کہا "تم یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے ڈرتا ہوں۔ مانا، تم سینکڑوں میں ایک جوان ہو۔ لیکن میں بھی اس میدان کا گھاگ ہوں۔

کملاڑی ہوں .... اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس علاقہ میں پولیس بھی آتی ہوئی ڈرتی ہے۔ میری گرفتاری یہاں نہیں ہوتی .... ادھر سے تو وہ مجھے تھانے لے جا رہے تھے کہ رات کاٹنی پڑ گئی ـــ تم مارے گئے تو یہاں آکر تفتیش کرنے کی جرأت بھی نہ کریگا کوئی ..."

رن جودھ سنگھ چھوی چڑھی، دونوں لاٹھیاں لے کر اجنبی کے سامنے پہنچ چکا تھا "ان میں سے ایک اٹھا لو ـــ تم سے نپٹ کر میں بھلے آدمیوں کی طرح جیون بتاؤں گا، یہ جھگڑا ابھی ختم ہو جائے گا ہمیشہ کے لئے ـــ اب تو تمہارا کوئی لڑکا بھی نہیں بچا جو تمہارا بدلہ مجھ سے لے .... اور پھر اس کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا، جیسا کہ تم خود ہی کہہ چکے ہو ...."

کرتار کور کی آنکھیں سرمہ کی موٹی لکیر کے باعث اور بھی بڑی دکھائی دے رہی تھیں ـــ وہ دم بخود کھڑی تھی۔

معاً سناٹا ٹوٹ گیا۔ لاٹھی سے لاٹھی اور چھوی کے لوہے سے لوہا ٹکرانے لگا۔ ان کے تہبند ہوا میں تڑپنے لگے، ڈھیلے ڈھالے کرتے پھڑ پھڑانے لگے۔ خوابیدہ پرندے چیخ چیخ کر پیڑوں پر سے اڑ کر تاریکی میں ٹہنیوں سے ٹکرانے لگے ـ دھرتی کا سینہ دھڑک اٹھا۔

دھندلی روشنی میں ایک دوسرے پر لپکتے، جھپٹتے، بچتے، سرکتے دو سائے پرے ہٹتے ہٹتے پیڑوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چلے گئے ـــ معاً قدموں کے دھماکوں میں ان میں سے ایک زور سے کراہ کر گرا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

کرتار کور کو ایسے لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں سے جان نکل گئی ہو۔ لمحہ بھر کو اس کے دماغ میں آندھی سی آئی اور پھر وہ چھاتی کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ادھر کو بھاگی ـــ رن جودھ سنگھ اجنبی کی صافی سے اس کی چھوی اور لاٹھی کو خون کے چھینٹوں سے پاک کر رہا تھا۔ اس کی اپنی چھوی اب بھی دشمن کے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے اچھل کر باہر کو گری ہوئی آنتوں میں الجھی پڑی تھی۔ اس نے اسے بھی سافی سے صاف کیا.. . اور پھر لاٹھیوں سے چھویاں اتارتا ہوا گھوڑے کی طرف بڑھا ـ کرتار کور پیچھے پیچھے لپکی۔

پہلے کی طرح وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے تو کرتار کور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو ـــ؟"

رن جودھ سنگھ نے پیچھے بیٹھی دلہن کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "مجھے کیا ہو سکتا تھا؟ ـــ دیکھو کرتار! پھر کبھی تمہارے دماغ میں ایسا خیال بھی آیا تو ایسا چھانپٹ دوں گا کہ تمہارا منہ گھوم کر پیٹھ کی طرف جا لگے گا۔"

اس کی آواز میں غصہ نہیں تھا جھنجھلاہٹ نہیں تھی، دھمکی بھی نہیں تھی ـ اس کی آواز چھوی کی دھار کی طرح تیز تھی۔

لمحہ بھر کے بعد رن جودھ سنگھ نے گھوڑے کو ایڑ دی تو وہ بہ یک جست آگے بڑھا .... اور کرتار کور نے اپنے ہاتھی دانت اور سونے کے چوڑے والے بازو اپنے مرد کی سیدھی، چوڑی اور مضبوط کمر کے گرد حمائل کر دیئے۔

ناشر ـــــــــــــ شمس زبیری
سرورق ـــــــــــــ جمیل نقش
طباعت ـــــــــــــ ضیا برقی پریس۔ کراچی
اشاعت ـــــــــــــ مئی۔ جون ۱۹۶۷ء
مقام اشاعت ـــ کاشانۂ اردو۔ ۲/۴۔ اکبر روڈ۔ کراچی
فون نمبر ۷۰۱۵۶

مہندر ناتھ

میرے زخم

دراصل میں خود حیران تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اُرملا کو دیکھنے کے بعد میری آواز کیوں حلق میں اٹک جاتی ہے۔ جو کچھ وہ کہتی ہے اُسے کرنے پر میں کیوں مجبور ہو جاتا ہوں۔ اُرملا کو میرے گھر آئے ہوئے صرف چند دن ہوئے تھے وہ اپنی پھوپی کے ساتھ آئی تھی۔ اگر میں اپنے خدوخال کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دوں تو مجھے سمجھنے میں آپ کو بہت آسانی ہو گی۔ میری صورت دیکھ کر آپ کبھی خوش نہ ہوں گے۔ یعنی اچھا خاصا بدصورت آدمی ہوں۔ یوں میرے بتیس دانت اپنی جگہ پر ہیں۔ ناک ذرا لمبی اور نوک دار ہے۔ لیکن اتنی لمبی اور نوکیلی نہیں کہ آپ میرا مذاق اڑاتے پھریں۔ آنکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی۔ چہرہ لمبوترا۔ رنگ ذرا سیاہ سا ماتھا چھوٹا اور بال کالے کم سفید زیادہ۔ یوں میری عمر زیادہ نہیں ہے، بلکہ اسے خاندانی بیماری سمجھیے کہ میرے بال کم عمر میں ہی سفید ہو گئے۔ یوں چہرے کو دیکھ کر آپ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ لیکن مجموعی طور پر میرا چہرہ خوشگوار اثر نہیں ڈالتا۔ یوں میرا قد لانبا اور میرا اچھا خاصا ڈیل ڈول ہے۔ بھاری آواز۔ پھر بھی کیا عرض کروں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بات نہیں بنتی۔

اس بات کا مجھے علم ہے کہ میرے پیدا ہوتے ہی میری ماں مر گئی تھی۔ اور میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میرا باپ ایک حوالدار تھا۔ اُسے سوائے حکم چلانے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ بچپن میں اُس نے مجھے خوب مارا۔ اس لیے پانچویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکا۔ جب میں جوان ہوا تو سارے علاقہ میں اچھا خاصا آوارہ گرد مشہور ہو چکا تھا؛

چند لوگ اچھے کام کر کے مقبول اور مشہور ہو جاتے ہیں۔ میں نے بُرے کام کر کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات تو نہیں کہ میں شرابی کبابی یا جواری تھا۔ بس کام نہ کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ بہت کوشش کرنے پر بھی یہ عادت مجھ سے نہ چھوٹ سکی تھی۔ ذاتی مشغلہ یہ رہ گیا کہ یار دوستوں سے یا تو گپیں ہانکنا، چار مینار کے مسلسل سگریٹ پینا، گھٹیا افسانے اور ناول پڑھنا، نت نئی فلمیں دیکھنا۔ اور اگر ان سے مہلت ملتی تو ایک ہلکی پھلکی کہانی گھسیٹ لیتا۔ ایک اور بُری عادت پڑ گئی تھی، جسے کہتے ہوئے شرم سی آتی ہے۔ یعنی جب میں کسی خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ حتیٰ کہ لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور میں خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا۔

میری بدصورتی مجھ پر اس قدر غالب تھی کہ آج تک کسی لڑکی نے مجھ سے مسکرا کر بات نہ کی۔ اکثر جوان لڑکیاں مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ یوں مرنجاں مرنج قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ اپنا کام نکالنا جانتا ہوں۔ کافی بیباک اور اکھڑ ہوں۔ جب تک لوگ میری مدد کرتے ہیں، میں ان کی طرفداری کرتا ہوں۔ جونہی وہ مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں، میں بھی اُن سے منہ پھیر لیتا ہوں۔ کبھی ملاقات ہو جائے تو اُن کی اچھی خاصی خبر لیتا ہوں۔

چھوٹے بھائیوں سے روپے اُدھار لے کر اُنھیں کبھی واپس نہیں کرتا۔ اپنے گھٹیا پن کا مجھے احساس ہے۔ کیا کروں زندگی کی گاڑی بھی گھٹیا پن کے بغیر نہیں چلتی اور اس وجہ سے لوگ مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُرملا نے میری طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں اُرملا تھی لڑکی۔ ایسی لڑکی نہیں کہ انسان دیکھتے ہی اُس پر فدا ہو جائے۔ میری طرح وہ بھی اچھی خاصی بدصورت تھی۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میرے چہرے پر وہ اعضا تھے جو ایک خوبصورت انسان کے چہرے پر ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ایسا تاثر پیدا کرتے کہ دیکھتے ہی گھن آنے لگتی۔ اُرملا کے چہرے کی بھی یہی حالت تھی۔ اُرملا کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ نہ ٹیڑھی نہ بھینگی۔ سر کے بال سیاہ تھے۔ ناک مجھ سے بہتر، ہونٹ ذرا موٹے موٹے اور رنگ۔ مجھ سے زیادہ سیاہ۔ چہرا بھرا ہوا۔ جہاں تک اُرملا کے جسم کا تعلق تھا اُس میں نسوانی دل کشی کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن اگر مجموعی طور پر اُرملا پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی تو اچھی خاصی بدصورت لڑکیوں کی صف میں جگہ ملے گی۔

پہلی ملاقات میں اُرملا نے بلا کر کہا۔ "یہ لو پانچ کا نوٹ اور فلم جنگلی کے دو ٹکٹ لاؤ، جلدی"۔ اُرملا کے اندازِ بیان میں کوئی نسائیت نہ تھی، بلکہ بات کہنے کا ڈھنگ ہتلرانہ تھا۔ جو مجھے ناگوار لگا۔ میں اس وقت خاموش رہا۔ اگر اس طریقہ سے میرا کوئی ساتھی مجھ سے ہم کلام ہوتا تو پانچ روپے کا نوٹ اُس کے منہ پر دے مارتا۔ میں نے سوچا کسی لڑکی کی اس طرح بے عزتی کرنا شرافت نہیں حماقت ہوگی۔ میں نے ٹکٹ خرید کر اُرملا کو دیدیئے۔ اُس نے شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ بس ٹکٹ مجھ سے چھین لیے۔ کیا میں اُرملا کا زرخرید غلام تھا۔ کیا سمجھتی ہے وہ اپنے آپ کو۔ شاید وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ جس نے اپنوں سے بگاڑلی وہ دوسروں کی کیا پروا کرے گا۔

اگلے دن وہ کہنے لگی "ذرا ماچس لائیے بازار سے"۔ اور میں ماچس لے آیا۔ پھر کہنے لگی "چائے کا پیکٹ!" وہ بھی لے آیا۔ پھر سوئی اور دھاگے کی فرمائش کر دی۔ ایک دن تو غضب کر دیا اُرملا نے۔ کہنے لگی "وہ سلیپر اُٹھا کر لائیے"۔ کوئی اور ہوتا تو سلیپر اُٹھا کر منھ پر مارتا میں نے خاموشی سے سلیپر اُٹھا کر اُس کے پاؤں کے پاس رکھ دیے۔ میری خودداری اور عزت کہاں گئی تھی۔ شرم سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے بے شرمی کا لبادہ کیوں اوڑھ لیا۔ میں اُرملا سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ اتنے گھٹیا کام مجھ سے کیوں کرواتی ہو۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ میں ایسے گھٹیا کام کرتا ہی کیوں ہوں۔

اُرملا دس دن تک میرے گھر میں رہی اور دس دنوں تک مجھ پر ایک ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتی رہی۔ اور میں ایک غلام کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہا۔ گیارھویں دن جب وہ جانے لگی تو اُس نے میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی رعونت اور اکھڑپن تھا۔ ان آنکھوں میں کسی قسم کی نرمی نہ تھی۔ نہ شفقت، نہ پیار اور نہ ہی محبت کی کوئی ایسی خوشبو جس سے میرا دماغ معطر ہو جاتا۔ وہ آنکھیں اصرار کے انداز سے کہہ رہی تھیں "جہاں میں جا رہی ہوں تمھیں آنا پڑے گا"۔ عجیب معشوقہ سے پالا پڑا ہے۔ خالص ڈکٹیٹر ہے، کم بخت۔ میں دو سال تک اپنے گاؤں میں بھٹکتا رہا، تاکہ اُرملا کو بھلا سکوں۔

ارملا نے مجھے کیا دیا تھا کہ میں اُسے یاد کرتا۔ بس نوکروں کی طرح کام لیتی رہی۔ وہ کون سی کافرادا حسینہ تھی کہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ مجھے غصہ تو اس بات کا تھا کہ میں غلاموں کی طرح اُس کے حکم بجا لاتا رہا۔ آخر کیوں ـــ دو سال تک میں اور کوئی کام نہ کر سکا۔ بس اُرملا کے خلاف ایک محاذ بناتا رہا۔ مل جائے تو اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میرا دماغ شل ہو گیا۔ یہ کس قسم کی نفرت تھی مجھے ارملا سے .. اور کیوں! میں اُرملا کو بھول کیوں نہیں جاتا۔ اس ذہنی انتشار سے مجھے کیا ملے گا! اُسے بے عزت کر کے مجھے کون سا تمغہ ملنے والا ہے۔ اُرملا کا بدصورت چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتا۔ پھولے ہوئے نتھنے سیاہ چہرے پر موٹے موٹے ہونٹ، بیکار سی رعونت۔ طرزِ تکلم ہتلرانہ۔ کیا یہ نفرت کالا وا محبت کو جنم دے رہا تھا۔ کیا نفرت کی

کو کہ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ میں پہلے ہی بیکار تھا۔ ارملا کی محبت نے اور بیکار کر دیا۔ میں چڑچڑا سا ہو گیا۔ بات بات پر یار دوستوں سے لڑ پڑتا۔ جو لوگ میرے ہمدرد تھے اُن سے بھی جھگڑا کرتا۔ اور جب اس گاؤں میں بالکل اکیلا رہ گیا تو میں نے ارملا کے شہر کی طرف رُخ کیا تاکہ میری روح کی تشنگی مٹ سکے۔

میں بمبئی آ گیا، جہاں ارملا اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ پیشانی پر فتح مندی کے آثار نمودار ہو گئے۔ کہنے لگی "مجھے یقین تھا تم آؤ گے"۔

یہ میری زندگی کا بدترین دَور تھا۔ آٹھ سال کا عرصہ ایک بھکاری کی طرح اس شہر میں گزار دیا۔ پانچویں جماعت پاس انسان بھلا اس شہر میں کیا کر سکتا تھا۔ بس تھوڑی سی ہندی آتی تھی، اور ٹوٹی پھوٹی انگلش۔ کام کاج کے لیے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر نتیجہ صفر نکلا۔ ایک وقت کھانا کھا کے سو جاتا۔ بس انھیں دنوں اُرملا میرے کام آئی۔ وہ اکثر مجھ پر ترس کھا کے مجھے ایک دو روپے دے دیتی کبھی کبھی میرے کپڑے دھوتی۔ قمیص یا پاجامہ پھٹ جاتا تو فوراً اُسے سی دیتی۔ اور مہینے میں ایک دو فلمیں بھی دکھا دیتی۔ اور ہمیشہ مجھ سے کہتی۔ "کوئی کام کر دو"۔ جب کوئی کام نہ ملا تو میں نے دادر پوسٹ آفس کے باہر منی آرڈر لکھنے کا کام شروع کیا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہو کر لوگوں کے منی آرڈر لکھتا۔ برسات میں جب بارش ہوتی تو پوسٹ آفس کی دیوار سے لگ کر تار اور منی آرڈر لکھتا۔ یہ کیسے دن تھے۔ یہ کیسی راتیں تھیں۔ یہاں تو کوئی کسی کا نہ تھا۔ بس ایک اُرملا تھی جو وقت بے وقت دو میٹھے بول بولتی۔ اب تو حکم نہ ماننے کی بھی ہمت مجھ میں نہ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اُرملا کے ظاہری خول میں ایک تکبر، غرور اور رعونت ضرور تھی۔ لیکن اس کے دل کے اندر میرے لیے کافی جگہ تھی۔ اگر وہ مجھ سے ہمدردی نہ کرتی تو وہ میرے کپڑے ہرگز نہ دھوتی۔ ان پر استری بھی نہ کرتی۔ میرے پھٹے ہوئے کپڑوں کو اسے سینے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اُسے کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "کہیں نوکری کر لو"! جب کبھی وہ نوکری کی بات کرتی تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ نہ جانے میرا جی ایک جگہ جم کے کام کرنے کو کیوں نہیں چاہتا۔ اگر مجھے نوکری مل جائے تو میں ایک کمرہ کرایہ پہ لے سکتا ہوں۔ اُرملا میرے پاس رہ سکتی ہے۔ جو کچھ میں کماتا اس سے دو وقت کا ہی کھا سکتا تھا۔

اُرملا کے بھائی کو ہم دونوں کی ملاقاتوں کا پتہ چل گیا۔ بس پھر کیا تھا، وہ اپنی بہن پر ایسا برسا کہ ناکوں چنے چبوا دیے۔ ایک رات اُرملا کو اتنا پیٹا کہ وہ سات دنوں تک گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ بھائی نے بہن سے صاف صاف کہہ دیا۔ "اگر تم نے اس ناخلف، بے شرم آوارہ اور بیکار انسان سے بات کی تو میں تمھاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ اور اگر وہ کبھی یہاں آیا تو اس کی لاش ہی یہاں سے جائے گی"۔

جب مجھے اس مار پیٹ کی خبر ملی تو بے حد رنج ہوا۔ میں کتنا بیکار قسم کا انسان ہوں کہ ارملا کو اپنانے کے لیے کچھ کرتا نہیں۔ چند دنوں کے بعد پتہ چلا کہ اُرملا کی سگائی ہونے والی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ کس سے کہوں اپنے دل کی واردات۔ میری کون دیکھ بھال کرے گا۔ اس دنیا میں اُرملا کے سوا میرا اور کون تھا۔ مجھے ایک دو روپے روز کون دے گا۔ میرے میلے کپڑے کون دھوئے گا۔ میرے پھٹے کپڑوں کو کون سیئے گا۔ مجھے ڈھارس کون دے گا۔ مجھ سے کون کہے گا کہ "تم کہیں نوکر کیوں نہیں ہو جاتے؟" مجھ سے کون بات کرے گا۔ اب میں کہیں کا نہ رہا۔ اُرملا کے بغیر میری زندگی بیکار تھی۔ میں ارملا سے ضرور ملوں گا۔ اور کہوں گا۔ اگر تم نے کسی اور سے شادی کر لی تو میں بالکل بے سہارا ہو جاؤں گا۔ میں اُرملا کے گھر کی طرف چل دیا۔ آج اگر اُرملا کے گھر سے میری لاش نکلتی ہے، تو نکلے۔ اُس کا بھائی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو قتل کرے۔ اب تو مرنا ہی بہتر ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ شام مجھے ابھی تک یاد ہے۔ وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا اس قسم کی شام زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ جونہی اُرملا کے گھر کے قریب پہنچا کہ سامنے سے ارملا آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ میرے قریب سے گزری۔ اُس نے

میری طرف نہیں دیکھا۔ میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ بازار سے نکل کر ہم دونوں ایک جنگلے کے قریب آ گئے۔ جنگلے کے ساتھ ریل کی پٹری تھی۔

"جانتے ہو، میری منگنی ہو رہی ہے ؟"

"ہاں !"

"اب تو میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب ملنے سے کیا فائدہ ؟"

"یہ فیصلہ تمھارے بھائی نے کیا ہے۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ تمھاری زبان سے سننا چاہتا ہوں"

میں نے چار مینار کا پیکٹ جیب سے نکالا اور ایک سگریٹ سلگایا۔

"آٹھ سال سے دیکھ رہی ہوں کہ تم ایک راستے پر چلے جا رہے ہو !"

"اور وہ راستہ تمھارے گھر کی طرف جاتا ہے" میں نے زور سے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ راستہ اب بند ہو چکا ہے۔ مجھے اب شادی کرنی ہو گی۔ میرے لیے اور کوئی راستہ نہیں !"

میں نے غصّے میں آ کر جلتے ہوئے سگریٹ کو بائیں طرف کی ہتھیلی سے رگڑ کے بجھایا۔ اُرملا نے جلتے ہوئے سگریٹ کو بجھتے ہوئے دیکھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی

"میں نے سوچا تھا ان آٹھ برسوں میں تم کچھ کر لو گے"

"اور میں کچھ نہ کر سکا"

"میں نے چاہا تھا کہ تم کہیں نوکر ہو جاؤ۔ ایک کمرہ لے لو۔ پھر میں اپنے بھائی سے ......"

"میں ایک کمرہ بھی نہ لے سکا"

میں نے دوسرا سگریٹ ہتیلی پر بجھاتے ہوئے کہا۔ دو زخم ہو گئے تھے۔ میرے ہاتھ کی جلد جل رہی تھی۔

"میں نے یوں بھی سوچا تھا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ گے اور گھر واپس چلے جاؤ گے"

"اور میں تمھیں آج تک نہ بھلا سکا" میں نے تیسری سگریٹ کو ہتیلی کی پیٹھ پر بجھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا تم خودکشی کر لو گے !"

میں نے اپنا چوتھا اور پانچواں سگریٹ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتیلی کی پیٹھ پر کچلتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔ پانچ جلتے ہوئے نشان ! میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ایک اور سگریٹ سلگایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو ؟" وہ چلا کر بولی "کیوں جلا رہے ہو اپنے آپ کو ؟"

"تم ہاتھ کی بات کر رہی ہو۔ آج میں اپنے آپ کو جلا دوں گا تمھارے .... اب میری راکھ کو .... سمجھ کر اپنی مانگ میں بھر لو"

اب اُرملا سے نہ رہا گیا۔ میرا ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میرے زخموں کی طرف دیکھا جو جل رہے تھے۔ اور ان جلتے ہوئے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور آہستہ آہستہ ان بے رحم آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور میری تشنہ روح کو سیراب کرتے گئے۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے سب کچھ مل گیا ہو۔ میں نے اُرملا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اُرملا بھی میرے سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی۔ منھ سے تو کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی سپردگی نے مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری ہے۔ میرے زخموں کی طرح میری !

جان بچی سو
لاکھوں پائے!

راہ چلتے لحاظ
باہمی مفاد!

سڑکوں کے قانون

برماشیل

نقش کراچی

نوحسن بخشی

محمود جالندھری

نیا دور ۔ کراچی

دیولی کی پرچھائیاں

عام طور پر پہاڑی لوگوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اگر آپ ان سے پوچھیں۔ "کیوں جناب، کیا آپ پہاڑی ہیں؟" تو وہ برجستہ جواب دیں گے "نہیں"۔ اور پھر گردن اکڑا کر اور سر کو اوپر کی طرف جھٹک کر کہیں گے "وہ پہاڑیئے، پہاڑیئے تو وہاں اوپر رہتے ہیں۔" اگر آپ بے صبر نہیں ہونے اور اوپر پہنچ کر جب آپ دوبارہ یہی بات پوچھیں گے تو وہاں کے رہنے والے بھی آپ کو اور آگے جانے کی ترغیب دیں گے۔ لیکن اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں دیولی کے تمام باشندے اپنے آپ کو پہاڑیئے کہلوا کر خوش ہوتے تھے۔ اجنبی کو اور آگے جانے کی تلقین نہیں کرتے تھے اور بخشی تھانیدار کے کہنے کے مطابق سب ایک ہی رسّی سے لٹکائے جانے کے قابل تھے۔ بخشی تھانیدار کو وہ گاؤں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب کبھی وہ اس گاؤں میں وارد ہوتا تو کسی قتل، ڈکیتی یا اغوا کے سلسلے میں۔ اسے گاؤں کے تمام باسی ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے نظر آتے تھے۔ پرلے درجے کے جھوٹے، ٹھگنے اور گٹھے ہوئے جسم کے پہاڑئے جن کے پسینے سے بھی شراب کی بو آتی تھی۔ برسوں کے پرانے چیتھڑے ان کا لباس تھے۔ سب کی آنکھوں سے قریب قریب ایک جیسی بے حیائی جھانکتی تھی اور سب کے ہونٹوں پر ایک جیسی بے حجاب مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ مجرم کی تلاش کرتے ہوئے ایک دوسرے پر الزام دھرتا اور دوسرا تیسرے پر۔ پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ آخر کار بخشی تھانیدار اکتا کر کہتا۔ "حرام زادو! تم سب ایک ہی رسّی سے پھانسی دینے کے قابل ہو۔"

لیکن اب کے بخشی تھانیدار کو خاص دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ جب نور پور شہر میں ناجائز شراب کی بوتلیں فروخت ہوتے ہوئے پکڑی گئیں تو اس نے فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ "وہ تو مارکہ" شراب مائی رتنی اور اس کے دونوں بیٹوں بوٹے اور بلّے کی بھٹی میں کشید کی ہوئی ہیں۔ ان بوتلوں پر کوئی لیبل یا مارکہ چسپاں نہیں ہوتا تھا۔ لیکن وہ تو سونگھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ کونسی "وڈسٹلری" کا مال ہے۔ اگرچہ دیولی کے گھر گھر میں بھٹیاں تھیں اور گھر گھر ناجائز شراب نکلتی تھی۔ مگر مائی رتنی کے سوا سب کے سب چاولوں کی شراب بناتے تھے۔ مائی رتنی گڑ کی شراب تیار کرتی تھی اور بخشی تھانیدار سب کچھ جانتا تھا کہ کون کیسی شراب بیچتا ہے۔ کون کس قدر شراب پیتا ہے اور کون "بیو ملیہ" ہے۔ پہاڑ کے دامن میں واقع چھوٹے سے شہر نور پور کا وہ تھانیدار بھی تھا اور آبکاری کا داروغہ بھی۔ حاکم بھی تھا اور بنا کا سرپرست بھی۔ جب کبھی دیولی کا کوئی بیوپاری شہر میں کچھ بیچنے آتا تو وہ خود بخود اپنی آمدنی کا دسواں حصہ بخشی صاحب کی نذر کرتا تھا اور وہ بھی پیر کے مزار پر بیٹھے مجاور کی طرح اسے اپنا حق سمجھ کر قبول کر لیتا۔ لیکن مائی رتنی کا مال گھر بیٹھے بٹھائے بک جاتا تھا اسے شہر آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرنی پڑتی تھی۔

مائی رتنی کے بیٹے دِنّا اور بلّا شہتیر جیسے دراز قد اور مضبوط جوان تھے مائی رتنی کے ہاتھ میں غضب کا کمال تھا اپنے بیٹوں کو اس دنیا میں لانے سے کوئی پہلے رتنی ہی یہ ہنر اس گاؤں میں لائی تھی اس وقت وہ جوان تھی اور دتّے اور بلّے کا باپ اسے خانہ بدوشوں سے خرید کر لایا تھا۔ دیول گاؤں میں پکّی بھٹی لگا کر اس نے بنجر اور بیکار پہاڑوں پر اپنا سِکّہ تو جمایا ہی تھا لیکن ایسے گاؤں میں جہاں مائیں ٹھنگنے بچوں کو جنم دینے کے لیے مشہور تھیں اس نے وہاں دیوقد بیٹوں کو جنم دے کر تمام پہاڑیوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

رتنی کئی بار اپنے گاہکوں کو بتایا کرتی تھی کہ میرے یہاں آنے سے پہلے سارے علاقہ میں اچھی شراب سونگھنے کو بھی نہیں ملتی تھی تمام لوگ چاولوں کی پچھوٹ پیتے تھے۔ جیسے خچروں کا پیشاب ہو۔ میں کئی بار دتّے اور بلّے کے باپ سے کہا کرتی تھی چھوڑو اپنا یہ پیشہ اور شراب کی بھٹی لگالو۔ وہ سات بھائی تھے نہ جانے انھیں ڈکیتی کا کیا جنون تھا۔ چار دن نہیں گزرتے تھے اور ان کے ہاتھوں ہی کھلی ہونے لگتی تھی۔ ساتوں بھائی ڈاکہ زنی کے دوران مارے گئے۔ میں انھیں منع کیا کرتی تھی مگر وہ کسی کی نہیں مانتے تھے میں تو انھیں کئی بار کہہ چکی تھی کہ شراب کی بھٹی ہو تو کیا، "دہار پر آئی ہوئی گیتا ہے ایک بار یہ بھٹی لگالو پھر دیکھنا کتنے کس طرح اکٹھے ہوتے ہیں جب وہ ساتوں کوچ کر گئے تو یہ سب مجھے اپنانا پڑا۔" آگے سے بخشی نمانیدار ہنس کر کہتا۔ "رتنیئے بہ تو ہوا، مگر کوئی ایسا کسب بھی تھا جو تونے نہ کیا ہوا آج مائی رتنی کی بیٹھک کیتا" والے دالان میں کتنے خود بخود جمع ہو جایا کرتے تھے۔ شرابی، کبابی، بدکار، مگر کسی کی کیا مجال تھی جو رتنی کے سامنے دم بھی ہلا سکے۔ رتنی ان سب کی استاد تھی۔ ان کی ساقی تھی سب کا دل بہلاتی تھی۔ شراب بیچتی تھی اور ساتھ ہی چٹخارے دار باتیں سنایا کرتی تھی۔ جس دن بھیڑ ذرا کم ہوتی تو کوئی کہتا "کیوں رتنیئے آج کیا تیرے گاہک نہیں آئیں گے۔؟"

"آئیں گے کیوں نہیں۔ سر کے بل آئیں گے۔ جسے حاجت ہوگی سو بار آئے گا۔"

رتنی اپنے گھر کا کام کاج چھوڑ کر کاروبار سنبھالے رہتی۔ گھریلو کام کاج گوری اس کی بہو کیا کرتی تھی اور اس کے بیٹے دِنّا اور بلّا گھریلو کاموں کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھے وہ یا تو دن بھر چھبرے سان پر چڑھاتے رہتے۔ چھریوں اور گنڈاسوں کی دھار تیز کرتے رہتے تھے۔ یا پھر پہاڑی پر اپنے باپ کی موروثی زمین میں کدال سے چھوٹی چھوٹی کیاریاں بناتے رہتے۔ ان کھیتوں کی ترتیب روز بروز سیڑھی کی شکل اختیار کرتی ہوئی اوپر ہی اوپر چلی جا رہی تھی شاید ان کا خیال تھا کہ یونہی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کسی روز شیو مہاراج کی دھونی تک پہنچ جائیں گے اور پھر ان سے پوچھیں گے۔ "کیوں حضور کیا آپ بھی پہاڑیئے ہیں؟"

ہر روز جب سورج دیوتا کا رستہ دیول گاؤں کے قریب سے گزرتا تو دتّا اور بلّا شیو جی مہاراج تک پہنچنے والی سیڑھیاں تراشنے میں مصروف ہوتے۔ سورج دیوتا کو تھوڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ "یہ چھوکرے تو میری کرنوں سے بھی زیادہ تیز طرار ہیں۔" اور پھر سورج دیوتا کافی دیر تک اپنی کرنیں ان چھوکروں پر نچھاور کرتا رہتا۔ جیسے ان کا حوصلہ اور دم دیکھ کر کہہ رہا ہو۔ "شیو تو کیلاش پربت پر آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے۔ اگر تم یونہی جٹے رہے تو ایک دن مجھ تک پہنچنے والی سیڑھیاں بھی تعمیر کر لو گے۔ نہ بھئی یوں نہ کرو۔ میں چلا۔" اور سورج دیوتا فوراً پہاڑی کی اوٹ میں منہ چھپا لیتا۔

اسی وقت گوری کا اُجلا مُکھڑا پہاڑی کی اوٹ سے نمودار ہوتا اور دتّے اور بلّے کے کھیتوں میں قدم قدم پر سرو کے بوٹے اُگ پڑتے گوری ان کے لیے دال بھات لے کر آئی تھی صدیوں کی گوری جو ریاضت میں محو شیو جی مہاراج کے لیے سوانگ گھونٹ کر لایا کرتی تھی دانجھے کے لیے کھیت میں چوری لاتی رہی تھی اور آج وہی گوری بلّے کے لیے دال بھات لائی تھی کل دتّے کے لیے لائے گی۔

گوری مائی رتنی کی بہو تھی وہ ابھی چھوٹی سی تھی جب رتنی نے شاید اسے بھی دیگر مال کی طرح کسی خانہ بدوش سے خریدا تھا وہ دتّے کی دلہن تھی یا بلّے کی اس بات کا تو اسے بھی پتہ نہیں تھا لیکن اسے دونوں اچھے لگتے تھے رتنی اسے اپنے بیٹوں سے بھی

پڑھ کر پیار کرتی تھی گوری میں اسے اپنا بچپن نظر آتا تھا اور اپنی ساری کی ساری جوانی دکھائی دیتی تھی۔ گوری اس کا گزرا ہوا شباب تھی جس نے اس کو بے پناہ محبت تھی آنے والا زمانہ گوری کے لئے اپنی جھولی میں کیا رکھتا تھا۔ گوری اس بات سے بے خبر تھی، مگر رتنی جانتی تھی کہ اس کی بہو گوری رتنی کبھی نہیں بن سکے گی اس لئے شاید اس نے گوری کو اپنے دھندے سے محفوظ رکھا تھا گوری تو پھر گوری تھی اس نے ابھی تک اپنے بیٹوں کو بھی وہ گر نہیں سکھایا تھا جس کی بدولت وہ سارے گاؤں میں استاد مانی جاتی تھی مگر کبھی کبھی رتنی اپنے بیٹوں کو سمجھایا کرتی تھی۔ "دیکھو نا تم دن بھر مٹی میں لت پت رہتے ہو۔ تم دھرتی سے جان لڑاتے رہتے ہو اور یہ گوری تم سے جان لڑاتی رہتی ہے۔ تم دھرتی کو سنوارتے اور نکھارتے رہتے ہو۔ اس کی خاطر تواضع کرتے ہو۔ اس لئے میں بھی گوری پر قربان ہو جاتی ہوں دراصل دھرتی اور عورت دونوں معصوم ہوتی ہیں۔" کئی بار رتنی گوری کو بھی ہدایت کیا کرتی تھی "بیٹا دھرتی وہی اچھی ہوتی ہے جو مالک کو ڈھیروں فصل دے جس سے مالک خوش رہیں۔" اور گوری سوچتی تھی کہ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اس سے اب تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تھا جس سے اس کے مالک اس سے ناراض ہو جائیں بہت دنوں کی بات ہے جب گوری نے کسی کے پھسلانے پر رتنی سے پوچھا "ماں لے ساس، ان دونوں میں سے میرا خاوند کون ہے؟" رتنی نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ "ہائے ہائے ری، تجھے موت آ جائے۔ تجھے شرم نہیں آئی یہ بات پوچھتے ہوئے، کیا شرم دھو کر پی لی ہے رنی۔ دونوں بھائیوں میں پھوٹ ڈالنے لگی ہے اری ابھی تو تجھے اس گھر میں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور تیری یہ ہمت۔ تو یہ سوال پوچھ رہی ہے ہائے رے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ اری بلّے اور دتے کے باپ کے سات بھائی تھے۔ میرے یہ بال سفید ہو گئے ہیں میرے دل میں تو آج تک ایسا گمان نہیں گذرا۔"

اس کے بعد "بوڑھی بچا بچاں" رتنی نے گوری کی وہ خبر لی تھی کہ وہ دن اور یہ دن گوری پھر ایسا سوال کبھی زبان پر نہ لائی اور اب تو اس نے اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ یہ گر بھی مائی رتنی ہی کا بتایا ہوا تھا۔ وہ کہا کرتی۔ "ایک بار مجھ سے جس کی مڈبھیڑ ہو جائے میں اس کا پتہ مار کر رکھ دیتی ہوں۔ پہلے میں نے اس خانہ بدوش لڑکے کا پتّہ مارا تھا جس نے مجھے شراب نکالنے کا ہنر سکھایا تھا۔ پھر دتے اور بلّے کے باپ کا۔ اس کے ساتوں بھائیوں کا۔ کیا مجال جو ساتوں بھائیوں نے مجھ پر انگلی اٹھائی بھی ہو۔ اور پھر جب انھوں نے جب ڈکیتی کا دھندا شروع کیا اور میری ایک نہ سنی تو سارا گھر سال بھر میں تباہ ہو گیا۔" اور پھر وہ پینترا بدل کر کہتی۔ "گوری میں نے بہت جھک ماری ہے بڑے بھلے سے نباہ کرتی رہی ہوں۔ مگر اب میرے بدن میں جان نہیں رہی۔ میں نے آج تک اپنے بیٹوں کو اپنی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ لیکن اب ان لڑکوں کا پتّہ تو ہی مار سکتی ہے۔ ورنہ یہ تیری آنکھوں میں دھول جھونک کر کہیں چلے جائیں گے اور تو سر پیٹ کر روئے گی۔ میری زندگی تو بیت چکی ہے۔ مگر تیرے سامنے پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے سن تجھے بھید کی ایک بات بتاؤں۔ جیسے بھی ہو آدم کے بیٹے پر کاٹھی ڈال کے رکھیو۔ اس اڑیل ٹٹو پر اماں حوا کی بیٹی ہی کاٹھی ڈال سکتی ہے۔"

ایک طرف رتنی کا طویل تجربہ بول رہا تھا اور دوسری طرف گوری کی متجسس جوانی سن رہی تھی اسے گرہ میں باندھ رہی تھی اور رتنی کے نزدیک اب گوری دھیرے دھیرے اماں حوا کی سگھڑ، سیانی بیٹی بنتی جا رہی تھی۔

•

نور پور سے دیلی جانے والی پگڈنڈی در اصل ایک ہی تھی۔ مگر دور سے دیکھو تو وہ پگڈنڈی بہت سی پگڈنڈیوں کا مجموعہ نظر آتی تھی خمدار، پُر پیچ، شیطان کی آنتوں کی طرح پھیلی ہوئی۔ نور پور سے چڑھائی شروع ہو جاتی تھی اور دور سے دیلی کی گھاٹیاں نظر آتی تھیں جیسے وہ ایک گھنے پیڑ کا تنا ہو اور اس کے ارد گرد لپٹی ہوئی۔ پگڈنڈی ایک امر بیل تھی جو جنگلی درختوں کو اپنی آغوش میں لئے رہتی ہے دن بھر ڈھیروں ڈھیر بھیڑیں ممیاتی ہوئی بکریاں اس پر سے گزرتی رہتی تھیں۔ جن پر مسافروں کا سامان لدا ہوا ہوتا تھا۔ دیلی سے آگے

ایک دو گھاٹیاں پار کرکے ایک وادی راستے میں پڑتی تھی جہاں شیوجی کا مندر تھا سال بھر میں ایک بار یہاں میلہ لگتا جب یاتریوں کا ہجوم چیونٹیوں کے قافلے کی طرح نور پور کی پگڈنڈی پر چل پڑتا تھا۔ دن رات نرسنگھے گونجتے رہتے سنکھ پھونکے جاتے اور خچروں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بجتی رہتیں۔ شیو کی تعریف میں گیت گاتے ہوئے یاتری گزرتے رہتے اور دیوی کی بھینٹ ٹھنڈی پڑ جاتیں ان دنوں دیولی کے باشندے اپنے گناہ بخشواتے اور ان کی گذر بسر یاتریوں کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کی بدولت ہوتی رہتی۔

مگر کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر بھی ادھر سے گزرتا تھا جو اپنا سب کچھ دان کر دیتا اور اپنا تن آرے سے کٹوانے کے لئے بھینٹ کر دیتا۔ اسے وہ "کردت لینا"، "آرے سے تن چیرانا"، کہا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے جس انسان نے اپنی زندگی میں گناہ کیا ہو وہ اگر "کردت" لے لے تو سیدھا سورگ (جنت) میں جاتا ہے۔ ایسا آدمی سب سے پہلے تمام تیرتھ استھانوں کی یاترا کرتا اور پھر آخر کار کاشی میں اسے مکتی (نجات) ملتی۔ جب کبھی کوئی ایسا یاتری شیوجی کے مندر میں آتا تو زور زور سے ڈھول تاشے بج اٹھتے۔ یاتری کے تلک لگایا جاتا اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور نرسنگھے سے ساری گھاٹی گونج اٹھتی۔

اس وقت گوری کا سینہ دھڑکنے لگتا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس پگڈنڈی کو پار کر لیتی جیسے کوئی گلہری درختوں کی شاخوں میں پھدک رہی ہو۔

لیکن گوری کا سینہ تو اس روز بھی دھڑکتا تھا جب اسے شہر جانا ہوتا تھا اس روز وہ صبح ہی سے ہار سنگھار کرنے لگتی۔ دنداسے سے اپنے دانت چمکاتی اور ہونٹوں کو لال سرخ کر لیتی دنبالہ سرمہ ڈالتی اور دھندلے سے آئینے کے سامنے بیٹھ کر جو اس نے کسی خانہ بدوش سے خریدا تھا اپنی زلفیں سنوارنے لگتی۔ بعض اس گھڑی نرسنگھے کی گرج کی طرح رتنی کے قہر آلود کوسنے کچے کوٹھے کی چھت تلے گونج اٹھتے — "اب بس بھی کر چھنال، شہر میں سودا سلف لینے جا رہی ہے اپنے کو بیچنے تو نہیں ..."

اور گوری کا جی چاہتا اس سے کہے "رہنے دے، میریاں کریں نکڑائیاں اپنے دن بھول گئی ماں۔ ساس ری ساس تو مجھ سے حسد کر رہی ہے اور تجھے اپنے دن بھول گئے"، لیکن وہ خاموش رہتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ شہر اپنے کو بیچنے نہیں جا رہی تھی لیکن پھر بھی جب وہ شہر سے واپس آئے گی تو رتنی کی نظروں میں اس کی قیمت اور بھی بڑھ جائے گی۔

حسن اسے خدا نے دیا تھا اور بناؤ سنگھار کے داؤ اسے مائی رتنی نے سکھائے تھے جب وہ چلتی تھی تو ایک گڑیا نظر آتی تھی۔ ایک بار تو دیکھنے والا دل تھام کر رہ جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔

ہاں اس گڑیا کے ساتھ دتا اور بلا ضرور جایا کرتے تھے۔ دونوں میں سے جسے ماں حکم دیتی وہ صبح سویرے ہی نہانے کے لئے چل کھڑا ہوتا اور تیزی سے اپنے بال سنوارنے لگتا جس میں سرسوں کا تیل دور سے تلوار کی دھار کی طرح چمکتا اور بو چھوڑتا۔ گوری فوراً بھانپ جاتی کہ آج بتے کی باری ہے کہ دتے کی۔ اس کے بعد وہ دھلا ہوا تہمد باندھ کر باہر آتا۔ اس کے گلے میں کالی واسکٹ بہت ہی زیب دیتی جس کے رنگین بٹن مائی رتنی نے خانہ بدوش پھیری والے سے ایک ایک کرکے نظر بچا کر کھسکا لئے تھے۔ مائی رتنی کے بیٹے ان کی اولاد تھوڑے ہی تھے وہ تو دیوتے تھے دیو۔ جو شے بھی سامنے آتی۔ اس پر بھوکے بھیڑیے کی طرح ٹوٹ پڑتے۔ چاہے وہ رتنی ہو یا اس کی بہو گوری۔ اسی لئے تو رتنی گوری کو خاص طور پر سمجھا بجھا کر بھیجا کرتی تھی۔ اس بدمست سانڈ کا خاص خیال رکھنا، شہر میں کوئی بدمستی نہ کرے۔ لیکن مائی رتنی کے بیٹے ہوں اور کوئی فتنہ نہ جگائیں۔ پھر شہر تو ابھی بہت دور تھا اور سامنے سات میل کا شہر تھا۔ گھر سے نکلتے ہی گوری کی شامت آ جاتی گوری بھی کسی سے کیا کم تھی اس کے ہاتھ پاؤں میں بھی بجلی کی سی تیزی اور طراری تھی۔ چاہے بلا ہو یا دتا۔ ضد تو ضرور کریں گے۔

"تو آگے آگے چل میں تیرے پیچھے آؤں گا۔"

"نہیں، ماں نے کہا تھا اسے نگاہ میں رکھنا۔ اس لیے تو آگے آگے چل۔"

تیری تیسری آنکھ تو تیرے پیچھے چوٹی میں بھی لگی ہوئی ہے۔" بیرن۔

گوری کے پاس تیسری آنکھ تھی یا نہیں مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہ آگے بڑھی نہیں اور اس مائی کے لال نے کوئی حرکت کی نہیں۔ یک بیک گوری کی چیخ اس کے ہونٹوں میں دب کر بھی ساتھ کی پر پیچ پہاڑیوں کا سینہ چیر کر رکھ دیتی جیسے کچی شراب کی بو ہانڈی پر ڈھکن رکھے رکھے بھی دور تک اڑ جاتی ہے۔

"او ئی ماں!"

"اب بلالے اپنی ماں کو۔"

اور راستہ بھر ایسی ہی کلیلیں ہوتی رہتیں۔ یوں ہاتھا پائی سے بمشکل مسافت طے ہوتی تھی۔ گوری جانتی تھی کہ یہ مسافت تو دیگ میں چاول کے ایک دانہ کے مترادف تھی اس کی زندگی کی منزل ابھی بہت دور تھی اور منزل تک پہنچنے کیلئے اسے اس دشوار گزار راستہ سے بھی کئی بار گزرنا پڑیگا شہر سے واپسی پر گوری کو کچھ آسانی رہتی تھی وہ اکثر بھاری گٹھڑی ان اڑیل ٹٹوؤں پر لاد دیتی اور خود بڑے آرام سے باز و ہلاتے ہوئے چلتی۔

عام یاتریوں کے لئے دیولی کی گھاٹی پر چڑھنا دشوار تھا۔ انھیں خچروں کا سہارا لینا پڑتا۔ مگر پھر بھی پیاس سے ان کے حلق میں کانٹے پڑ جاتے زبان سوکھ جاتی اور بار بار تالو سے چمٹ جاتی مائی رتی کے بیٹے خچروں سے کم نہیں تھے ہاں اگر گوری کو پیاس لگتی تو وہ نور پور سے خریدی ہوئی پہاڑی ناشپاتیاں کھانے لگتی۔ بھوک لگتی تو گوری الوک کھاتی جو اسے بہت پسند تھے اس وقت وہ بہت خوش ہوتی اور بلبل کی طرح چہچہاتی۔ ایسے میں بلے اور دتے کو کوئی نازیبا حرکت کرنے کا نیاں تک نہ آتا اور وہ نیک لڑکوں کی طرح خاموش چلتے رہتے گوری کو ان پر ترس آجاتا۔ وہ اپنے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بلے یا دتے کی طرف مڑ کر دیکھتی اور پیار سے چھوٹی ناشپاتی ان کے منہ میں ڈال دیتی وہ دیر تک اسے چپڑ چپڑ کھاتا رہتا گوری کو یہ چپڑ چپڑ بہت اچھی لگتی تھی۔ جیسے کوئی پلا اپنی ماں کے تھن چوس رہا ہو۔ یہ سوچ کر اس کی ہنسی نکل جاتی۔

نور پور اور دیولی کے درمیان ایک ایسا مقام آتا تھا جہاں ہر ایک مسافر تھوڑی دیر کے لیے سستایا کرتا تھا۔ اس مقام کو "پریاں دا کھوہ" (پریوں کا کنواں) کہا جاتا تھا۔ ویسے وہاں نہ کنواں تھا اور نہ پریاں۔ ہاں ایک چشمہ ضرور تھا جو ترل ترل ترل کرتا ہوا بہتا تھا۔ جیسے پریاں ہنس رہی ہوں اور اس کے ارد گرد گھنے پہاڑی پیڑ تھے۔ جیسے پریاں جھرمٹ باندھ کر رقص کر رہی ہوں گرمیوں میں مسافر ان پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں ٹھہر کر سستاتے اور تازہ دم ہوا کرتے تھے۔

جب دتے یا بلے کے ساتھ گوری اس مقام پر پہنچتی تو وہ بھی کچھ دیر کے لئے یہاں رک جایا کرتے تھے۔

وہ اپنی بوجھل گٹھڑی نیچے رکھ دیتا۔ اگر دتا ہوتا تو وہ دوڑ کر چشمہ پر پہنچتا اور مویشیوں کی طرح اوندھے منہ ہو کر چپڑ چپڑ پانی پینے لگتا۔ اس کی چوڑی پیٹھ کے مضبوط پٹھے دمکتے رہتے اگر بلا ہوتا تو وہ اوک سے پانی کم پیتا گراتا زیادہ۔ اس کی اوک بھی کچھ ایسی ہی کا بوکا" (چمڑے کا ڈول) پھر گوری کی باری آتی۔

وہ بار بار مل کر اپنا منہ دھوتی اور بہتے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھتی۔ ہر بار اسے یاد آتا کہ جب پانی میں آدمی کو اپنا عکس نظر نہ آئے تو جان لو کہ اس کی موت کے دن نزدیک آگئے۔ پھر وہ پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتی۔ رستہ ہی ساتھ پاؤں

ہلاتی رہتی اور اپنے تھیلے میں سے "کپڑے ، بھنگ وغیرہ" نکال کر کھاتی رہتی ۔ دتا ہو یا بلا دونوں ہی ایک ہی مٹی کے ڈھلے ہوئے تھے پہلے تو وہ اس کی دودھیا پنڈلیوں کی طرف دیکھتے رہتے جن سے چشمہ کا پانی چھو رہا ہوتا ۔ انھیں اس کی پنڈلیاں سلفہ کی دو لاٹیں نظر آتیں ۔ اور پھر گوری کو اچانک یہ محسوس ہوتا کہ پانی میں اس کے نکھرے ہوئے عکس پر کسی دیو کا سایہ پڑ رہا ہے اسے اپنا عکس نظر آنا بند ہو جاتا موت کے چنگل سے جب گوری کی جان بچتی تو اندھیرا اور بھی گھنا ہو جاتا ۔ دتا اور بلا اپنی بوجھل گٹھڑی اٹھا کر یوں بھاگتے جیسے وہ پھول کی طرح ہلکی ہو گئی ہو تھکی ہاری گوری پیچھے رہ جاتی اسے یک لخت یہ احساس ہوتا کہ اس کی تمام رنگین چوڑیاں ٹوٹ گئی ہیں جنھیں اس نے نور پور کے بڑے بازار میں منیہار سے جھگڑ جھگڑ کر چڑھوایا تھا دیولی کی اونچی گھاٹی کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ جو گوری صبح گڑیا بن کر نہر گئی تھی کیا یہ وہی گوری ہے ؟ اور اب قسمت کے طاقت ور ہاتھوں نے برسوں کا تجربہ اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا ۔ اس کی کمر اس کے بوجھ سے دوہری ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر جھریوں کا جال تن گیا تھا ۔

اور بوڑھی بچا چاں رتنی کو گوری کی اس درگت کا جیسے پہلے ہی سے علم ہوتا ۔ وہ دل ہی دل میں مسکراتی ۔ اس کا باطن گوری کی تعریف سے لبریز ہو جاتا وہ اسے اس حالت میں اور بھی پیاری لگتی ۔ سگھڑ سیانی بہو رانی ۔

ساری دیولی کو علم تھا کہ بخشی تھانیدار سے رتنی کی گہری چھنتی تھی ۔ اس نے ضرور بخشی تھانیدار کا پتہ مار دیا ہوگا ۔ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ دتے اور بلے کے بزرگوں کی خاندانی ڈاکہ زنی کا بھید اسی بوڑھی بچا چاں نے پولیس کو بتایا تھا جس سے سارا کنبہ تباہ ہو گیا تھا ۔ اسی لئے رتنی کھلے خزانے ناجائز شراب کشید کرتی تھی اور خم ٹھونک کر بیچتی تھی پھر بھی سارے گاؤں میں کہرام بپا ہو گیا ۔ جب بخشی تھانیدار پولیس کی گارد لے کر دگڑ دگڑ دیولی کی گلیاں پار کرتا ہوا بوڑھی رتنی کے دروازے کے ــــــــ آگے جا کھڑا ہوا ۔ اس وقت رتنی کا کوئی بیٹا گھر پر موجود نہ تھا ۔ یہ ایک انہونی بات تھی چونکہ وہ اپنے بیٹوں کو باری باری کام سے بھیجتی تھی جب پولیس آئی تو اس گھڑی رتنی اور اس کی بہو کوٹھے پر مٹکوں کو اوندھا رہی تھی عین اس وقت سپاہیوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا ۔ پھر بخشی تھانیدار ادھر ادھر جھانک کر اس کے گھر میں داخل ہوا ۔

"بھئی واہ ــ چور تو چوری چھپے گھروں میں داخل ہوتے ہیں لیکن پولس نے یہ پیشہ کب سے اختیار کیا ہے ؟"

"جب سے تیرے بیٹوں نے نور پور میں شراب بیچنی شروع کی ہے ــ اے بڑھیا !"

"نہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا کسی دشمن نے یہ ہوائی اڑائی ہے"

"اچھا ذرا اپنے لاڈلوں کو تو بلوا ۔"

"میرے بیٹوں کو تو اتنی خبر بھی نہیں کہ میں شراب نکالتی ہوں یا نہیں ۔"

"ہاں ، ہاں تیرے بیٹوں کو تو یہ خبر بھی نہیں ہوگی کہ وہ تیرے بیٹے بھی ہیں یا نہیں نا ۔"

"ٹھیک ہے ــ وہ تو دن بھر کھیتی کرتے ہیں ۔ اب بھی جا کے دیکھ لو ۔ بلا تو پڑوس کے گاؤں میں رہٹ کا بوکا" مرمت کرانے گیا ہے اور دتہ ــ"

"اور دتہ کل شہر گیا تھا ۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟"

اور رتنی کی آنکھوں تلے جیسے یک بیک اندھیرا چھا گیا ۔ پھر اس نے پلک جھپکتے ہوئے اپنی بہو کی طرف دیکھا ۔ یوں جیسے بہتے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی ہو ۔ مگر رتنی کو پہلی بار محسوس ہوا جیسے پانی میں اس کا عکس غائب تھا ۔ گوری اس سے

آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی۔ ٹھیک ہے۔"

اپنے بیٹوں کو ذرا اور سمجھنے کی کوشش کر بڑھیا۔ تیرے بیٹوں کی انٹی میں ایک طرف چاقو ہوتا ہے دوسری طرف شراب کی بوتل مگر رتنی تھی کہ پھول پر پانی نہیں پڑنے دے رہی تھی اور تھانیدار تھا کہ اسے بے نقاب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ تھانیدار ایک بات کہتا تو رتنی آگے سے اُسے سو باتیں سناتی۔ ہار کر اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا "اس بڑھی چھاچھال کو فرش پر چت لٹا دو اور اس کے منہ میں لگام دے دو۔ کس طرح چپڑ چپڑ باتیں بنا رہی ہے۔"

اتنے میں باہر ہلچل ہوئی۔ یوں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ یا پھر کیلاش پربت پر شیو جی مہاراج نے تانڈو ناچ کے لئے پاؤں اٹھایا ہو۔ نہیں یہ بھونچال نہیں تھا۔ یہ تو مائی رتنی کے بیٹے تھے۔ دتہ اور بلا۔ کڑیل جوان جنھیں سپاہی مشکیں باندھ کر لائے تھے کبھی کبھی وہ ایسا ہنگامہ برپا کرتے تھے جیسے کوئی نو عمر بھوت کسی سیانے کے سونٹے کے سامنے ناچتا ہے۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر گودڑ اور رتنی کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سپاہیوں نے گھر کے کونے کونے کی تلاشی لی۔ مٹکے، مٹکیاں، کڑاہے کڑاہیاں چھلنیاں۔

بخشی تھانیدار نے ایک ایک چیز کی تفصیلات قلمبند کیں رتنی کی ڈسٹلری کی شراب کے نمونے شیشیوں میں بند کئے گئے۔ رتنی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے بخشی تھانیدار سے الگ ہو کر بات چیت کی۔ مگر بے سود بخشی کے سر پر تو آج بھوت سوار تھا۔ اس نے ایک نہ سنی ایک نہ مانی۔ شاید حکام بالا نے اسے خاص ہدایت دے کر بھیجا تھا۔

"میں اس گاؤں کی ایک ایک چلتی بھٹی بند نہ کرادوں تو میرا نام بخشی نہیں۔ میں تم سب کی کھال نہ اتروا دوں تو کہنا حرامزدو تم سب ایک ہی رسی سے لٹکانے کے قابل ہو۔"

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بخشی آج تہیہ کر کے آیا تھا۔ جب گاؤں میں مائی رتنی کی سب سے بڑی بھٹی بخشی تھانیدار کی ٹھوکروں سے ٹوٹ گئی تو باقی بھٹیوں کا کیا تھا سب نے خوف کے مارے اپنے مٹکے توڑنے شروع کر دیئے۔ شراب بہانی شروع کر دی سارے گاؤں کو خوفزدہ کرنے کے بعد بخشی اور سپاہی گاؤں میں یوں گھومنے لگے جیسے تحصیل میں سرکاری سانڈ گھومتے ہیں۔

گھومتے گھومتے جب ایک سپاہی کی نظر گاؤں کے ایک گھر کی عورت پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ اس عورت کے ہاتھ میں کوئی لوٹا تھا۔ سپاہی کو دیکھ کر وہ فوراً دالان میں بیٹھ گئی جیسے رفع حاجت کے بعد ہاتھ دھو رہی ہو۔ سپاہی ہنستا ہوا پیچھے مڑ گیا۔ جب اس نے یہ بات بخشی تھانیدار کو سنائی تو ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"وہ بڑی چالاک عورت تھی۔" یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگاتا۔

"تو نے کیا کیا؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"جی، میں واپس چلا آیا۔"

"تف ہے تجھ پر۔"

سارا گاؤں کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

سارے گاؤں میں ہر طرف شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ شراب تھی کہ گلیوں میں بہہ رہی تھی جیسے پریوں کے کنوئیں والا پانی کی جگہ شراب انڈیل رہا ہو۔ شراب جس کے لئے دیوتا اور راکشش آپس میں لڑے تھے۔ لہر کی بڑی بہن اور امرت کی چھوٹی بہن کشید کرنا تو دیولی کا قدیم پیشہ تھا۔ اسی لئے تو اس گاؤں کو دیولی کہتے تھے۔ دیو، راکشش، اور دیو، دیوتا، راکششوں اور دیوتا کی دیولی۔

تیرا سارے گاؤں کا۔ دیکھتے دیکھتے پولس مائی رتنی اور اس کے دونوں بیٹوں کو پکڑ کر لے چلی۔ گوری خاموش بافتہ کھڑی تھی اس کی آنکھوں سے بے بسی جھانک رہی تھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکتی تھی زندگی میں آج پہلی بار دتا اور بلا گوری کے سامنے بے بس کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں پشیمانی کے آنسو تھے رتنی اپنے بیٹوں کی یہ حالت دیکھ کر گرجی "یہ کیا ہے؟ کیا کبھی شیروں کے بیٹے بھی رویا کرتے ہیں؟ میرے بچو! تمہیں شیرنی نے جنم دیا ہے کتیا یا سورنی نے نہیں۔ کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔" اس کے بعد وہ گوری سے بغلگیر ہو گئی۔ دونوں دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ جیسے کوئی کنواری پہلی بار اپنے باپ کے گھر سے جاتی ہے۔ مگر دونوں کو معلوم تھا کہ باپ کا گھر چھوڑنے ہوئے دونوں نے آنسو نہیں بہائے تھے ان کا بیاہ تھوڑا ہی ہوا تھا دونوں فروخت ہوئیں تھیں اور پھر رتنی نے گوری کی پیٹھ ٹھونکی اور پیار سے اس کے کان میں کچھ کہا۔

دتے اور بلے کو یوں محسوس ہوا جیسے گوری نے ان کی ماں کی بات سن کر گرہ میں باندھ لی ہو مزار کے پیر کا تبرک سمجھ کر۔ پھر رتنی ان کو نہ دیکھ سکی اس کا سر ٹکرا گیا اور وہ اپنے دروازے کی دہلیز پر گر پڑی۔ دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ دونوں بہت دور جا چکے تھے۔ اس نے دیکھا۔ دیوتا بھی راکششوں کو کھینچ رہے تھے اور راکشش کبھی دیوتاؤں کو گھسیٹ رہے تھے۔

"راتاں کالیاں کلّی نوں ڈر آوے۔
چھیتی لے کے آجا مترا۔"

(راتیں بہت تاریک ہیں، اکیلی کو ڈر لگتا ہے۔ جلدی لے کر آجا میرے بالم۔)

لیکن گوری کے بالموں تک اس کی یہ فریاد نہیں پہنچ سکتی تھی کوٹھری میں قید دونوں بھائیوں کو روز پیٹا جاتا اور وہ اپنی "مینا" کے چھپوں سے زیادہ بخشی تھانیدار کی گالیاں سنا کرتے۔ وہ قلعہ کے اندر پنجرے میں بند ایک طوطے کی طرح بنتے جیسے کوئی جان اس مینا میں تھی جو دیولی میں پل پل دم توڑ رہی تھی۔

وہ ہر گھڑی اپنے گھر کی دہلیز میں کھڑی رہتی اس کی نظریں نور پور کی پگڈنڈی پر جمی رہتیں۔ یہاں سے کوئی اکا دکا راہگیر گزر رہا ہوتا پھر خبریں ہوتیں۔ جوڑے میں جوڑ میں ڈھنیچوں ڈھنیچوں کرتی چڑھتی ہوئی نظر آتیں ٹکٹکی باندھے ہوئے جب اس کی نگاہیں تھک جاتیں۔ گردن دکھنے لگتی تو وہ افسردگی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ دوسری طرف اسے دتے اور بلے کی ویران کھیتیاں دکھائی دیتیں۔ جو ان کی کڑی محنت کی منتظر تھیں۔ مگر یہ کھیتیاں اسے پہچانتی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر ہنس رہی تھیں دھند اور کہر میں سے اس کو اشارہ کرتی تھیں اور اسے آنکھ مارتی تھیں۔

اور پھر یہ دھند دھیرے دھیرے اوپر اٹھنے لگتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے پاربتی دھوئیں کی چادر لپیٹ کر دتے اور بلے کی تراشی ہوئی سیڑھیوں پر قدم رکھتی اوپر اوپر ہی چڑھ رہی ہو۔ ضرور وہ اپنے شیو سے ملنے جا رہی تھی وہ شیو بھولے بھنڈاری کے لئے سرور بھنگ گھونٹ کر لائی ہوگی۔ اور شیو پاربتی کے اس نذرانے پر ریجھ جائیں گے۔ پاربتی بھی تو ایک عورت ہی تھی۔ عورت کی محنت مرد کی محنت سے عظیم ہوتی ہے۔ مگر اس کا شیو کہاں تھا؟

یک بہ یک، اس کے سامنے دتے اور بلے کے چہرے ابھر آئے۔ دتا اپنی طاقتور باہوں سے جب پہاڑ کے سینے پر اپنی کدال سے ضرب لگاتا تھا تو منوں مٹی نیچے پھسل جاتی تھی اور بلا اپنے چوڑے ہاتھوں سے "چھسے کا بوکا" آسانی سے اوپر کھینچ لیتا تھا جسے دو بیل مل کر بمشکل کھینچتے تھے۔ وہ دونوں بہت اچھے لگتے تھے۔ ایک دن مذاق مذاق میں رتنی نے اس سے پوچھا تھا۔

آپ کی بچت
خود بخود بڑھتی ہے

مثلاً

۱۰۰ روپے سے ۱۸۰ روپے

۱۰۰۰ روپے سے ۱۸۰۰ روپے

۱۰,۰۰۰ روپے سے ۱۸,۰۰۰ روپے

شرط یہ ہے کہ آپ

ڈیفنس سیونگز سرٹیفیکیٹس

میں روپیہ لگائیں

زیادہ سے زیادہ منافع

انکم ٹیکس میں رعایت

اگر آپ یہ سرٹیفکٹ پانچ برس تک اپنے پاس رکھیں گے تو منافع ۶ فیصد ملے گا۔

اور اگر مزید پانچ برس تک رکھیں گے تو منافع ۸ فیصد ہو جائے گا یعنی ۶ فیصد منافع اور مزید ۲ فیصد بونس۔

اس طرح دس برس میں آپ کے ۱۰۰ روپے ۱۸۰ ہو جائیں گے۔

انفرادی طور پر سرمایہ کاری ۲۵,۰۰۰ ہزار روپے تک

اجتماعی طور پر سرمایہ کاری ۵۰,۰۰۰ ہزار روپے تک

ادارے اس سے زیادہ رقم لگا سکتے ہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔

نامزدگی کی اجازت ہے۔

ڈیفنس سیونگز سرٹیفیکیٹس

اسٹیٹ بینک آف پاکستان، دیگر منظور شدہ بینکوں اور تمام ڈاک خانوں سے مندرجہ ذیل مالیتوں میں حاصل کئے جاسکتے ہیں

۵ روپیہ، ۱۰ روپیہ، ۵۰ روپیہ، ۱۰۰ روپیہ، ۵۰۰ روپیہ، ۱۰۰۰ روپیہ اور ۵۰۰۰ روپیہ

رام لعل — سیپ کراچی

لمحوں کی دہلیز

جین اچانک اسی گلی میں پھر جا نکلا ہے جہاں اس کے پرکھوں کا بنایا ہوا مکان ہے جس میں کچھ تبدیلیاں اور اضافے اس نے چند سال پہلے کئے تھے، جس میں اس کی بیوی سمترا اور ان کے دو بچے سوم اور لوجی رہتے ہیں۔ سوم آج کل بمبئی میں مقیم ہے انجنیرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں۔

جین اس کے ساتھ نہیں رہتا۔ اسی شہر میں ایک اور جگہ رہتا ہے اپنی دوسری بیوی مونی کے ساتھ ایک سال پہلے اس نے بنگال کی اس ریڈیو آرٹسٹ کے ساتھ شادی کر لی تھی وہ اسکول میں پڑھاتی بھی ہے۔ لوگ ابھی تک اسے مونی باسو کے نام سے جانتے ہیں جین نے مونی باسو کی آواز ریڈیو پر بارہا سُنی تھی۔ اس کے ادا کئے ہوئے مکالمے سنے تھے دو چار بار اسے اسٹیج اور پھر دہلی کے ٹی وی پر بھی دیکھنے کا موقع ملا تھا لیکن کسی عورت سے محبت کرنے کے لئے محض اس کی آواز سن لینا یا اسے ایک فاصلے سے ہی دیکھ لینا کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک اسے بہت قریب سے نہ دیکھ لیا جائے، اس سے بل نہ لیا جائے اور اس کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا نہ کر لی جائے۔ تب تک وہ دل میں پوری طرح گھر نہیں کرتی۔

جین کو ایک ڈرامہ کلب کی سرپرستی کرنے کا موقع ملا تھا۔ اسی کلب میں مونی باسو بھی اکثر آجاتی تھی۔ ادھیڑ، خوش اطوار اور کافی حد تک سکیل آدمی اپنی زندگی میں بے شمار ڈرامے دیکھ چکا تھا۔ بے شمار فلمیں بھی۔ اور یقیناً بیشمار کتابیں بھی وہ پڑھ چکا تھا جس میں بنگالی مصنفین کی تخلیقات بھی شامل تھیں۔ اتنے سارے تجربات اور محسوسات نے اس کا جو ردیہ بنا رکھا تھا اس کی بنا پر وہ ایک باصلاحیت آرٹسٹ کے ساتھ گھنٹوں گفتگو بھی کر سکتا تھا اور اسے متاثر بھی، آغا حشر، امانت، ٹیگور، نذرل، ٹینسی ولیمز، شا، کے عباس، بلراج ساہنی، پرتھوی راج، وی شانتا رام، القاضی اور انٹی ڈراما اور انٹی تھیٹر جیسے کتنے موضوعات پر، کتنی تحریکوں پر اس نے سچ مچ بے تکان تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ مونی باسو کو بھی جیسے برسوں کی تلاش کے بعد اب تیسویں موڑ پر اچانک ایک ایسا مرد مل تو گیا تھا نا۔ جو اگرچہ ادھیڑ تھا شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ بھی، لیکن دکھی، تنہا، کسی کی محبت اور رفاقت کا منتظر۔ دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پہچانا اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے پھر ایک ہو گئے۔

کوئی بھی ہو — مرد یا عورت — اگر اس کا کوئی ماضی ہے — اس کے کوئی بندھن ہیں — سنسکار ہیں — نشان ہیں، جو اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں تو وہ نئی زندگی اختیار کر کے بھی اداس ہی رہتا ہے جین اپنے بیوی بچوں کو بھلا نہیں سکا ہے ان کا ذکر اکثر کیا کرتا ہے۔ خاص طور پر لوجی کا جسے وہ بہت ذہین بتاتا ہے اور اسے بے حد چاہتا ہے وہ بچپن ہی سے بے حد شریر اور شوخ تھی ہر بات میں مین میخ نکالنا اس کی خاص عادت تھی اسی بنا پر وہ پہلے اسے ٹوکا کرتا تھا پھر دھیرے دھیرے لوجی کہنے لگا۔ مونی اس سے اکثر کہتی ہے "۔۔۔

کبھی اس گھر میں کیوں نہیں ہے آتا وہ اس کی بیٹی سے مل کر بہت خوش ہوتی!

لوجی اب بڑی ہو چکی ہے یونیورسٹی میں تعلیم پاتی ہے جب وہ گھر چھوڑ کر موتی کے ساتھ رہنے کے لئے چلا آیا تھا، اسی سال اس نے ایم اے میں داخلہ لیا تھا لیکن ایک دو دفعہ اسے دفتر کے ایک آدمی نے اشارۃً بتایا کہ اس نے لوجی کو کسی لڑکے کے ساتھ اکثر گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ لڑکا کون ہے، وہ یہ نہیں بتا سکا۔ اسی وجہ سے جین فکر مند ہے۔ آج وہ اچانک ایک سال کے بعد اپنی گلی میں پھر سے چلا آیا ہے تو اس کی بڑی وجہ وہی ہے لیکن اس کے دل پر اس بات کا بھی بڑا بوجھ ہے کہ گھر جا کر سمترا کی جلی کٹی سننا پڑیں گی۔ اس کے چڑچڑے پن سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہا ہے گھر چھوڑ جانے کا ایک کارن یہ بھی تو تھا۔

اسے اپنی گلی میں کچھ واقف کار ملے ہیں جو اسے دیکھ کر چونک پڑے ہیں لیکن کسی کسی نے ہی اس کے ساتھ دعا سلام کی ہے۔ بہتوں نے تو اس کی طرف بس طنز سے ہی تاکا ہے۔ پھر اچانک ہی اس کی نظر لوجی پر جا ٹکی ہے جو کتابیں اٹھائے بس اسٹاپ کی اور جا رہی ہے جین اسے دیکھ کر حیران بھی ہو رہا ہے اور خوش بھی۔ لوجی کی نظر جب اپنے باپ پر پڑتی ہے تو وہ بھی حیران رہ جاتی ہے لپک کر اس کے قریب آجاتی ہے۔

"ڈیڈی، آپ آگئے!"

نہ شکایت نہ غصہ۔ بس وہی ایک طفلانہ مسرت جو اس کی نو عمر بیٹی کی آنکھوں میں دو دیوں کی طرح چمک رہی ہے وہ اپنی بیٹی کو بڑے پیار سے دیکھ رہا ہے جو ٹائیٹ شلوار قمیص اور دوپٹے میں ہے اس نے بڑے سلیقے سے بال سنوار رکھے ہیں۔ جوانی کی تمازت سے جلتی ہوئی سی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سرشاری بھی ہے اور بے خوفی بھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں جب سیدھی دیکھتی ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ یہ نظر کبھی کبھی بیٹی کی نظر نہیں رہتی۔ ایک نو عمر سنجیدہ لڑکی کی ہو جاتی ہے۔

جین اس سے کچھ کہنے کے لئے الفاظ ٹٹولنے لگا ہے اس کا دل ایک کرب سے بھرا ہوا ہے کرب ایک سال سے گھر سے دور رہنے کا بھی ہے اور لوجی کے بارے میں اس کی شکایت کا نتیجہ بھی۔ وہ ایک ہی لمحے میں حقیقت جان لینے کا متمنی ہے ــــ لوجی کیا سچ مچ کسی سے محبت کرنے لگی ہے؟ لیکن وہ لڑکا کون ہے؟ اس نے لوجی کی ذہنی تربیت میں بیس سال تک جو حصہ لیا ہے کیا لڑکے کے انتخاب میں کچھ اس سے بھی کام لیا گیا ہے یا نہیں؟ وہ لوجی کے چہرے سے کچھ نہیں جان سکتا۔ لوجی باپ کے سامنے پھر سے ایک معصوم بچی بن گئی ہے بمعصوم اور شوخ!

"سب ٹھیک چل رہا ہے لوجی؟"

"ہاں ڈیڈی!"

"کوئی خاص بات؟"

"کوئی نہیں!"

اس کے بعد خاموشی ــــ وہ گھر کے سامنے کھڑے ہیں، دو منزلہ مکان کے آگے جس کے دروازے پر ابھی تک اس کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے دوسری نیم پلیٹ نیچے کے حصے میں رہنے والے کرایہ دار کی ہے۔

جین پوچھتا ہے ــــ "چھٹیوں میں سوم گھر آیا تھا نا؟"

"جی آیا تھا۔"

"واپس چلا گیا مجھ سے ملے بغیر ہی!"

لوجی سے کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ اسے جلد ہی یہ بتانے کے قابل ہو گئی ہے ــــ "میں نے سوم سے کئی بار کہا۔ چلو ہم۔ ڈیڈی آپ سے مل آئیں۔ لیکن وہ تیار نہ ہوا۔ اصل میں وہ آپ سے بہت ناراض ہے۔

وہ جانتا ہے سوتم کیوں ناراض ہے۔ ناراض تو سب ہی ہیں یہاں کے۔ یہ لڑکی بھی کب خوش ہے اس سے؟ یہ تو اپنی نطرت سے مجبور ہو کر اپنی ناخوشی چھپائے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ لیکن جب یہ دیکھتی ہے ڈیڈی کوئی ایسا ویسا سوال نہ پوچھ بیٹھیں، وہ گھر کی طرف چلنے لگتی ہے۔

سوم نے میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ میں نے اسے دو بار منی آرڈر سے روپئے بھیجے۔ لیکن اس نے دونوں ہی بار لوٹا دیئے۔"

لوجی سیڑھیوں پر سے اوپر جا چکی ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ سمترا ان کی چاپ سن کر کمرے سے باہر نکل پڑی ہے لیکن اسے دیکھتے ہی وہ پھر اندر چلی گئی ہے لوجی بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی ہے۔ جین بالکل اچانک تنہا کھڑا رہ گیا ہے۔ گھبرایا ہوا سا، ادہر ادہر دیکھتا ہوا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا وہ بھی اسی کمرے میں داخل ہو جائے؟ یہ گھر اسی کا تو ہے۔ ہر کمرہ اس پر کھلا ہوا ہے لیکن وہ خود کو کس قدر اجنبی سا محسوس کر رہا ہے! جیسے یہاں آزادی سے گھومنے کی وہ ساری شکتی ہی کھو بیٹھا ہو!

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا وہ اپنے ڈرائنگ روم میں چلا آیا ہے۔ یہاں وہ ایک صوفے میں ڈوب کر بیٹھ گیا ہے اس نے خود کو پہلے اس قدر کمزور کبھی نہیں محسوس کیا تھا ابھی تو وہ پینتالیس کا ہے مضبوط اور صحت مند۔ لیکن اسے یوں لگ رہا ہے جیسے یہاں آتے ہی لمحے پھیل پھیل کر کئی سال بن گئے ہیں اب وہ تن کر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ تیز تیز مضبوط قدموں سے بھی نہیں چل سکتا۔

یہ ڈرائنگ روم وہی ہے۔ اس کا سب کچھ ہی تو وہی ہے۔ میز، کرسیاں، صوفے، الماریاں، پردے، دیواروں پر ٹنگی تصویریں اور بدھ، نہیرو، اور گاندھی کی مورتیاں! چند سال پہلے کا دفتر کا ایک گروپ۔ ایک گروپ لوجی کے کالج کی این سی سی کلاس کا ایک گروپ سوم کے فرینڈز کی پک نک کا۔ وہ عجیب سے پوز سوتم اور لوجی کے جن میں لڑکپن زیادہ ہے، سنجیدگی کم۔ لیکن وہ کتنی دیر سے ان کی طرف مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے یہ مسرت اس کے ہونٹوں کے کونوں میں بھی موجود ہے لیکن وہ یکایک اداس ہو بیٹھتا ہے۔ اس کی نظریں ایک اور تصویر پر ٹک کر رہ جاتی ہیں۔ ایک دھندلی سی تصویر پر جس میں وہ اور سمترا ہیں۔ یہ کئی سال پہلے کی تصویر ہے جب ان کی شادی ہوئی تھی۔ انہی دنوں کی۔ اس میں دونوں نوجوان اور مسرور نظر آتے ہیں آئندہ زندگی کے کتنے ہی سپنے دونوں کی آنکھوں میں موجود ہیں۔

وہ سپنے اب بکھر چکے ہیں۔ بیس برس ساتھ رہ کر بھی وہ ایک دوسرے سے میلوں دور رہے ہیں دو خوبصورت ذہین بچوں کو جنم دیکر بھی وہ ایک دوسرے کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکے۔ بیس برسوں کی طویل مدت چند ثانیے بن کر جین کی آنکھوں کے سامنے جھلملا گئے ہیں چیختی چلاتی۔ بات بات پر جھگڑتی، مخالفت کرتی ہوئی اور اس طرح دانت نکوس کر بولتی ہوئی عورت۔ جیسے وہ اس کی پشتوں کی دشمن ہو۔ اس نے سمترا کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ایک ذہنی سمجھوتہ استوار کرنا چاہا۔ کچھ پسند کی چیزیں تیاگ کر، کچھ ناپسندیدہ چیزیں قبول کر کے۔ لیکن وہ کسی ایسی مٹی کی بنی ہوئی تھی جس پر منطق یا سمجھداری کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

سوم اور لوجی کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی ہے۔ سوم بچپن میں باپ کے قریب تھا۔ پھر بڑا ہو کر ماں کی طرف جھک گیا لیکن پھر ماں سے بھی کٹ کر اپنے دوستوں کے قریب چلا گیا۔ آج کل وہ اپنے آپ میں ہی کھویا ہوا ہے اگرچہ باپ کے خلاف اپنا غصہ دکھانے میں بھی نہیں چوکتا۔

لوجی ایک نرم دل بھولے والے مزاج کی لڑکی ہے پہلے ماں باپ کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے دکھی اور خوف زدہ رہتی تھی پھر وہ اپنی ماں کو ناپسند کرنے لگی۔ اسی وجہ سے اس کی مخالفت بھی کرتی۔ باپ نے اس کی ہر خواہش پوری کی ہے اسی لئے وہ باپ سے زیادہ قریب ہے

سمترا کو اس بات پر ہمیشہ غصہ آیا ہے کہ وہ بھی اس کے باپ کو کوسنے میں اس کا ساتھ کیوں نہیں دیتی وہ تینوں مل کر تو اس مرد کو باتوں میں پچھاڑ سکتے ہیں جو ہر مہینے ایک معقول سی تنخواہ لے کر گھر آتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے کو آزادی سے خرچ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا جو ایک عجیب سی شان بے نیازی بھی دکھاتا ہے اور اخلاق و تہذیب کی بُو باس کا مظاہرہ بھی کیا کرتا ہے اور جس کے دوستوں اور خیر خواہوں کی تعداد اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ان سب کی ناز برداری کرنے کی اس کے اندر ہمت نہیں ہے لوجی نے اپنے باپ کے ان رویّوں کی کبھی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس نے اپنے باپ کی طرف ہمیشہ تعریفی نگاہوں سے ہی دیکھا ہے جیسے وہ بھی ہمیشہ یہی سوچتی رہی ہو کہ مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

لوجی ڈرائنگ روم میں آرہی ہے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی ہے اور برہمی بھی ــــ "ڈیڈی! میں نے ممی کو بہت سمجھایا کہ وہ آپ کو معاف کر دیں آپ کے پاس آکر بات بھی کریں۔ لیکن وہ کسی طرح تیار نہیں ہوتیں اس کے لئے!"

جین کے چہرے پر ایک کش مکش سی ابھر آئی ہے۔ جیسے اسے لوجی کی بات اچھی نہیں لگی ہو ــــ "میں معافی مانگنے نہیں آیا ہوں۔ لوجی! میں تو ــــ میں تو تم لوگوں کی خیریت جاننے چلا آیا۔ اور یہ روپے بھی لے آیا ہوں، تمہیں ضرورت ہوگی۔"

جین نے جیب میں سے سو سو کے پندرہ نوٹ نکال کر لوجی کے ہاتھ میں دے دیئے ہیں۔ لوجی ان نوٹوں کو بے مقصد سی دیکھتی ہوئی پلٹ کر ماں کے پاس چلی گئی ہے چند ہی لمحوں کے بعد جین کے کانوں میں سمترا کے چلانے کی آواز آنے لگی ہے ــــ "دے جا انھیں میں کہتی ہوں ہمیں نہیں چاہیئے خیرات۔ جاکر باپ کے منہ پر پھینک دے۔ ہماری بسر ہو ہی رہی ہے۔"

لوجی واپس آگئی ہے کچھ بولتی نہیں۔ آکر بس چپکے سے سارے نوٹ باپ کی گود میں رکھ دیتے ہیں اس کے چہرے پر بھی ناخوشی ہے وہ اچانک گھڑی دیکھتی ہوئی کہہ اٹھتی ہے ــــ "مجھے دیر ہو رہی ہے میں آج کا پیریڈ مس نہیں کرنا چاہتی۔ بہت اپارٹمنٹ ہے۔ آپ گھر پر ہی رہیئے گا نا ڈیڈی!"

جین آنکھوں میں آنسو بھر کر بیٹی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جیسے کہنا چاہتا ہے ــــ میں ایسے حالات میں اس گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں؟ رہ پاتا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں؟"

لوجی جا رہی ہے ــــ "اچھا ڈیڈی، آپ خود ہی بات کیجئے ممی سے۔ میں تو چلی!"

وہ اپنے مخصوص دل کش انداز سے کندھے جھٹکتی ہوئی باہر چلی گئی ہے۔ جین وہاں پھر اکیلا رہ گیا ہے۔ اکیلا اور پریشان۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کرے!

وہاں بیٹھے بیٹھے اسے کئی منٹ ہو گئے ہیں۔ سمترا ابھی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی۔ سارے گھر پر ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی ہے جیسے یہاں کوئی نہ ہو۔ سارے کمرے خالی پڑے ہوں کھلے ہوئے دروازے۔ حیران منہ پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے سے۔

جین گود میں بکھرے ہوئے نوٹ سمیٹ کر اب خود ہی سمترا کے پاس جا رہا ہے دوسرے کمرے کے دروازے پر جاکر رک سا گیا ہے جیسے کسی نے آگے بڑھنے سے روک دیا ہو۔

سمترا پلنگ کی پٹی پر سر جھکائے ہوئے بیٹھی ہے گھٹنوں پر دونوں کہنیاں ٹکا رکھی ہیں اور دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا رکھا ہے وہ کتنی دیر سے سامنے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ادھیڑ عورت کے کس کر باندھے ہوئے کالے بالوں میں جگہ جگہ سفید بال بھی چمک رہے ہیں اس کی سفید گردن پر ایک پیارا سا کالا تل ہے۔ جین نے اس تل کو کئی بار چھوا ہے کئی بار اسے چوما بھی ہے اب بھی اس کا جی چاہ رہا ہے کہ آگے بڑھ کر اس تل پر انگلی رکھ دے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ سمترا اس کا لمس پاتے ہی بھڑک اٹھے گی۔ چلانے لگے لگی۔

اسی پلنگ پر وہ اس کے ساتھ کتنی بار سویا ہے اسی پلنگ پر جس پر وہ بیٹھی ہے اس کے روم روم میں دونوں کے جسم کی خوشبو

رچی ہوئی ہے۔ عورت جب مرد کے ساتھ سوتی ہے تب وہ کتنی مختلف ہوتی ہے۔ جب الگ ہو جاتی ہے تو کتنی بدل جاتی ہے وہ، اس عورت کو کبھی ایک سا نہیں پا سکا ہے بستر سے باہر جا کر اس نے اسے ہمیشہ ایک مختلف، اجنبی عورت کا سا احساس دیا ہے۔

سمترا نے جب کافی دیر تک سر نہیں اٹھایا، تو جین نے وہیں دہلیز پر ہی نوٹ رکھ دیئے ہیں — "ضد نہ کرو سمترا۔ یہ روپے رکھ لو۔ میں جانتا ہوں تمھیں ان کی ضرورت ہے!"

"مجھے ضرورت نہیں ہے میں کہتی ہوں"! وہ بالآخر چلا اٹھی ہے لال لال آنکھوں سے اس کی اور دیکھ بھی رہی ہے۔ "چاہو تو یہ مکان بھی ہم سے لے لو۔ چاہو تو نیچے کا کرایہ بھی وصول کر کے لے جایا کرو۔ ہم تمھارے آسرے پر زندہ نہیں رہنا چاہتے۔"

" جین روہانسا سا ہوا اٹھا ہے —"میں دراصل ایک بہت ہی ضروری کام سے آگیا تھا۔ میں نے لوجی کے بارے میں ایک بات سنی تھی تمھیں بھی اس بات سے پریشانی ہوئی ہوگی!"

"تم بکتے ہو! اپنی بیٹی پر تہمت لگاتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ پر تمھیں تو خوش ہونا چاہیئے، وہ تمھارے ہی راستے پر چل رہی ہے!"

جین کے لہجے میں بے حد نرمی ہے اس کی روح کا سارا گداز ہے اس کی آواز اتنی دھیمی ہے کہ ان کے سوا اور کوئی سن ہی نہیں سکتا — "میرے لیۓ اور راستہ ہی کون سا رہ گیا تھا؟ یا تو میں اسی گھر میں تمہاری دن رات کی جی کو جلانے والی باتیں سن سن کر ٹی بی کا شکار ہو کر مر جاتا، یا اس عورت کے پاس چلا جاتا۔ جو مجھ سے محبت بھی کرتی ہے۔ کسی بات پر بلا وجہ کڑھتی تو نہیں۔"

یہ سن کر سمترا پلنگ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی ہے۔ سر سے پاؤں تک ایک شعلہ سی بن گئی ہے۔ حسد، نفرت، غصہ اور اپمان کا دہاٹ روپ — "تم سے کہا کس نے تھا اس چڑیل کی گود میں سے نکل کر یہاں لوٹ آؤ؟ پر تو تمھیں کس منہ جلی نے بلوا بھیجا تھا؟ ابھی چلے جاؤ یہاں سے۔ ایک منٹ بھی اور ٹھہرے تو میں چھت سے کود کر جان دے دوں گی۔ جاؤ! جاؤ! میں کہتی ہوں جاؤؤؤؤ!!!!!"

اس کی آواز سارے میں ہی گونج گئی ہے خالی کمروں میں اور آس پاس کے مکانوں میں بھی۔ اس نے قریب قریب دھکا ہی دے دیا ہے جین کو۔ وہ سیڑھیوں پر سے اتر رہا ہے لیکن اس کی آواز پیچھا کرتی آرہی ہے — جاؤ! جاؤ! جاؤ!! — وہ دروازے میں سے باہر نکل آیا ہے۔ آس پاس کھڑکیوں اور دروازوں میں سے کتنے چہرے اسے دیکھ رہے ہیں۔ اچانک اوپر سے سمترا نے سارے نوٹ بھی پھینک دیئے ہیں — "لے جاؤ انھیں۔ مجھے نہیں چاہیئے تمہاری خیرات!"

سارے نوٹ گلی میں بکھر گئے ہیں۔ اڑتے ہوئے سے ادھر ادھر جا پڑے ہیں۔ وہ انھیں چنتے ہوئے کانوں کے ساتھ چنتا پھرتا ہے سب کی نظریں اسی پر جمی ہیں۔ سب کی نظروں میں حقارت ہے۔ سب کی نظروں میں اس کی بیوی کے رویّے کی تائید ہے۔

چند گز لمبی گلی کا فاصلہ وہ بڑی مشکل سے طے کر پایا ہے۔ ایک ایک قدم کئی کئی من کا ہو گیا ہے — اب وہ گلی پیچھے رہ گئی ہے، تب بھی اس کے حلق سے اطمینان کی سانس نہیں نکل رہی۔ وہ کھلی سڑک پر پہنچ گیا ہے، تب بھی اسے اپنا وجود بے معنی سا محسوس ہو رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ کسی تیز رفتار موٹر یا ٹرک کے آگے جا پڑے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالے، ہر قدم کے ساتھ توہین کا زہر حلق کے نیچے اتارتا ہوا سا چلتا جا رہا ہے اس کی آنکھیں کھلی ہیں لیکن اس کے اندر کے آدمی نے آنکھیں بند کر لی ہیں وہی دل ہی دل میں مصمم ارادہ کرتا ہوا اچل رہا ہے۔ اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں آئے گا۔ اس عورت کا منہ کبھی نہیں دیکھے گا — کبھی نہیں! کبھی نہیں! اس نے اس عورت کو اپنا سب کچھ دے دیا۔ لیکن اس نے اسے کچھ بھی نہیں دیا۔ محبت کا ایک لمحہ بھی نہیں۔ سوکھی بنجر دھرتی کی طرح جو برسات کا سارا پانی سوکھ لیتی ہے۔ لیکن اگاتی گھاس کا ایک تنکا تک نہیں۔ یہ عورت بانجھ نہیں ہے۔ لیکن اس کے پاس محبت کرنے کا جذبہ بھی نہیں ہے آدمی صرف بچے ہی نہیں چاہتا۔ محبت بھی چاہتا ہے اپنے ارد گرد بکھری ہوئی۔ پھولوں کی طرح لہلہاتی، جھومتی ہوئی محبت۔ اخوشبوئیں

پھیلاتی ہوئی محبت!

جین نے پتلون کی جیب میں سے رومال نکال کر اپنا چہرہ پونچھا ہے، آنکھوں کو زور زور سے مَلا ہے اور پھر ارد گرد کی دنیا کو کچھ مطمئن سا ہو کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسے اچانک ایک لڑکا دکھائی دے گیا ہے۔ سائیکل سے آتا ہوا اپنے ایک پرانے ملنے والے کا لڑکا۔ ڈگی۔ ؟ ہاں ڈگی ہی تو!

ڈگی اسے دیکھ کر رک جاتا ہے لیکن اسے نسنے کہہ کر نکل بھی جانا چاہتا ہے۔ جین اسے روک لیتا ہے۔ "ڈگی سنو!"

اب وہ اس کے سامنے کھڑا ہے اسی قبتا لمبا، دل کش۔ جین اسے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ بچپن میں یہ لڑکا کتنا کمزور اور ملوٹا سا تھا اس کا خیال تھا بڑا ہو کر یہ لڑکا اچھی پرسنالٹی نہیں پائے گا۔ لیکن یہ تو بہت ہی وجیہہ نظر آتا ہے نو عمری میں کلین شیو چہرے کتنے حسین ہو جاتے ہیں یہ دیکھ کر وہ خوشی محسوس کر رہا ہے۔

"ڈگی تمہارے ڈیڈی کا کیا حال ہے؟ جالندھر سے ان کا خط آتا رہتا ہے نا"؟

"جی ہاں آتا رہتا ہے بالکل ٹھیک ہیں وہ!"

"اور تم کیسے ہو کیا کر رہے ہو آجکل؟"

ایک جھکی جھکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آجاتی ہے ـــ آج کل تو بس نوکری ہی تلاش کرتا رہتا ہوں جہاں بھی ویکینسی ہوتی ہے اپلائی کر دیتا ہوں۔"

"کیوں، کیا تمہیں ابھی تک نوکری نہیں ملی؟ تمہارے پاس تو الیکٹرک کا ڈپلوما بھی تھا۔"

"جی ہاں، پر کوئی ڈھنگ کی کمپنی بھی تو ملے، جو اچھا گریڈ بھی دے سکے"!

جین کی خواہش ہے کہ وہ ایک ہی جگہ جم کر کھڑے نہ رہیں۔ چلتے ہی جائیں ـــ

"اس وقت تم کہاں جا رہے ہو ـــ"؟

"جی، ذرا۔۔ شاہجہاں روڈ تک ہی جانا ہے۔ ہندوستان ٹولز کے آفس تک۔" ـ جیسے وہ جھوٹ بول گیا ہے اسے اِدا اَئڈ کرنے کے لئے۔

"میرے ساتھ نہیں چلو گے؟ ذرا دور تک تو چلو۔ کسی جگہ بیٹھ کر چائے بھی پئیں اور باتیں بھی کریں۔"

ایک باپ کی حیثیت سے جین نے اس لڑکے کو اپنی بیٹی کے لئے پسند کر لیا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ابھی اور باتیں کرنا چاہتا ہے تھوڑی سی دیر کے لئے باتیں کر کے وہ اپنی بوریت کھو چکا ہے اسے اس وقت ایک سہارے کی سخت ضرورت ہے۔

ڈگی کے چہرے پر ابھری جھجک دیکھ کر وہ کہہ رہا ہے ـــ "چلو چلو، وہاں سامنے کے ہی ریستوران میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

ڈگی اس کے ساتھ چل پڑا ہے ایک ہاتھ سے سائیکل تھامے، دوسرے ہاتھ سے کبھی اپنے بال سہلاتا ہوا۔ کبھی بیٹھ ہی کھجاتا ہوا۔

"کہیں انٹرویو کے لئے بھی تمہیں بلایا گیا ـــ؟"

"جی! پچھلے مہینے ریلوے سروس کمیشن نے بلایا تھا۔"

"بلایا تھا؟ ـــ اچھا پھر کیا ـــ"؟

"میرا نام نہیں آسکا۔ اس لسٹ میں جو کامیاب کینڈیڈیٹس کی نکلی ہے" ـ ڈگی کے چہرے پر کچھ ندامت سی جھلک آئی ہے۔

"کیا کیا پوچھا گیا تھا انٹرویو میں؟"

"بہت کچھ پوچھا تھا مجھ سے کچھ تھیوری کی باتیں۔ کچھ پریکٹیکل کی۔ پولیٹکس اور جنرل نالج بھی تھا۔"

ریستوران کے سامنے رک کر جین ڈگی کو سر سے پاؤں تک گھورنے لگا ہے جیرت ہے ـ "یہ تم چلتے کیسے ہو ڈگی؟"

وہ سچ مچ ایک عجیب انداز سے چلتا ہوا آیا ہے۔ کچھ جھکا جھکا سا اور کچھ ٹیڑھے ٹیڑھے سے قدم رکھتا ہوا جس میں بے حد بیزاری ہے۔

ریستوران کے اندر جا کر وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ بیرا ان کے سامنے ٹھنڈا پانی رکھ جاتا ہے۔ ایک دل و دماغ مینو بھی۔ جین اب خود کو کسی حد تک سکونت پذیر سا محسوس کرتا ہے۔ پریشانیوں سے مکت!

"ڈگی پہلے یہ بتاؤ، جب تم انٹرویو کے لئے گئے تھے تو بورڈ کے سامنے کس طرح چل کر پہنچے تھے؟"

ڈگی اس کی طرف حیران ہو کر دیکھ رہا ہے۔

"میرا مطلب ہے کیا اسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے ہی گئے تھے؟"

"جی نہیں تو۔۔۔!" ایک معصوم طفلانہ تردید جس میں گھبراہٹ بھی شامل ہے۔

"اچھا ذرا چل کر دکھاؤ تو!"

ڈگی اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں۔ جین مسکرانے کی ساری کوششیں بروئے کار لا کر کہہ رہا ہے۔

گھبراؤ مت! مجھے تمہاری کمزوری معلوم ہو گئی ہے جس کا تمہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ ویسے تو تم بہت ہی ٹیلنٹڈ ہو بہت ہی قابل! مجھے معلوم ہے۔ شاباش! ذرا کھڑے ہو جاؤ بھئی! سامنے دروازے تک ہی جا کر میرے پاس لوٹ آؤ۔ بس تمہیں تمہارا نقص بتا دوں گا۔"

جین کی مسکراہٹ اب جیسے چپک سی گئی ہے، اس کے ہونٹوں کے ساتھ۔ اسے پوری امید ہے ڈگی انکار نہیں کرے گا۔ اس کی ہدایت پر پورا پورا عمل کرے گا۔ لیکن ڈگی جم کر ہی بیٹھا رہتا ہے اس کے چہرے پر ایک ناگواری سی بھی پیدا ہونے لگتی ہے جین خود ہی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"لو میں ہی تمہیں پہلے چل کر دکھاتا ہوں!"

وہ دروازے تک دھیرے دھیرے چل کر جاتا ہے اب وہ اپنے اندر کی ساری کیفیت کھو چکا ہے، وہی جو کچھ دیر پہلے اسے پیش آئی تھی سمترا! اس کی گالیاں، محلے بھر کی نظریں۔ اس کی کھوئی ہوئی شخصیت واپس آ گئی ہے۔

دروازے تک پہنچ کر وہ پلٹ آتا ہے۔ ڈگی پر نظریں جمائے ہوئے ایک متوازن شاہانہ چال سے چلتا ہوا اس کے پاس آتا ہے۔

انٹرویو بورڈ کے سامنے اس طرح پورے کونفیڈنس کے ساتھ چل کر جانا چاہئے بہت سے لوگ اپنی ساری لیاقت کے باوجود کونفیڈنس سے ہی محروم رہتے ہیں۔"

وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا ہے ۔۔۔ "تمہیں بتاؤں جب میں پہلی بار انٹرویو کے لئے گیا تھا؟ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ تب تو تم شاید پیدا بھی نہیں ہوئے ہو گے۔ میں بورڈ کے سامنے اسی طرح چل کر پہنچا تو انھوں نے سوالات کی بوچھاڑ سی کر دی۔ ایک نے کہا۔ "تم کہاں سے آئے ہو۔؟" دوسرے نے پوچھا۔ تم نے فلاں فلاں سبجکٹ میں کم نمبر کیوں پائے؟ تیسرا آدمی غرا کر بولا۔ ویل مائی بوائے۔ نئے گنگا برج کے کتنے پلر ہیں۔؟ ۔۔۔ ان سب کے سوالات اتنے اچانک اور اس قدر زیادہ تھے کہ ان کے سامنے کوئی بھی ہوتا گھبرا اٹھتا لیکن میں نے ان کو جواب دینے سے پہلے انہی سے صرف ایک سوال پوچھ لیا۔ ایک خالی کرسی جو ان کے سامنے پڑی تھی کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "کیا میں اس کرسی پر بیٹھ سکتا ہوں؟ اگر آپ اجازت دیں تو!" بس اس پر ان سب کے منہ سے ایک ساتھ ہی 'وسوری' نکل گیا۔ 'سیٹ!' اور انھوں نے مجھے بیٹھ جانے کی اجازت بخوشی دے دی۔ اس کے بعد انھوں نے بڑے اطمینان سے باری باری ہی سے سوالات پوچھے جن کے میں نے اسی اطمینان سے جواب دیئے۔ پھر میرے ساتھ سب نے مل کر معلوم ہے کیا کہا؟ ۔ گڈ لک! تھینک یو! ۔ اور اس انٹرویو کے نتیجے میں میرا نام ٹاپ پر تھا۔"

جین کی مسکراہٹ چوڑی ہو چکی ہے۔ وہ ڈگی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھ رہا ہے ۔۔۔ "اور جانتے ہو میرا یہ ایٹی ٹیوڈ کس نے بنایا تھا؟ میرے فادر کے ایک دوست نے۔ ان کی کتنی ہی باتیں میں آج تک نہیں بھولا ہوں تمہیں بھی میری باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ میں بھی تمہاری کامیابی چاہتا ہوں۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟ بس ایک ہی بار اس دروازے تک چل کر دکھا دو۔ میں تمہیں تمہاری کمزوری سے باخبر کرنا چاہتا ہوں!"

ڈگی کے ماتھے پر پسینے کی بے شمار بوندیں جمع ہوگئی ہیں وہ بار بار گھڑی کو دیکھ رہا ہے اور پھر گھبرا کر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے دھیرے دھیرے چل کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ وہاں پہنچ کر باہر ہی نکل جاتا ہے پلٹ کر نہیں آتا۔ جین کو بے حد صدمہ پہنچتا ہے اس نے خود کو بیوقوف کیوں ثابت کیا۔!

وہ دروازے پر اب بھی نظریں جمائے ہوئے بیٹھا ہے۔ دس منٹ گزر گئے اس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے اسے اس بات کی کوئی امید نہیں رہی کہ ڈگی اب دروازے پر پھر نمودار ہوگا۔ وہ واپس نہیں آئے گا۔ باہر جا کر خوب ہنسا ہوگا اسے یوں لگ رہا ہے جیسے وہ خود نیل کر دیا گیا ہو۔ پچیس برس کے ایک ناتجربہ کار لڑکے نے اسے ریجکٹ کر دیا۔!

کیا وہ سچ مچ ہی بے وقوف اور شکی ثابت ہوا ہے؟ وہ اس بات کی تائید نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے ہیں اس وقت مونی اس کے پاس ہوتی۔ وہی اس کی کیفیت کو ٹھیک سے سمجھ سکتی! وہ اسے فون کر کے اسکول سے بلا کیوں نہ لے!

اچانک دروازہ کھل گیا ہے۔ وہاں سچ مچ ڈگی نمودار ہو گیا ہے جس کی اسے کوئی امید نہیں تھی۔ یہ وہی ڈگی ہے، دگمبر پرشاد جسے پیار سے ہمیشہ ڈگی ہی کہا جاتا ہے۔ بے حد سنجیدہ! بے حد خاموش! سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا۔ وہ اکیلا نہیں آیا ہے!

اس کے پیچھے پیچھے لوجی بھی اندر آئی ہے۔ لوجی اور ڈگی دونوں شانہ بشانہ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ میز کے قریب پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ کتنے ہی لمحوں تک کھڑے سے رہتے ہیں، جین حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کچھ کہہ بھی نہیں پا رہا ہے۔ ایک لفظ تک نہیں!

اچانک ڈگی اس سے پوچھتا ہے۔

"انکل! آپ کی اگر اجازت ہو تو ہم آپ کے سامنے بیٹھ جائیں!!"

جین اچانک جیسے کسی خواب سے چونک اٹھتا ہے۔

"ہاں ہاں! ضرور ضرور!"

اور پھر وہ مسکرا اٹھتا ہے۔

واجدہ تبسم

بانو۔ دہلی

من کا موتی

بارش کہتی تھی آج برس کر کبھی نہ برسوں گی۔ سارے میں پانی ہی پانی تھا۔ یہاں، وہاں، اِدھر، اُدھر، جدھر نگاہ جاتی تھی پانی ہی پانی۔ اور شاداں کو تو آج ہی مسجد میں چراغ جلانا تھا آج تیسرا جمعہ تھا۔ بڑی ماں نے کہا تھا کہ پابندی سے ہر جمعہ کو چراغ جلایا جائے تو من کا موتی ہاتھ آتا ہے ورنہ۔ اور اس کے آگے شاداں کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ ضرور چراغ جلانے جائے گی۔ چاہے اس کوشش میں اس کی اپنی زندگی کا چراغ کیوں نہ گل ہو جائے۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر طاقچے پر رکھی ماچس کی ڈبیا اُتاری اور کوری کوری سرخ مٹی کا چھوٹا سا دیا آنچل کی اوٹ میں لئے وہ آنگن میں اتر آئی۔ ذرا سا سر نیہوڑا کر اس نے کمرے میں جھانکا۔ اماں گہری نیند سو رہی تھیں۔ رہے بے چارے ابا تو وہ صبح سویرے کے جاگے ہوئے رہتے تھے۔ انہیں تو سرِ شام ہی بچوں کی طرح پٹ سے نیند آجاتی تھی۔ ایسا کوئی اندیشہ اسے نہ تھا کہ اماں اسے کھوجتی پھریں گی یا ابا اس کا نام لے لے کر پکارتے نکلیں گے۔ پھر مسجد بھی کونسی بڑی دور تھی بس چار چھ قدم گھر سے نکل کر چلو، پھر بائیں طرف مڑ جاؤ، سامنے ہی تو اپنے پرشکوہ جھلملاتے میناروں کے ساتھ وہ مسجد کھڑی تھی۔ آخر کو زندگی کی تمام امیدوں کا سوال تھا۔ کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو وہ ٹال بھی جاتی۔ اس کی نگاہوں میں ایک گھر گھوم گیا جس میں بڑی سی میز کے سرے پر ایک وجیہہ شخص بیٹھا انڈے پر سیاہ مرچ اور نمک چھڑک کر کھا رہا تھا۔ اور بہت پیارے پیارے دو لڑکے اور ایک لڑکی دودھ میں کارن فلیک ملا کر کھا رہے تھے۔ اور وہ خود اس مرد کے مقابل والی کرسی پر بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔ یہ آئندہ زندگی کا ایک معصوم اور بھرپور نقش تھا۔ جو اس نے تصور میں بارہا دیکھا تھا۔ جیتے جی اس تصویر کے حقیقت بننے کا دُور دُور شائبہ تک نہ تھا۔

شاداں کی بے حد پیاری سہیلی صنوبر جب سے ایک نائب تحصیل دار سے بیاہ کر شہر چلی گئی تھی اس کی اپنی زندگی کی ساری خوشیاں ایک دم جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ بات نہیں کہ صنوبر سے اس کی ایسی ہی زندگی کی ڈور بندھی ہوئی تھی کہ اس کے جدا ہوتے ہی اس کے اپنے زندہ رہنے کے لالے پڑ گئے ہوں۔ بات تو صرف اتنی تھی کہ گاؤں کی بیاہی صنوبر جب شہر پہنچی تو اس کی زندگی اور ماحول ہی یکسر بدل گیا۔ تین برس میں وہ تین بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ اور اب وہ میکے آتی تو دسترخوان کے کنارے آلتی پالتی مار کر کھانے کا اسے سلیقہ ہی نہ رہا۔ کبھی ساڑھی پر سالن کے سُرخ سرخ چھینٹے پڑ جاتے تو کبھی نوالہ ہی گود میں گر جاتا۔ وہ بڑی معصومیت سے، جس میں رعونت کا عنصر چھپائے نہ چھپتا، کہتی - ہائے، اب ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے کی عادت ہو گئی ہے نا۔ مجھ سے تو اب زمین پر بیٹھا ہی نہیں جاتا۔ ایسے میں اس کی ماں بڑے فخر سے پاس بیٹھی تمام بیبیوں کو دیکھتیں مگر لہجے میں گڑ بھر کر بولتیں: اے بی۔ ہم نے تو اپنے بس بھر مشرقی طور طریقے سکھا دیئے تھے بیاہ جانے پر بیٹی پر کس ماں کا بس چلا ہے۔ اب دیکھو اکیس برس کی عادت سے

ان بی بی نے دنوں میں پنڈ چھڑالیا۔"

ان کے طعنے کی توڑ صاف سیدھی شاداں کی ماں پر جاکر پڑتی تھی جن کی بیٹی کا اب اکیسواں بھر رہا تھا اور جو صنوبر ہی کی ہم عمر تھی۔ مگر ابھی تک جس کے پیروں میں بچھوؤں کی چھنک نہیں چھنکی تھی۔

ماؤں کی آپس میں کتنی ہی تکرار چلتی مگر صنوبر اور شاداں اب بھی ایک جان ہی تھیں۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے بعد بھی صنوبر میں وہ تناؤ نہیں پیدا ہوا تھا جو اپنی ساتھ کی کھیلی سہیلی سے خواہ مخواہ ہی ایک اکڑ سی پیدا کر دیتا ہے۔ صنوبر کی رعونت تو لے دے کر ساری اس بات پر تھی کہ میاں انگریزی فیشن کے متوالے ہیں چاہے جیسے سے خوش ہیں، ورنہ الگ کمرے میں اکھٹی تک دونوں شاداں اور وہی صنوبر تھیں۔ میاں کے پہلے دن سے لیکر آج تک کے قصے شاداں کو آکر سنا دیتی مگر کبھی اس بات کی تہہ کو نہ پہنچ پاتی کہ انیس برس کے کنوارپن کی آگ میں جلنے والی اس برہن کو پیا ملن کی روداد کیسے بھسم کر ڈالتی ہوگی۔ صنوبر کا شوہر یوں بھی فوٹوگرافی کا ایک ہی شوقین تھا۔ بات بات پر، قدم قدم پر تصویریں کھینچتا ایک تصویر صنوبر نے شاداں کو دکھائی تھی جس میں ایک ٹیبل کے گرد ان کی پوری فیملی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ شاداں نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا۔

۔ تیرے میاں خود تو اس تصویر میں موجود ہیں پھر بھلا تصویر کس نے اتاری ہوگی۔" صنوبر بڑے پیار سے ہنس کر کہنے لگی "اب تو تو نری بدھو رہ گئی: اری ایسے بھی کیمرے ملتے ہیں کہ اس کا ایک بٹن دبا کر اپنی کرسی پر آکر بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں کھٹ سے بٹن بند اور تصویر حاضر۔ پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوکر بولی "یہ پتہ نہیں خالہ بی اور خالو میاں تیرے نصیب سے ایسے بے پروا ہوکر کیوں بیٹھے ہیں، کیا ساری دنیا کے لڑکوں میں ایسے ہی کیڑے پڑ گئے ہیں صنوبر کی اس بات پر شاداں اس وقت کھسیانی ہوکر رہ گئی تھی مگر اس نے طے کر لیا تھا کہ اماں اور ابا تو اچھے لڑکے، کی آس میں دانتوں کی طرح اس کے بال بھی سفید کر دیں گے۔ وہ خود ہی اپنے لئے کوشش کیوں نہ کرے؟۔ دعا کیوں نہ کرے؟ منت کیوں نہ مانگے؟ اور اس کی نگاہوں میں جمن اماں گھوم گئیں۔

جمن اماں گاؤں بھر کی دکھی لڑکیوں کا آسرا تھیں۔ بے اولاد والیاں ان کے پاس جاتیں وہ اپنی بے نور آنکھیں لئے رات بھر وظیفہ اور دعائیں کرتیں اور یوں دوسروں کی زندگی کو روشن کر دیتیں۔ ایسی بے غرض اور بے لوث خدمت تھی جمن اماں کی کہ کبھی کسی سے نذرانے کے طور پر ایک پائی تک نہ وصول کی ان ہی جمن اماں نے شاداں کے دل کی بات سنکر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا تھا "بدل نہ ہو بیٹی۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ میں گناہ گار تو بس دعا کر سکتی ہوں۔ مگر اتنا تمہیں بھی کرنا ہوگا کہ پانچ جمعوں تک ہر ہفتے مسجد میں ایک چراغ جلانا ہوگا۔ خدا سے پوری امید ہے کہ پانچویں چراغ کے جلاتے ہی تمہیں تمہارے من کا موتی ضرور مل جائے گا۔ اس قدر پر یقین تسلی پاکر شاداں کے آنسو ابل پڑے تھے سسکی کی آواز سنکر جمن اماں نے کہا تھا "روؤ نہیں بیٹی۔ خدا بہت بڑا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بیوی بننے، ماں بننے کی تڑپ ہر عورت کے دل میں رہتی ہے یہ ایسی کوئی غلط خواہش نہیں جس پر تم شرماؤ یا خود کو شرمندہ محسوس کرو۔ جاؤ خدا تمہاری مراد بر لائے گا۔"

اور آج تیسرا ہی جمعہ تھا اور پانی اس قدر دھواں دھار برس رہا تھا۔ اب اگر وہ ہمت ہارتی تو بے چاری جمن اماں کو کیا تکلیف تھی کہ خواہ مخواہ ہی اس کے لئے دعائیں کرتی پھرتیں؟ اس نے بڑی ہمت کرکے آنگن کے شپ شپ کرتے پانی میں اپنے پاؤں ڈبو ہی دیئے۔ چپلوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی گھستے ہی اس کے تمام بدن میں ایک سرد آگ سی بھر گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ اس ٹھنڈک کی عادی ہوکر پانی میں چلتی ہی گئی۔

گھر سے باہر اندھیرے کے بھوت نے اسے جکڑ لیا۔ لڑکیاں اپنے سامنے کسی غیر مرد کو پاکر شاید اتنا نہیں ڈرتیں جتنا اندھیرے سے۔ دو تین قدم چلنے پر ایک دم اس کے پاؤں ٹھٹھک گئے اور کان کھڑے ہو گئے۔ فتو کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلنے لگی۔ وہ اونچے نیچے سروں میں گائے جا رہا تھا۔ "آج تو میں بازار جانے والا ہوں۔"

اس فتو کا بھی جواب نہیں تھا۔ گانے کا حد درجہ شوقین تھا لیکن یہ بھی اس میں خاص بات تھی کہ زندگی میں کبھی کوئی گیت یا شعر نہیں گایا، ہمیشہ

سیدھے سادے جملوں کو شعر کے انداز میں لے سے پڑھتا۔ بیل گاڑی پر فصل کے میوے یا اناج بیا گئے لدوا کر جب وہ شہر کی منڈی میں لے جانے لگتا تو چلا چلا کر گاتا "آج تو گئے بازار چلے ہیں"۔ پھر وہ اسی کو بار بار دہرائے جاتا اور جملہ الٹ پلٹ ہو جاتا۔ "اجی آج تو بازار چلے ہیں گئے۔ ہو گئے۔ اجی ہائے گئے۔ ہائے گئے۔" پھر اس کے ساتھ وہ تالیاں بجا کر یا انگلیاں چٹخا کر جو تال دیتا تو پھر سچ مچ پتہ نہ چلتا کہ یہ ایک نثری جملہ تھا یا واقعی شعر تھا۔

اس وقت بھی برستے پانی اور اندھیرے میں پتہ نہیں وہ کون سے بازار جلا تھا کہ چلائے جا رہا تھا "آج تو میں بازار چلا ہوں۔ جی بازار چلا ہوں۔ جی بزار چلا ہوں۔"

شاداں کے پاؤں وہیں جم سے گئے۔ آواز کا رخ اسی طرف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اس طرف آ ہی نکلا تو پھر چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آئے گا فتو جب کسی لڑکی کو چھیڑ رہے، کسی کو ستا رہے، کسی سے گالی نہ کھائے تو وہ فتو ہی کیا ہوا۔ ؟ گاؤں کی ایک لڑکی کے ساتھ تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بھگا کر لے گیا اور تین دن بعد اسے بھوک کی طرح پھر اس باپ کے گلے ڈال گیا۔ چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد، یہ موٹا تگڑا، رستم کا رستم لگتا۔ سب ہی اس سے ڈرتے تھے گاؤں کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کا گروہ ہمیشہ اس کے ہاتھ پر رہتا۔ جو چاہتا کرتا۔ کسی کی یہ مجال رہتی کہ اس سے لڑنے کی سوچتا۔ مندر کے نام پر کھلے سانڈ کی طرح اسے چھوٹ تھی کہ جس دکان پر جائے جو بھی مال پسند آ جائے منہ مارے، پورا نام تو اس کا فتح خاں تھا اور واقعی یہ حقیقت تھی کہ جس چیز کو بھی چاہتا فتح کر لیتا مگر پیکے یار لوگوں نے نام کو بگاڑ کر فتو کر دیا تھا۔ کوئی فتے کہتا، کوئی فتا، مگر یہ سب پیار محبت کی حد تک تھا۔ اگر کوئی ٹیڑھی آنکھ کر کے فتا کہہ دیتا تو اس کی بس شامت ہی آ جاتی۔

گانے کی آواز اور قریب، اور قریب ہوتی جاتی تھی اور شاداں کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ وہیں سہم کر ایک بوسیدہ سے مکان کی دیوار سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسے چھما چھم پانی میں یہ دیوار گر بھی سکتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ فتو کے جنگل میں پھنسنے سے یہ کیا برا ہے کہ دیوار تلے ہی دم نکل جائے۔

گانے کی آواز اب بند ہو گئی تھی۔ شاداں نے سکون کی لمبی سانس بھری اور قدم اٹھایا ہی تھا کہ سانپ کی سی پھنکار کے ساتھ، اس کا دوپٹہ سرسراتا ہوا کسی اور کے ہاتھ میں چلا گیا۔

"اب بتا اتنی رات کو کہاں چلی تھی ؟" تیز آواز کا کوندا لپکا۔

شاداں کا اوپر کا دم اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، لیکن اتنے میں بھی شاداں نے لپک کر اپنا دوپٹہ کھینچ ہی لیا اور تیزی سے بولی "حرامی شرم نہیں آتی اکیلی لڑکی کے ساتھ چھیڑ کرتے "

"ارے تم اکیلی کہاں ہو پیاری، ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہیں "

شاید حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے خوف ہی کا دوسرا نام بہادری ہے۔ شاداں اسی انداز میں بولی "قبر میں کیڑے پڑیں گے جو مجھے ہاتھ لگایا یا چھوا "

فتو بھی کمینے پن پر اتر آیا، جھلا کر بولا "تجھ ایسی سڑی ماری کو چھوئے کون جو قبر میں کیڑے پڑنے کی نوبت آئے "

"تو پھر میرا دوپٹہ کیوں کھینچا ؟"

فتو سر کھجا کر کہنے لگا "یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ ٹھیر ذرا سوچ کر بتاتا ہوں " اور ایک دم اس نے لپک کر دونوں ہاتھوں میں شاداں کو دبوچ لیا۔ شاداں پانی میں بھیگ کر مچھلی کی طرح سل سل ہو رہی تھی۔ ذرا سی کشمکش سے وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی اور تیزی سے اندھیرے میں دوڑ پڑی۔ فتو بھی اس کے پیچھے لپکا، مگر جانے شاداں کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ تھوڑی دیر کی ادھر ادھر کی تاک جھانک کے بعد وہ ایک جملہ گاتا ہوا اپنی راہ چلا گیا "آج تو بچ گئی لونڈیا پھر سمجھ لیں گے، ارے پھر سمجھ لیں گے ہو، پھر سمجھ لیں گے۔ اجی آج تو بچ گئی۔"

آج سے نہیں، پانچ برس سے فتو شاداں پر مر رہا تھا، مگر شاداں کے باپ نے نہ صرف یہ کہ انکار ہی کیا بلکہ فتو کے باپ کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ

انہیں کبھی دن میں تارے نظر آگئے ہوں گے۔ شاداں تھی بھی ایسی ہی بھرپور جوانی کہ جو دیکھے مچل جائے۔ کیا دنیا میں کسی لڑکی کا رنگ گورا نہیں ہوتا؟ کیا کسی لڑکی کی کٹیلی آنکھیں نہیں ہوتیں؟ کیا کسی کا ستار کی طرح کستا ہوا بدن نہیں ہوتا؟ کیا کسی کے بال ایسے لمبے نہیں رہتے کہ وقت پڑنے پر دوپٹے کی بجائے اوڑھ لیے جائیں؟ یہ سب ہوتا ضرور ہے مگر ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ یہ سارے حادثے ایک ہی لڑکی پر ٹوٹ پڑے ہوں اور یہی بدنصیبی شاداں کو بھی لے ڈوبی تھی اس کے بے پناہ حسن کو سجدے کرنے کے لئے کتنوں نے اپنی جبیں جھکائی مگر اس کے ابا اور اماں ایک کبھی نہ ٹوٹنے والے غرور میں چور رہتے کہ جس کی ایسی بیٹی ہو اس کو بر بھی ایسا ہی ملنا چاہیئے۔ پندرھویں، سولھویں برس میں تو شاداں کے لئے اتنے پیغام آئے کہ سال کے آخر میں جب دونوں میاں بیوی نے بیٹھ کر حساب جوڑا کہ چائے پلانے پلانے میں مہمانوں پر کتنا خرچ آیا تو پورے ساڑھے چار سو روپے بیٹھے تھے اور اتنے میں تو مزے سے خود لڑکی ہی کو بیاہ دیا جا سکتا تھا، مگر بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ کوئی گھر چل کر آئے اور اسے چائے کا پیالہ تک نہ پلایا جائے۔!

عورت اور پھل، دونوں کا حشر ایک ہی ہوتا ہے، اگر وقت پر ڈال سے اتارا نہ جائے تو سڑ کر خود ہی نیچے گر جاتا ہے۔ شاداں کا بھی یہی حشر ماں باپ کے غرور کے آگے ہوتا تھا۔ اور یہ ہوا۔ چار چھ برس تک تو پیغام ٹوٹ ٹوٹ کر آتے ہی گئے مگر کب تک؟۔ پھر تو لوگوں نے سوچنا بھی چھوڑ دیا کہ مرزا صاحب کے ہاں کوئی لڑکی بھی ہے۔ البتہ فتح خاں ابھی تک شاداں کے بارے میں ہی سوچا رہتا تھا، اور یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ شاداں کو دھوم دھڑکے کے ساتھ بیاہ لے جا کر دلہن بنانے کے خواب دیکھتا تھا، ورنہ کیا یہ ناممکن تھا کہ وہ شاداں پر ہاتھ صاف نہ کر دیتا؟ اس لئے اس نے باقاعدہ پیام بھجوایا تھا اور بیچ میں اپنے بوڑھے باپ کو بھی ڈالا تھا۔ اور بوڑھے باپ کی جو بے عزتی ہوئی تھی وہ اسے یاد تھی اور اسی وقت سے وہ ایسے موقعے کی تاک میں تھا کہ گن گن کر بدلے لے سکے۔

شاداں کے لئے فتح خاں نے پیغام کوئی دو برس ہوئے ہی بھجوایا تھا، کیونکہ فتو کا اپنا ایک خاص مزاج تھا۔ وہ یہ کہا کرتا کہ کھلے ہوئے پھول میں جو بات ہے وہ مونہہ بند کلی میں نہیں ہے۔ اسی لئے تیرھویں سولھویں برس میں جب پیام شاداں پر بیروں کی طرح پٹا پٹ گر رہے تھے تو اس نے سوچا بھی نہیں لیکن شاداں جب انیس سال کی بھرپور تمنا بن گئی تب اس نے پیام بھجوایا۔ ماں باپ کی تو خیر الگ بات تھی۔ خود شاداں کو بھی جب پتہ چلا کہ اس کے لئے فتح خاں کا پیام آیا ہے تو وہ آگ اگلنے لگی۔ اس نے ہمت ہی کیسے کی؟ بس یہی سوچ سوچ کر اس کا جی جلا کرتا۔ ما نا کہ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین اسی کی تھی۔ محنتی بھی اتنا تھا کہ نوکروں چاکروں کے ہوتے بھی ہر کام خود ہی سمیٹتا، اپنا مال تک خود ہی گاڑیوں میں لدوا کر شہر لے جاتا، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا بھی ایسا شوقین تھا کہ شہر میں جو بھی نئی چیز فیشن میں آتی، سب سے پہلے فتو ہی کے پاس نظر آتی۔ ٹیری لین کی شرٹ سب سے پہلے اسی نے پہنی۔ کیا کپڑا تھا! واہ وا بس دھوؤ اور پہن لو۔ چیمپا ہوا۔ نہ استری کرنے کی ضرورت نہ رات بھر تہہ کر کے تکئے کی طرح سرہانے دبانے کی حاجت، اور پھر چھوٹے سے ڈبے میں رنگا رنگ پروگرام، نت نئے گانے یہ اور بات ہے کہ خود اس کو گانے دل سے جوڑنے کا خبط تھا، مگر ٹرانزسسٹر تو پہلے اسی نے خریدا تھا۔ لیکن یہ بھی کہیں ہوا ہے کہ پیسے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے؟ شرافت بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ اور شرافت نام کی کوئی چیز تو دور دور تک فتو کے آس پاس نہ ملتی۔ پینے پلانے سے لیکر رنڈی بازی، جوئے، ڈاکے ڈکیتی، سب میں اس کا نام پیش پیش تھا۔ اتنے پر مرزا جی نے بیٹی دینے سے انکار کیا تو کیا برا کیا۔ بلکہ شاداں کنوارپن کی آگ میں جھلستی رہنے کے باوجود بے حد خوش تھی کہ ایسے لوفر کے پلے نہ پڑی۔ کنواری رہنے میں تو پھر بھی آس تو تھی کہ کبھی تو بھاگ کھلیں گے، اور جو ایسے کے پلے پڑ جاتی تو زندگی دوزخ بن جاتی اور اس سے فرار کی کوئی راہ بھی نہ ہوتی۔

جمن اماں کے کہنے پر شاداں ہر جمعہ کو پابندی سے چراغ جلا کر مسجد میں رکھتی رہی۔ نہ تو اندھیری رات نے اس کے قدم روکے، نہ جھاجوں برستے پانی نے اس کی راہوں میں بند باندھے۔ اس رات بھی جب پانی کے سوا اور دوسری کوئی شے دکھائی دیتی ہی نہ تھی، اور فتے نے بھی اس کی راہ روکی تھی، وہ چراغ جلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جانے کیوں جمن اماں کی عبادت اور دعاؤں پر اسے پورا بھروسہ تھا۔ کوئی کہتا تو وہ ایک حد تک خود اپنے وجود سے انکار کر دیتی

مگر مجنی اماں کی دعائیں۔۔؟ وہ یہ گناہ کیسے مول لے سکتی تھی کہ ان کے خلوص پہ ذرا بھی شک کرے۔

یہ آخری جمعہ کی بات تھی کہ گاؤں میں ایسی واردات ہوگئی کہ کسی کے کانوں میں ایسی بھنک بھی کبھی نہ پڑی ہوگی۔ بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے کہ جوئے کے داؤ پر کسی شریف باپ نے اپنی کنواری بیٹی کو لگا دیا ہو۔ مگر ایسا ہوا اور سب نے دیکھا تھا۔ بات صرف اتنی سی ہوئی کہ اس دن مرزا جی کے پڑوسی کریم الدین کی بیٹھک میں ایسے ہی گپ شپ کی محفل جمی۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی گپ بازی چلتی رہی۔ پھر کریم میاں جو جوئے کے ایسے دھنی تھے کہ کیا کوئی شرابی شراب کا بھی ہوگا، بول اٹھے۔ "ارے یار ذرا دو دو ہاتھ ہو ہی جائیں"۔ ان کا مطلب پتوں سے تھا۔ ایک زمانے میں مرزا جی خود بھی ایسے کھیلوں کے بڑے رسیا تھے اور اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک جیب سے پائی پائی تک نہ جھڑ جاتی۔ مگر اب عمر کے ساتھ وہ ذرا بجھ بھی گئے تھے۔ ان کے کھیل کا جوانی میں عجیب ہی طور تھا، یا تو ایسے ہارتے کہ خالی پھٹک رہ جاتے یا اس طرح اٹھتے کہ سب کی جیبوں کی کھنکھناہٹ ان کا مقدر بن جاتی۔ آج بھی انہوں نے بہت نانا کی مگر جب کریم میاں اور دو چار ساتھیوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا ہی لیا تو ناچار بیٹھ گئے۔ وہ بہت زمانے کے بعد کھیل رہے تھے، مگر ہر بازی ان ہی کے ہاتھ پڑ رہی تھی، یار لوگ شہ پر شہ دیئے جا رہے تھے، اور یہ پرانے دنوں کی یادیں تازہ کئے جا رہے تھے۔ اسی دم بھاری بھاری قدموں کی آواز نے سب کو سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ دروازے میں پردے کی طرح چھا کر رہ جانے والا اور کوئی نہیں فتو تھا۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ نمبری غنڈہ ہونے کے باوجود فتو کی سب سے یاری تھی، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈر کے مارے کسی کی ہمت ہی نہ تھی کہ اس کی طرف سے مونہہ پھیر کر گزر سکتا۔ لوگ اس سے نہیں ڈرتے تھے، اپنی عزت کو ڈرتے تھے۔ اور تو کسی نے نہیں بلکہ مرزا جی نے اسے دیکھ کر ناگواری سے پتے زمین پہ پٹخ دیئے اور بولے "اچھا تو کریم میاں میں چلا"۔

"بیٹھو بھی، ایسی بھی کیا گڑبڑ ہے؟" کریم میاں نے کہا۔

مرزا جی پھر بھی بڑھے ہی گئے تو فتو بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "کھیل ادھورا چھوڑ کر جانا تو بچوں کی سی بات ہے مرزا جی۔ آیئے اب ہو ہی جائے کچھ"۔ مگر پھر بھی مرزا جی بڑھے ہی گئے، تو ایک ساتھی نے ایک فقرہ کھینچ مارا۔ "اصل میں بھاگنے کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔ مقابلے پر اب فتو آ گیا ہے نا!"

اب مرزا جی رہ نہ سکے۔ الجھ کر بولے، "ہونہہ میں اور کل کے لونڈے سے بھاگوں؟"

فتو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ "تو آ ہی جاؤ شاہ جی، ابھی دیکھے لیتے ہیں کہ کل کا کون ہے اور آج کا کون؟"

مرزا جی اس تہیئے سے بیٹھے کہ اس کو ہرا کر چھوڑوں گا اور فتو ادھار کھائے بیٹھا تھا کہ اسی نے تو باتوں میں میری بے عزتی کی ہے۔ بدلہ نہ لوں تو فتح خاں نام نہیں۔

اب پانسہ پلٹ گیا تھا اور مرزا جی پٹا پٹ ہارتے چلے جا رہے تھے۔ پہلے جیب کی ساری نقدی نکلی۔ پھر گریبان میں بندھے ہوئے سونے کے بٹن، پھر کلائی پر بندھی گھڑی، انگلی میں جگ مگ کرتی انگوٹھی۔ پھر آخری بازی جس میں فتو نے للکارا۔ "ارے شاہ جی یہ سب کیا ہے؟ ہاتھ کا میل ہی نا؟ کوئی ایسی قیمتی چیز داؤ پر لگاؤ نا کہ کھیل کا کچھ مزہ بھی آئے؟"

فتو اور مرزا جی کے مقابل آ جانے پر باقی سب نے اپنے پتے پھینک دیئے تھے اور اب پرانی شاہی لڑائیوں کی طرح بس دو جنگ جو آمنے سامنے ایک دوسرے سے لوہا لئے جا رہے تھے۔

"غصے سے پھنکارتے ہوئے مرزا جی نے اس یقین کے ساتھ چیخ کر کہ جیسے بازی ان ہی کے ہاتھ ہوئی۔ کہا۔ "اب میں اپنی بیٹی کو داؤ پر لگاتا ہوں لے دیکھ لے!"

اور جیسے ہی پتے زمین پر گرے سب آگے اس طرح جھکے کہ سب کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔

ایک دم پوری محفل میں قبرستان کی سی خاموشی چھا کر رہ گئی۔

دوسرے ہی لمحے فتو خوشی سے چیختا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ "میں جیت گیا۔ میں بازی جیت گیا۔"

کریم الدین اس کے پیچھے لپکے۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اسے روکو۔۔۔ ارے خدا کے لئے اسے روکو۔۔۔ مرزا جی، یہ کھیل کی بات تھی، کوئی حقیقت تھوڑی تھی کہ بیٹی اس کے حوالے کر دی جائے۔" کریم الدین کہے جا رہے تھے۔

سب نے بڑے اچنبھے سے دیکھا کہ مرزا جی ٹس سے مس نہ ہوئے اور سب نے دوہرے اچنبھے کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ فتا مرزا جی کے گھر میں گھسا، کبوتری کی طرح سہمی ہوئی شاداں کو گھسیٹتا ہوا باہر تک لایا اور اپنے اونچے گھوڑے پر بٹھا کر یہ جا وہ جا۔

موج میں آکر فتے نے گھوڑے کو دلکی چال پر ڈال دیا اور خود مزے میں گانے لگا۔ "آج تو میں دولہا بن گیا۔ اسے میں دولہا بن گیا، اجی دولہا جی، ارے دولہا جی۔"

شاداں سہمی ہوئی فاختہ کی طرح گھوڑے کی پیٹ سے چپک کر رہ گئی تھی۔ چلتے چلتے فتے کا گھر آ گیا۔ اس نے للکار کر شاداں سے کہا۔ "میں ابھی آتا ہوں بھاگنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا۔ ہاں۔" اندر جا کر اس نے اپنا بڑا سا بکس نکالا۔ سرمئی سلک کی قمیص، چھ خانے کی بوسکی کی تہبند نکالی اور بڑے ٹھاٹھ سے موہنہ ہاتھ دھو کر نیا جوڑا زیب تن کیا پھر شاداں کے پاس آ کر بولا۔ "آج یاروں کے مزے ہیں۔ دولہا بنے ہیں ہم۔ اور تم، تم دلہن بنو گی، بیوی جی!" اور اپنے بھونڈے مذاق پر وہ خود ہی موہنہ پھاڑ کر ہنس دیا۔ شاداں کا دل دہل کر رہ گیا۔ عطر کا ایک زوردار بھپکا آیا اور فتا اچھل کر پھر گھوڑے پر آ بیٹھا۔

رات کی آمد آمد تھی، چار دن سے بارش بوند بھر بھی نہ برسی تھی، تو شام بھی نکھری ستھری اور دھلی دھلائی سی تھی۔ اور رات تو بہت ہی سہانی تھی۔ دوسری بار گھوڑا ایک ندی کنارے رکا اور فتے نے بڑے پیار سے شاداں کو بھی اتار لیا۔ شاداں کا دل پھر زور سے اچھلا۔ اب وہ گھڑی آ گئی، اس نے لرز کر سوچا۔ مگر وہ گھڑی ٹل گئی، کیونکہ فتے نے خود بھی پانی پیا اور شاداں کو بھی موتی سا جگمگاتا پانی پلا کر پھر سے سفر جاری رکھا۔

برلے گاؤں میں میلا لگا تھا۔ گھوڑے کو اپنے ایک پہچان والے کے پاس کھڑا کر کے فتے نے جیب میں اڑسی ہوئی مڑی تڑی دستی نکالی، جو نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر شاداں سے بولا۔ "ایک اچھا سا جوڑا پسند تو کر لو دلہن بی بی۔" شاداں پھر لرزی۔ موہنہ سے کچھ نہ بولی۔ فتے نے خود ہی سب سے بھاری اوڑھنی اور گھاگھر خرید لی۔ دوسری دکان سے مانگ میں بھرنے کی چمکی، چوڑیاں، ایک دکان سے نقلی موتیوں کا پورا زیور پھر ایک اور دکان سے پان کا پورا سامان اور ہونٹوں کے لئے مسّی، سب ہی کچھ خرید ڈالا، اور پھر گانے لگا۔ "آج تو یاروں کے مزے ہیں، دلہن کے ہاتھ کا پان کھائیں گے ہم۔" گھوڑا پھر دلکی چال چل رہا تھا۔ اندھیرا کسی جگہ گہرا ہو جاتا تو شاداں لرز لرز جاتی۔ "آخر وہ گھڑی آ ہی گئی۔" جانے اندھیرے کیوں وسوسوں کو جنم دیتے ہیں مگر ایسے بہت سے موڑ آئے اور گئے، اور شاداں لرزتی رہی کب وہ گھڑی آتی ہے۔ کب۔ کب۔ کب۔ اب اس کا جی اس قدر گھبرا اٹھا تھا کہ وہ چاہ رہی تھی کہ جلد سے جلد وہ گھڑی آ کر ٹل بھی جائے کہ اس کے دھڑ دھڑ دھڑکتے دل کو قرار آ جائے۔ مگر فتے کی تیاریاں پوری ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔ ایک سنار کے ہاں گھوڑا روک کر اس نے شاداں کے لئے چھم چھم کرتی پائلیں خریدیں۔ کنگن اور چاندی کے ہاے لئے۔ جگہ جگہ رک رک کر نہ جانے کتنا سامان اس نے خریدا کہ ایک پوٹلی سی بن گئی۔ شاداں ایک لاش کی طرح گھوڑے سے جڑی بیٹھی تھی کہ اگر اسے موقع ملتا تو بھی شاید ہی بھاگ سکتی۔

اب زندگی میں رہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ بھاگنے کی سوچتی۔

پھر ایک جگہ اور گھوڑا رکا۔ فتے نے ایک دکان سے کھانے پینے کے لئے ڈھیر سا سامان خریدا۔ پھر ایک جگہ اور گھوڑا رکا اور۔۔۔

شاداں کا دل نئے سرے سے دھڑک اٹھا۔ مگر وہ تو پوٹلی نیچے گری تھی جسے اٹھانے کے لئے فتو نے گھوڑا روکا تھا۔

رات بھیگ رہی تھی اور گاؤں کی تمام تر روایتی خوبصورتیوں کے ساتھ اپنا نشہ تیز کر رہی تھی۔ بھوک نیند، خوف و ہراس، اب ہر ہر جذبہ شاداں کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ پہلے تو ہر بار گھوڑے کے رکنے پر شاداں خوف سے کانپ کانپ جاتی تھی، تو وہ گھڑی آ ہی گئی، مگر اب وہ بے حد مطمئن انداز میں گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں جیسے زندہ ہی نہ ہو۔ پھر گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے ملگجے اندھیرے کے باوجود شاداں کو یہ احساس ہوا کہ یہ راستے اس کے جانے پہچانے ہیں، یہ گلیاں، یہ کھیت، یہ گھر۔ اور یہ آخری موڑ آتے ہی وہ چیخ پڑی۔ "ارے یہ تو میرا ہی گاؤں ہے، یہ تو میری ہی مسجد ہے"

فتے نے گھوڑا روک لیا۔ اپنی گلی کی مانوس خوشبو سونگھتے ہی شاداں کے گئے حواس لوٹ آئے تھے۔ اور بے خوفی اور خوشی نے گویا اسے بھلا ہی دیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ وہ بچوں کی سی خوشی اور بے خوفی سے بولی۔ "ارے فتو تو نے مجھے میرے گھر پہنچا دیا۔ تو نے تو...."

ہاں فتو بڑی بے پروائی سے بولا۔ یاروں کا اصول ہے کہ کسی کی مجبوری سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا کرتے۔"

اور وہ اسی ترنگ میں گھوڑے پر کود کر ایک جملے کو گاتا ہوا جانے لگا۔ "آج تو اپن دولہا بن گئے۔ آج تو...."

شاداں کا دل ایک عجیب سے غم اور ہمدردی سے بوجھل ہو اٹھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے لپکی اور کہنے لگی "مگر فتو یہ تو سنو، پھر تم نے یہ ڈھیر سا سامان کس کے لئے خریدا تھا؟"

فتو نے گھوڑا ذرا کی ذرا روکا اور بولا۔ "میرے دل سے دولہا بن جانے کی اور تجھے دلہن بنا لینے کی آرزو ختم تو نہیں ہو گئی نا۔ ڈھکوسلوں سے بھی کبھی کبھی جی کو بہلا لیا جاتا ہے۔"

اس نے گھوڑا بڑھایا ہی تھا کہ شاداں لپک کر گھوڑے کے سامنے آ گئی۔ فتو بھی کچھ نہیں بولا۔ شاداں بھی کچھ نہیں بولی۔ بس فتو نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جہاں اپنا پاؤں زمین پر رکھا تھا، وہاں کی تھوڑی سی مٹی اٹھا کر شاداں نے اپنی مانگ میں بھر لی۔

آج پانچواں اور آخری جمعہ تھا۔

نسیم درانی

چوپایہ

ایک دن اور کم ہوگیا ـــــ اُس نے سوچا، اور اس خیال کے ساتھ ہی ایک انجانا سا خوف اُس کے ذہن پر مسلط ہوگیا۔ آج منگل تھا ـــــ اور جمعہ میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔

یکے بعد دیگرے گھنٹے گزرتے جارہے تھے۔ اُس کو یہ بھی یاد نہ تھا کہ آج اُس نے کیا کچھ پڑھا تھا۔ یہ آخری گھنٹہ تھا۔ اور وقت کسی طرح گزرنے کا نام نہ لیتا تھا ـــــ مسز بلگرامی بے تکان بولے چلی جارہی تھیں ـــــ اُن سے اُسے ہمیشہ ہی سے نفرت تھی۔ کبھی جو اُنھوں نے ناغہ کیا ہو ـــــ کلاس میں آئیں۔ ایک سرسری نظر کلاس پر ڈالی۔ اور پھر جو پڑھانا شروع کیا، تو اُس وقت تک اُن کا لکچر جاری رہتا جب تک کہ گھنٹہ ختم ہوجانے کے بعد دروازے پر دوسری استانی نظر نہ آجاتیں۔

وہ عجب بے چینی میں مبتلا تھی۔ کوئی عجیب سا احساس اُس کے دل کو رندے کے مانند چھیل رہا تھا۔ اُس کے جسم میں میٹھا میٹھا درد ہورہا تھا۔ اور اعصاب میں تشنجی کیفیت تھی۔ یہ درد اور یہ تشنج بہت لذت آمیز اور سرور انگیز تھا۔ کبھی کبھار تو بے خیالی میں اُس کے منہ سے دبی دبی سسکی سی اُبھر جاتی۔ وہ اس کیفیت سے ایک لمحہ کو نکلی، تو مسز بلگرامی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"ـــــ زمین کے بغیر کسی قسم کی دولت پیدا نہیں ہوسکتی ـــــ کیونکہ قدرت نے انسان کے لیے طرح طرح کے عطیات پیدا کیے ہیں۔ ان عطیات پر انسان انسانی وسائل لگاتا ہے، اور اُن سے افادہ حاصل کرتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ زمین ہی بنیادی عامل پیدائش ہے ـــــ زندگی کی بقا ـــــ"

اس کے بعد اُسے معلوم نہیں مسز بلگرامی کیا کچھ کہتی رہیں۔ وہ تو بس زمین، اس پر لگائے جانے والے وسائل اور افادہ کے وہ معنی اخذ کرتی رہی۔ جو خالص جنسی نوعیت کے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ جذبات کے دھارے پر بہتی ہوئی نہ معلوم کہاں نکل گئی کہ اُسے اچانک پھر جمعہ کا خیال آگیا۔

برابر بیٹھی ہوئی راحیلہ نے اُسے ٹھوکا دیا۔ اور ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جس پر اُس نے "آج کے لیکچر کا گراف" عنوان قائم کرکے چند تصاویر بنائی تھیں۔ اُس نے چونک کر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ کہیں اُس نے اُس کے من کا چور تو نہیں تاڑ لیا! ـــــ لیکن اُس کی آنکھوں میں شوخی کی وہی چمک تھی۔ اس گراف میں افادہ کے ساتھ ہی "فروغِ نسلِ انسانی" تحریر تھا۔ راحیلہ بہت شوخ و بے باک تھی۔ زن و مرد کے باہمی رشتوں پر بے تکان بولتی تھی۔ اور اکثر وہ کہا کرتی تھی ـــــ "ہائے اللہ راحیلہ تم تو بہت بے شرم ہو!"

لیکن آج وہ یہ جملہ نہ کہہ سکی، اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ اُبھری، اور اُس نے وہ کاغذ پھر راحیلہ کی طرف بڑھا دیا

ایک دن اور کم ہوگیا ـــــ اُس نے ایک مرتبہ پھر سوچا، اور اس کے ساتھ ہی خوف ناک اندیشوں اور وسوسوں نے اس کو آ
اُس نے گھبرا کر اُچٹتی سی نظر مسز بلگرامی پر ڈالی، اور دروازے کی راہ سے باہر دیکھنے لگی۔ اسکول کا صحن آہستگی سے چپکے چپکے پھیلنے والی شام
سناٹے میں ڈوبا ہوا اُداس سا معلوم ہوتا تھا۔ شام کا اندھیرا تیزی سے دبے پاؤں بڑھتا جا رہا تھا۔ ستمبر کے آخری دن تھے ۔ را
طویل اور دن روز بروز مختصر ہوتے جا رہے تھے ۔ اُس نے مختصر سے صحن کے پار دیکھا۔ مس اکرام اللہ کرسی پر بیٹھی کسی کتاب کے مطالعہ میں
تھیں۔ اور کلاس کی لڑکیوں کے آپس میں دھیمی آوازوں میں باتیں کرنے کا ہلکا ہلکا شور اُبھر رہا تھا۔ صحن میں دوسرے کنارے پر گھ
قریب آئی کھڑی تھی، جیسے وقت پورا ہونے کا انتظار تھا۔

چھٹی کا وقت قریب تھا۔ لیکن مسز بلگرامی ـــــ اُن کے جوش وخروش اور لہجے میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُس نے اپنے خوف سے
آکر پھر مسز بلگرامی کی آواز سننے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی راحیلہ کا بنایا ہوا گراف پھر اُس کے ذہن میں چکرا کر رہ گیا۔ مسز
کہہ رہی تھیں ـــــ

"ـــــ غذائی پیداوار اور غیر غذائی پیداوار اور معدنیات سب زمین ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر بعض معاشیین نے
دولت کی ماں کہا ہے۔ اس حقیقت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کسی بھی ملک کی . . "

اُس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اُس کے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اور پھر اسکول کی چھٹی کا گھنٹہ بج گیا۔ اور اس
گویا اطمینان کی سانس لی۔ اضطراب اور بے چینی میں کسی ایک جگہ جم کر بیٹھنا بھی کتنا اذیت ناک ہے۔ اُس نے سوچا۔ اور پھر شمسہ کو
کرتے ہوئے جلدی جلدی برقع پہننا شروع کر دیا۔

آج منگل ہے ـــــ دلوں کے خوف نے اچانک اُس پر حملہ کر دیا۔
ایک دن اور کم ہوگیا ـــــ جمعہ میں اب دو دن ہی تو رہ گئے تھے۔

یہ گزشتہ ہفتہ کی بات ہی تو تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ اور اُس کے ذہن میں چھٹی کا خیال عجیب سی تازگی گھول رہا تھا
ہونے پر وہ حسب معمول شمسہ کے ساتھ نکلی۔ بس اسٹاپ پر دونوں نے تھوڑی دیر ساتھ ہی وقت گزارا۔ شمسہ کی بس آئی اور وہ چلی گ
اپنے روٹ کی بس کے انتظار میں کھڑی تھی، کہ اچانک اُس کی نظر نذیر پر پڑی، وہ اُس کو گھور رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی وہ مسکرایا ـــ
یہاں پہلی مرتبہ اُسے نظر آیا تھا۔ اُس نے سوچا، شاید کسی کام سے اِدھر آیا ہوگا۔ جب وہ بس میں بیٹھی تو اُس نے نذیر کو بھی بس میں
ہوتے دیکھا۔ اُس کو کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ نذیر بس میں سوار ہوا۔ اور سیٹوں کے درمیان ہوتا ہوا اس جالی کے پاس آ کھڑا ہوا جو
کی نشستوں کو علیحدہ کرتی تھی۔

یہ نذیر تھا ـــــ وہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ جانتی تھی ـــ اس کو اکثر اُس نے اپنے محلہ میں گلی کی نکڑ پر "فینسی ہیئر کٹنگ سے
اینڈ گرم حمام" کے باہر بنچ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ نذیر کو دیکھ کر اُسے ڈر محسوس ہونے لگا۔ شاید آج اس کی آ
کی چمک اُسے عجیب معلوم ہوئی تھی۔ نذیر نے کبھی اس سے کچھ نہ کہا۔ وہ جب بھی اسکول جاتے اور آتے ہوئے "فینسی ہیئر کٹنگ سے
اینڈ گرم حمام" کے پاس سے گزرتی، نذیر اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ بعض اوقات تو اس کو نذیر کی نظریں اپنی کمر میں چبھتی محسوس

نہ تو کبھی ٹھنڈی آہیں بھرتا، اور نہ ہی اس پر کوئی فقرہ چست کرتا۔ جیکہ "ماڈرن ٹیلرنگ شاپ" کا بھینگا ٹیلر ماسٹر بھی جب کبھی وہ قریب سے
اتنی زور سے چھینکیں تھا کہ وہ ڈر جاتی تھی ــــ لیکن گزشتہ ایک ماہ سے نذیر تقریباً روزانہ ہی کبھی اسکول کے پاس، کبھی گھر کے قریب
بس اسٹاپ پر نظر آتا تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسی بس میں سوار ہوا تھا۔

یہ اُسی دن کی بات تھی۔ بس سے اُتر کر وہ تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ نذیر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ خوف و دہشت سے اس کی ٹانگیں
لرزنے لگیں۔ اس کی رفتار کچھ اور تیز ہوگئی۔ پھولی سانسوں، لڑکھڑاتے قدموں اور کانپتے دل کے ساتھ جب وہ اپنے کوارٹر کی گلی کے موڑ
پر ہی تو نذیر نے اتنی تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اُس کے دل کی رفتار تیز ہوگئی۔ نذیر جھٹ پٹ ایک پرچہ اُس کے ہاتھ
میں تھما کر آگے بڑھ چکا تھا۔ اور وہ اسی جگہ گم سم بت بنی کھڑی رہ گئی تھی۔

اُس کے ہوش جب کچھ ٹھکانے لگے تو اُس نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تمام گلی سنسان پڑی تھی۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔
کسی نے نہیں دیکھا ــــ لیکن "پرچے" نے اس کو ایک لمحے کے لیے مزید پریشان کر دیا۔ یہ پرچہ اُس کے ہاتھوں میں آگ لگائے ہوئے تھا۔

یہ اس کے ساتھ پہلا واقعہ تھا۔ ویسے اُس نے اس قسم کی باتیں اپنی کچھ سہیلیوں سے سنی اور کچھ کتابوں میں پڑھی تھیں۔ یوں یہ
واقعہ ان واقعات اور کہانیوں سے کچھ مختلف نہ تھا جو اُسے گھر میں پیش آتے رہے تھے۔ وہ گھر میں بھی اسی قسم کے واقعات سے دو
چار ہو چکی تھی۔ لیکن یہ معاملہ سڑک کا تھا۔ گھر کی بات گھر میں رہتی ہے۔ اور پھر وہ تو غیر تھا۔ اور یہی وہ احساس تھا جو اُسے
خوف زدہ کر رہا تھا۔

نذیر کے پرچے کا کیا کرے؟ ــــ اُس نے گھر کی طرف بوجھل قدم اُٹھاتے ہوئے سوچا۔ اب اُس کی رفتار سست تھی۔ ..
گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس پرچے کے متعلق فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ کیا اسے پھینک دے؟ ــــ اُس نے سوچا۔ پھر خود ہی اس کا دل
کہ کم از کم وہ یہ تو دیکھ لے کہ نذیر نے کیا کچھ لکھا ہے۔ پھر اسے ان بہت سی لڑکیوں کا خیال آیا، جن کے متعلق اسے علم تھا کہ ان کی
لڑکوں سے دوستی ہے۔ اور ان میں پرچے بازی ہوتی ہے ــــ اور .. . اور .... اس سے آگے کی باتوں پر وہ خود ہی جھینپ گئی۔ اُس
نے ہاتھ کی آگ کو سینے کی طرف منتقل کیا اور گھر میں داخل ہوگئی۔

گھر پہنچ کر کافی دیر تک اس کو یہ احساس ستاتا رہا کہ کہیں کسی نے یہ واقعہ دیکھ تو نہیں لیا؟ ــــ اس روز کسی کام میں بھی
اس کا جی نہ لگا اور وہ سارا وقت بَولائی بَولائی سی پھرتی رہی۔

رات ہوگئی تھی۔ ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ اوس اتنی تیزی سے گر رہی تھی کہ بارش کا گمان ہوتا تھا۔ بستر صحن سے کمروں میں آ
چکے تھے۔ نوّے گز زمین پر تعمیر کیا ہوا یہ مکان دو کمروں، باورچی خانے، غسل خانے اور مختصر سے صحن پر مشتمل تھا۔ صحن کے ایک حصہ کو بھی
ٹین کے سائبان کی مدد سے کمرے کی شکل دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک کمرے میں وہ خود سوتی تھی اور کبھی اُس کی چھوٹی بہن اور
بھائی بھی اسی کمرے میں سوتے تھے۔ دوسرے کمرے میں اس کی امی، ابّو اور منّی سوتے تھے۔

وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن کونے میں بیٹھے اسکول کا کام کر رہے تھے۔ دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔
پھر بھی اُس نے اطمینان کی خاطر ادھر اُدھر نظر ڈالی اور سینے میں چھپے ہوئے پرچے کو نکال کر ایک کاپی میں رکھ لیا، کاپی کھولی اور نہایت
اطمینان سے لیٹ کر وہ خط پڑھنے لگی ــــ

خط پڑھ کر اُسے بڑی مایوسی ہوئی، کچی اور بچکانہ تحریر میں اس نے بالکل اسی قسم کی باتیں لکھی تھیں جو ایک مرتبہ اس کے خالہ زاد بھائی
نے اُسے لکھ کر دی تھیں۔ شاہد جو کالج میں پڑھتا تھا، اور نذیر جو اس کے مقابلہ میں بالکل ہی اَن پڑھ تھا۔ خط کا مضمون تو ویسا ہی تھا۔

البتہ اس میں ایک بات ضرور ایسی تھی جس کا اُس کے خالہ زاد بھائی نے بھی اپنے خط میں اظہار نہیں کیا تھا۔ اور وہ بات اس خط میں بطورِ خاص تحریر تھی۔ نذیر کے خط میں کافی دنوں سے دیکھتے رہنے اور محبت ہو جانے کے ساتھ ساتھ کہیں مل بیٹھنے کی خواہش کا بھی اظہار تھا۔ اور آیندہ جمعہ کے دن چھٹی سے قبل بس اسٹاپ پر ملنے کی درخواست بھی کی گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک ہدایت نامہ بھی تحریر تھا کہ وہ کس طرح ٹیکسی لے کر بس اسٹاپ کے قریب اس کا انتظار کرے گا۔ اور کس طرح وہ ٹیکسی میں آکر بیٹھ جائے گی۔ اور پھر وہ دونوں کسی کیفے میں چائے پئیں گے۔ اور پھر کسی سینما میں میٹنی شو دیکھیں گے۔

اور اسی بات پر اس کا دل دہل گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے دنوں کے خوف نے اس پر حملہ کیا تھا۔ جوں جوں جمعہ نزدیک آرہا تھا، اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ـــــ

گھر پہنچ کر کافی دیر تک وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا رہی ـــــ آج منگل ہے، کل بدھ، پرسوں جمعرات اور پھر ـــــ جمعہ ـــــ وہ کیا کرے؟ ـــــ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ کتنے ہی خیالات تھے جو اُس کے ذہن میں مسلسل ٹکرا رہے تھے۔ کبھی وہ سوچتی کہ وہ جمعہ کو ضرور جائے گی۔ اور نذیر سے ضرور ملے گی۔ اور اس کے ساتھ سینما بھی ضرور دیکھے گی ـــــ دراصل اس خیال کو تقویت اُسے سہیلیوں سے سنے سنائے واقعات میں شامل ـــــ "ارے بڑا مزا آتا ہے!" قسم کے جملے سے مل رہی تھی۔ بعض سہیلیاں تو اس "مزے" کی تفصیل کچھ اس انداز میں بیان کرتیں، اور اس قدر تفصیل کے ساتھ کہ خود اس کو بھی لذت محسوس ہوتی۔ اور ساتھ ہی اپنی زندگی میں ایک کمی کا احساس شدید ہو جاتا۔ اکثر وہ کہتی ـــــ "تمھیں ڈر بھی محسوس نہیں ہوتا!" لیکن اس سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دیتا۔

اب اس کو ایک موقع ملا تھا اس کمی کو پورا کرنے کا۔ اور اس "مزے" سے لطف اُٹھانے کا جو بڑا جذبات انگیز تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بدنامی، دیکھ لیے جانے کا خوف، اور اخبارات میں خوف ناک قسم کی خبروں کا تصور اُس کے ذہن میں اُبھرتا تو وہ اس روز سکول نہ جانے کا عزم کر لیتی ـــــ لیکن وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔

جمعہ، جو اُس کے لیے ایک عفریت بن گیا تھا۔ خوف و دہشت کی علامت۔

وہ کیا کرے؟ ـــــ کس سے مشورہ لے! کس سے پوچھے! اس کے سامنے کوئی حل بھی موجود نہ تھا۔ اسکول میں یوں تو اُس کی کتنی ہی سہیلیاں تھیں، ایک دوسرے کی رازدار، ایک دوسرے کو اپنے رومانوں کا بڑھ چڑھ کر قصہ سنانے والی سہیلیاں۔ اور وہ آپ کی رازدار تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہفتہ کے دن کا واقعہ وہ اُن میں سے کسی کو نہ بتا سکی۔ ایک بار اُس نے ہمت کر کے شمسہ سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہی تو اچانک جمعہ کا خوف اُس کے حلق میں پھندا ڈال گیا اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

رات زیادہ ہو گئی تھی، باہر صحن میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اور برابر والے کمرے میں بھی، باہر سائبان کے نیچے اس کا چھوٹا بھائی اور بہن سو رہے تھے۔ گھر میں صرف وہی جاگ رہی تھی۔

اُس نے کئی بار سونے کی کوشش کی، لیکن اُسے نیند نہ آئی۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے اس کو بے چینی اور تھکن سی محسوس ہوئی۔ پھر اُس نے کمرے کی لائٹ بجھائی اور چادر تان کر سونے کی کوشش کی۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں بند کیں، نذیر اس کے خیالوں میں آگیا۔ لیکن خلافِ معمول اس وقت نہ تو اُسے خوف محسوس ہوا نہ دہشت۔ اس کے برعکس اس کے تمام جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ پھر ایک مدہوش کن کیفیت پیدا ہو گئی۔ اور تمام جسم میں میٹھی میٹھی آنچ دہکنے لگی۔ اس کو اپنے بدن کے انگ انگ میں کھچاؤ اور تناؤ محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ کوئی اس وقت

آئے اور اُس کے جسم کو اتنے بل دے اتنے بل دے کہ وہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔

یہ احساس اُس کے لیے نیا نہ تھا۔ وہ احساسات و جذبات کی اس جھلسا دینے والی کیفیت سے پہلے بھی گزر چکی تھی۔ اسے شاہد یاد آیا۔ اچھن صاحب یاد آئے۔ اچھن صاحب جو شاہد کے مقابلے میں اسے بے حد پسند تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ اُسے ان سے بہت ڈر لگتا تھا، ہول آتا تھا ــــ

اس وقت وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں آج بھی اسے یوں یاد تھیں جیسے وہ بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہی ہو۔ اچھن صاحب اس کے پڑوس میں رہتے تھے۔ چالیس بیالیس کی عمر تھی۔ ایک دوسرے کے یہاں بلا تکلف آنا جانا تھا۔ اچھن صاحب سے نہ اُس کی امی پردہ کرتی تھیں، اور نہ ہی اس کے ابّو سے اچھن صاحب کی بوڑھی ماں اور سکینہ خالہ۔ سکینہ خالہ جو اچھن صاحب کی بہن تھیں۔ اور بیوہ ہو گئی تھیں۔ اور اچھن صاحب کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ سکینہ خالہ کی لڑکی فہمیدہ سے جو اُس کی ہم عمر تھی اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ اسکول کے بعد سارا وقت وہ فہمیدہ کے ساتھ گزارتی تھی۔

اچھن صاحب بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور اسے بھی وہ بہت چاہتے تھے۔ اور خود وہ کتنی کترائی سے چھپتی پھرتی تھی۔ ڈری ڈری، سہمی سہمی، ایک ہلکا ہلکا دھیما دھیما سا خوف اس کے ذہن پر حاوی رہتا تھا۔ ان دنوں اس کی عمر ہی کیا تھی۔ دس گیارہ سال ہی کی تو تھی۔ جب اچھن صاحب پڑوس میں آن کر بسے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ اچھن صاحب کے پاس جانے کو اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس انجانے خوف کی وجہ وہ خود نہ سمجھ سکی۔ وہ خود چاہتی تھی کہ اچھن صاحب کے پاس جائے۔ اور جب بھی وہ اچھن صاحب کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ اُسے اتنے بہت سے پیار کرتے جو زیادہ تر کٹنے ہی نکلتے۔ اور پھر میٹھے کی تلاش میں وہ بہت دیر سرگرداں رہتے۔ ابتدا میں تو اُسے یہ سب اچھا لگا۔ پھر اُنھوں نے اس کے جسم میں چٹکیاں لینی شروع کر دیں، تو اسے ان چٹکیوں میں بڑا مزا آتا۔ پھر اچھن صاحب چٹکیوں میں اور بھی بے باک ہو گئے، تب اُسے ڈر لگنے لگا۔ پھر اکثر ایسا ہوتا کہ جب کبھی وہ اور فہمیدہ کمرے میں کوئی کام کر رہی ہوتیں، یا کھیل رہی ہوتیں اور اچھن صاحب آ جاتے، تو اُن کو اچانک مختلف کام یاد آ جاتے اور فہمیدہ کو کبھی پانی کے لیے کبھی پان کے لیے اور کبھی سگریٹ منگانے کے لیے بھیج دیتے۔ اور فہمیدہ کے جاتے ہی اُسے گود میں بٹھا لیتے اور ٹانگوں کی قینچی بنا کر یوں چلانے لگتے گویا کپڑا کاٹ رہے ہوں۔ اسے چمٹاتے، پیار کرتے اور چٹکیاں لینی شروع کر دیتے۔ وہ کسمساتی، چیختی، چلاتی، لیکن بے سود۔ وہ اُس کو چھوڑتے ہی نہ تھے۔ اس عرصہ میں اگر کوئی آ جاتا تو اچھن صاحب اس کے گدگدیاں کرتے ہوئے مخاطب ہو جاتے ــــ "بول! ــــ چیں بول جلدی سے ــــ!"

اُن کی ان تمام ناپسندیدہ حرکات کے باوجود اُسے اس ہنگامے میں ایک طرح کا لطف ضرور ملتا تھا۔ یہ کیسا لطف تھا! ــــ یہ سوال اکثر اُس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ اور اُس کے ذہن پر بوجھ بڑھ جاتا۔ اور وہ کچھ نہ سمجھ پاتی۔ اور اپنے آپ کو اچھن صاحب کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کرتی۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اگر وہ اپنے ہی گھر میں ہوئی اور اچھن صاحب اس کے ابّو سے ملنے کیلیے گھر پر ہی آ گئے تو وہ اِدھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتی، لیکن اچھن صاحب اُسے ڈھونڈ ہی نکالتے، وہ اُسے چھیڑتے اور پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیتے۔ اور امی ابو سے گفتگو جاری رکھتے۔

ایک بار اُس نے ایسے ہی موقع پر احتجاجاً امی کو مدد کے لیے بھی پکارا، مگر اُلٹا اُسے ہی ڈانٹ پڑی۔ امی نے اُسے ہی بُرا بھلا کہا ــــ "لے لو، ایک تو بیچارے اتنی محبت کریں ہیں اس سے، اور نواب زادی ہیں کہ دماغ ہی نہیں ملتے" ــــ اور پھر وہ خاموش ہی ہو گئی تھی۔ یہیں سے اُس نے سمجھا کہ جیسے اچھن صاحب کی حرکتیں کوئی انوکھی بات نہیں!

اور یوں وہ اچھن صاحب کی چٹکیوں، بوسوں اور ٹانگوں کی قینچی کی سی حرکتیں سہہ سہہ کر بڑی ہوتی گئی۔ ان سے نجات اس وقت ملی

...ت صاحب نے اپنا کوارٹر فروخت کر کے نیو کراچی میں سستا کوارٹر لیا اور وہاں منتقل ہوگئے۔ کچھ عرصے وہ ایک کمی سی محسوس کرتی رہی۔ اس اور سرور کی کمی کا احساس جس کو وہ کوئی نام نہ دے سکی تھی، جو اُسے جسم پر چٹکیوں، گود میں بیٹھنے اور پیار سے حاصل ہوتا تھا۔ اب یہ سب ...یا تھا ــــ رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتی گئی۔

شاہد ــــ شاہد تو بس یونہی سا تھا۔ وہ اس کی خالہ کا لڑکا تھا، اور کبھی کبھار اس کے یہاں آیا کرتا تھا! اور اس سے فلموں کی ...فیشنوں کی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا تھا۔ اکثر اس کے جسم کے مختلف حصوں سے اُس کے ہاتھ یوں ٹکراتے گویا بے دھیانی، اور ...یں لگ گئے ہوں۔ وہ یہ بات خوب سمجھتی تھی کہ اس میں شاہد کے ارادوں کو دخل ہوتا ہے۔ جب بہت دن اسی طرح گزر گئے تو شاہد ...دن ڈرتے ڈرتے اسے اکیلے میں ایک پرچہ دیا تھا ــــ یہ پہلا پرچہ تھا ــــ اور اس پرچے کو بھی اُس نے بہت احتیاط کے ساتھ چھپ کے پڑھا تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ بس شاہد کو اس سے محبت ہوگئی تھی۔ پھر اس نے شاہد کی حسب ہدایت یہ چپ پڑھ کر اُسی جلا دیا تھا۔

وہ اب بڑی ہوگئی تھی۔ اور زندگی کے بہت سے اسرار و رموز اس پر عیاں ہونے لگے تھے۔ اس کے جسم نے بہت سی کروٹیں لی تھیں۔ ...س کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ اُس نے بہت سی باتیں بڑے صبر کے ساتھ برداشت کی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سوالات کا ایک انبار ...س کے ذہن میں جمع ہو رہا تھا۔

"کیا یہ سب کچھ ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا صرف وہی ایک ایسی ہے!" ــــ یہ سوال اکثر اُسے پریشان کرتا تھا۔ اُس نے ایک بار ...سے پوچھا بھی تھا۔ اور اُس نے اس کا بے حد مذاق اُڑایا تھا۔ تب اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کبھی وہ اس قسم کے سوالات کسی سے نہ ...اور نہ ہی ایسی باتیں کسی سے پوچھے گی۔

اور آج منگل تھا ــــ

جمعہ میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی، نہ ہی اس نے اب تک کسی سے مشورہ لیا تھا۔

وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی ــــ کھڑکی سے جھانک کر گلی میں دیکھا۔ باہر ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ مہیب تاریکی ہر طرف پھیلی تھی ــــ ...تاریکی کا تسلط تھا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ صحن میں تاریکی تھی۔ باہر گلی میں تاریکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پھر اسے یوں محسوس ...یہ اندھیرا اس کے پورے وجود پر پھیلتا جا رہا ہو۔ اور وہ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں ڈوبتی چلی جا رہی ہو۔ اور ایک ہاتھ اُس ...وجود کو اپنے اندر سمیٹ رہا ہو۔ اُس کے جسم کو چٹکیوں میں مسل رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے جسم میں ایک جانا پہچانا ...تھا سا درد اور ایک پر لطف تھکن محسوس کی۔

"اچھن صاحب! ــــ اچھن صاحب!" ــــ اچانک اُسے اچھن صاحب یاد آگئے۔ اچھن صاحب مدت سے اس طرف نہیں ...اکثر وہ سوچا کرتی تھی، اب اگر اچھن صاحب آئے بھی تو کیا! ــــ وہ اب اُسے پیار تھوڑی کر سکیں گے۔ وہ بڑی جو ہوگئی ہے ــــ ...کسی نے نہیں بتائی تھیں، بس اُس نے ایسے ہی سوچا تھا، اور یہ ٹھیک ہی ثابت ہوا تھا۔

لیکن اس وقت اسے جمعہ کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا ــــ

"تو کیا نذیر ....." اُس نے سوچا ــــ کیا وہ بھی اچھن صاحب کی طرح پیش آئے گا، یا شاہد کی طرح، یا دوسرے رشتہ کے

بھائیوں کی طرح ؟ ـــــ اس اچانک سوال پر وہ خود گھبرا گئی ۔

"اگر وہ اچھّن صاحب کی طرح پیش آیا تو ؟" ـــــ وہ اپنے آپ سے بولی ـــ "پھر !" ـــ وہ ایک لمحہ کو ٹھٹکی ۔

"نہیں ...نہیں ـــ میں نہیں جاؤں گی !" ـــ اُس نے اپنا فیصلہ ایک بار پھر دُہرایا اور سونے کی کوشش کرنے لگی ـــ

اُس نے بہت چاہا وہ سو جائے ۔ لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے اُڑ چکی تھی ۔ نیند' خوف اور کمرے کے ڈراؤنے ماحول اور چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی سے اُس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہو رہی تھی ۔ اُس نے اپنے آپ کو بے حد تھکا ہوا محسوس کیا ۔ ایک بار پھر اُس دل کی دبی ہوئی خواہش نے سر اُبھارا ـــ "میں جاؤں گی ـــ میں جاؤں گی !" ـــ اور پھر اُس نے کہا ـــ "آخر کوئی تو ہو' ـــ کو جو اس بے قرار جسم میں چٹکیاں بھرے ، ٹوٹتے ہوئے انگ انگ کو سختی سے اپنے جسم سے چمٹا لے ـــ پیار کرے ـــ رہے ـــ اور . . . ."

اس کے ساتھ ہی نذیر ایک مرتبہ پھر اُس کے ذہن کی سطح پر اُبھرا ۔ وہ بے حد پیاسی تھی ، پیاس بجھانے کے لیے بہانے اور تلاش کر رہی تھی ۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کے دل میں نذیر سے ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی ـــ جمعہ کو اس بے چارے کو کتنی کوفت ہو گی جب نہ پہنچے گی ـــ کسی رومانی ناول میں پڑھا ہوا یہ جملہ ـــ "وہ اُداس ہو جائے گا" ـــ اُس کے لیے جواز بن گیا ۔

لیکن ـــ اگر ابّو کو معلوم ہو گیا تو ! ـــــ پہلی مرتبہ اُس کے ابّو نے اس کے معاملات میں مداخلت کی ۔

ہاں میں نہیں جاؤں گی ! ـــــ اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔ وہ ایک شریف لڑکی ہے ، اور اُسے ایسی باتوں کو سوچنا ہی نہیں چاہیئے ـــ لیکن ـــ اس تھکن کو کیا کیا جائے ! ـــ جو اُس کے جوڑ جوڑ کو توڑے دے رہی ہے !

تھوڑی دیر تک وہ یونہی لیٹی رہی ۔ گہرا اندھیرا پورے ماحول پر پھیلا ہوا تھا ۔ گلی میں سامنے بھینسوں کے باڑے میں اور بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں ـــ

"شاید ڈھائی بج گئے !" ـــ اُس نے یونہی لیٹے لیٹے سوچا ـــ گھوسیوں نے دودھ دُوہنا شروع کر دیا ہے ـــ اس کے تصور میں دوہتی ہوئی بھینس آ گئی ـــ

بھینس کو دوہنے کے تصور کے ساتھ ہی اُس کو اپنے سینے میں ایک طوفان سا اُٹھتا ہوا محسوس ہوا ـــ یہ طوفان بڑا شدید تھا ۔ بہت تیز و تند ، اُس کی سانس اُکھڑ گئی ـــ اُس کی سانسوں میں بے ترتیبی آ گئی ۔ اُس کو اپنے سینے پر اچھّن صاحب کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا ـــ شاہد کے ہاتھوں کی پھسلتی ہوئی رگڑ محسوس ہوئی ۔

وہ اُٹھی ـــ سینے سے نذیر کا پرچا نکالا ' اور اندھیرے میں اُس کے کئی ٹکڑے کر کے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے ـــ آنکھیں پھاڑ کر صحن میں کھلنے والے دروازے کو دیکھا ۔ اور آہستہ سے دروازے کی کنڈی لگا دی ۔

کھلی ہوئی کھڑکی سے دُودھ دوہنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی ـــ بالٹی میں دُودھ کی گرتی ہوئی دھاروں کی "سی سی" کی آوازیں اُبھر رہی تھیں ـــ

وہ پھر اپنے بستر پر آ گئی ـــ اپنے تمام کپڑے اتار دیئے ـــ اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل وہ بستر پر چوپائے کی طرح کھڑی ہو گئی ۔

ڈاکٹر صاحب ! آپ تو خود بیمار ہیں

آمنہ ابوالحسن

سیپ۔ کراچی

بھنور

ننھا سا گھر اچانک ایک چیخ سے گونج اٹھا۔

صحن کی نم مٹی سوکھ چلی تھی۔ پھول مرجھا گئے تھے۔

ادھر ادھر کھیل کود میں مصروف کھلونوں کی طرح بکھرے ہوئے بچے یک لخت سمٹ کر دالان میں آ گئے۔ پڑوس کی دیواروں پر دفعتہً چند چہرے نمودار ہوئے۔ پھر اپنے سامنے گھر پر مسلط بے رونقی سے گھبرا کر اوجھل ہو گئے۔

فرزانہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔ اس نے بڑی بے بسی سے ایک بار چارپائی کی جانب دیکھا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے اس پر رکھا ہوا جسم سفید چادر سے ڈھک دیا۔ اور یہ سفید چادر دفعتہً فرزانہ کی ساری زندگی پر پھیل گئی۔ اور زندگی اچانک کتنی محدود کتنی مختصر اور کتنی بے معنی ہو گئی۔ محض ایک مرد، ایک ساتھی، ایک پالنے والے کے بچھڑ جانے کے باعث۔

وہ غم سے نڈھال ہو کر پلنگ کے پائینتی ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ اور پلنگ کی پٹی پر سر ٹیک کر زور زور سے رونے لگی۔

اگر نصرت اس کی ہچکیاں سن سکتا تو یقیناً لوٹ آتا۔ مگر گھور اندھیرے میں فقط چند شعاعیں تھیں، جن کی روشنی فی الحال بڑی مدھم، مبہم غیر واضح اور ناکافی تھی۔ اس نے چلا کر بچوں کو پکارا۔ اور جب بچے اس کے اطراف جمع ہو گئے۔ تو پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچوں نے حیرانی سے دیکھا۔ بیماری کی حالت میں بھی سونی سونی آنکھوں سے انہیں دیکھنے والا ان کا باپ اس وقت ان سے بالکل غافل اور بے نیاز تھا۔ چادر کے نیچے اس کا بے حرکت، بے آواز جسم ان کی عقل و فہم سے باہر تھا۔ وہ ڈرے ڈرے ماں کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے سب کچھ اسی کی زبانی جاننا چاہتے ہوں۔ مگر ماں کی شخصیت تو آنسوؤں میں بالکل ہی ڈوب چکی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ چھپ چھپ کر رو رہی تھی۔ جب سے ان کا باپ بیمار پڑا اور ڈاکٹر صبح و شام آنے لگے۔ مگر آج تو ماں بے خوف ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار سا بندھ گیا تھا۔ انہیں عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب خوفزدہ ہو کر پلنگ کے اطراف چپ چاپ بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے کھلونے پھینک دیے۔ سوندھی سوندھی مٹی سے اٹے اپنے ہاتھ کرتوں کے دامن سے رگڑ رگڑ کر خود ہی صاف کر لیے۔ نامعلوم خوف کے احساس سے ان کے دل پنڈولم کی طرح ہلنے لگے۔ پھر گھر کے ہیبت ناک سناٹے سے گھبرا کر دیواروں پر سے جھانکنے والے سارے پڑوسی ایک ایک کر کے دروازے میں نمودار ہونے لگے۔ اور سبھوں نے دیکھا کہ اس گھر کی زندگی تو بہہ چکی۔ ویرانی گھر پر اپنا تسلط جما چکی۔ سفید چادر نے ایک جسم کو نہیں ڈھکا۔ بلکہ ایک پورے گھر کی خوشیاں اور خوش حالیاں چھین لیں۔ اور گھر میں آنسو تھے۔ آہیں تھیں۔ اور اس بری زندگی کا بخشا ہوا اثاثہ چند بچے جو ایک عورت کی خالی گود میں پڑے ہوئے تھے اور اضطراب سے

کی ہستی کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔

آنے والوں کی آہیں نکل نکل گئیں۔

ہائے یہ عورت جو بالی عمر میں بیاہی گئی۔ بابل کی دہلیز پر بیٹھ کر جس نے ہمیشہ سپنوں کے جال بنے۔ بابل کی دہلیز چھوڑ کر سسرال سدھاری تو وہاں ہر وقت مستقبل کے نت نئے خاکوں میں زندہ اور شوخ رنگ بھرتی رہی جس نے زندگی کے کارواں کو آگے بڑھانے میں اپنا پورا حصہ ادا کیا۔ جس نے زندگی سے کم لیا۔ مگر زندگی کو زیادہ دیا۔ پھر بھی کوئی شکایت نہ کی۔ جس نے کبھی سکھ کی نیند نہ لی۔ بلکہ گردش دوراں کے کولھو میں محض ایک بیل کی طرح جتی رہی۔ جس نے دن انتظار میں، شامیں اہتمام میں اور لمبی کٹھن راتیں شوہر کی پرسکون نیند کے جتن میں چپ چاپ کاٹ دیں۔ جو ہر حال میں خوش رہی۔ جس نے کبھی نہ کہا کہ اسے شوہر اور بچوں کے علاوہ بھی کچھ چاہیے۔ ہائے وہ اتنی سی عمر میں اجالوں سے محروم اندھیروں کا شکار ہو گئی۔ اب کیسے کیسے سانپ بچھو اسے نہ ڈسیں گے۔ اور وہ اُف بھی نہ کر سکے گی۔ کیسے کیسے گھاؤ رِسنے لگیں گے۔ اور وہ چلا بھی نہ سکے گی۔ کیونکہ اب اُس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا، اس پر سایہ کیے رہنے والا کوئی نہیں۔ اسے اکیلے ہی دنیا کا مقابلہ کرنا اور جینا ہے۔ گھر کی فکر کرنا اور بچوں کو سنوارنا ہے۔ دنیا سے لڑ کر جیتنا ہے۔ اب وہ گھر کے اخراجات میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر اپنی ضرورت و شوق کی چیزیں نہیں منگا سکے گی۔ اپنی سفید ساڑیاں گلابی، بسنتی، دھانی پستئی رنگوں میں نہیں رنگ سکے گی۔ انہیں کلف اور مایہ نہیں لگا سکے گی۔ انہیں عطر اور بیلے کی خوشبودار دھوئیں سے معطر نہیں کر سکے گی — بلکہ یوں ہی بے رنگ اور سفید کپڑے اپنے جسم سے لپیٹ لے گی۔ کفن کی طرح۔

کفن جو ایک مٹی ہوئی ہستی کا گردپوش بنا ایک جیتی جاگتی ہستی کا لباس بن گیا۔ اور ساری سہاگن عورتوں نے بڑی حسرت، بڑی ہمدردی سے اس بنفشی ساڑھی کو دیکھا۔ جو اب تک آئندہ چند لمحوں تک فرزانہ کے جسم کی زینت بنی ہوئی تھی۔ اور ساری سہاگن عورتوں نے لرز کر کپکپا کر اسی لمحے اپنے اپنے سہاگ کی برقراری کی دعائیں مانگیں، اپنی چھم چھماتی چوڑیاں یوں چوم لیں جیسے اپنا سہاگ چوم رہی ہوں۔ تب اچانک لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ عزیز اقارب۔ دوست احباب، ملنے جلنے والے، پڑوسی سب ایک کر کے جمع ہونے لگے۔ سب کے چہرے اترے ہوئے افسردہ اور ملول تھے۔ سب کے دل ایک انسان کے بچھڑ جانے کے غم ناک احساس سے بوجھل۔

فرزانہ ہوش و حواس کی کیفیتوں سے بہت آگے جا چکی تھی۔ اسے نہ زندگی کی آسائشوں کے چھن جانے کا غم تھا نہ حیات کی جگمگاہٹوں کے گم ہو جانے کا۔ وہ ان خیرگیوں کے بغیر بھی جی سکتی تھی۔ بشرطیکہ اس کا ساتھی نہ بچھڑتا۔

اس نے ایکبارگی پھر تڑپ کر نصرت کے بے جان چہرے پر سے چادر کھینچ لی۔ "مجھے دیکھو، مجھے دیکھو۔ کیا یوں ہی بے آسرا چھوڑ کر چلے جاؤ گے"

مگر نصرت نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ فرزانہ کو نہیں دیکھا۔ بلکہ مجمع میں سے چند عورتیں اٹھیں اور انہوں نے فرزانہ کو تھام لیا۔ "صبر کرو فرزانہ بیٹی — جلد یا بدیر، ہر انسانی زندگی کی یہی منزل ٹھہری۔"

"منزل؟" فرزانہ نے سوچا۔ کیا یوں بے یار و مددگار بیچ اُدھر چھوڑ جانے کو منزل کا نام دیا جا سکتا ہے۔؟

منزل تو وہ ہوتی ہے جہاں آدمی شاد کام و کامراں پہنچتا ہے۔ فرائض سے سبکدوش و سرفراز ہو کر، اور اس نے بھری بھری آنکھوں سے اپنے بچوں کی جانب دیکھا۔ اب انہیں تعلیم کون دلائے گا۔ کون ان کی خوشیاں دیکھے گا۔ کون انہیں بڑھتے پھیلتے پھولتے دیکھے گا۔ کون انہیں لائق فائق بنائے گا۔ گھر سے باراتیں گئیں نہ آئیں۔ سہروں کی کلیاں کھلیں نہ مرجھائیں۔ اور وہ ایک جھونکے کی طرح گزر گئے میں اکیلی کیسے یہ کام نمٹاؤں گی۔ وہ پھر بلک کر لاش کی طرف لپکی۔ جیسے ہمیشہ خاموش رہنے والی زبان کھول کر ایک دم ہی یہ سب کچھ کہہ دینا چاہتی ہو۔ کہ میں تو بس تمہارے سہارے زندہ تھی بہت سے اتحاد سے مضبوط مگر تم نے یہ کیا کیا؟ اس نے بچوں کی طرف دیکھ کر پھر بڑے زور کی چیخ ماری۔ اور بچوں کی ننھی آنکھوں سے بھی ننھے ننھے آنسو موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگے۔ واقعات کے فہم و ادراک سے بے خبر وہ سہمی سہمی نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے رہے۔ جو کسی ذبح کیے

ہوئے پرندے کی طرح تڑپے جا رہی تھی۔ مارے ڈر کے وہ ماں کے آنسو بھی نہ پونچھ سکے۔ رندھے ہوئے گلوں سے یہ بھی نہ کہہ سکے۔ بابا جاگ جاگتے کیوں نہیں۔ ماں کو دیکھتے کیوں نہیں۔ رونے سے روکتے کیوں نہیں۔ بلکہ انہیں بابا کے یوں خاموش بے حس رہنے پر دل ہی دل میں سخت غصہ آیا۔ اور روشن گرم دوپہران سب واقعات سے بے نیاز دبے دبے قدموں سے دھیرے دھیرے سرک گئی۔ سانجھ کی سرحدوں پر سورج اوجھل ہونے لگا۔ سائے پھیلنے لگے۔ نعش غسل کے لیے لے جائی گئی۔

غسالوں نے اپنے کھردرے بے رحم ہاتھوں سے نعش کا سواگت کیا۔ انہیں احساس نہیں تھا کہ یہ ایک جسم ہے۔ نرم و ملائم۔ جس سے اگرچہ روح چھن چکی ہے احساس ختم ہو چکا ہے تاہم ـــــ

بڑے کاروباری انداز میں انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور پردے کی اوٹ میں فرزانہ کانپتی رہ گئی۔ اوبے دردو۔ دھیرے دھیرے اس جسم کے سکھ کے لیے میں نے کیا کیا آفتیں خود برداشت نہ کیں۔ فرزانہ کا جی چاہا دوڑ کر نعش ان کے سفاک ہاتھوں سے چھین لے۔ لمدر زندگی بھر کی طرح یہ آخری خدمت بھی خود ہی کر ڈالے۔ مگر مشیت اقتدار کی ریشمی ڈور اس کے ہاتھ سے چھن چکی تھی۔ اور سب کچھ اس کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا وہ بے بس کھڑی آنسو ٹپکاتی رہی۔ بارے یہ کرب ناک مرحلہ بھی تمام ہوا۔ نعش سجا سنوار کر، خوشبوؤں سے معطر کر کے آخری سفر سے قبل آخری دیدار کے لیے رکھ دی گئی۔ لوگ بے قراری سے اُمڈنے لگے۔ ایک دوسرے کو دھکیلتے ایک دوسرے کو ریلتے۔ وہی لوگ جنہوں نے زندگی کا اتنا شاندار خیر مقدم نہ کیا۔ اب موت کا کر رہے تھے۔ اور کیسے بزدل بن گئے تھے۔ اپنی اپنی ہستیوں اور اس کی فانی حقیقت سے آگاہ اور خوفزدہ خوفزدہ ہمدرد بازوؤں کے حلقے میں فرزانہ لڑکھڑاتی لڑکھڑاتی آگے بڑھی۔ اس تخت کی جانب جہاں اس کا سب کچھ ایک بیکار گٹھڑی کی طرح رکھا ہوا تھا۔ کہ دفعتہً جیسے کسی ڈرامے میں کوئی اچانک بات اَن ہونے انداز میں وقوع پذیر ہو کر لوگوں کو بوکھلا دیتی ہے۔ اسی طرح ایک لڑکی بھیڑ کو چیرتی ہوئی فرزانہ سے بھی زیادہ روتی چلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے لوگوں کا خیال نہیں کیا۔ فرزانہ کا خیال نہیں کیا۔ دنیا سے مطلق نہیں ڈری بلکہ سب کے دیکھتے دیکھتے بے اختیار جھکی اور دیوانہ وار نعش سے لپٹ گئی۔ اس نے بے قرار ہو ہو کر نعش کا ماتھا، رخسار اور ہونٹ چوم ڈالے۔ پھر اپنا زندگی سے بھرپور چہرہ نعش کے ساکت زندگی کی حرارت سے محروم چہرے سے رگڑنے لگی۔ آنسو اس کے چہرے سے نعش کے چہرے پر ٹپکتے رہے۔ اور عورتیں حیرت و ہیبت سے جہاں کی تہاں مبہوت کھڑی رہ گئیں۔ فرزانہ کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ کسی طرح نہ کہہ سکی۔ یہ ایک آدمی نہیں ایک لاش ہے اور لاش کسی کو کچھ دے لے نہیں سکتی۔ اور پھر یہ تمہاری نہیں میری لاش ہے۔ اس سے تمہیں مطلب؟ اور لاش کو تو فقط دیکھنے کی اجازت ہے۔ اسے چھونے چومنے، مَس کرنے کی نہیں اس لیے اب پرے ہٹ جاؤ۔

مگر فرزانہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں اچانک سوکھ گئے اور چیخیں اندر ہی اندر حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔ پھر حالات سے واقف ہو کر چند مرد دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے کوئی لحاظ کیے بغیر لڑکی کو نعش سے پرے کھینچ لیا۔ نعش ڈھک دی گئی۔ نعش اٹھا دی گئی۔ فرزانہ نے اپنے شوہر کا آخری دیدار نہیں کیا۔ وہ بت بنی بس یہی سوچتی رہ گئی۔ کہ یہ لڑکی کون ہے۔ میرے شوہر کی زندگی اور اس کی موت پر اس کا کیا اختیار؟ ـــ

جب لوگ ڈولا اٹھا کے گھر سے باہر نکل گئے۔ تو ایکبارگی ہی ایک تیز چیخ فرزانہ کے حلق سے نکل کر اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ اور اس نے بڑے زور سے اپنا ماتھا دروازے پر دے مارا، اور بڑی تکلیف، بڑی جانکاہی اور اذیت سے اپنے رخصت ہوتے ہوئے شوہر سے پوچھنے لگی: ٹھہرو ٹھہرو، کچھ تو بتاتے جاؤ، کم از کم اتنا ہی کہ میری زندگی میں دوسروں کا کیا حصہ؟ مگر بند ہونٹ تو ایک سربستہ راز اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے کھل نہ سکے۔ فرزانہ کو بتا نہ سکے کہ کچھ بے حد اہم اور قیمتی چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں انسان دنیا کی نگاہوں سے بچا کر بھی خود کو چور محسوس نہیں کرتا بلکہ اتنی بڑی۔ یا میں یہ بالکلیہ اس کا اپنا حصہ ہوتے ہیں۔ اور اتنی بڑی دنیا کے مقابل محض اس کی اپنی مختصر سی ذات کی تکمیل و تشکیل کا واحد

سبب۔ پھر انہیں وہ دنیا میں کیوں جانے۔ کسی کو ان کے بارے میں کیوں بتائے؟ مگر لڑکی کی جسارت نے فرزانہ کو بتا دیا تھا کہ جس کو وہ زندگی بھر اپنا سمجھتی رہی۔ وہ اس کا نہیں پرایا تھا۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی یک لخت فرزانہ کو اپنی ساری زندگی بڑی عجیب اور نا فہم محسوس ہوئی۔ قطعی اجنبی جیسے اب تک وہ جس ڈگر جس راستے پر چل رہی تھی وہ قطعی اس کا اپنا نہ تھا۔ تو کیا وہ ایک فریب شدہ ہستی تھی۔ اس کی اپنی ذات کی کوئی سچائی کوئی اصلیت نہیں؟ ساری دنیا ایک پرچھائیں کی طرح لرزی اور فرزانہ کی آنکھوں تلے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ جب اسے ہوش آیا۔ دوبارہ اس کا احساس بحال ہوا۔ تو اسے ساری دنیا اور خود اپنی ہستی بڑی ذلیل اور بڑی مشکوک نظر آئی۔ بوند بوند اکٹھا کرکے زندگی کے جس بڑے ساگر کو بڑے جتن سے اس نے اپنی ہستی میں سمیٹا تھا وہ ایک دم ہی کسی خوفناک مہیب دلدل کی طرح دنیا سے اپنا حساب چکانے کے لیے بے قرار ہو گئی ہر اس شے کو ہڑپ کر جانے کے لیے بے چین جس نے اسے دھوکا دیا۔ زندگی کے نام پر اس سے جینے کا انتقام لیتی رہی۔ حتیٰ کہ نصرت نے بھی اسے نہیں چاہا۔ چاہت کا محض ڈھونگ کرتا رہا۔ ورنہ کسی ڈرامائی حادثے کی طرح زندگی کے حقیقی اسٹیج پر آخری منظر میں اچانک وہ لڑکی نمودار نہ ہوتی۔ اور فرزانہ اپنی قیمتی ترین چیز کے چھن جانے کی اندوہناک اور تلخ حقیقت بھی پورے کرب اور پوری شدّت و سچائی کے ساتھ برداشت کر لیتی۔ لیکن وہ لڑکی؟

وہ لڑکی جس نے بساط الٹ پلٹ دینے کی بجائے ساری بازی بڑی ہوشیاری، بڑی مکاری سے خود کو دنیا سے علیحدہ رکھ کر جیت لی۔ اور فرزانہ کی حیثیت محض اس کھلاڑی کی بنا ڈالی جو زیست کی اتنی اہم دوڑ میں محض ضابطے کے طور پر شریک کر لیا گیا ہو۔ لیکن دوڑ جیت نہ سکا بلکہ الٹا اپنی قوت زائل کر بیٹھا۔

فرزانہ نے ذرا سا سر ابھار کر سوگوار عورتوں کے ہجوم میں اس لڑکی کو تلاش کیا۔ مگر وہ اسے نظر نہ آئی۔ اور شدید نفرت شدید کرب دل میں لیے فرزانہ ہجوم سے گھبرا کر اس کمرے میں چلی گئی۔ جہاں نصرت نے اپنی بیماری کا سارا زمانہ کراہتے سسکتے ہوئے اس کے ساتھ گزارا تھا جہاں نصرت کی تیمارداری کرتے ہوئے فرزانہ نے نہ طلوع ہونے والے دن کی روشنی محسوس کی تھی۔ نہ بھری دوپہر کی جگمگاہٹ، نہ شب کی گھٹا ٹوپ تاریکی۔ مگر آج وہ معروفیت ختم ہو چکی تھی۔ اور فرزانہ کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ اسے دنیا بھر سے۔ دنیا کی ہر پسندیدہ و ناپسندیدہ شے سے سخت اکتاہٹ اور بیزاری ہو رہی تھی۔ اپنی ہستی اسے اس تناور پیڑ کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جس کی اونچائی اور گھنیری چھاؤں سے للچا کر پرندوں نے اس کی ڈالوں پر بسے اپنے گھونسلے بنا لیے اور اپنے شب و روز گزار کر پھر سے اڑ گئے۔ تو اکیلے درخت اور اس کی چھاؤں کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی۔ وہ غم ذات میں گم کھڑا رہ گیا۔ اسی وقت کہیں نہ کہیں سے روتے بسورتے سہمے ہوئے بچے فرزانہ کے اطراف جمع ہو گئے۔ وہی بچے جنہیں بڑا کرتے کرتے فرزانہ کی عمر کے درخشاں ماہ و انجم دھندلکوں میں نہاں گردش دوراں کی نذر ہو گئے۔ جنہیں مسرّت و کامرانی کی منزل تک پہنچانے کی دھن میں وہ خود اپنے آپ کو بھول گئی۔ تب سوکھے ہوئے سہمے بچوں نے فرزانہ کی آنکھوں میں پھر پوری شدت کے ساتھ ابل پڑے اس نے بے اختیار بچوں کو سینے سے لپٹا لیا۔ نصرت پر، دنیا پر، خود اپنی حماقتوں اور بھول پر آیا ہوا غصہ ان ننھے منے مگر مضبوط سہاروں کو پا کر ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔ اس نے غور سے بچوں کی طرف دیکھا۔ بڑے کے ہونٹ بالکل نصرت جیسے تھے۔ منجھلے کی آنکھوں میں وہی بے قراری۔ منے کے ہاتھ پیر تو ایسے جیسے کسی نے تراش کر نصرت کے بڑے ہاتھ پاؤں کو چھوٹی شکل دے دی ہو۔ اور لڑکی کا لہجہ بالکل جیسے نصرت خود بول رہا ہو۔ اس نے سارے بچوں کو سمیٹ کر قریب کر لیا۔ زندگی نے کچھ نہ کچھ تو اسے ضرور دیا۔ جبکہ وہ اجنبی لڑکی بالکل اکیلی بے سہارا لگ رہی تھی۔

سکون کے ایک نئے احساس کے ساتھ فرزانہ بچوں سمیت کمرے سے باہر نکل کر رکے ہوئے کام نمٹانے لگی۔ اگر چھت گر پڑی ہے تو کیا ہوا گھر کے ستون تو موجود ہیں۔ وہ ان ستونوں کی چھاؤں میں بیٹھ گی۔ اور۔ اور سکڑتی ہوئی، سمٹی ہوئی محدود زندگی کسی بے کراں سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتی ہوئی نظر آنے لگی اور فرزانہ نے صاف کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ زندگی کے گرداب میں اس بار اجنبی لڑکی ڈوب رہی

(باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

ماہنامہ **نقش** کراچی

جناب عبدالغفور

اور

جناب سلطان محمود

کو

انکے ادارہ **یونائیٹڈ ایڈورٹائزرس** کراچی کی

پندرھویں سالگرہ

کے مبارک موقعہ پر خلوص دل کے ساتھ

ہدیۂ تبریک

پیش کرتا ہے

آثم مرزا

افکار کراچی

آوازوں کا پتھراؤ

گلی میں نسوانی قہقہہ اچھلا اور ہم چاروں کھڑکی پر آ گئے۔

محلہ میں ہمارا دوسرا دن تھا۔

پہلا دن سامان کو ترتیب دینے میں گزر گیا تھا۔ کسی سے شناسائی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ کسی کے چہرے کی پہچان نہ ہوئی تھی۔ گلی میں آمد و رفت بھی بہت کم تھی۔ گلی کے سبھی مکان اتنے بڑے تھے کہ بچوں کو کھیلنے کے لئے باہر آنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ لوگ زیادہ تر کاروباری تھے۔ صبح جاتے اور شام کے بعد واپس لوٹتے اور پھر باہر نہ نکلتے تھے۔

ہمیں بڑی سفارش سے محلہ میں ایک کٹ وہ بیٹھک کرائے پر ملی تھی۔ ہمیں محتاط رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ شریفوں کے محلے میں اپنا وقار پیدا کرنے کا ہر ایک نے عہد کر لیا تھا۔

ہم چاروں مختلف دفاتر میں ملازم تھے چونکہ ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے اس لئے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ کھانا جس ہوٹل میں کھاتے تھے وہ بھی زیادہ دور نہ تھا۔

باہر نکلتے وقت ہی ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کسی دل کش منظر کی اس کھلی گلی میں امید رکھنا عبث ہے اور اگر کسی کی جھلک نظر آ گئی تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا کیونکہ بازاروں میں گھومتے رہنے سے آنکھیں اپنی پیاس فراوانی سے بجھا لیتی تھیں اور جب ہم محسوس کرتے کہ ابھی جذبات کی شدت باقی ہے، تو اسٹیشن آ جاتے اور پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر یوں پلیٹ فارم پر چکر لگاتے رہتے۔ جیسے طویل سفر پر جانے کی وجہ سے در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈال رہے ہیں۔

لیکن جب گلی میں نسوانی قہقہہ اچھلا تو ہم سب بے اختیار ہو گئے۔

کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھول کر شریف نے باہر جھانکا۔ کلیم نے اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی جما دی۔ چودھری ایڑیاں اٹھا اٹھا کر جھانکنے لگا۔ میرے لئے کوئی جگہ باقی نہ بچی تھی۔ میں نے شریف کو زور سے گدگدایا۔ وہ پیچھے ہٹا تو کلیم کا توازن بھی قائم نہ رہ سکا میں اس لمحے سے فائدہ اٹھا چکا تھا۔

گلی میں ایک نوجوان لڑکی تکونے برقع کا نقاب اٹھائے، نظریں اوپر کئے کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

ابھی چند لمحے ہی وہاں ٹھہر سکا۔ شریف مجھے پرے دھکیل کر اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔

میں چارپائی پر بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگا! چند لمحے ... زندگی کے بائیس برسوں پر محیط ہو چکے تھے۔ ایک لمحہ ہی کائنات کی کایا پلٹ کے لئے کافی ہوتا ہے — ایک لمحہ جس میں وقت کی وسیع خلیج سمٹ کر قطرہ بن جاتی ہے۔ ایک لمحہ جس میں قلو پطرہ سے لے کر سوہنی تک کا سارا حسن جامد ہو جاتا ہے — وہ ایک لمحہ، چند لمحوں میں ڈھل کر میری آنکھوں کی پتلیوں میں جم کر رہ گیا۔ میرے دل کی پہنائیوں میں ایک چمک جو ندپیدا ہوئی۔ اور میرے شعور کی ساری سلوٹیں منور ہو گئیں۔

وہ لمحہ، اڑتے بادل کے سائے کی مانند بھاگ گیا۔ لیکن ہم چاروں یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔

ابھی ہمیں سستانا تھا، پھر کھانے کے لئے باہر نکلنا تھا۔ لیکن بے خوابی کے مریض کی مانند سب کی آنکھوں میں ایک چبھن تھی ایک تجسس جھانک رہا تھا۔

میں یوں محسوس کرنے لگا۔ جیسے ہم کسی صحت افزا مقام پر آئے ہوئے مختلف ممالک کے سیاح ہوں۔ جو ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہوں۔ جن کی کوئی قدر مشترک نہ ہو اور رقص گاہ میں بیٹھے ایک ایسا نغمہ سن رہے ہوں جس کی لے بے حد مسحور کن اور کیف آور ہو۔ لیکن جس کے بول سمجھ سے بالاتر ہوں۔

چودھری نے کسمسا کر کہا۔ "کب تک ہم یہاں ٹھہرے رہیں گے؟"

کلیم نے گہرا سانس بھر کر کہا "جب تک مسمریزم کا اثر زائل نہ ہو جائے۔"

شریف مجھ سے مخاطب ہوا "آؤ ملک ہم چلیں۔ دوپہر کو چائے کا صرف ایک کپ پیا تھا۔"

میں نے سب کی آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے ہر جگہ اپنے جذبات ہی کا رنگ نمایاں نظر آیا۔

پھر یک دم چودھری قہقہہ لگا کر میرا کندھا دبانے لگا۔ "ہم سب کتنے بیوقوف ہیں۔ پیٹ میں بھوک انتڑیاں چبا رہی ہے اور سر پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔"

کلیم کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

میرے کھڑے ہونے پر شریف نے تالا اٹھایا۔ دروازے کو تالا لگا کر ہم نظریں جھکاتے ہوئے گلی میں سے گذرے اور بازار میں آ کر یوں سانس لینے لگے جیسے تاریک غار میں سے نکل کر آئے ہوں۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہ کی۔

ہوٹل میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ وہاں ابھی زیادہ شور نہ تھا۔ کونے والی میز کے گرد بیٹھ کر بات کرنے کے لئے موضوع تلاش کرنے لگے۔

اس سے پہلے ہم نے یوں گھٹن محسوس نہ کی تھی۔ ہزاروں موضوع تھے۔ ناواقفیت کے باوجود جن پر ہم دل کھول کر بحث کیا کرتے تھے لیکن اب یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے بات شروع کی اور وہ کسی جرم کا مرتکب ہوا۔

چودھری نے ہوٹل کے ملازم ناٹے قد کے باقر کو آواز دی۔ "ارے باقر، جگ میں پانی لے آ۔"

کلیم نے گلے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "یار، عجیب الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے کبھی اتنی شدت سے پیاس محسوس نہ کی تھی۔ نہ جانے یہ اس حسن کی گرمی کا اثر ہے!"

شریف میز پر کہنیاں ٹکا کر بولا "ظالم کا حسن اتنا تحیّر زا تھا کہ سوچنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔"

میں نے ہونٹے سے کہا۔ "ہمیں ہو کیا گیا تھا۔ سب کسی جادو کے زیر اثر آ گئے تھے۔ پہلا موقع تھا کہ ہم میں سے ہر ایک پر وارفتگی کی

کیفیت طاری ہوگئی تھی۔

چودھری نظریں گھما کر بولا۔ "میں خود حیران ہوں کہ ہم جو حسن کو دیکھنے کے بعد پرکھنے کے عادی ہو چکے ہیں یوں سدھ بدھ کیسے گنوا بیٹھے"

شریف نے یقین دلانے کی خاطر کہا۔ "صورتیں تو بہت دیکھیں۔ لیکن اس کی کوئی مثال ہی نہیں۔ وہ ہماری گلی ہی کی رہنے والی ہے بائیں طرف کے تیسرے مکان کے دروازے پر پہنچ کر اس نے برقع کا اوپر کا حصہ اتار لیا تھا۔

میں نے انھیں ورغلانے کی خاطر کہا۔ "ہمیں اس طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیئے۔ ہم کسی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتے۔ جو دیکھ لیا بس اتنا ہی کافی ہے۔

شریف نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

چودھری نے اس کی نیت کو بھانپ کر کہا۔ "ملک نے ٹھیک ہی کہا ہے اس عورت سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے اور پھر ہمارا ساطہ ہی کیا ہے ایک معمولی کلرک کہاں تک چھلانگ لگا سکتا ہے۔"

مجھے بات بڑھانے کا بہانہ مل گیا۔ "ابھی تو صرف ایک بار دیکھنے ہی سے کھنچاؤ پیدا ہو گیا ہے اور خدانخواستہ اس نے کسی سے بات کر لی اگرچہ اس کا امکان نہیں۔ تو پھر ہم میں سے شاید کوئی قتل بھی ہو جائے۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

اور کلیم نے پانی کا دوسرا گلاس ختم کر کے کہا۔ "تم تو یوں بات کو طول دے رہے ہو۔ جیسے عشق کا کھیل تم برسوں سے کھیل رہے ہو۔ پانی کے دو چار گلاس پیو۔ خون کی کھولن ختم ہو جائے گی۔"

میں اب خوشی محسوس کر رہا تھا کہ دوساتھیوں کو اپنا ہمنوا بنا کر شریف کو شکست دے دی ہے اب کوئی بھی اس لڑکی کو اہمیت نہ دے گا۔ مجھے اس تک رسائی حاصل کرنے کی راہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ شاید دوسرے بھی ایسا ہی سوچ رہے ہوں میں نے اس طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شریف نے ہوٹل سے باہر نکل کر کہا۔ "میں تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔ دفتر میں بے حد مصروف رہا ہوں اس میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

جی تو میرا بھی کہیں اور جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن میں خود کو دوسروں کی نظروں میں گرانا نہ چاہتا تھا۔ میں نے بے نیازانہ لہجے میں کہا۔ "ہم تو بازار کا چکر لگائے بغیر گھر واپس نہ جائیں گے۔ تم جا سکتے ہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

اس کے جانے کے بعد کلیم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ "بڑا آیا شاہ بہرام کہیں کا۔ جیسے وہ اس کے انتظار میں گلی میں ہی کھڑی ہو گی ہونہہ۔"

اس دن کے بعد ہم میں سے ہر ایک اسی ٹوہ میں رہنے لگا کہ اس لڑکی سے پوری طرح آگاہی حاصل کی جائے۔

گلی کے نکڑ پر ایک پنواڑی کی دکان تھی جسے ادھر سے گزرتے ہوئے میں سلام کرنے لگا آہستہ آہستہ اس پر میں اپنی اہمیت جتلانے لگا تھا پان لینے کے بہانے لکڑی کی بنچ پر بیٹھ کر میں اسے نئی فلم کے پوسٹر پر باتیں کرنے لگتا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بھی میری ذات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے اس گلی کے تقریباً سبھی مکینوں کے نام اور کام معلوم کر لیے۔

ہر بات میں وہ نگینہ کا ذکر ضرور لے آتا۔ اس کی دونوں کنواری بیٹیوں کو موضوع گفتگو بنا کر اس کی آنکھوں میں بھی حریصانہ چمک پیدا ہو جاتی تھی وہ یوں الفاظ چبا چبا کر ادا کرتا جیسے اس کا بس چلے تو وہ عارفہ اور صادقہ دونوں کو پان کی گلوری بنا کر کلے میں دبا لے اور

سمجھائے ۔

وہ دونوں ہماری دسترس سے باہر تھیں۔ ان تک پہنچ ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ ہم اس ٹوہ میں لگے رہتے تھے کہ کوئی بہانہ ملے اور ہم نگینہ کی ہمدردی حاصل کر سکیں۔

بنواڑی نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ جس پر نگینہ مہربان ہو، محلہ میں کوئی اس طرف انگلی اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ جیز مین کا بھتیجا اشرف اس کے گھر میں بے جھجک آتا رہتا تھا۔ خواجہ نیاز کی وجہ سے نگینہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ خواجہ نیاز کپڑے کی ایک مل کا مالک تھا۔ اونچی کرسیوں تک اس کی پہنچ تھی۔ شہر کے مشہور بدمعاش اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ بیوی فوت ہو چکی تھی ایک ہی لڑکا تھا۔ جو زیادہ وقت کار میں گھوم کر گذارنے کا عادی بن چکا تھا۔

ایک شام بنواڑی نے ریڈیو کا بٹن گھماتے ہوئے آنکھ کے اشارے سے گلی میں داخل ہونے والے ایک ادھیڑ عمر کے خوش پوش آدمی کی طرف توجہ دلائی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ درمیانہ قد اور دوہرے بدن کا آدمی کندھے اٹھائے آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔

بنواڑی نے طنز کے ساتھ کہا۔ "یہ ہے خواجہ نیاز ہمارا دشمن نمبر ایک اس نے نگینہ کو اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ وہ ہر ایک کی پگڑی اچھال دیتی ہے۔"

میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "نگینہ میں ایسی کیا خوبی ہے جو خواجہ جیسا مال دار آدمی اس کی محبت کا دم بھرتا ہے۔؟"

بنواڑی ہنس پڑا۔ "بابو جی آپ بھی کتنے بھولے ہیں۔ یہ سب عارفہ کے حسن کی کرشمہ سازی ہے۔ نگینہ لاکھ میک اپ کرے لیکن اسی۔ بہ سا سامی کو نہیں پھانس سکتی۔ وہ تو عارفہ کی خاطر ہی روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔"

"اور جیز مین کا بھتیجا؟"

"وہ بھی عارفہ کا شیدائی ہے"

"اور نواب زادہ راجہ حبیب؟"

"سبھی عارفہ پر مرتے ہیں اور نگینہ سب کو بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"لیکن مرنے والے کیا رقابت کی آگ میں نہیں جلتے؟"

"کون کسی کو بیاہ رچانا ہے۔ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے جب تک ہوائیں خوشبو رچی ہے سبھی گہرے سانس بھر کر مست ہو رہے ہیں جب کبھی بدبو پیدا ہوئی سبھی کہیں دور ٹھکانہ تلاش کر لیں گے۔"

"تو کیا نگینہ ساری عمر لڑکیوں کو گھر بٹھائے رکھے گی۔؟"

"ابھی تو وہ اس مسئلہ پر غور کرنا بھی گوارا نہیں کر سکتی۔"

میں تو بالکل ناامید ہو گیا تھا۔ بنواڑی سے جو معلومات حاصل ہوئیں۔ میں دوسرے ساتھیوں کو بتا دیتا تھا۔ ان بڑے لوگوں کے سامنے ہماری بساط ہی کیا تھی لیکن عشق کا بھوت بڑا بے رحم ہوتا ہے جتنی زیادہ حالت بگڑتی جائے اتنا ہی اسے ستانے میں مزا آتا ہے ہم میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت شریف کی تھی۔ دوسروں نے تو ابھی تک اپنے جذبات کو رسوائی سے بچانے کی خاطر بے قابو ہونے دیا تھا۔ لیکن شریف بے بس ہو گیا تھا رات کو کئی بار آنکھ کھلنے پر اسے کمرے میں ٹہلتے ہوئے پاتا۔ وہ عجیب عجیب حرکات کرتا۔ تکیہ کو بعض میں دبا کر انگریزی فلموں کے رومان پرور منظر کی مانند تکیہ پر رخسار رگڑ کر گہرے سانس بھرتا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب وہ کسی دماغی عارضہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

ایک دن دفتر سے واپس آیا تو گلی میں گالیوں کی آوازوں کا پتھراؤ ہو رہا تھا۔ پنواڑی نے کہا بھی تھا کہ نگینہ آپے سے باہر ہو گئی ہے وہ ٹھیکیدار کی بیوی پر تابڑ توڑ حملے کر رہی ہے۔ مجھے فضا کے پرسکون ہو جانے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ مگر میں غیر شعوری طور پر بڑھتا گیا۔

شریف کمرے میں آ چکا تھا۔

دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہوا تو وہ کھڑکی کی سلاخوں پر رخسار رکھے کھڑا تھا مجھے دیکھ کر اس نے خاموش رہنے کا اشارا کیا۔

میں بھی اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔

اس نے سرگوشی کی "بڑی جی دار عورت ہے۔ تین عورتیں اس کے مقابلے پر اتری تھیں۔ دو کی تو اس نے خوب درگت بنائی اور تیسری بھاگ گئی اس کی گالیوں میں بھی نیا پن ہے۔"

واقعی میں نے ایسی ننگی گالیاں ایک عورت کی زبان سے پہلے نہ سنی تھیں، شام کے بعد تک وہ اسی پاٹ دار آواز میں ٹھیکیدار کے گھر والوں کو کوستی رہی تھی۔

ہم بہت دیر کے بعد کھانے کے لئے باہر نکلے۔ پنواڑی نے بتایا کہ جنگ ابھی اور چلے گی۔

تین دن تک یہ محاذ گرم رہا۔

ٹھیکیدار کے گھر والوں کی حمایت میں دو تین گھر اور میدان میں آ گئے لیکن نگینہ اکیلی ہی سب کا مقابلہ کرتی رہی۔ عارفہ اور صادقہ صرف دلانے پر کھڑی رہتی تھیں اور ہمیں جی بھر کر نظروں کے جال پھینکنے کا موقع مل گیا تھا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد ڈپو والے کی بیوی نگینہ سے الجھ پڑی۔

چیئرمین اسے دھمکانے آیا، تو اس نے اسے بھی دھتکار دیا۔

ڈپو والے کا مکان ہمارے کمرے سے دائیں طرف تھا اس لئے نگینہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ بہت دیر تک وہ ہمارے کمرے کے سامنے کھڑی متکبرانہ لہجے میں ان لوگوں کو کوسنے دیتی رہی تھی۔ میک اپ کی بدولت اس میں اب بھی خاصی جاذبیت تھی۔ چست ریشمی لباس میں وہ عارفہ کی جوانی کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اتنا خونخوار حسن ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ہم سب زیادہ محتاط ہو گئے تھے اس سے کسی سطح پر بھی مقابلہ ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ ہم تو اس کی ایک گالی بھی برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ بات بڑھنے پر وہ ہمیں ہمیشہ کے لئے یہاں سے نکلوا سکتی تھی۔

چودھری ہم میں سب سے زیادہ بزدل تھا وہ اسی وقت کمرہ تبدیل کرنے پر مصر تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ صبح نئے مکان کی تلاش شروع کر دی جائے گی۔

اگلے دن دفتر جاتے وقت ہم میں سے کسی نے بھی نظر اٹھانے اور ادھر ادھر گھمنے کی جرأت نہ کی تھی پنواڑی کے پاس تک ہم نہ ٹھہرے شام کو واپس آ کر ابھی ہوٹل جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ صادقہ دروازے پر آ گئی عمر تو اس کی بارہ تیرہ سال کی ہو گی لیکن چست قمیص اور بناؤ سنگار کی بدولت وہ ہر لحاظ سے بالغ نظر آ رہی تھی اس نے نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ سب کی طرف باری باری دیکھا۔

اور ہم بت بن کر رہ گئے۔

مسکراہٹوں کا کوئی تبادلہ نہ ہو سکا۔

ہمارے حلق خشک ہو گئے۔

میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے۔

صادقہ نے شیریں لہجے میں کہا۔ "ہمارا ریڈیو خراب ہو گیا ہے باجی نے فرمائش سننی ہے۔ آپ رات کے لئے ہمیں اپنا ریڈیو دے سکتے ہیں؟"

شریف نے گہرا سانس بھرا۔

میں زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

ٹرانسسٹر چودہری کا تھا۔ وہ گھر سے اس کی ٹیون ٹھیک کرانے کے لئے لایا تھا اور تنخواہ ملنے پر اس کا پروگرام گھر جانے کا تھا۔

چودہری ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ شریف نے ٹرانسسٹر کی بیرونی سطح پر رومال پھیر کر کہا۔ "جب تک تمہارا ریڈیو درست نہ ہو، یہ ٹرانسسٹر پاس ہی رکھنا ہمیں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"

کلیم نے ٹرانسسٹر اٹھا لیا اور دروازے کے پاس جھک کر تشنہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ ہم سے تو نہ جھگڑیں گے۔ ہم پردیسی تو پیار کے بھوکے ہیں۔"

میرا خیال تھا، صادقہ کی مسکراہٹ میں تلخی پیدا ہو جاتی گی۔ لیکن اس میں تو اور بھی زیادہ نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے لجا کر کہا۔ "آپ سے بھلا کون لڑ سکتا ہے۔"

ٹرانسسٹر پکڑ کر وہ گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

اور شریف نے کلیم کی گردن دبوچ لی۔ "تم کون ہوتے ہو پہل کرنے والے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

کلیم نے جھٹکے سے گردن چھڑا کر درشت لہجے میں کہا۔ "ہوش کی دوا لو شریف! کہیں ایسا نہ ہو مجھے تمہاری بتیسی نکالنی پڑے۔"

چودہری دونوں کے درمیان آ گیا۔ "مال ہمارا گیا اور گرم تم ہو رہے ہو۔"

میں بھی خاموش نہ رہ سکا۔ "شریف! اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو ہم تمہارا سامان گلی میں پھینک دیں گے۔ وہ گھڑی کا مبلہ ہے کونسا ہم نے ساری عمر یہیں بیٹھ رہنا ہے۔"

شریف نے چبھتی ہوئی نظروں سے سب کی طرف دیکھا اور بے بس ہو کر بالوں میں انگلیاں گھمانے لگا۔

اب ہم میں جرات پرواز پیدا ہو رہی تھی۔ وہ پہلا سا خوف نہ رہا تھا۔

تیسرے دن صادقہ پھر آئی اور دلربایانہ انداز میں بولی۔ "کل تک ریڈیو مرمت ہو کر آ جائے گا۔"

شریف جلدی سے بول پڑا۔ "ایسی جلدی بھی کیا ہے جب ضرورت پڑے گی ہم خود منگوا لیں گے۔"

صادقہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "شکریہ! آج ہمیں گھڑی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ صبح ابا کو پہلی گاڑی پکڑنی ہے اور ہمارا ٹائم پیس خراب ہو گیا ہے"

گھڑی صرف میرے پاس ہی تھی۔ میں نے بڑے فخر سے سب کی طرف دیکھا اور گھڑی اتار کر صادقہ کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ نخریلے انداز سے قدم اٹھاتی جب وہ اپنے دروازے پر پہنچ گئی تو میں بشیر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مرجھا سا گیا تھا نہ تو اس کے پاس ٹرانسسٹر تھا اور نہ گھڑی۔ عشق کی دوڑ میں ہم سب سے آگے نکل گئے تھے۔

وہ چارپائی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ اب ہمارے ساتھ باہر نکلنے کو تیار نہ تھا اور ہم اس کی جذباتی بے چارگی کا مذاق اڑاتے رہے تھے گھڑی کے بغیر مجھے الجھن تو بہت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس خیال سے سینے میں آسودگی کی لہر پھیل جاتی تھی کہ گھڑی عارفہ کی کلائی پہ بندھی ہو گی۔

یہی حال چودھری کا تھا۔ اس کے لئے یہی تصور سرور انگیز تھا کہ عارفہ ٹرانسسٹر کے پاس بیٹھ کر گانے سن رہی ہو گی۔

ابھی ہمارے تصورات کا رنگ نکھر ہی رہا تھا۔ ہمارے خوابوں کی وادیوں میں حسین پھول کھل ہی رہے تھے کہ ایک نیا ہنگامہ پیدا ہو گیا۔

دفتر سے واپسی پر میں پنواڑی کی دکان کے قریب پہونچا تو اس نے آواز دیکر مجھے اپنی طرف بلالیا۔ بابو جی، اب لطف آئے گا دیکھیں میدان کس کے ہاتھ آتا ہے!"

میں اس کی باتوں کا مفہوم نہ سمجھ سکا تھا۔

وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔ "شیریں نے ڈپو والے کا مکان کا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے۔"

"شیریں کون؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ بڑی جی دار عورت ہے۔ وہ خود نہیں آئی، اسے لایا گیا ہے اور لانے والا خواجہ ریاض ہے۔"

"میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔"

اس نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور مسرورانہ لہجے میں کہا "خواجہ ریاض کو اپنے باپ خواجہ نیاز کا نگینہ کے یہاں آنا جانا اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ مل کی زیادہ تر آمدنی نگینہ کے گھر جا رہی ہے اس نے شیریں پر ڈورے ڈالے اور نگینہ کے مقابلے پر لے آیا ہے اب دیکھئے کیا گل کھلتے ہیں۔"

مجھے ایک دھکا سا لگا۔

پنواڑی ہمدردی جتا رہا تھا لیکن مجھے اس کی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ گلی والوں کے لئے نگینہ کی موجودگی خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ ہمارے لئے تو اس کا ردیہ باعثِ مسرت تھا۔

میرا ذہن سلگنے لگا۔ اس کی آنچ دوسرے ساتھیوں تک بھی پہنچ گئی۔ ہم دیر تک دفاعی تدابیر سوچتے رہے تھے۔

صبح ابھی بیدار ہی ہوئے تھے کہ گلی میں گالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ ہمارے دفتر جانے تک دونوں محاذوں سے گولہ باری شدت سے جاری تھی۔

پنواڑی نے بتایا کہ صادقہ دودھ لے کر آ رہی تھی کہ شیریں نے دھکا دیکر اسے گرا دیا۔ وہ روتی ہوئی گھر پہنچی تو نگینہ باہر نکل آئی اسے یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس کی گالیوں کا جواب دینے کی کسی میں جرأت پیدا ہو سکے گی۔ شیریں نے جب اس سے وزنی گالی، بھاری پتھر کی مانند اس کے شعور کے پیچھے پردے ماری تو نگینہ کا ذہن جھنا اٹھا تھا۔

"الہی خیر!" میری نظر اپنی خالی کلائی پر پڑی اور میں کپکپا اٹھا۔

شام کو بھی محاذ گرم تھا۔

نگینہ کی آواز قدرے بیٹھ چکی تھی لیکن دم خم وہی تھے۔ وہ گلی میں دندنا رہی تھی اور شیریں اپنے دروازے پر کھڑی تھی مجھے تسلی ہوئی کہ نگینہ بازی جیت جائے گی۔ محلہ پر اسی کا رعب چھایا رہے گا۔

ہم دیر تک کمرے میں دبکے رہے تھے۔

ہوٹل سے واپسی پر پنواڑی کی دکان پر ٹھہرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہاں کئی نوجوان کھڑے نئے حالات پر تبصرہ کر رہے تھے نئی معلومات حاصل کرنے کی خاطر ہم بھی رک گئے۔

ایک نوجوان شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں کو درست کرتے ہوئے بولا "مقابلہ سخت ہے آج تو نگینہ کا پلہ ہی بھاری رہا۔

پنواڑی نے تمکنت کے ساتھ کہا۔ شیریں اسے ڈھیل دیتی رہتی ہے دو چار دن کے بعد تم خود ہی اس کی تعریف کرنے لگو گے۔

دو کشر نوجوان نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔ اگر نگینہ ہار گئی تو پھر کیا ہوگا۔؟"

"پھر اس کی ساری اکڑ ختم ہو جائے گی۔ کوئی بڑا آدمی اس کے دروازے پر نہ جا سکے گا اور ہم جیسوں کی قسمت جاگ پڑے گی۔" پنواڑی کی رال ٹپکنے لگی تھی۔

یہ انکشاف ہمارے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ جذبات میں جو تلخی پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ شیریں سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی، وہ مٹ گئی۔

رات کو نہ جانے کیا وقت ہوگا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گلی میں شیریں کی آواز گونج رہی تھی۔ "دو نکال اس حرامزادے کو شریف بہو بیٹیوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جو لفنگا ہے وہ رات کو یہاں ڈیرہ جما لیتا ہے۔"

میں نے کھڑکی کا پٹ کھول دیا

شیریں نے سرکاری نل کے چبوترے سے زور لگا کر ایک اینٹ اکھاڑی اور پورے زور سے نگینہ کے دروازے پر دے ماری۔
بھیگی رات کے دامن میں زلزلہ آگیا۔ دھماکے کی گونج دور تک پھیل گئی۔ بشیر اور کریم بھی جاگ پڑے۔ ہم سانس روکے اگلے منظر کے ہیجان اور کلائمکس کے منتظر تھے۔

شیریں نے دوپٹہ کمر کے گرد لپیٹ رکھا تھا وہ پہلوانوں کی مانند جھوم رہی تھی۔ سرکاری بجلی کی ٹھٹھری ہوئی روشنی میں بھی اس کا حسین چہرہ رعنا مند جسم مسحور کن ہو رہا تھا۔

نگینہ نے کھڑکی کھول کر اس کی گالی کا جواب دیا۔

اور شیریں نے ایک اور اینٹ اکھاڑ لی۔

آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں۔ لوگ جاگ پڑے تھے۔

دوسری اینٹ کا دھماکہ بھی لرزہ خیز تھا۔

نگینہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا۔

شیریں نے بازو لہرا کر "ہو آ — ہا —" کا نعرہ لگایا۔ اور ڈنڈے کا وار اپنی ہتھیلی پر روک کر بڑی پھرتی سے ڈنڈا جھٹکا دے کر چھین لیا۔ ڈنڈا [illegible] جھٹک کر وہ چیتے کی مانند اس پر جھپٹی اور اتنے زور سے اسے دو چار جھٹکے دیئے کہ نگینہ کی چیخ نکل گئی۔ پھر شیریں نے اسے نیچے گرا لیا اور اسٹنٹ فلم کے ہیرو کی مانند مکے مارنے [illegible] اگر لوگ بیچ بچاؤ نہ کراتے تو [illegible] اسے ختم ہی کر دیتی۔

لوگ گھروں سے نکل آئے۔ میں بھی باہر آ گیا۔

نگینہ کے نتھنے بری طرح خون آلود تھے چہرے پر نیل کے نشان ابھر آئے تھے وہ بڑی طرح کراہ رہی تھی اسے اٹھاتے ہوئے عارفہ کی [illegible] میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔

شیریں ہمارے دروازے کے سامنے بڑی پھنکار رہی تھی۔
لوگوں کی آنکھوں میں ٹوٹی ہوئی نیند کے خمار کے ساتھ حیرت اور خوشی کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے۔
کمرے میں واپس آکر میں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنی کلائی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے میں بے کلی سی محسوس کرنے لگا دوسرے بھی نروس تھے۔ ہم گڈمڈ خیالات کا اظہار کرنے سے قاصر تھے۔

صبح بازار میں بھی رات کا ہنگامہ موضوعِ بحث بن چکا تھا۔

پنواڑی کے چہرے پر عجیب رونق پیدا ہو گئی تھی۔

اگلی رات کو پھر شیریں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔

نگینہ کے گھر سے اب کوئی بھی باہر نہ نکلا تھا۔

شیریں اس کا دروازہ پیٹتی رہی خونخوار لہجے میں چلاتی رہی "نِکال اپنے خصموں کو مقابلے میں۔ رنڈی نے گلی محلے میں گندگی پھیلا رکھی ہے تیرا جینا حرام نہ کر دیا تو شیریں نام نہیں!"

لوگ کھڑکیوں میں سے جھانکتے رہے اور ہم کمرے میں دبکے رہے۔

نگینہ کو میں نے تیسرے دن اپنے دروازے پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نیل کے نشان اب بھی ابھرے ہوئے تھے اس کی بائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی اس کی ناک موٹی ہو گئی تھی اور وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں سامنے کے مکان والی عورت سے کہہ رہی تھی "وہ شریفوں کے لئے تو سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے ایسی چھٹی ہوئی عورت سے کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ عزت دار آدمی تو میلی آنکھ سے بھی گھبراتا ہے۔ میں نے نئی آبادی میں مکان کرائے پہ لے لیا ہے عارفہ کی سگائی کی رسم وہیں ادا کروں گی یہاں رہ کر اپنی بچیوں کا مستقبل تاریک نہیں بنا سکتی۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے آسیب زدہ ماحول میں آ گیا ہوں۔

بشیر نے سنا تو اس کے چہرے پہ زردی کھنڈ گئی۔

کلیم دیوار سے ٹیک لگا کر سر کو دائیں بائیں حرکت دینے لگا

اور چودھری پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلی کے فرش کو تک رہا تھا

پنواڑی کے پاس آئے تو اس کے چہرے کی رونق غائب ہو چکی تھی اس تک نئی خبر پہنچ چکی تھی اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا "وہ یہ بھی ایک طرح کی دھمکی ہے چیئرمین کا بھتیجا اب یقیناً کھل کر اس کی حمایت پہ اتر آئے گا۔ خواجہ نیاز اسے یہاں سے کبھی نہ جانے دیگا۔ ڈپو والا شیریں کے ساتھ اپنی بیوی کو بھی گھر سے نکال دے گا نگینہ یہ گلی کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ عارفہ کی سگائی کی رسم کبھی ادا نہیں ہو سکتی۔ شیریں ہی کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ ہاں، دیکھ لینا۔"

اور اگلے دن ہم نے دفتر جانے سے پہلے دیکھا کہ نگینہ کے گھر کا سامان چھکڑے پر لادا جا رہا ہے جب صادقہ ٹرانسسٹر لئے باہر نکلی تو چودھری مسکرانے لگا اور مجھے اپنی وضعداری کے خول میں دراڑیں پڑتی نظر آنے لگیں۔ صادقہ تمکنت کے ساتھ دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔ عارفہ بھی بانہہ ہلاتی گزر گئی اور چودھری کا چہرہ لٹک گیا۔ میں مضطربانہ انداز میں باہر نکلا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک پہ آ گیا۔ صادقہ اور عارفہ تانگہ پر سوار ہو رہی تھیں۔ میں پنواڑی کی دکان پہ رک گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی میرا بازو کہنی تک کاٹ کر لے گیا ہو۔ درد کی شدید لہر نے میرے زندگی کے ہر گوشے کو جھنجھوڑ دیا تانگہ آگے بڑھ گیا اور پھر نظروں سے غائب ہو گیا۔

پنواڑی لرزتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا: "وہ یہ سب کچھ خلاف توقع ہوا ہے نگینہ ہار ماننے والی عورت نہ تھی سیاہ بختی میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا —— اور پھر بابو جی! سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علاقہ میں ایک ہی بدمعاش کا سکہ چل سکتا ہے یہ ناممکن ہے کہ دو بدمعاش ایک ہی وقت میں دندناتے پھریں۔ ایک کو تو بوریا بستر گول کرنا ہی پڑتا ہے۔"

نقش کا آئندہ شمارہ خواتین افسانہ نمبر ہوگا!

پاکستان ویسٹرن ریلوے

ٹینڈر نوٹس

نہ چھڑائے جانے والے مال بشمول پارسل اور ریل کے ڈبوں میں یا ریلوے کی عمارت میں ملنے والی گمشدہ اشیاء کو پاکستان ویسٹرن ریلوے کی طرف سے معاہدے میں مذکور شرائط کے مطابق نیلام کرنے کیلئے مشہور اور قدیمی نیلام کنندگان سے سربمہر لفافوں میں جن پر "نیلام کرنے کے لئے ٹینڈر" درج ہو، ٹینڈر مطلوب ہیں۔ معاہدہ کی ایک نقل مقررہ ٹینڈر فارم کے ساتھ منسلک ہوگی۔

۲:۔ ٹینڈر مقررہ فارموں پر پیش کئے جائیں جو دستخط کنندہ ذیل سے -/۵ روپے نقد (ناقابل واپسی) ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں ۹۳ پیسے مزید ادا کر کے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ٹینڈر کے ساتھ -/۵۰۰ روپے کی رسید جو خزانہ پی۔ ڈبلیو ریلوے لاہور میں چیف کیشیئر کے پاس جمع کر کے حاصل کی جائے منسلک کرنی ضروری ہے۔ یہ رقم زرِ ضمانت سمجھی جائے گی اور ناکام امیدواروں کو واپس کر دی جائے گی۔ اس ٹینڈر دہندہ کی صورت میں جس کو معاہدہ کے لئے منتخب کیا جائے گا۔ یہ رقم مبلغ -/۱۰۰۰ روپے سیکیورٹی میں شامل سمجھی جائے گی جو اس کو جمع کرانی ہوگی، اگر وہ مقررہ وقت میں کام شروع نہیں کر سکا یا کسی شرط یا متعلقہ ہدایت کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا تو زرِ ضمانت کو ضبط کر لیا جائے گا۔

۳:۔ ٹینڈر دہندگان فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کا سرٹیفکیٹ بھی ٹینڈر دیتے وقت پیش کریں جس میں ان کے سابقہ حالات کیریکٹر اور مالی استحکام کی تصدیق کی گئی ہو، ٹینڈر کے ساتھ ٹینڈر فارم میں مندرج دستاویزات بھی پیش کریں۔ اگر محولہ بالا میں سے کوئی دستاویز یا ٹینڈر فارم ہر طرح سے مکمل نہیں ہوا تو ٹینڈر کو جائز خیال نہیں کیا جائے گا۔

۴:۔ ٹینڈر چیف کمرشیل منیجر کو زیادہ سے زیادہ ۲۴ جولائی کو ۱۱ بجے دن تک پہنچ جانے چاہییں جو اسی روز ۸ بجے موقع پر موجود ٹینڈر دہندگان کے روبرو کھولے جائیں گے۔

۵:۔ ڈاک کے ٹکٹ ٹینڈر فارم کی قیمت کے طور پر قبول نہیں کئے جائیں گے، ٹینڈر کھولنے کی تاریخ پر ٹینڈر فروخت نہیں کئے جائیں گے۔ کھولنے کے بعد ٹینڈر واپس نہیں لئے جا سکتے۔

۶:۔ چیف کمرشیل منیجر بلا وجہ بتائے کسی یا تمام ٹینڈروں کو مسترد کرنے کا حق رکھتے ہیں

(دستخط برائے) چیف کمرشیل منیجر

(INF (L) - 1715.)

غیاث احمد گدی

سیپ۔ کراچی

پہیہ

چھو رانی کی کہانی لکھنا کوئی کھیل نہیں بڑے دل گردوں کا کام ہے پھر بھی جب کل شام رخصت ہوتے وقت اس نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پر یقین لفظوں میں وعدہ لے لیا تو مجھے ایسا لگا کہ اب بہانہ بازی سے کام نہیں چلے گا اب تو ایک پرشور دریا کے آگے بند باندھنا ہی ہوگا یا دوسری صورت میں مجھے شہر چھوڑ کر بھاگ جانا ہوگا۔

دراصل میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میں قصے کا آغاز کہاں سے کروں یعنی میری ساری افسانہ نگاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور میں الو کی دم فاختہ نظر آنے لگتا ہوں۔ چھو کی کہانی لکھنے کے لئے دس بیس سال کے تخلیقی تجربے نہیں، صدیوں کی ریاضت درکار ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی شدہ چھو نے جب دیکھا کہ اس کا شوہر ہر رات اس کی بجائے دلاری سے پاؤں دلواتا ہے اور آدھی رات کو اس کو نیچے فرش پر دھکیل کر، لیمپ کو بجھا دیتا ہے اندھیرے میں صبح دم تک دلاری اس کے پاؤں دابتی رہتی ہے تو ایک دن وہ۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے اور پھر لوٹ کر خاوند کا منہ نہیں دیکھتی۔

”پھر کیا ہوتا ہے چھو؟“

”چھو نہیں، چھو رانی کہو، چھو رانی . . . .“ اس نے قطع کلام کرتے ہوئے پہلے نام کی صحت کی طرف متوجہ کیا۔

”اچھا چھو رانی، پھر تم نے کیا بتایا تھا؟“

پھر چھو رانی کو الفت یکہ وان مل گیا تھا جس نے پسنجر کے ایک خالی ڈبے میں ایک گٹھڑی کے ساتھ اسے بھی گٹھڑی بنا نیند میں بے خبر پایا تھا اس نے چھو رانی کو جگایا اور پوچھا کہ کہاں جاؤ گی تو چھو نے نیند اور سفر کی تھکان سے ٹوٹتے ہوئے جسم کو سیدھا کرتے ہوئے غنودگی کے عالم میں کہا۔ ”گھر“

پھر الفت یکہ وان نے مزید کچھ سوال اس لئے نہ کرنا مناسب سمجھا کہ اس کیفیت میں اس سے معقول جواب کی قطعی توقع نہ تھی اور یکہ میں بیٹھا کر اپنی جھونپڑی میں ایک بھاری گٹھڑی کی طرح ٹوٹی جھلنگ چارپائی پر پٹک دیا تو وہ چونکی۔

”ارے مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”گھر“ الفت نے اسی سادگی سے کہا اور چولھے کے پاس پہنچ کر آگ جلانے لگا۔

اس کے بعد چھو نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ چھو کو ایک گھر چاہیئے اور اس کی مختصر سی زندگی میں — اس کے خاندان کی پچھلی صدیوں

کار وائتی تصور یہی تھا۔ ایک چار دیواری ہو، جہاں کوئی ٹوٹی جھلنگا چار پائی ہو نہ ہو ایک چولہا ضرور ہو اور اس کے بعد اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو بس اس کے گھر والا بھی ہو بغیر گھر والا کے گھر کا تصور نامکمل ہوتا ہے۔

الفت کی بیوی سال بھر ہوئے اللہ کو پیاری ہوئی تھی۔ الفت کا گھر بن گھرنی کے بھوت کا ڈیرہ لگ رہا تھا، ایسے میں نزول رحمت سے نیضیاب نہ ہونا کفران نعمت تھا۔

پھورانی اکثر مجھ سے ازدواجی زندگی سے متعلق ایک بہت پرانی گھسی پٹی، مگر حقیقت سے قریب تمثیل پیش کرتی ہے یعنی، یعنی زندگی ایک گاڑی ہے اور عورت اور مرد اس کے دو پہیئے۔ لہٰذا دونوں پہیوں کا برابر اور متوازی ہونا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ قدم قدم پر دھکے ہیں سٹوکریں ہیں!

چنانچہ چند ہی مہینوں کے بعد پھورانی کو یقین ہوگیا کہ یہ جو زندگی کی گاڑی وقت کی سڑک پر اچھلتی کودتی، اچھلتی پھاندتی بھاگی جارہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سڑک ہی خراب ہے۔ بلکہ پہیئے کچھ درست نہیں۔ چھوٹے بڑے ہیں اور آپس میں لاگ نہیں کھاتے۔

بقول پھورانی کے، چند ہی مہینوں کے بعد ہر روز وہ اس کی پٹائی کرتا، وہ پٹائی کرتا کہ مار دیتا نہیں، سچ مچ اسے اپنی نانی یاد آنے لگی۔ منہ اندھیرے وہ یکہ لے کر گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب واپس آتا تو شراب کے نشے میں دھت، پہلے کھانے کو گوشت روٹی مانگتا ہے۔ جب گوشت کھا چکتا اور روٹی پھینک چکا تو پھورانی کی طرف یوں متوجہ ہوتا گویا دن بھر کا قرضہ چکانے کا وقت آگیا ہو۔ جب تھک جاتا تو جھلنگا چار پائی پر یوں پڑ جاتا گویا سارے فرائض پورے ہوگئے ہوں، ادھر اطمینان سے اس امید میں پٹنے والی پھورانی کی بعد ازاں عام شوہروں کی طرح محبت بھی کریں گے، دیکھتے دیکھتے جب دیکھا کہ کنویں کا پانی ایک دم سے تارا ہو گیا ہے تو سوچتے سوچتے ایک دن وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان بلوں میں تیل ہی نہیں رہا۔

آبڑ کھابڑ سڑک پر چلتے چلتے الفت میاں کے یکے کا انجر پنجر بے حد ڈھیلا ہو گیا ہے اور اب تو خدشہ ہے کہ کسی دن سواریوں کو لئے دیئے دھڑام سے کسی کھڈ میں نہ جا گرے۔

پھورانی نے بتایا کہ گدی جی، بس اسی دن سے میں نے یہ جانا کہ یہ چار پائی پر گہری نیند سویا ہوا الفت یکہ وان جس کے ساتھ میں نے اپنی قسمت جوڑی تھی وہ نرا گوشت کا لوتھڑا ہے گوشت کا لوتھڑا۔!

"پھر تم نے کیا کیا پھورانی؟"

"پھر میں کیا کرتی۔ تھوک دیا اس کے منہ پر اور چلی آئی اس شہر میں۔۔۔!"

جس شہر میں الفت میاں یکہ ہانکتا تھا، وہیں اس کا ایک یار رہتا تھا، سدو۔ سدو اکثر الفت کے ساتھ اس کے گھر آیا کرتا تھا خصوصاً رات کے وقت جب الفت شراب کے نشے میں چور ہوتا۔ وہ یکہ سے اتار کر سہارا دیتے ہوئے اسے چار پائی پر لٹاتا گھوڑی کو کھولتا۔ یکے کو چھتے تلے رکھتا، گھوڑی کو سانی پر لگاتا۔ پھر گھنٹہ دو گھنٹہ گھوڑی کی اتنی محبت سے مالش کرتا گویا گھوڑی الفت کی نہیں خود اس کی اپنی ہے۔

مالکانہ احساس کا یہ ارتقا تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے خود پھورانی کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا جس طرح وہ گھوڑی کو سانی لگاتا۔ گاڑی کو چھجے میں رکھتا، چاہتا کہ پھورانی کی بھی دیکھ ریکھ شروع کر دے۔

بلکہ ایک دن جب پھو سہ پہر کے وقت چھوٹے سے دھندلے آئینے کی مدد سے ماتھے پہ بندیا لگا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بندیا ٹھیک جگہ پر نہیں لگ رہی ہے۔

پھورانی نے کہا۔ "تو منہ کیا دیکھتا ہے لگا دے!"

سدو آگے بڑھ کر بندیا لگنے لگا اور دفعتاً اس کے ہاتھ کانپے اور پھورانی نے محسوس کیا کہ بندیا سدو کے گاؤں والے پیشانی پر ہی نہیں، سارے رخسار پر لگتے ہیں

"یہ کیا کر رہا ہے سدو؟"

"کچھ نہیں رانی، بندیا . . . . . "۔ سدو کی آواز حلق میں گھٹنے لگی، اور وہ سرمستی کے عالم میں اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

پھورانی بولی۔ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی گھمن سانپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا ہے ذرا دیر کے لئے تو میں ڈری پھر نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں نے سدو کو ایسا دھکا دیا کہ چکرا کر زمین پر دہ جا گرا۔ تب میں پھر لپکی اور چاندی کے کڑے والے ہاتھ سے جو پیٹا، جو پیٹا کہ اس کے ہواس ٹھکانے آگئے۔

پھورانی نے کہا کہ گدی جی یہاں تک تو ٹھیک تھا میں اگرچہ اسے پیٹ رہی تھی اور وہ پٹ رہا تھا۔ مگر مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ اکیلا گھر ہے اور سدو پھر بھی مرد ذات ہے مگر جب دیکھا کہ اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑیا کر مجھ سے معافی مانگنے لگا تو میرے ہاتھ رک گئے اب کوئی ایسوں کو کیا مارے۔ اس وقت مجھے بڑی شدید نفرت ہوتی اور میں نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا۔

پھر یوں ہوا کہ پھورانی نے جس سدو کے منہ پر تھوکا تھا۔ اس وقت جب اس کو الفت میاں کے کنگلے پن کا احساس ہوا اور ساری دنیا تیرہ و تار دکھائی دینے لگی تو روشنی کا مینار بن کر جو چیز اس کے سامنے آئی وہ سدو ہی تھا۔

وہ اس رات کے پچھلے پہر، جب چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا لالٹین کی ٹمٹماتی کے پاس آئی جہاں لید کے پاس میلے ٹاٹ پر سدو دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سدو کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے جگایا۔ سدو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور لگا اس کے پاؤں پکڑ کر گھگھیانے "نہیں نہیں پھو، اب نہیں، اب تو مجھے معاف کر دے۔ بہت دن ہو گئے اب تو بخش دے!"

پھورانی کو یوں لگا کہ پھر اس کے منہ پر تھوک دے، مگر اندھیرے کنویں میں ایک یہی رسی تھی جسے تھام کر وہ باہر آ سکتی تھی۔

پھورانی نے بتایا۔ پھر سدو کے ساتھ میں یہاں بھاگ آئی۔ بھاگ کیا آئی، یوں سمجھو اسے بھگا لائی اور سچ مانو تو گدی جی چار برس میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ میرا خاوند نہ رہ سکا۔ اس سے مجھے بچہ بھی ہوا یعنی میری زندگی کے پیڑ میں پھل بھی لگا۔ مگر میں نے برابر یہی سمجھا کہ سدو میرا مرد نہیں میری جورو ہے۔ میری بیوی اور میں اس کا مرد ہوں جو دن بھر پان کی دکان پر کتھے چونے کا تماشہ لگا کر پیسہ بناتی ہوں۔ بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ اپنے اور سدو کے لئے کپڑے خرید کر لاتی ہوں اور وہ بے چارہ دن بھر شریف عورتوں کی طرح کھانا پکاتا ہے، کپڑے صاف کرتا ہے، مسالہ پیستا ہے اور کسی کسی دن جب میرا بدن بہت ٹوٹتا ہے تو وہ مالش بھی کرتا ہے

یہاں پہنچ کر پھورانی شرما جاتی ہے اور آنچل سے منہ ڈھک کر ہنسنے لگتی۔

میں کہتا "وہ ساری کہانی ہے پھورانی یوں تو تم ہر جگہ اپنے عورت پنے کا پتہ چھوڑتی آئی ہو۔ مگر ظاہری طور پر یہیں عورت دکھائی دیتی ہو۔ اپنے دیس کی عورت . . . . . "

کیا اپنے دیس میں عورتیں میری جیسی نہیں ہوتی ہیں کیا۔ کیا اس کی دو ٹانگیں، دو ہاتھ، ناک، آنکھیں . . نہیں ہوتیں۔

"ہوتی تو ہیں! مگر کوئی عورت تمہاری طرح اپنے شوہر کا شوہر نہیں ہوتی۔ اور اپنے شوہر سے بدن نہیں دبواتی۔"

"تو میں کیا کروں۔ وہ نکھٹو ہے بھی ویسا ہی۔"

پھر میں اچانک ایک الگ سوال کر بیٹھتا ہوں۔ "وہ جو بھی سہی، پر تم اس کے ساتھ خوش تو ہو؟"

پھورانی اس سوال کو سن کر کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر لمبی سانس لے کر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے "پتہ نہیں جی

پر ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ اور چاہیئے !"

بس یہی وہ مقام ہے جہاں میرا قلم رک جاتا ہے اور اپنے آپ میں یوں الجھ جاتا ہوں جیسے گھنے جنگل میں کھو گیا ہوں پھورانی کی گرہستی کی گاڑی بڑے مزے میں چلی جا رہی ہے سڑک بھی ہموار ہے اور دونوں پہیے بھی چھوٹے بڑے نہیں ۔صرف اتنی سی چوک رہ گئی ہے غالباً یہ کہ دائیں طرف بایاں پہیہ لگ گیا ہے اور بائیں طرف داہنا ۔مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے بہ ظاہر اس جگہ پہنچ کر کہانی مکمل ہو جاتی ہے یعنی راجہ اور رانی مزے سے رہنے لگتے ہیں ۔قصہ ختم پیسہ ہضم ۔

اگرچہ یہاں تک سوچنے کے بعد میں بہ ظاہر افسانہ کو اختتام تک پہنچا دیتا ہوں ۔مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخیل طرازی میں مجھ سے کہیں بھول ضرور ہوئی ہے کچھ چھوٹ رہا ہے کوئی کمی پڑ رہی ہے گویا اس ٹھہری زندگی میں کہیں کوئی اور موڑ آنا چاہیئے ۔ کوئی واقعہ کوئی حادثہ . . . کوئی ۔

چنانچہ میں پھورانی پان والی کی کہانی نہیں لکھ پاتا ۔میرے قلم کو میری روح کو ۔پھورانی کی زندگی سے متعلق کسی انوکھے حادثے کا انتظار ہے یہ حادثہ کب وقوع پذیر ہوگا ۔کن حالات میں ہوگا ، پھر اس سے پھو کی یکسانیت سے بہنے والی زندگی پر اور بعد ازاں میرے افسانے پر کیا ردعمل ہوگا ۔کیسا ہوگا ۔۔ کیسے ہوگا ۔

میں چند ہفتوں کے لیئے آفس کے کام سے باہر چلا گیا ۔کام کی کثرت اور نئے لوگوں کے جھمیلے میں پھورانی اور اس کا افسانۂ زندگی تو کیا میں اپنے آپ کو بھول سا گیا ۔چند ہفتے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو راتوں رات مجھے ملیریا بخار نے آ دبوچا ۔اکیلے گھر میں بخار اور درد کی شدت کے باعث ساری رات اور سارا دن میں نے خود فراموشی کے عالم میں گزار دیا ۔شام ہوتے ہوتے بخار ذرا کم ہوا تو سرہانے پھورانی کو پنکھا جھلتے ہوئے پایا ۔

"میں نے صبح سویرے تالا کھلا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا کہ تم آ گئے ہو ۔۔ ذرا دن چڑھے تو تم خود آ ؤ گے سگریٹ لینے ۔ باٹ دیکھتے دیکھتے دوپہر ہو گئی ۔ مند دروازہ کھلا ہی نہیں تو میرے من میں شک ہوا دیکھا تو سچ مچ تم مردہ سے پڑے ہو ۔"

میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔" نہیں نہیں ، اٹھو نہیں ۔ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے"

" ڈاکٹر کیسے آیا ؟" میں نے گردن گھما کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی ۔" کیا تم لے آئیں ؟"

" نہیں جی ، ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے کہا ۔ اندر چل کر دیکھ لو ۔" پھورانی نے یوں کہا گویا اپنے آپ کو پس پردہ رکھنا چاہتی ہو ۔

دس دنوں تک پھورانی نے میری بڑی خدمت کی ۔ سارا سارا دن پنکھا جھلتی ، ٹھنڈے پانی کی پٹی چڑھاتی ، ساگودانہ بنا کر دیتی اور ان سب سے بڑا کام یہ کرتی کہ تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو دور دور تک پھٹکنے نہ دیتی ۔بلکہ راتوں کو جب کبھی میری نیند ٹوٹتی تو محسوس ہوتا گویا پھو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے یا باہر دروازے پر بیٹھی اونگھ رہی ہے ۔

" یہ تم کیا کرتی ہو پھو ، تمہاری دکان داری خراب ہوتی ہوگی ۔اور سدو کی کمر کام سے دوہری ہو جاتی ہوگی ۔ !"

" سدو کو میں نے مار بھگایا ! " پھورانی نے بڑے اطمینان سے کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو ۔

" آئیں ۔ ! " میں نے محسوس کیا جیسے پھورانی کی گرہستی کی گاڑی دھڑام سے کھڈ میں گر پڑی ہو ۔میں نے پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا ۔ اس کا چہرہ بدستور مطمئن تھا ۔

" یہ کیسے ہوا ؟"

" ہوا ، تم اچھے ہو جاؤ تو بتاؤں گی ۔"

لچھورانی کے لہجے کی طمانیت سے میں بھی مطمئن ہوگیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا پاؤں نہیں دبائے ہوں گے بچاپے نے!"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اس موئے کی قسمت ہی میں پاؤں دابنے لکھے تھے۔ مرد نام کی تو اس میں چیز ہی نہ تھی۔ میری دکان میں پان کھانے وہ پٹھان آتا تھا نا، بڑی بڑی مونچھوں والا ۔۔"

لچھورانی کی دکان میں بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان پان کھانے کے علاوہ کچھ اور امید میں بھی آتا تھا۔ لچھورانی محسوس بھی کرتی تھی مگر اتنا بھی نہیں سوچتی۔ جوان آدمی ہے دل لگی کرلیتا ہے۔

مگر ایک روز شام کے جھٹپٹے میں جب دکان میں اور کوئی گاہک نہ تھا اور لچھورانی گوبر مٹی سے سامنے والا فرش پوت رہی تھی پٹھان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ باتوں باتوں میں نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اس کی لچھو کو توقع نہ تھی۔ اس نے سنبھالا لیا اور زور سے ایک جھٹکا مار کر پٹھان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ اس نے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اٹھائی اور ڈپٹ کر بولی۔

"خبردار، جو آگے بڑھے!"

مگر وہ پٹھان تاؤ میں تھا اس لے لپک کر پھر کلائی پکڑلی اور لگا جھنجھوڑنے۔ لچھورانی مدافعت کررہی تھی۔ مگر سدو، راہ گیروں کی طرح صرف بیچ بچاؤ کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

لچھورانی نے بتایا گدی جی! تب میں نے گالی دے دی اور للکارا کہ پاس پڑی ہوئی لوہے کی چھڑ سے دے ایک۔ مگر یہ سن کر تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کانپتے ہاتھوں سے اس نے چھڑا اٹھایا تو ٹھیک، مگر اسی وقت پٹھان نے اسے ایک لات رسید کی اور وہ دور جا گرا۔

پھر اسے باپ رے باپ کہتا ہوا جھونپڑی میں گھس گیا۔ جیسے لچھو کا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو خیر سے راہ گیروں نے پٹھان کو مار بھگایا، ورنہ پتہ نہیں۔ اس دن کیا قیامت گزرتی۔

قیامت تو اس دن گزری جس دن لچھو برتن مانجھ رہی تھی اور میں صحن میں کرسی پہ بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔ لچھو نے راکھ بھرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو اوپر پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر بھی کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ تم شادی کرلو!"

"شادی تو میری ہوچکی۔ لچھو تم تو جانتی ہو!"

"پر بیگم جی، یہاں رہتی تو نہیں۔ کیا فائدہ اس شادی کا!"

میں نے کاغذ سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ گویا میرے حالات سے کافی متاثر تھی۔

"اب دیکھو نا تم کتنا بیمار پڑے۔ کوئی دیکھنے سننے والا نہ تھا۔ اگر تم کو کچھ ہوجاتا تو؟"

"کچھ نہیں ہونے کا، ہم کہانی لکھنے والے بڑے بے حیا ہوتے ہیں۔ پھر تم جو تھیں، کتنا خیال رکھا ہے تم نے میرا۔ تم نہ ہوتیں تو شاید میں اب تک مر کھپ گیا ہوتا۔!"

اس نے پلٹ کر کہا "خدا نہ کرے۔ تم جگ جگ جیو جی۔"

اس کے پلٹ کر دیکھنے میں، اس کے لہجے میں، الفاظ میں کوئی رمز تھا کوئی راز تھا یہ عام انسانی جذبے سے کچھ اوپر کی چیز تھا۔ مگر میں سمجھ نہ سکا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھو کے گزر گیا۔ جھنجھوڑ نہ سکا۔

تیسرے دن وہ میرے یہاں آئی اور میری کتابیں سجاتے ہوئے بولی۔ "جانتے ہو جی، لوگ کیا باتیں بناتے ہیں۔ کہتے ہیں ... کہتے ہیں ..." وہ رک گئی۔

"کیا کہتے ہیں لوگ ؟" میں نے کہانی کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

"کچھ نہیں جی، تم نہیں سمجھو گے۔"

"اچھا" میں نے بے خیالی میں کہا اور افسانوں کی دنیا میں کھو گیا۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب چراغ جل چکے تھے اور رم جھم بارش کے باعث فضا بہت خوشگوار ہو رہی تھی لچھو رانی ایک نہایت خوبصورت ساڑھی میں ملبوس چہرے پہ پاؤڈر لگائے۔ مخموری چال چل کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے آج بہت خوش دکھ رہی ہو ؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے !"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے ؟" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آج لچھو رانی مجھے کچھ اجنبی اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔!

"کچھ نہیں ۔۔" اس نے ہڑبڑا کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ "میں نے یہ سوچا ہے، آج سے میں آپ کے یہاں سویا بھی کروں دن بھر تو ایک طرح سے رہتی ہی ہوں۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے لچھو رانی ۔؟"

کیوں کا ہے نہیں ہو سکتا۔ میں تمھارا کھانا بنا سکتی ہوں، جھاڑو دے سکتی ہوں، برتن مانجھ سکتی ہوں، بستر تک لگا سکتی ہوں تو پھر یہ کیسے نہیں ہو سکتا ؟"

لچھو کی منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے فیصلہ کن انداز دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔

"مگر۔۔۔مگر۔۔۔!"

"مگر کیا" وہ میری بوکھلاہٹ کا تماشہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ "نہیں بھائی میں تو اب یہاں سے ٹلنے والی نہیں، کل صبح تک سارا ضروری سامان لے آؤں گی۔"

"لیکن کل تو میں مہینہ بھر کے لئے باہر جا رہا ہوں !"

"کوئی بات نہیں۔" وہ قطع کلام کرتے ہوئے اطمینان سے بولی "تب تو یہاں میرا رہنا اور ضروری ہو گیا ہے آخر گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا تمھارے پیچھے۔ آج کل جانتے ہو کتنی چوریاں ہو رہی ہیں۔"

مناسب یہی معلوم ہوا کہ میں فی الحال خاموش رہوں۔ میں نے ایک صندوق میں ضروری سامان رکھا اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا

"ارے ابھی سے، جاؤ گے تو کل ہی نا ؟"

"نہیں مجھے آج ہی جانا پڑے گا۔" میں نے جیب سے کنجی نکال کر اس کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔ "مہینہ بھر بعد آؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے اس رات کو ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے ہی دن شہر کے دوسرے رخ، تقریباً تین میل کے فاصلے پہ ایک مکان کرایہ پر لے کر اٹھ گیا۔

بہت دن ہو گئے۔ غالباً ۲ مہینے گزر گئے۔ لچھو رانی تا حال میرے ذہن پر سائے کی طرح نقش جمائے ہوئے تھی۔

ایک روز میں بزاز کی دکانوں کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک کھلی ہوئی فٹن سے کسی نے مجھے آواز دی۔ پلٹ کر دیکھا تو فٹن میں ایک برقع پوش عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"میں ہوں گدی جی، لچھو رانی۔"

پھورانی! یکایک میرا دل دھک سے ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میری اپنی زندگی کی گاڑی کھڈ میں گر پڑی پھو نے نقاب الٹ دی اور کھل کھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"ڈرونت جی، میں نے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی پھو؟" میں نے کچھ ندامت، کچھ اطمینان و مسرت سے کہا۔

اس کے چہرے پر بڑا گہرا میک اپ تھا۔ سرخی پاؤڈر، ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک۔ اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی اور مسرت سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

"خوش تو ہو پھورانی؟"

"بہت" وہ گویا میرے سوال کی منتظر تھی "میرا خاوند مرد ہے۔ بزدل نہیں ڈرپوک نہیں۔ اتنی بڑی چھاتی ہے اس کی گدی جی بھگیڑ نہیں مجھے معلوم تھا یہ سارے تیر کا نشانہ میں ہی تھا۔ میں نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم کہانیاں لکھنے والے بڑے بزدل، بڑے کمزور ہوتے ہیں پھو۔ تمہاری گاڑی کا پہیہ تو . . . ؟"

"کیا نا بہت مضبوط ہے . . . " اس نے برجستہ کہا اور نقاب چہرے پر الٹ لی۔ "وہ آرہے ہیں، تم جاؤ۔"

میں گاڑی سے الگ ہٹ گیا۔ ایک بزاز کی دکان سے کپڑے کا پیکٹ لئے ہوئے لمبا تڑنگا سرخ پٹھان جھومتا جھامتا فٹن کی طرف آرہا تھا پھورانی کی زندگی کی گاڑی کو دوسرا پہیہ مل گیا۔ مضبوط بھی اور غالباً موزوں بھی۔ پھر بھی میں اس کی کہانی لکھنے سے معذور ہوں میری طبع کو اطمینان نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چیز گھٹ رہی ہے، کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، کوئی اور موڑ . . . !

ادب کے چار مینار

الف لیلہ

عربوں کی وہ شہرہ آفاق تخلیق جس کے ہر عنوان سے فردوسِ خیال کا ایک باب کھلتا ہے ۔ افسانوی ادب کا ایک زریں کارنامہ جس کی بنیادوں پر مغرب کا ارتقائی قصرِ ادب تعمیر ہوا اور سینکڑوں سال بعد آج بھی جدت طرازی اور ندرت آفرینی کا ایک معجزہ ہے ۔

" الف لیلہ " صرف ایک ہزار کہانیوں ہی کا مجموعہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ہزار سالہ تمدن کا آئینہ بھی ہے ۔ اور عربوں کے معیارِ معاشرت کا ایک مرقع بھی جس کے اردو ترجمہ اور تلخیص میں الیاس مجیبی کے قلم نے اپنی گلکاریاں دکھائی ہیں اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اعلیٰ طباعت ۔ پنج رنگ ٹائیٹل ۔ قیمت صرف سات روپے

لکھنو کا دبستانِ شاعری

دہلی کی بساطِ سخن کے الٹنے کے بعد لکھنؤ نے اردو شاعری کے چراغ روشن کئے لکھنؤ کی فضا دہلی سے مختلف تھی تہذیب و ثقافت کے اس نئے گہوارے میں، خانقاہوں سے " اللہ ہو " کی ضربوں کے ساتھ طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی ۔

اس ماحول نے زندگی کے ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ۔ اسکا دامن غزل اور قصیدے سے آگے بڑھنے لگا اور مثنوی اور مرثیہ کو تو یہ فضا ایسی راس آئی کہ یہ دونوں درجۂ کمال کو پہنچ گئے ، جدت طرازی کی دوسری کروٹ میں ریختی اور منظوم ڈرامہ کی داغ بیل پڑگئی اور امانت نے اندر سبھا لکھ ڈالی ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے پوری تحقیق اور کد و کاوش سے ان مناظر کا نقشہ کھینچا ہے اور ادب کے ساتھ ادیبوں کی بھی تاریخ مرتب کردی ہے ۔

ترمیم اور اضافہ شدہ ایڈیشن ۔ قیمت ۱۲/۵۰ روپیہ

دہلی کا دبستانِ شاعری

" اردو " نے دکن میں جنم لیا ہو یا ہندوستان کے کسی اور حصہ میں ۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دہلی اس کا گہوارۂ تربیت تھا جس میں نہ صرف زبان کے خد و خال درست ہوئے بلکہ وہ اس طرح نکھاری گئی کہ دلہن بن گئی ، میرؔ نے اس کی مانگ میں سیندور بھرا ۔ غالبؔ نے ماتھے پر ٹیکا لگایا ۔ ذوقؔ اور مومنؔ نے رخساروں پر غازہ مل کر رنگ روپ درست کردیا ، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ڈی لٹ نے ان تفاصیل کو تاریخ کی روشنی میں قلمبند کیا ہے اور تحقیق و تنقید کا حق ادا کرکے کتاب کو نظم کی ایک تاریخی دستاویز بنادیا ہے ۔

لائبریری ایڈیشن ۔ ٹائپ کی طباعت ۔ قیمت ۱۰/۵۰ روپیہ

داستانِ تاریخ اردو

اردو کے نثری ادب کا بہترین انسائیکلوپیڈیا مولانا حامد حسن قادری کا زندۂ جاوید کارنامہ ۔

جس طرح مولانا کی ذات گرامی نے نسلوں کو پروان چڑھایا اسی طرح ان کی یہ تخلیق ادبی تاریخ کا ایسا روشن سیارہ ہے جس سے یکے بعد دیگرے ہفت رنگ شعاعیں پھوٹتی ہیں اور ان سے ماضی کے تاریک افق پر ان ادیبوں کے چہرے منعکس نظر آتے ہیں جنھوں نے اردو کی قربان گاہ پر اپنی زندگیاں بھینٹ دے دیں اور جن کے قلم کی موشگافی آج ہمارے ادب کا سرمایہ ہے ۔ حامد حسن قادری کی یہ گراں قدر تالیف ایک متوازن ادبی دستاویز ہے جو ان کے ساتھ فنکاروں کی حیاتِ دائمی کی ضمانت کرتی ہے مختصر ہونے کے باوجود ضخیم سے ضخیم جلدوں پر بھاری ہے ۔

یہ تاریخ عرصے سے ناپید تھی ۔ ناشرین نے وقت کی پکار پر آخری اضافہ و ترمیم کے ساتھ نمایاں شان طریقہ پر شائع کیا ہے ۔

مجلد ۔ پچیس ۲۵ روپیہ   لائبریری ایڈیشن ، ستّرہ روپیہ

اردو اکیڈمی سندھ :- ۱۶ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی ۲

جمیل زبیری
الشجاع ۔ کراچی

نشاطِ زندگی

رات کے بارہ بج چکے ہیں نائٹ کلب کی رونق کچھ اور بڑھ گئی ہے کلب کی مدھم روشنیوں میں سائے سے لہرا رہے ہیں یکے بعد دیگرے رقاصائیں مختلف رقص پیش کر رہی ہیں بوتلیں کھل رہی ہیں جام کھنک رہے ہیں۔ ہر رقص کے اختتام پر تالیوں کا شور ابھرتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے اور اس کے بعد صرف لوگوں کے دبے دبے قہقہے یا باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مختلف میزوں پر لوگ بے ترتیبی سے بیٹھے ہیں کچھ لوگ زیادہ پی جانے کی وجہ سے کسی دوسری فضا میں کھوئے ہوئے ہیں کسی کسی پر اس زیادتی کا اثر الٹا پڑا ہے اور وہ بول رہا ہے یونہی فضول۔ کوئی کوئی زیادہ چڑھا کر بیرے سے ہاتھا پائی کے لئے تیار ہو گیا ہے اور اس کے دوست یا اس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگ اسے خاموش رہنے کی تلقین کر رہے ہیں اور اسے زبردستی پکڑ کر بٹھا رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی عورتیں بیٹھی ہیں بنی سنوری، مگر اکیلی چپ چاپ جیسے رقص دیکھنے میں اتنی محو ہوں کہ انھیں وقت اور جگہ کا احساس تک نہ رہا ہو۔ وہ کون ہیں اس کلب میں کیوں آئی ہیں وہاں اس طرح بیٹھنے کا کیا مقصد ہے جیسے انھیں کچھ پتہ بھی نہیں۔ اسٹیج کے قریب کی میزیں ابھی تک خالی ہیں ان پر RESERVED لکھا ہوا ہے۔

یہ RESERVED ہیں شاید کچھ بڑے آدمیوں کے لئے جو بارہ بجے کے بعد کلب آتے ہیں ان کی میزیں پہلے سے RESERVED ہو جاتی ہیں۔ مبادا دیر میں آنے کی وجہ سے انھیں اسٹیج کے قریب جگہ نہ ملے اور وہ رقاصہ کی تھرکتی ہوئی پنڈلیوں لچکتے ہوئے بازو اور مٹکتی ہوئی کمر کو قریب سے نہ دیکھ سکیں۔

آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے جو عورتیں ابھی تک تنہا بیٹھی تھیں اب ان کے پاس کوئی نہ کوئی بیٹھا ہے سامنے بوتلیں کھل رہی ہیں کاک ٹیل کے آرڈر دیئے جا رہے ہیں بیرے بڑی پھرتی سے بوتلیں لاتے ہیں اور گلاسوں کو میز پر رکھ دیتے ہیں۔ RESERVED سیٹیں بھی اب بھر چکی ہیں چند بڑے لوگ وہاں آکر بیٹھ چکے ہیں دور شروع ہو چکا ہے انھوں نے دن بھر ہزار دو ہزار یا پانچ ہزار کمائے ہیں تو پچاس، پانچ سو یہاں خرچ کر دینے سے کیا کمی ہو جائے گی اور پھر ان کا کمانا کس لئے ہے زندگی کی نشاطِ زندگی کے لئے۔ کو رنگین بنانے کی خاطر زندگی کی خاطر۔

میرے برابر والی میز پر دو شخص آکر بیٹھ گئے ہیں۔ مجھے ان کی گفتگو صاف سنائی دے رہی ہے۔

"آپ کیا پئیں گے؟"

"میں صرف بیئر پیوں گا۔"

"بیئر تو یہاں عورتیں پیتی ہیں۔"

"نہیں میرا مطلب ہے پہلے بیئر پیوں گا۔"

"اچھا میں منگواتا ہوں۔"

"تم نہیں پیو گے؟"

"جی نہیں میں صرف چائے پیوں گا۔"

"کیوں۔"

"اس لیے کہ میں تو شراب پیتا ہی نہیں۔ میں نے آج تک کبھی نہیں چکھی۔"

"مذاق مت کرو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم یہاں ملازم ہو تمہیں تو ہر قسم کی آسانی ہے۔"

"ملازم ضرور ہوں لیکن ملازمت کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں شراب ضرور پیوں میری ڈیوٹی یہاں صرف رات کو دس بجے سے ایک بجے تک ہوتی ہے وقت پر آتا ہوں اور اپنا کام کر کے چلا جاتا ہوں۔"

"اور دن بھر کیا کرتے ہو؟"

"دن بھر ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہوں۔"

"بھئی تعجب ہے یہاں کلب میں تمہارے کسی سے تعلقات نہیں میرا مطلب ہے کسی سے دوستی نہیں۔ جان پہچان سب سے ہے مگر دوستی کسی سے نہیں۔ ہوٹل کا مالک مجھ سے بہت خوش ہے اگر میں اپنے ساتھ کبھی کبھی آپ جیسے کرم فرماؤں کو لے آتا ہوں تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اچھا آپ جب تک ڈانس دیکھیں میرا تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے وہ ختم کر کے ابھی آتا ہوں، کہیں تو ایک بوتل اور بھجوا دوں۔"

"ہاں یہ رقاصہ بڑی حسین ہے۔"

"یہ عجیب لڑکی ہے اس کے بارے میں میں آکر آپ کو بتاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا ہے اس میز پر بیرے نے لا کر ایک بوتل اور رکھ دی ہے اب JAZZ بجایا جا رہا ہے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے دو دو کے جوڑے سائے کی طرح میرے سامنے سے گزر رہے ہیں اور اسٹیج کے قریب جا کر ناچنے لگے ہیں۔ میوزک اور تیز ہو گیا ہے ناچنے والوں کے قدم اور زیادہ تیزی سے تھرکنے لگتے ہیں وہ کبھی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچتے ہیں کبھی علحدہ ہو کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو کر عجیب انداز سے تھرکتے ہیں پورے ہال میں سگریٹوں کا دھواں گھٹا ہوا ہے سگریٹ اور شراب کی ملی جلی بدبو سے فضا مکدر ہو گئی ہے لیکن اس کدورت کا احساس کسے ہے میری میز سے کچھ فاصلے پر دو نوجوان ایک لڑکی کو لئے بیٹھے ہیں جو کبھی ایک کے کبھی دوسرے کے کاندھے سے لگ کر ایک ایک گھونٹ پیتی ہے اور قہقہے لگاتی ہے ہال میں روشنی اتنی کم ہے کہ کسی کی صورت صاف نظر نہیں آتی۔ کسی کو پتہ نہیں کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ یہاں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ میرے برابر والا شخص دو بوتل ختم کر چکا ہے اور JAZZ کی دھن پر سر اور پاؤں ہلا رہا ہے۔ ہوٹل کا ملازم واپس آگیا ہے اور ذرا دیر سے واپسی کی معذرت کر رہا ہے وہ دونوں گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں

"کیوں بھئی وہ لڑکی جو ان نوجوانوں کے ساتھ بیٹھی ہے وہ کون ہے۔ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"جی ہاں یہ سب لڑکیاں یہاں ملازم ہیں۔"

لازم ہیں، کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ جو لوگ یہاں تنہا آتے ہیں یہ ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر پیتی ہیں اور انھیں پلاتی ہیں۔"

"اچھا تو اسے یہاں بلالو۔"

"مجھے افسوس ہے۔ یہ کام آپ کو خود ہی کرنا ہوگا۔"

"یعنی میں خود اس کے پاس جاؤں۔"

"یا تو خود جائیے یا بیرے کو ٹپ دیجئے وہ آپ کا کام کر دے گا۔"

"ہاں وہ جو تم مجھے اس رقاصہ کے متعلق بتانے والے تھے۔"

"جی وہ عجیب لڑکی ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ وہ کوئی پیشہ ور رقاصہ نہیں بلکہ ایک اسکول میں پڑھتی ہے اور یہاں کی آمدنی سے اسکول کی فیس ادا کرتی ہے ۔ اور اپنا پیٹ پالتی ہے۔"

"تو کیا اس کا اور کوئی نہیں۔ ؟"

"جی ہاں۔ اس کی ماں ہے وہ اپنے وقت میں پیشہ ور رقاصہ تھی مگر اب اس کی آنکھیں جاتی رہی ہیں اس نے بہت کوشش کی کہ یہاں سے اس کی رقص و سرود کی زندگی ختم ہوتی ہے وہاں سے اسی طرح اپنی بیٹی کی زندگی شروع کروا دے۔ لیکن وہ اپنی ماں سے بہت مختلف ہے اسے پڑھنے سے رس دلچسپی ہے وہ اس ہال کے باہر سوائے کلب کے مالک کے کسی سے بات نہیں کرتی ۔

"آج تم مجھے عجیب عجیب باتیں سنا رہے ہو۔ یقین نہیں آتا۔"

"آپ یقین کیجئے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل حقیقت ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ۔ اچھا ڈیڑھ بجنے والا ہے مجھے اجازت دیدیں تو بڑا مشکور ہوں گا۔ میرا گھر کافی دور ہے پہنچتے پہنچتے دو بج جاتے ہیں۔"

"کلب کس وقت تک کھلا رہتا ہے؟"

"رقص تو دو بجے تک ختم ہو جاتا ہے کچھ لوگ ایک آدھ گھنٹے بعد تک بیٹھے رہتے ہیں۔"

اچھا جانے سے پہلے مجھے ایک بات بتاتے جاؤ۔ مگر بالکل سچ سچ بتانا۔"

"جی پوچھیئے۔"

"کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میں خوش ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے ایک نیک سی بیوی ہے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بس یہی ہماری چھوٹی سی دنیا ہے جس میں ہم سب مگن رہتے ہیں۔

"کیا تمھاری بیوی کو معلوم ہے کہ تم اس نائٹ کلب میں ملازمت کرتے ہو؟"

"جی ہاں معلوم ہے۔ ہماری خوشی اور مطمئن زندگی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ میں اس سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرتا۔ رات گئے تک گھر سے باہر رہنے کے لئے مجھے کوئی بہانہ ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ میں اس سے کبھی جھوٹ نہیں بولتا ۔ اچھا آخری رقص شروع ہونے والا ہے آپ اس سے لطف اندوز ہوں اور مجھے اجازت دیں۔"

"اچھا جاؤ۔"

اس کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس شخص نے ایک لمبا سانس بھرا اور گلاس اٹھا کر

ایک ہی گھونٹ میں اسے خالی کر دیا۔

آخری رقص کا اعلان ہو گیا ہے لوگ اس رقص کو دیکھنے کے لئے کچھ زیادہ بے چین معلوم ہوتے ہیں۔ نئے سرے سے بوتلیں میزوں پر لگ گئی ہیں سگریٹ کے دھوئیں کی تہہ کچھ اور دبیز ہو گئی ہے۔

ایک جھنا کے کے ساتھ رقاصہ اسٹیج پر آ گئی ہے۔ اس کے جسم کا زیادہ تر حصّہ کھلا ہوا ہے۔ وہ متحرک رہی ہے اور عجیب وحشیانہ انداز سے جسم کے مختلف حصوں کو حرکت دے رہی ہے۔ میوزک تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے وہ ناچتے ناچتے کچھ مدہوش سی ہو گئی ہے اور اب اس نے اپنے جسم کے وہ چند کپڑے بھی اتار دیئے ہیں۔ لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے ہیں ان کی آنکھیں بھوکے بھیڑیوں کی طرح چمک رہی ہیں ان کے منہ کھلے ہوئے ہیں ٹانگیں رقص کی موسیقی کے ساتھ ساتھ متحرک رہی ہیں۔ ہاتھوں میں جام ہے اور ہر شخص کی زندگی سمٹ کر اس جام میں آ گئی ہے۔

رقص ختم ہو گیا ہے سب لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر چلے گئے ہیں وہ ایک میز پر ایک شخص سر پکڑے بیٹھا ہے شاید وہ سو گیا ہے یا زیادہ نشہ ہو گیا ہے بیرا آ کر اسے جھنجوڑتا ہے اور باہر جانے کے لئے اشارہ کرتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھتا ہے پھر گر جاتا ہے پھر کوشش کر کے اٹھتا ہے اور پھر لڑکھڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔

میرے دل میں ایک کسک ہے میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا ہوں میرے سامنے زندگی کا وسیع و عریض کینوس پھیلا ہوا ہے اور اس شخص کے جملے میرے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ میں خوش ہوں میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے ایک نیک سی بیوی ہے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بس۔ یہی ہماری چھوٹی سی دنیا ہے جس میں ہم مگن رہتے ہیں۔

مقبول حسین
سُرتیا۔ دہلی

موت سے پہلے

آج سے سات برس پہلے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ایسا بھی وقت آسکتا ہے جب بھولا اور رام پرشاد جیسے جگری دوستوں کی دوستی دشمنی میں بدل جائے گی۔ اور دشمنی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔

دونوں ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ایک برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ہی ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اور یہی نہیں بلکہ دونوں خاندانوں میں اتنے گہرے تعلقات تھے کہ ضرورت پڑنے پر دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے لیے جان کی بازی تک لگا دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

دونوں گھروں کے یہ تعلقات تین پشتوں سے چلے آرہے تھے۔ کبھی بھولا کے بچے رام پرشاد کے گھر دن دن بھر رہتے۔ اور کبھی اس کے بچے بھولا کے گھر۔ مگر شدنی کو کون جانتا ہے۔ چک بندی کے سلسلے میں آپس میں کچھ ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور کچھ ایسی رنجشیں بڑھ گئیں کہ بڑھتے بڑھتے ایک خوفناک شکل اختیار کر گئیں۔

بھولا کے دل میں دھیرے دھیرے گاؤں والوں نے یہ شک بٹھا دیا کہ رام پرشاد کے گھر والوں نے چک بندی کے محکمہ والوں کو رشوت دے کر اچھے پلاٹ کو اپنے نام کرا لیا ہے۔ اور خراب اور دُور والے پلاٹ پر بھولا کا نام چڑھوا دیا ہے۔

زمین کی بات تھی بڑھ گئی۔ تناؤ پیدا ہو گیا۔ اور آخر ایک دن کھیت کے مسئلہ پر بھولا اور رام پرشاد کے بڑے بھائی کے درمیان اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔ بھولا تو کئی دنوں سے خار کھائے ہوئے بیٹھا ہی تھا، موقع ملتے ہی بہت کچھ الٹی سیدھی سنا ڈالیں۔

رام پرشاد کا بھائی بھی دبنے والا کب تھا۔ اُس نے بھی اس کی کئی پشتوں کی خبر لے ڈالی۔ بات تو تو میں میں سے بڑھ کر گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ اور پھر جب اس سے بھی آگے بڑھی تو دیکھتے دیکھتے دونوں نے ڈنڈا سنبھال لیا۔ اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے۔ قسمت کی بات رام پرشاد کے بڑے بھائی کا سر کھل گیا۔ اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ بھولا ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

مقدمہ چلا، پیسہ خرچ ہوا، اور آخر بھولا کو چھ مہینے کی سزا مل گئی۔ اور اس دوران دونوں خاندانوں کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کیلیے نفرت اور دشمنی کی ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی۔

بھولا جب سزا کی میعاد گزار کر قید سے باہر آیا تو اُس کے گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ تمام لوگ اُس سے نفرت سی کرنے لگے تھے۔ ہر آدمی اُس سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی آدمی بھی اُس پر اعتماد نہیں

گمرہا ہے یہاں تک کہ اُس کے اپنے لڑکے بھی کٹے کٹے رہتے ہیں۔ ... یہ احساس اُس کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔ اور پھر ایک رات نہ جانے اس جذبہ کے تحت رام پرشاد کو دھوکے سے مار کر اُس نے بُری طرح زخمی کر دیا۔ اور گھر بار، بال بچوں کو چھوڑ چپ چاپ اکیلا کہیں نکل گیا

بہت دنوں تک تو اُس کی کوئی خبر نہ مل سکی۔ گھر والوں نے یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ مرکھپ گیا، رو دھو کر صبر کر لیا۔ مگر یک بیک جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے اور ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ بھولا اتنا گر جائے گا کہ وہ ڈکیتی جیسی ذلیل حرکت پر اُتر آئے گا۔ مگر وہ گر گیا تھا اور روزانہ دو چار وارداتیں کر رہا تھا۔

اُس کے اوپر سترہ قتل اور ارتیس ڈکیتی کے الزام تھے وہ اپنے علاقہ کا ایک خوفناک ڈاکو مانا جانے لگا تھا۔

پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ مگر اس کی پارٹی کا ایک آدمی بھی ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے پولیس کے دو آدمیوں کو اُس نے مار ڈالا تھا، پولیس بھی اُس کے پاس جاتے ہوئے کتراتی تھی۔ اس کے قتل اور غارت گری سے پریشان ہو کر گورنمنٹ نے اُس کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر دو ہزار روپیہ کا انعام بھی رکھ دیا تھا۔

بھولا کا منجھلا لڑکا ہرلسی گاؤں سے ملے ہوے قصبہ کے ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ حد سے زیادہ ذہین اور حساس واقع ہوا تھا۔ جب اُسے اپنے باپ کی حرکتوں کی خبر ملتی، یا اس کے ساتھی اس کے باپ کے کرتوتوں کی وجہ سے چھیڑتے تو اس کا جی چاہتا کہ یا تو ان تمام مذاق اُڑانے والوں کا سر توڑ دے، یا خود کہیں جا کر خودکشی کر لے۔ اور یہ کیفیت اس پر اکثر طاری ہوا کرتی۔ مگر وہ کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ ہاں اس کا ردِّ عمل یہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ تنہائی میں اکثر گھنٹوں رویا کرتا تھا۔

ایک دن اسکول کا کام نہ کرنے پر جب کلاس ٹیچر نے اُس کے باپ کے کارناموں کا حوالہ دے کر اس پر طنز کیا تو اس کا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ وہ اسی وقت اپنی کتابوں کو لے کر واپس گھر کی طرف چل دیا۔ دروازہ پر پہنچا تو اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

باہر دو کانسٹبل کھڑے تھے، اور سینکڑوں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بجائے باہر کچھ پوچھنے کے وہ ہانپتا ہوا سیدھا گھر میں پہنچا۔ اور ماں کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

ماں کئی عورتوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اُٹھی اور اسے لپٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بار بار حیرانی سے پوچھ رہا تھا کہ آخر بات کیا ہے؟ مگر بجائے اس کے کہ کوئی جواب دے، سب کے سب اُسے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے جن میں کچھ افسوس بھی تھا، کچھ ہمدردی بھی تھی۔ اور کچھ بھی تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اور گھبرا کر باہر نکل آیا۔

باہر اپنے پڑوسی الگو چچا سے اُس نے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس کا بڑا بھائی ٹھاکور گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور گرفتار کرانے میں رام پرشاد کے گھر والوں کا ہاتھ ہے۔

جب اُس نے واقعہ کی مزید تفصیل چاہی تو انھوں نے بتایا کہ آج قریب دو بجے کنوئیں کی جگت پر رام پرشاد کے گھر کا ایک لڑکا آ کر پاخانہ کر رہا تھا۔ ٹھاکور نے اُسے ڈانٹا تو وہ روتا ہوا اپنے گھر بھاگ گیا۔ اُس کا گھر پہنچنا تھا کہ اُدھر سے تین چار آدمی گالی دیتے ہوئے نکلے۔ اور ٹھاکور کو گھیر لیا۔ الزام اس پر یہ تھا کہ اُس نے لڑکے کو مارا ہے۔ حالانکہ اُس نے چھوا تک بھی نہیں تھا۔ بات بڑھتی گئی۔ اور ایک آدمی نے طیش میں آ کر ٹھاکور کے تھپڑ مار دیا۔ بس وہ اُن پر بھوکے بھیڑیئے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اور انھیں ان کے گھر تک ڈھکیل آیا۔ اس کے بعد وہ سب چوکی پر گئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد لوٹے۔ ان سبھوں کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پولیس آئی اور ٹھاکور کو پکڑ کر لے گئی۔ کہنا یہ ہے کہ اس نے ڈکیتی اور لوٹ مار کے سلسلے میں ان کے گھر پر حملہ کیا تھا۔

لنگوٹیا سے یہ سب سن کر اس کا دماغ بھنّا اٹھا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اب گاؤں میں رہنا ہی وہ بھر ہوتا جا رہا ہے۔ باپ ڈاکو کیا ہوا، گھر کا گھر مجرم بن گیا۔ مار بھی کھاتے جاؤ اور ڈاکو بھی کہلاتے جاؤ۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف ایک شدید نفرت کا احساس جاگ اٹھا اور وہ اس احساس کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر کے شام کو اپنے بھائی کو ضمانت پر چھڑا لایا۔

ایک بار پھر دونوں گھروں میں ایک معمولی سی بات کے لیے کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ اور دونوں طرف ایک دوسرے کو مارنے اور نیچا دکھانے کا منصوبہ بننے لگا۔

ایک دن گزرا۔

دو دن گزرا۔

تین دن گزرا۔

اور چوتھے دن اچانک رات کے دو بجے رام پرشاد کے گھر ڈکیتی پڑ گئی۔ اڑوس پڑوس کے سبھی لوگوں کو خبر مل گئی۔ پولیس کی چوکی پر بھی شور و غل کی آواز پہنچ گئی۔ مگر ملے ڈر کے رام پرشاد کے گھر کے نزدیک کوئی بھی نہیں پھٹکا۔

جس وقت ہرلش کے کانوں میں چیخ و پکار کی آواز گئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اُس کا بھائی ٹھاکر پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔

"مالوم ہوت ہے رام پرشاد کے ہاں ڈکیتی پڑ گئیل۔" اُس نے کہا۔

ہرلش نے لپک کر کونے سے گنڈاسا اٹھا لیا اور جیسے ہی چاہا کہ باہر نکل جائے، ٹھاکر نے اُچک کر اُسے پکڑ لیا۔ اور بہت زور سے ڈانٹ کر بولا۔

"کا کرت ہے بے، جان دیبے کا!"

"بھیا" ہرلش نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر چھڑا لیا۔ اور بولا۔ "ای ہے مناسب کہ ہمن کے رہتے ہی گھر میں ڈکیتی پڑ جائے۔"

"ابے اُ ہمن کے دشمن کا گھر ہے۔"

"ناہیں بھیا، بالکل ناہیں۔ اپن جھگڑا اپنے ساتھ۔ باہر کا کوئی آکے آنکھ دکھا جاوے ای نہ برداشت ہوئی۔"

"اچھا نا، جا جو جی میں آوے کر۔"

ٹھاکر نے غصے میں آ کر کہہ دیا۔ اور ہرلش دھیرے سے باہر نکلا۔ اور اندھیرے میں پچھواڑے کی طرف رینگ گیا۔

شور و غل برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ اور ہرلش اپنے مکان کے پچھواڑے اُپلے کے ڈھیر کی آڑ میں چپ چاپ دبکا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکو اسی راستے سے واپس جائیں گے۔ اور کوئی دوسرا راستہ بھی تو گاؤں کے باہر جانے کا نہیں تھا۔ دو طرف پانی تھا اور ایک طرف آبادی تھی۔

ابھی اُسے مشکل سے پندرہ منٹ بیٹھے ہوئے ہوں گے کہ رام پرشاد کے گھر کی طرف سے کچھ سایے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے، جو دھیرے دھیرے اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سانس روک کر کچھ اور دبک گیا۔ اور ان کے حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ اُس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مگر اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اکیلا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ خوف زدہ تو ضرور تھا۔ مگر اُس نے موقع ملنے پر اُن پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

ایک سایہ بڑھتا ہوا آیا، اور اُس کے قریب سے گزر گیا۔ مگر وہ خاموش رہا۔

پھر دوسرا آیا اور وہ بھی بڑھ گیا۔

پھر تیسرا آیا۔

پھر چوتھا، پھر پانچواں۔

اور اس طرح یکے بعد دیگرے پندرہ آدمی اُس کے قریب سے گزر گئے۔ مگر وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اُس کے ہاتھ میں آئے ہوئے شکار نکل چکے تھے

اور وہ اپنے اوپر لعنت بھیج رہا تھا۔

اب وہ اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ تھوڑی دُور پر ایک اور سایہ حرکت کرتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی بہت احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ جب وہ بھی اُس سے قریب دس گز آگے نکل گیا تو یہ چپکے سے اُٹھا اور قدم دبا کر اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

وہ آدمی بجائے سیدھا جانے کے اُس کے اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔ اور پچھواڑے کی دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بھی چپکے چپکے پیڑوں کی آڑ لیتا ہوا اُس سے تین چار گز کی دوری پر پہنچ کر آم کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ ڈاکوؤں میں سے ہی کوئی ہے۔ مگر پھر اکیلے! کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا بھائی ٹھاکر ہو ــــ ان چند لمحوں میں بہت سے خیالات اُس کے ذہن میں آئے اور بے خبری میں کچھ ایسی آہٹ ہو گئی کہ وہ آدمی یک بیک اندھیرے میں چونک کر سرگوشی کے انداز میں بول اُٹھا ــــ "کون ہے سامنے آجائے۔ نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

اور اِدھر ہرلش کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سچ مچ اُس نے گولی مار دی ہو۔ اُس کے ہاتھ سے گنڈاسا چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"میں کہہ رہا ہوں، سامنے آؤ۔" ایک بار پھر اجنبی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"او" ایک بار پھر ہرلش چونک گیا۔ اُس نے گنڈاسے کی دھار پر ہاتھ پھیرا۔ چند لمحہ کھڑا رہا۔ پھر اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کا خون کھولنے لگا ہو۔ اُس نے نہایت پھرتی سے تنے سے داہنی طرف سرک کر گنڈاسے کو فضا میں بلند کیا اور ایک بھرپور ہاتھ اس آدمی کے سر دے مارا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ اُس آدمی کو سنبھلنے اور سمجھنے کا کچھ موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ کراہ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

ایک گھنٹہ کے بعد جب بالکل سکون ہو گیا تو لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلنے لگے۔ چوکی پر سے دیوان جی بھی چھ سات پولیس والوں کے ہمراہ موقع واردات پر پہنچ آئے۔ رام پرشاد کے گھر والوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ تین بکس اور ڈھائی ہزار کے قریب نقد روپیہ ڈاکو لے گئے ہیں۔

وہاں سے لوگوں کا ہجوم ٹارچ اور لالٹین کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اس راستے پر پہنچ گیا۔ جدھر سے تھوڑی دیر پہلے ڈاکو گزرے تھے۔ آگے آگے دیوان جی اور کانسٹبل تھے اور اس کے پیچھے گاؤں کے لوگوں کا ایک بہت بڑا مجمع تھوڑی دُور آگے بڑھنے کے بعد یک بیک بہت سے لوگ تو لالٹین اور ڈنڈا وغیرہ پھینک پھینک کے بھاگ نکلے۔ اور بہتوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

دس ہی قدم کے فاصلے پر ایک بہت خوفناک آدمی بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ داڑھی اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ ناک کے بیچ سے لے کر سر تک ایک گہرا زخم دکھائی دے رہا تھا جس سے خون بہ بہ کر اُس کی داہنی آنکھ اور گال کے بالائی حصّہ پر جم گیا تھا۔ لالٹین کی مدھم اور ٹارچ کی محدود روشنی میں اُس کا چہرہ اور بھی بھیانک نظر آ رہا تھا۔ داہنی طرف تھوڑی دُور پر ایک دیسی ساخت کا پستول گرا ہوا تھا۔ اور بائیں طرف اس کے پیروں کے قریب ایک گنڈاسا پڑا ہوا تھا۔

پورے گاؤں میں یہ خبر بجلی کی سُرعت کے ساتھ پھیل گئی کہ ایک ڈاکو پکڑ لیا گیا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے پورا گاؤں ٹوٹ پڑا۔ دیوان جی نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اور اُسے بندھوا کر چوکی پر اٹھوا لے گئے۔ اور وہاں وہ ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے قصبہ کے تھانہ سے داروغہ جی بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے بے قراری سے کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ وہ دروازے کے پاس ہی پڑا تھا۔ انھوں نے ایک زور کی ٹھوکر اس کی کمر پر ماری۔ مگر وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ انھوں نے اُس کے پیر کو زور سے دبا دیا۔ مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ انھوں نے گھبرا کر جھک کر اسے دیکھا۔ پھر جیوں ہی اُسے ہاتھ لگایا اُچھل کر پیچھے ہٹ گئے۔

وہ مر چکا تھا اور اس کا پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ ایک بوسیدہ سی چادر لا کر اس کے اوپر ڈال دی گئی

اتنی دیر میں کافی دن نکل آیا۔ اور پورا گاؤں اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑا۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب کے سب جوق در جوق

(باقی صفحہ ۱۵۴ پر)
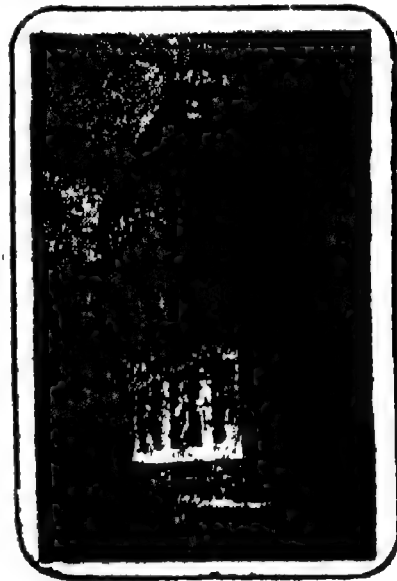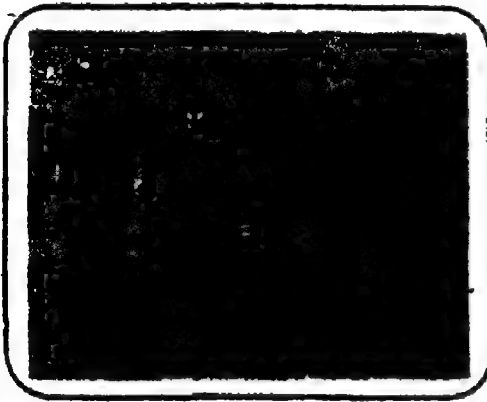
یہ عمارتیں ایک جھلک ہیں اس عظیم تر پاکستان کی جو ہمارے شہروں اور دیہی علاقوں میں اُبھر رہا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن ان سب کی مضبوطی کا راز ایک ہی ہے۔ وہ ہے، زیل پاک اور میپل لیف فیکٹریوں میں تیار ہونے والی اعلیٰ قسم کی ڈبلیوپی آئی ڈی سی سیمنٹ کا استعمال!

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

اوشا سیٹھ
ساقی۔ کراچی

سب سے بھلا روپیہ

تقریباً اڑتالیس گھنٹے کے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد رام بھج جب اپنی سسرال کے گاؤں کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اترا تو اس کا دل کسی انجانے جبال و خوف کے زیر اثر دھک دھک کر رہا تھا اور بائیں آنکھ رہ رہ کر پھڑک جاتی تھی۔ وہ پورے چار سال بعد اپنی ساس اور دلہن رکمنی سے ملنے آیا تھا اور اس کا مصمم ارادہ تھا کہ لوٹتے ہوئے رکمنی کو اپنے ساتھ بمبئی لے جائے گا اور صحیح معنوں میں اپنی ازدواجی زندگی شروع کرے گا۔ راستہ بھر وہ نجانے کیسے کیسے حسین اور روح افزا خیالات و تصورات کے گہوارے میں جھولتا ہوا اپنی خوش آئند زندگی کے خیش محل تعمیر کرتا رہا تھا۔ مگر اب جب کہ وہ قریب قریب اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا تو نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا جیسے وہ شیش محل زلزلوں کے نرغے میں پھنس گئے ہوں

پلیٹ فارم پر کھڑا کھڑا وہ ایک دو منٹ تک اپنے اس خیال و خوف کو دل سے نوچ کر پھینک دینے کا کوشاں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دیوی دیوتاؤں کو مناتا رہا اور پھر خود کو سنبھال کر اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

اسٹیشن سے گاؤں تین میل تھا۔ اس کے پاس ایک تھیلے کے علاوہ اور کوئی سامان نہیں تھا۔ لہذا تکان سے چور چور ہونے کے باوجود گاؤں کو جانے والے تانگہ میں بیٹھنے کے بجائے پیدل ہی گاؤں کی طرف چل دیا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اسے پانی کی پیاس محسوس ہوئی۔ سڑک کے کنارے ہی ایک کھیت میں رہٹ چل رہا تھا۔ اس نے وہاں جا کر پانی پیا اور کچھ دیر سستانے کے لئے ایک قریبی درخت کی طرف چلا، جہاں بوڑھا بھگو، جو کہ اس کھیت کا مالک تھا، بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ ایک سلیک کے بعد وہ بوڑھے کے پاس جا بیٹھا۔ پھر جب اس نے بوڑھے سے اپنا تعارف کرایا تو بوڑھا انگشت بدنداں سا رہ گیا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر خود کو سنبھال کر بوڑھے نے اسے جو کچھ بتایا اسے سن کر وہ شل سا ہو کر رہ گیا۔

"بیٹا! بوڑھے نے ایک سرد آہ بھر کر انتہائی مخلصانہ اور ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"زمانہ بڑا کھوٹا ہے! کوئی کسی کا نہیں۔"

وہ خاموش رہا۔

"اسے کہتے ہیں کلجگ بیٹا! " بوڑھے نے پھر ایک آہ بھری۔ "اس حرامی کالو نے تیری ساس سے کہا کہ تیرا داماد لیعنی تو ریل کے نیچے کٹ کر مر گیا ہے اور تیری لاش تک نہیں ملی اور تیری ساس نے اس بات کو سچ مان لیا۔ تیری بیوی کی چوڑیاں بھی توڑ دی گئیں اور دنیا دکھاوے کو تیری موت کا سیاپا اور پھر تیرھویں بھی کی گئی۔"

"ارے!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور آنکھیں بھر بھر کر چھلکنے لگیں۔

"بیٹا" بوڑھے نے انتہائی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میرا دل تو پہلے ہی یہ کہہ رہا تھا کہ اس میں کوئی چال ہے۔ پھر کچھ دنوں بعد تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو گئی۔"

"وہ کیسے بابا؟" اس نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

"بیٹا!" بوڑھا سنجیدگی سے بولا۔ "تیری موت کا سیاپا اور تیرہویں کی رسم تو دنیا دکھاوے کی باتیں تھیں اصلی بات تو یہ تھی کہ تیری ساس اپنی بیٹی کا دوسرا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے کالو کے ساتھ مل کر یہ سب ناٹک رچایا۔ اب سنتے ہیں کہ تیری ساس اپنی بیٹی رکمنی کو چنگلوں کی بستی کے بھولو کے گھر بٹھانے جا رہی ہے۔"

اس نے یہ سب سنا اور اس کا سارا وجود بلک بلک کر رو پڑا۔ اب اسے اپنے مرنے اور تیرہویں کی رسم ہو چکنے کا ذرا بھی غم نہیں رہ گیا تھا۔ غم تھا تو صرف یہ کہ اس کی زندگی میں ہی اس کی بیوی کا دوسرا بیاہ ہو رہا ہے۔ اس کی غیرت مردی چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگی اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی زندگی میں ایسا ہرگز نہ ہونے دیگا۔ "تو اب میں کیا کروں بابا؟" اس نے حسرت آمیز نگاہوں سے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔" اس کی آواز میں بھراہٹ کے ساتھ ساتھ بے پناہ متانت تھی۔ گویا وہ اپنی بیوی کی دوسری شادی کو روکنے کے لئے ساری دنیا سے لوہا لینے کو تیار ہو۔

"بیٹا!" بوڑھے نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں کہ ایسے نیچ لوگوں سے جب بھی جان چھوٹے تبھی اچھا۔ ایسے لوگوں کا کیا بھروسہ۔ تو تو پردیس میں تھا۔ تیرے پیچھے نہ جانے کیا کچھ ہوا ہوگا۔ تیرے جیسے گبھرو کو کیا لڑکیوں کی کمی ہے!"

بوڑھے کی گفتگو کی بات کو اپنے لئے سود مند سمجھتے ہوئے بھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ یوں چپ چاپ اس ظلم کو برداشت کر لینا بھی کوئی مصلحت اور عقلمندی نہیں ہے اس کی قسمت میں جو کچھ ہے وہ تو ہے ہی تاہم اسے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیئے۔

بایں ہمہ نہ جانے کیوں اس کے دل میں یہ خیال رہ رہ کر سر نکال رہا تھا کہ اس سازش میں رکمنی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی رکمنی کا سانولا سلونا معصوم چہرہ اس کی آنکھوں میں ناچنے لگ جاتا اور اس کی معصومیت کا یقین سا آ جاتا۔ رکمنی ایسی حسین و معصوم بیوی پا کر وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا یہ اس کی خوش قسمتی ہی تو تھی کہ رکمنی کی ماں جو کہ گاؤں میں کاکی کے نام سے موسوم تھی نے اسے اپنا داماد بنایا تھا۔ ورنہ اس یتیم، بے گھر بار اور بیکار چھوکرے کے ساتھ کون اپنی بیٹی کا مستقبل وابستہ کرتا اور بیاہ کی بیدی پر بیٹھے ہی بیٹھے اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے اسے کچھ بھی کرنا پڑے وہ رکمنی کو رانیوں کی طرح اپنے گھر میں رکھے گا اور کاکی کو دکھا دے گا کہ اسے اپنے انتخاب یعنی اسے اپنا داماد بنانے پر کبھی افسوس نہیں ہوگا بلکہ وہ تو اپنی اور بیٹی کی قسمت پہ ناز کرے گی اسی ارادہ کے زیر اثر وہ بیاہ کے ایک ہفتہ بعد ہی وطن سے تقریباً نو سو میل دور بمبئی چلا گیا تھا۔ جہاں وہ گزشتہ چار سال سے دن رات ایک کر کے روپیہ کماتا رہا تھا اور اس نے دس ہزار سے بھی زائد رقم جمع کر لی تھی۔ اب جبکہ اس کی تکالیف اور جدائی کا دور ختم ہو گیا تھا اور رکمنی کے ساتھ سکھ سے رہنے بسنے کا وقت آیا تھا تو اس کی قسمت نے اسے یہ سانحہ سنوایا وہ کیا جانتا تھا کہ انسان اتنی جلدی بدل بھی سکتا ہے جب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا تو وہ کاکی کا داماد بھی تھا اور رکمنی کا شوہر بھی اور جب کہ اس کے پاس سب کچھ ہے تو وہ نہ کاکی کا داماد ہے نہ رکمنی کا شوہر کتنی عجیب ہے یہ دنیا! اور پھر اگر وہ کاکی کی مرضی کے خلاف بمبئی گیا ہوتا تو بھی کچھ بات تھی۔ وہ تو باقاعدہ اس کی اجازت اور آشیرباد لے کر گیا تھا۔ رکمنی نے اسے روکنا چاہا تھا۔ مگر اسے اس نے مستقبل کی ایسی سنہری جھلک دکھائی تھی کہ وہ رضامند ہو گئی تھی۔ مگر اب کاکی بھی بدل گئی تھی اور شاید رکمنی بھی۔ اور اس سب کی وجہ اس کی قسمت کے پھیر کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور اب اسے

احساس ہو رہا تھا کہ گزشتہ چھ سات ماہ سے کاکی کی طرف سے جو اس کے خطوط کا جواب موصول نہیں ہو رہا تھا اس کی واحد وجہ یہی سازش تھی ورنہ۔ "کس سوچ میں کھو گیا بیٹا تو"! دفعتاً بوڑھے بھگتو کی آواز سے وہ چونک پڑا۔ بوڑھا شفقت اور اپنائیت سے لبالب بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں بابا!" اس نے اپنے درد کو دل ہی میں دبائے رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "میں اپنی قسمت پر رو رہا ہوں!"

"ہمت سے کام لے بیٹا!" بوڑھے نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "ایسے تیج کا خیال دل سے نکال دے ایسی ایسی ہزاروں چھوکریاں تیرے آگے پیچھے پھریں گی!"

"سو تو ٹھیک ہے بابا پر میں ایک بار ان لوگوں سے مل کر گاؤں والوں کے سامنے ان کی نیچتا اُجاگر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے سنجیدگی و متانت سے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جیسی تیری مرضی بیٹا۔" بوڑھے نے اس کے خیال کی تائید کی اور پھر دونوں کاکی اور رکمنی کی باتوں میں کھو گئے بوڑھے نے اسے مکمل تعاون اور مدد کا یقین دلایا اور یاس کے اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے امید کی ایک سہری کرن متحرک اٹھی۔

دن ڈھلے وہ بوڑھے بھگتو کے ساتھ گاؤں میں پہنچا اور بھگتو نے اپنے پڑوسی کے لڑکے مادھو کے ذریعہ کاکی کو اس کی آمد کی اطلاع کرائی۔

مادھو نے جا کر کہا "کاکی تمھارے داماد آئے ہیں۔"

"داماد!" کاکی چونکی اور رکمنی کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ بیٹھی دھان پھٹک رہی تھی مگر دفعتاً اس کے ہاتھ ساکت و جامد ہو کر رہ گئے

"کون داماد رے مادھو؟" کاکی نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ اس نے بھولو کو اپنا داماد مان لیا تھا مگر اس کی بیٹی رکمنی دلہن بن کر اس کے گھر نہیں گئی تھی اور جب تک سب کام پورا نہ ہو جاتے وہ بھولو کو اپنا داماد ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔

مادھو نے فوراً جواب نہ دیا۔ لہٰذا کاکی نے پھر استفسار کیا۔ کون داماد رے مادھو؟"

"داماد کون کاکی؟" مادھو مسکرا کر بولا "وہی اپنے بمبئی والے"

یہ سن کر رکمنی فرطِ مسرت سے دل ہی دل میں جھومتی ہوئی سوچنے لگی "میرا تو پہلے ہی جی دھڑک رہا تھا کہ وہ مرے نہیں، پر ماں کب سنتی ہے کسی کی! کالو نے کیسا رنگ جمایا ہے اس پر!" اور ابھی رکمنی سوچ ہی رہی تھی کہ کاکی بے اختیار چلا اٹھی۔ "اچانک موت ہوئی تھی، تبھی تو بھوت بنا۔ تیرہویں میں لگایا اتنا روپیہ بھی بیکار ہی گیا!"

مادھو چند ثانیے تک خاموش رہا۔ اور پھر یکایک بولا "بھوت نہیں کاکی۔ سچ مچ کا داماد ہے۔ بھگتو دادا کے گھر ٹھہرا ہے۔"

یہ سن کر کاکی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی اور رکمنی کیف و سرور کے ایک بحرِ بے پایاں میں غوطے کھانے لگی۔ اس کے معصوم دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ پہلے سے یہ جانتی ہوتی کہ تیرہویں کرنے سے اس کا رام بھج آجائے گا تو اس کی تیرہویں کالو اور بھولو کے اس چال کو پہلے سے بہت پہلے کر دی ہوتی۔

"مادھو!" سوچتے سوچتے یکایک کاکی تیکھی آواز میں بولی۔ "وہ پہلے کیوں نہیں آیا؟ تب اسے کیا ہو گیا تھا؟" اس کے ساتھ ہی بھولو کا مسکین اور رحم طلب چہرہ اس کی آنکھوں میں ناچنے لگا اور جو جو بھلائیاں اور احسانات بھولو نے ان پر کئے تھے۔ وہ سبھی یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ "کتنا اچھا چھوکرا ہے بھولو!" اس نے دل ہی دل میں کہا "وقت بے وقت جب چاہو ہاتھ باندھے کام کرنے کو تیار! عمر بھی زیادہ نہیں ہے! اور ایک یہ رام بھج ہے نہ ماں نہ باپ نہ گھر بار! میری بیٹی کو تیدن بنا کر پردیس جا بیٹھا!" پھر وہ مادھو سے مخاطب ہوئی "مادھو اس سے کہہ دے۔ میری بیٹی رانڈ ہو گئی ہے اور اب وہ رانڈ ہی رہے گی! اس سے کہہ دے کہ تمہارے گھر آنے کی ضرورت نہیں"

"ماں!" رکمنی نے سہمی سہمی سی آواز میں پکارا مگر اس نے رکمنی کی آواز سنی اَن سنی کردی اور مادھو سے مخاطب رہی: "ہمیں ایسے کے ساتھ اپنی بیٹی کی زندگی خراب نہیں کرنی!"

"پر کاکی برادری... ؟" مادھو نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھاڑ میں جائے برادری!" اس نے تنک کر زور سے کہا۔ "جب میں انصاف پر ہوں تو مجھے برادری کا کیا ڈر!"

"ماں!" رکمنی نے پھر پکارا۔ مگر اس نے بیٹی کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور مادھو سے مخاطب رہی۔ "وہ آیا ہے تو آئے ہمیں اس سے کیا؟ — وہ ہمارے لئے مرگیا اور ہم اس کے لئے!"

"کیوں کاکی۔" مادھو نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر وہ تمہارا تیرہویں اور کریاکرم پر ہونے والا سارا روپیہ لوٹا دے تو۔!"

"نہیں بیٹا!" اس نے تنک کر جواب دیا۔ "اب وہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے! کچے دھاگے کو بار بار کیوں جوڑا جائے۔ وہ تو ٹوٹے!"

"ماں!" رکمنی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا مگر اس نے اب بھی بیٹی کی طرف کوئی توجہ دی مادھو سے مخاطب رہی۔ "بھگوان کی یہی مرضی تھی بیٹا!"

"اچھا کاکی!" مادھو نے ایک آہ بھر کر کہا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔

کاکی کے پاس سے آکر مادھو نے رام بھج کو سب احوال کہہ سنایا اور مادھو ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ رات کو بوڑھے بھگتو کی صلاح اور رائے کے مطابق اس نے گاؤں کی پنچایت کے سامنے اپنا دکھڑا رو دیا۔ پنچایت میں بھولو اور اس کے احباب بھی موجود تھے کالو نے اس پر بدچلنی اور بازاری عورتوں کے ساتھ راہ و ربط رکھنے کا الزام لگایا اور کالو کے اس الزام کو بالکل غلط اور بے بنیاد سمجھتے ہوئے بھی پنچایت کا ہر رکن کالو کے ڈر کی وجہ سے خاموش رہا۔ اس بات پر کالو اور اس میں کافی بحث ہوئی اور آخر میں ایک بوڑھے پنچ نے ازراہ مصلحت ایک تجویز پیش کی بولا "اچھا بھائیو، تم لوگ لڑو مت! اگر رام بھج نیک چلن ہے تو ٹھیک!" سب نے اس تجویز کو مان لیا۔

"پر اس بات کا فیصلہ کون کریگا؟" رام بھج نے پوچھا۔

"فیصلہ کون کرتا؟" کالو نے بڑے طمطراق سے کہا "یہ کون مشکل بات ہے۔ بڈّا پنڈت کے یہاں چلو۔ وہ بہت پہنچا ہوا پنڈت ہے رتّی رتّی حال بتا دے گا۔"

"ٹھیک ہے!" پنچایت میں موجود ہر فرد نے بیک آواز کہا اور ساتھ میں کاکی اور رکمنی کو بھی لے چلنے کا فیصلہ ہوا تاکہ وہ بھی سب کچھ سن اور سمجھ لیں اور پیچھے کوئی جھگڑا باقی نہ رہے۔

اگلی صبح کاکی اور رکمنی کو لے کر سب بڈّا پنڈت کے یہاں پہنچے۔ بڈّا پنڈت اپنا معمول کا پوجا پاٹھ ختم کرنے ہی والا تھا۔ اس نے سب کو وہیں پوجا کی کوٹھری میں بلا لیا۔ وہ دیوی کا بھگت تھا اس کی پوجا کی جگہ انسان ہی نہیں کتے، بلی اور گیدڑ تک کی کھوپڑیاں نہایت قرینے سے رکھی ہوئی تھیں دیوی کی مورتی سیندور سے رنگی ہوئی تھی اور جلتے ہوئے تیل کی بدبو ہر طرف فضا میں رینگ رہی تھی۔

سب نے پنڈت جی کو پالاگن کہا اور بیٹھ گئے۔

"او بھگتو" پنڈت جی نے عجیب سی نظروں سے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آؤ بھگتو۔ کہو کیسے کشٹ کیا؟"

"پنڈت جی" سرپنچ بولا "کاکی کا داماد لوٹ آیا ہے۔"

"لوٹ آیا ہے؟" پنڈت جی چونک سے پڑے۔ پھر مسکرا کر بولے "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ مرا نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ رام بھج سے مخاطب ہوتے کہو بیٹا کشل سے تو ہو؟"

"آپ کی دیا ہے مہاراج!" رام بھجن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا

سرپنچ بولا "پنڈت جی، اس کی بہو رکمنی کا جھگڑا ہے اس کی ساس کاکی اپنی بیٹی کو دوسرے کے گھر بٹھا رہی ہے۔"

"تو اس میں میں کیا کروں؟" پنڈت جی نے بے پروائی سے کہا۔

"آپ بس یہ بات بتا دیجئے کہ ان تین چار برسوں میں اس نے کیا کچھ کیا ہے۔" سرپنچ سنجیدگی سے بولا۔ "کالو کہتا ہے کہ یہ بدچلن ہے اور"

"یہ کوئی بڑی بات ہے پنڈت۔" نے دلی کلام کرتے ہوئے بڑے طمطراق سے کہا اور آنکھیں بند کر کے دھیان میں مگن ہو گئے۔

کوٹھری کی فضا چند ثانئے تک سکوت میں ڈوبی رہی۔ پھر یکایک پنڈت جی کی آواز فضا میں لہرائی "بھائیو" وہ ایسے بول رہے تھے جیسے کوئی خواب میں بول رہا ہو۔ "بہت دن پہلے الہ آباد گیا وہاں اس نے ایک سیٹھ کی دکان سے ٹھہرو، میں دیکھ رہا ہوں کہ سیٹھ کا منہ دوسری طرف ہے اور کوئی آدمی کانپتے ہاتھوں سے اس کی تجوری سے کچھ نوٹ نکال رہا ہے۔ اس کی صورت رام بھجن سے ملتی ہے!

سیٹھ نے منہ پھیرا تو وہاں کوئی آدمی نہیں تھا اس نے تجوری کی طرف دیکھا تو وہ چیخ اٹھا "پولیس! پولیس!" اور اچھا۔ اب وہی آدمی بمبئی کے اسٹیشن پر دکھائی پڑتا ہے۔ ہاں اس نے اب ایک تھیٹر میں ملازمت کر لی ہے۔ تھیٹر سے چھٹی ہوتے ہی وہ اپنے گھر پہنچتا ہے اور۔۔۔ ارے، یہ کیسا گھر؟۔۔۔ یہاں۔۔۔ تو۔۔۔ ایک عورت ہے اور۔۔۔ وہ دیکھو اس عورت کی گود میں ایک بچہ بھی ہے اس مرد کی صورت بھی رام بھجن سے ملتی ہے۔۔۔ اب سمجھ میں آگیا وہ عورت وہی ہے جسے رام بھجن نے گھر میں ڈال رکھا ہے۔"

"میں تو یہ سب پہلے ہی جانتی تھی" کاکی اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتی ہوئی بلند آواز میں بولی "ایسے لچھن تھے تبھی تو چار برس سے پردیس میں بیٹھا تھا۔۔ میں تو اندھی ہو گئی تھی جو اپنی بیٹی اسے دی!"

کالو اور اس کے ساتھیوں نے کاکی کی تائید کی اور بیچارہ رام بھجن غصہ سے اندر ہی بل کھا کر رہ گیا۔ رکمنی اپنی بدنصیبی پر دل ہی دل میں سسک کر رہ گئی اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ ایسے برے آدمی کی شکل تک نہیں دیکھے گی۔

پنڈت جی نے پھر دھیان لگایا اور کہنے لگے اب وہ ہی آدمی گاؤں کی طرف آرہا ہے اور بس اس سے آگے کچھ دکھائی نہیں پڑتا کوٹھری کی فضا پر ایک سکتہ سا طاری تھا۔ گاؤں والے جس مقصد کے لئے پنڈت جی کے پاس آئے تھے وہ پورا ہو گیا تھا اب سبھی واثق الیقین تھے کہ رام بھجن اور نیک چلنی میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان میں۔

رام بھجن خاموش صم بکم بیٹھا اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ غم و غصہ کی فراوانی کے زیر اثر اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اب اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر رونا بھی آرہا تھا۔ وہ انصاف اور انصاف کے دعویداروں کے درمیان اس طرح گھرا تھا کہ نکل بھاگنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کاکی تھی کہ اپنی بیٹی کی خیریت منائے جا رہی تھی اور پنچایت تھی کہ انصاف کے پلڑوں کو برابر کئے ہوئے تھی۔

"بھائی رام بھجن۔" دفعتہً کالو نے میدان سنبھالا اور ناصحانہ انداز میں بولا "اچھے برے سب کام آدمی ہی سے ہوتے ہیں اگر تم سے یہ سب کچھ ہوا ہے تو بھگوان کی مرضی۔ تمہارا اور رکمنی کا ساتھ جب بھگوان ہی کو منظور نہیں تو پھر ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں؟"

رام بھجن نے کالو کے الفاظ سنے اور زہر کے کڑوے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

جب ہر طرف سے ماحول اپنے موافق نظر آیا تو پھولو نے بھی رکمنی کے ساتھ بیاہ کی اپنی خواہش پنچایت کے سامنے پیش کی۔ مگر بڈھے بھگتو نے اس بات کی مخالفت کی اور متانت سے بولا "بھائیو، فیصلہ چاہے کر لیا ہو، پر رام بھجن کے ہوتے ہوئے رکمنی کو کسی دوسرے کے گھر بٹھانا ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ نہ ہو بھگتو دادا!" کالو نے تنک کر کہا۔ "اس بات کا فیصلہ تو ہو چکا بدچلن آدمی کے ساتھ وہ کیسے رہ سکے گی۔"

"پھر رکمنی سے تو پوچھ لو۔" بوڑھا بھگتو کالو کی بات کو سنی اَن سنی کر کے بولا "اگر وہ راضی ہو تبھی نا۔"

سب کی نظریں بیک وقت رکمنی پر مرکوز ہو گئیں۔ سرپنچ نے اسے مخاطب کر کے پوچھا "کیوں بیٹی؟" رکمنی نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس پر رام بھج نے کچھ کہنا چاہا مگر کالو نے اسے ٹوک دیا۔ بولا۔

"جو بدچلن ہے، اسے برادری میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔"

"پر تو کون ہوتا ہے مجھے ٹوکنے والا؟" رام بھج نے خشمگیں نگاہوں سے کالو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"فیصلہ پنچایت کو کرنا ہے۔ چاہے جو فیصلہ کرے۔" پھر وہ پنچایت کو مخاطب کر کے بولا "پنچو، پہلے ایک بات میری بھی سن لو۔"

"ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" سرپنچ نے منظوری دیتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ رام بھج نے بہ نظر غائر کاکی اور رکمنی کی طرف دیکھا پھر اپنی آنکھیں پنڈت جی کے چہرے پر جما کر سنجیدگی سے بولا "تمہارے پنڈت جی نے میرے سب بڑے کام بتا دیئے پر ان چار برسوں میں میں نے جو دس ہزار روپے بچائے ہیں اور رکمنی کے لئے ڈھیر سارا گہنا اور کپڑا خرید کر رکھا ہوا ہے ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔ یہ کیسی بات ہے؟"

"یہ اس بات کا سمے نہیں ہے!" کالو تنک کر بولا۔

"سمے کیسے نہیں ہے؟" رام بھج بھی غصے سے بھڑ اُٹھا اور پھر سب کو مخاطب کر کے متانت سے بولا "پنڈت جی یہ بات بتا دیں کہ وہ روپے اور گہنا کپڑا کہاں رکھا ہے تو میں رکمنی پر سے اپنا ادھیکار چھوڑتا ہوں۔"

یہ سن کر ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا اور سبھی معنی خیز اور پُر امید نظروں سے پنڈت جی کی طرف دیکھنے لگے۔ مگر پنڈت جی لاجواب اور گونگے سے گردن جھکائے بیٹھے رہے

"کیوں پنڈت جی؟" سرپنچ نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے کہا۔

"میں میں میں ...!" پنڈت جی نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر صرف ہکلا کر رہ گئے۔ یہ دیکھ کر رام بھج فاتحانہ انداز سے مسکرایا اور رکمنی کی دھڑکنوں میں ایک گدگدی سی ہوئی۔ اس نے کنکھیوں سے ایک بار رام بھج کی طرف دیکھا اور پھر گلابی سی ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔

"کیوں بیٹی؟" سرپنچ نے رکمنی کو مخاطب کر کے کہا "تم بھولو کے گھر ...؟" مگر اس سے پہلے کہ سرپنچ اپنا جملہ مکمل کرتا۔ رکمنی کی گردن کو ایک طویل انکاری جنبش ہوئی کالو کا چہرہ اتر گیا اور بھولو کا دل برف کی مانند جم گیا۔

"کاکی۔" سرپنچ نے کاکی کو مخاطب کیا۔ بولا۔ "رکمنی تو تیار نہیں اب تم اپنی کہو؟"

"میں ...!" کاکی نے سر اونچا کیا اور متانت سے بولی "جب لاحب رکمنی ہی تیار نہیں تو میں کون ہوتی ہوں اسے کسی کے گھر بٹھانے والی!"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور رام بھج کے پاس آ کر اس کی بلائیں لیتی ہوئی بولی "واری جاؤں لال تمھارے!۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم اتنے کماؤ ہو!... میری بیٹی تو راج کرے گی۔!"

"لو بھائی بھولو۔" سرپنچ نے بھولو کو مخاطب کیا۔ مگر بھولو، کالو اور ان کے تمام ہمنوا اس دوران میں وہاں سے کھسک چکے تھے اور پنڈت جی جان کی خیر مناتے ہوئے ہاتھ میں دلیری کا پرشاد لئے رام بھج کے سامنے کھڑے تھے۔

آئندہ شمارہ خواتین افسانہ نمبر ہو گا۔

اعتبار ساجد
افکار۔ کراچی

موٹل

اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران میں داخل ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے سوٹ کا جائزہ لیا اور دو روپے چار آنے کی ٹائی کی گرہ کچھ یوں کالروں کے مرکز پر جمائی کہ بے ساختہ اسے کھانسی آگئی۔ ایسی چال میں لقہ کبوتر کی تمکنت پیدا کرنے کی کوشش میں اس نے آگے بڑھ کر بلائی وڈ کا دروازہ کھولنا چاہا کہ اسپرنگ دار دروازہ تیزی سے کھلا اور وہ قلابازی کھا جانے والے انداز میں غڑاپ سے اندر ـــــ

اندر تو دنیا ہی نرالی تھی۔ بلائنڈ ونڈ گلاس کے پیچھے روشنی کے سرمئی دھبے کانپ رہے تھے اور پردوں پر بنے ہوئے نیلے پھول آکٹوپس کے بازوؤں کی طرح دور دور لہراتے نظر آ رہے تھے۔ عجب نیم تاریک سا سرمئی رنگ کا خواب آلود منظر تھا۔ خوب صورت میزوں کے جزیرے پورے ہال میں پھیلے ہوئے تھے اور جھنجھناتی ہوئی سرگوشیاں اور مہذب قہقہے سگرٹ کے دھوئیں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ رنگ برنگی ساریاں، اودے نیلے سوٹ اور چست فراکوں نے ہال کی سرخ آرام دہ کرسیوں کو گلدستوں کے روپ میں ڈھال دیا تھا وہ میزوں کے جزیروں کے درمیان یوں چل رہا تھا ایک نادیدہ زنجیر ہے جو اسے گھسیٹے لئے جا رہی ہے

کئی چہرے اس کی طرف گھومے، کئی آنکھوں نے اسے دیکھا۔

وہ کچھ محجوب سا ہو گیا۔

" اے نیو پرینزر ـــ! " اڑتا ہوا سا ایک جملہ اس کے کانوں سے ٹکرا گیا۔

" ایگر دیٹک فرام لوجھاب " ایک نسوانی قہقہہ نے کہا۔

" مہیر کڑا اے نیو پرینزر ـــ " پانچویں میز پر بیٹھے ہوئے ایک اسمارٹ نوجوان نے سگریٹ سلگایا۔

وہ جھینپ مٹانے کے لئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اجلی براق وردی میں ملبوس ایک بیرے نے لپک کر اسے آگاہ کیا۔

" ریزرو۔ "

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کئی دبے دبے قہقہے جھنجھنائے۔ کئی حسین چہرے اس کی طرف گھومے۔

اف یو ڈانٹ ٹو سیٹ ـــ بیرے نے بڑی رواں انگریزی میں کہا " دو وہن فالو می۔ "

اس نے بیرے کو فالو کیا۔

ایک ہنا مبز اسے مل گئی یہیں اس نے بیرے کو چائے لانے کو کہا۔ بیرا چپ چاپ چلا گیا۔

اس نے جیب سے تازہ خریدا ہوا کیپسٹن کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے۔

تمیز سے سگریٹ پیو یہ اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران ہے۔

وہ چونک کر ادہر ادہر دیکھنے لگا۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو اس کے اندر کی آواز تھی یہ اندرونی آوازیں بڑی پریشان کن ہوتی ہیں اس کے اندر جانے کتنے آدمی چھپے بیٹھے تھے۔

ایک آدمی نے کہا تھا! "بشیر الدین! زندگی فائلوں کی ورق گردانی کا نام نہیں ہے ان فائلوں کے انبار سے باہر جھانک کر دیکھو۔ زندگی بڑی خوبصورت اور بڑی وسیع ہے۔ یہاں پھول ہیں اور گیت ہیں اور قہقہے ہیں اور اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران ہے تم نے ہوٹل بہت دیکھے ہوں گے اب ذرا موٹل بھی دیکھ لو۔

اور اب وہ موٹل دیکھنے آیا تھا۔

لیکن یہ موٹل کہاں تھا موٹل بھلا ایسا کیوں ہونے لگا۔ یہ تو ہوٹل ہے پورا ــــ البتہ اس ہوٹل کے ساتھ اسٹینڈرڈ کے دم چھلے نے اسے ایک جیتے کے لئے مخصوص کرکے رکھ دیا تھا اسٹینڈرڈ ــــ کیا پیارا لفظ ہے جیسے بادل گرج رہے ہوں اور شیر دھاڑ رہے ہوں کیسی رعونت ہے اس لفظ میں۔ کیسی بو ہے اس لفظ میں جیسے گوشت جل رہا ہو یا کارخانے کی چمنی دھواں اگل رہی ہو دھواں جس میں ان مزدوروں کے پسینے کی بو شامل ہے جسے دو ماہ سے تنخواہ نہیں ملی

"چل کر دیکھنا تو چاہیئے۔" اس کے اندر کے دوسرے آدمی نے ترغیب دی تھی "دیکھنا تو چاہیئے کہ یہ موٹل کیا ہوتا ہے اور جب موٹل اسٹینڈرڈ کے ساتھ چپک جائے تو مناظر کی ہیئت کیا ہوتی ہے۔؟"

یہ خواہش اس وقت ابھری تھی جب اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران کا افتتاح ہوا تھا اور وہ فائلوں کی دنیا میں سر جھکاتے ہندسوں سے کھیل رہا تھا۔ اس خواہش کو اس نے بڑی بے دردی سے کچلا تھا۔ کرم خوردہ فائل کے اوراق میں اس خواہش کو دفنا کر جب وہ دفتر سے باہر نکلا تو ایک متمول دوست مل گیا اس کے ہاتھ میں موٹل کی افتتاحی تقریب کا کارڈ تھا۔ فائلوں میں دفنائی ہوئی خواہش ادھ موئے بچھو کی طرح پھر اس کے ذہن میں رینگنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے متمول دوست کے ہاتھ سے کارڈ چھین کر اسٹینڈرڈ موٹل کی طرف لپک جائے۔

لیکن پھر جب اس نے جھرجھری لے کر اپنی آنکھیں ملیں تو حقائق کی طرف لوٹ آیا۔ آسمان بہت دور تھا اور زمین سخت تھی اور اس کی تنخواہ صرف ایک سو دس روپئے تھی ان ایک سو دس روپوں کا کوئلہ نو آدمیوں کے کنبے کا انجن نہیں چلا سکتا تھا۔ ان ایک سو دس روپوں سے تو کفن کا معقول لٹھا بھی نہیں مل سکتا تھا پھر میاں بشیر الدین تم جونیئر کلرک ہو کر اسٹینڈرڈ کی باتیں کیوں سوچتے ہو اس نے اپنے آپ کو سینکڑوں گالیاں دیں تھیں اور غڑاپ سے غریب ہوٹل میں گھس گیا تھا جہاں چائے شیشے کے میلے چکٹ گلاس میں ملتی ہے اور کاؤنٹر پر رکھا ہوا گراموفون ایسے گیت اتنے تیز سروں میں بجاتا ہے کہ ارد گرد کھڑے لوگ اپنی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرنے لگتے ہیں۔

یہ ہوٹل اس کا تھا اور اس جیسے ان سینکڑوں کلرکوں کا جو پیٹ بھرنے کے لئے سویٹ ڈش اور ٹماٹو جوس نہیں مانگتے روٹی اور چنے کی دال مانگتے ہیں اور ایک لمبی ڈکار لے کر گندم کا نشہ بڑھانے کے لئے دو آنے گلاس والی چائے منگواتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی یا چنے کی دال ہے یا اس فائل میں جس کے اوراق جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔

جانے موٹل کا خناس کہاں سے اس کے ذہن میں گھس گیا تھا کہ لہو بن کر رگوں میں دوڑنے لگا تھا۔ بعض خواہشیں اتنی شدت سے اپنے

وجود کا اعلان کرتی ہیں کہ سارا جسم جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں ۔

موٹل کی خواہش نے تو اس کے جسم کو کچی لسّی کی طرح بلو کر رکھ دیا تھا ماں دمہ کی مریضہ بہن کا دوپٹہ چیتھڑے میں تبدیل ہو گیا تھا بھائی بغیر فیس کے اسکول جانے پر رضامند نہیں تھا اور کنبے کے نو افراد، نو پیٹ، نو منہ روٹی مانگتے تھے اور آٹا پنتالیس کی خبر لا رہا تھا کہ ناگہاں موٹل اس کے ذہن میں اور رگوں میں خواہش بن کر رینگنے لگا اس نے ذہنی مدافعتی جنگ میں بارہا اس خواہش ما بدی پالی جو کی تھی لیکن خواہش اپنی جگہ برقرار تھی ۔

اس خواہش کو ہوا ان خیالات نے دی جو اس کے ذہنی افق پر منڈلا رہے تھے موٹل جانے کی ایک دلیل ایک ٹھوس جواز اس کے پاس موجود تھا کہ وہ اس معاشرے کا ایک فرد ہے اور فی الحال خواہشوں پر اس دیس میں انکم ٹیکس لگنا شروع نہیں ہوا ۔ وہ بھی اس معاشرے کا ایک فرد تھا گو اپنی فائلوں میں محبوس تھا لیکن دکتی پیشانی چومنے کا حق کس نے چھینا ہے وہ بھی چار پہیوں کی گاڑی کے مالکان کی طرح اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران جائے گا اور زندگی کی مسکراہٹوں میں سے اپنا حق چھین لائے گا اور اپنے ساتھی کلرکوں کو بڑے غرور سے بتائے گا کہ زندگی کب مسکراتی ہے اور موٹل کسے کہتے ہیں ۔

اس خواہش کی تکمیل میں اسے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی امجد صاحب مہربان آدمی نہ ہوتے ان کا سوٹ کیسے ملتا اور پہلی تاریخ نہ آتی تو وہ موٹل کیسے پہنچتا ۔ امجد صاحب بڑے شریف آدمی تھے ۔ انھوں نے ایک لفظ کہے بغیر چپکے سے سوٹ لا کر اسے دے دیا تھا ۔ البتہ جب وہ چلنے لگا تو یہ ضرور کہا تھا

ورخیال رکھے گا ۔ میں نے اسے کل ہی ڈرائی کلین کروایا ہے ۔

ٹائی البتہ وہ دینا بھول گئے اس نے اتنی معمولی سی چیز مانگنا مناسب بھی نہ سمجھا، اور چپکے سے دو روپے چار آنے کی ایک سیکنڈ ہینڈ ٹائی خرید لی ۔ ایک سو سات روپے بارہ آنے اس کی جیب میں تھے وہ گھر جانے کی بجائے ایک دوست کے ہاں سوٹ بدل کر موٹل پہنچنا چاہتا تھا ۔

یہ پہلی تاریخ تھی ـــــ اور مہینے کی یہی تاریخ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لاتی تھی ۔ چنانچہ جب وہ اسٹینڈرڈ موٹل اینڈ ریستوران میں پہنچا تو مسکرا رہا تھا ۔

چائے اب تک نہیں آئی تھی ۔ حالانکہ پینتالیس منٹ پہلے اس نے بیرے کو چائے لانے کو کہا تھا ۔ ساتواں سگریٹ اس کی انگلیوں میں کانپ رہا تھا ۔ منہ کا ذائقہ بُری طرح بگڑ گیا تھا اور اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ دقت گزاری کے لئے چہروں یا پردوں کا جائزہ لے سکے ۔

اسے احساس تھا کہ لوگ اسے استہزائیہ انداز میں گھور رہے ہیں یہی وجہ تھی کہ بیرا اس کے قریب سے کئی مرتبہ گذرا تھا لیکن اسے پکارنے کی ہمت اس میں نہیں تھی بیٹھے بیٹھے اسے یوں لگا جیسے وہ لکڑی کی ڈمی کا روپ دھارتا جا رہا ہے اور اس کی جھکی ہوئی گردن میں درد ہونے لگا ہے ۔

بارے خدا خدا کر کے بیرا چائے لایا ۔ پیسٹری اسٹینڈ اس کے سامنے سجا کر چائے کی ٹرے رکھتے ہی بیرا الٹے پاؤں لوٹ گیا ۔ چائے ہلانے کے لئے اس نے کپ سیدھا ہی کیا کہ وہ اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے پھسل کر چھن سے فرش پر گرا، اور کئی حصّوں میں تقسیم ہو کر دور تک بکھر گیا اس کے سارے جسم میں کپکپی دوڑ گئی ۔ لوگوں کے قہقہے اور سرگوشیاں اسے اپنے جسم میں جونکوں کی طرح دھنستی ہوئی محسوس ہوئی ۔ اس ڈر سے اس نے بیرے کو بلا کر نیا کپ لانے سے احتراز کیا کہ شاید اسے ایٹی کیٹ سے بالکل عاری نہ سمجھ لیا جائے ۔ چنانچہ وہ مٹی کا مادھو بنا لرزتی انگلیوں سے پیسٹریاں کھانے لگا ۔ دس منٹ بعد بیرا دوسرا کپ لایا ۔ وہ ساتویں پیسٹری کھا رہا تھا ۔ بڑی احتیاط سے اس نے چائے بنائی اور زہر کے پیالے کی طرح اپنے حلق میں انڈیلنے لگا چائے تیز گرم نہیں تھی ۔ چنانچہ جھٹ ساتویں سپ میں ختم ہو گئی وہ بل کے لئے بیرے کا انتظار کرنے لگا ۔ اس قدر کوفت، گھبراہٹ اور پریشانی آج تک اسے لاحق نہیں ہوئی تھی وہ جلد از جلد اس گھٹے گھٹے سے سرد، سپاٹ اور بے جان ماحول سے نکل جانا چاہتا تھا ۔

پندرہ بیس منٹ بعد بل آیا تیرہ روپئے دس آنے! اس میں کپ کی قیمت بھی شامل تھی۔ لرزتی کانپتی انگلیوں سے اس نے بیس روپئے جیب سے نکالے اور ٹرے میں پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ لوگوں کی نظروں کی پروا کئے بغیر بیرے کے ساتھ ساتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھنے لگا۔

جب بیرے نے بقایا رقم اسے کاؤنٹر کے قریب ہی لوٹائی تو اس نے ایک اٹھنی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی اور تیزی سے ہوٹل کے بیک ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ چھن سے اٹھنی اس کے بوٹ سے آکر ٹکرائی۔ سپلائی وڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے گھوم کر دیکھا۔ بپھرا ہوا بیرا کہہ رہا تھا۔

" رِی ممبر اگین، دِس اِز اسٹینڈرڈ ہوٹل اینڈ ریسٹورین ... ! "

باہر نکل کر وہ تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگا۔ اس کی ٹائی سینے سے الٹ کر شانوں پر پھڑ پھڑا رہی تھی اور وہ سرخ چہرہ لیے راہ گیروں کے ردعمل کی پروا کئے بغیر تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ پھر اسٹینڈرڈ ہوٹل اینڈ ریسٹوران دور پیچھے رہ گیا۔ ٹریفک کا شوروغل دھیما پڑ گیا۔ پر رونق بازار تنگ دکانوں اور تاریک گلیوں میں مدغم ہو گیا اور اس کے کانوں میں ریکارڈنگ کی آواز آنے لگی۔ بسم اللہ اینڈ غریب ہوٹل گلی کے موڑ پر اس کا راستہ روکے کھڑا تھا وہ نٹ پاتھ پھلانگ کر غریب ہوٹل میں گھس گیا۔ ایک چرچراتی ہوئی پرانی کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے اس نے زور سے چلا کر کہا۔

چلئے لائیو بے کریم دین۔ خوب کڑک۔ حور دار۔ سالے ہوٹل نے تو کباڑا کر دیا ... !

بقیہ صفحہ ۱۳۸

چلے آ رہے تھے۔

ڈاکو کی لاش کو کوٹھری سے نکال کر باہر رکھ دیا گیا۔ اسے پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال لے جانا تھا۔ پورے گاؤں کے لوگوں نے اسے محاصرہ میں لے لیا تھا۔ اور اس کا چہرہ دکھانے کے لیے داروغہ جی سے بار بار کہہ رہے تھے۔

داروغہ کے اشارے پر ایک کانسٹبل نے آگے بڑھ کر اُس کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔

چادر کا چہرے سے ہٹنا تھا کہ مجمع میں ایک طرف تو ہرلیش کی ماں بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑی اور دوسری طرف داروغہ جی اچھل پڑے۔

" بھولا ! "

وہ چونک پڑے، اور پھر دیوان جی کو کنارے لے جا کر کان میں کچھ چپکے چپکے کہنے لگے۔

ٹھاکور نے جس وقت گنڈاسا دیکھا تھا اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ مارنے والا ہرلیش کے سوا کوئی نہیں ہے۔ مگر جس وقت مارا جانے والا اُس کا اپنا باپ ہی نکلا تو اُس پر ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ اور دروازہ ہی پر سے ایک خوفناک آواز میں چلایا۔ " ہرلیشوا ... ! "

ہرلیش آنگن میں سر لٹکائے بیٹھا تھا۔

ٹھاکور غم و غصہ کی حالت میں اُس کی طرف بڑھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی یہ بھی اسے مار ڈالے گا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ہرلیش کے پاس پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس سے لپٹ کر بے اختیار رو پڑا۔

" ہرلیش ! ای تو کا کئے دی ہل، باپے کا مار دی ہل ! "

اور ہرلیش بھی بجائے کچھ کہنے سننے کے اُس کے کندھے سے لگ کر رو پڑا۔

باپ کی ذات اور اُن کے کاموں سے جو اُسے نفرت سی ہو چلی تھی، وہ اب اُس کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں اب باپ کی محبت کا جذبہ جاگ اُٹھا تھا۔ وہ خود کو یتیم اور بے سہارا محسوس کرنے لگا تھا۔ اُسے اب اپنی حرکتوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے اپنے باپ کو مار کر کوئی بہت بڑا پاپ کر دیا ہو۔ اتنا بڑا پاپ جس کی اب تلافی بھی ممکن نہیں۔

رشیدہ خان

سرتیا۔ دہلی

اَن داتا

میں نے جب آنکھ کھولی تو یہی سُنا اور سمجھا کہ راجہ اس شخص کو کہتے ہیں جو شراب پیتا ہے ریس کھیلتا ہے، عیاشی کرتا ہے اور بڑے بڑے جرائم کرکے بھی جیل نہیں جاتا۔ بلکہ دربار میں بیٹھ اَن (اناج) کھلانے والوں کا گلا کاٹ کر اَن داتا کہلاتا ہے اس کے کپڑے پیرس میں ڈھلتے ہیں شراب فرانس سے آتی ہے علاج یوروپ کے بڑے بڑے ڈاکٹر کرتے ہیں اور اس کے بچے لندن میں تعلیم پاتے ہیں اس کے ریس کے گھوڑے پھل اور میوہ جات کھاتے ہیں اور ان سب اخراجات کا بوجھ بھوکے، مفلس اور جاہل عوام کے کاندھوں پر رکھا جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک اَن داتا کی سرزمین نہر سنگھ گڑھ میری ننھیال تھی جہاں اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا میں نے وہ شاندار قلعہ اندر سے بھی دیکھا ہے جو ایک پہاڑی پر بنا ہے اور جو اپنے وجود میں ہزاروں داستانیں چھپائے آج بھی کھڑا ہے مگر ویران اور بند ہے اور جو اب صرف ایک یادگار ہے۔

اس قلعہ میں کبھی ایک دنیا آباد تھی راجہ صاحب معہ اپنی رانیوں کے یہیں رہا کرتے تھے پورے قلعہ میں بساط سیاست بچھی رہتی تھی آقا سے لے کر نوکر تک اس بساط پر اپنے اپنے مہرے چلاتے نظر آتے تھے ایسے جوڑ توڑ ملائے جاتے تھے کہ عقل دنگ رہ جائے۔

اس قلعہ کے لوگ دو پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے ایک بیوہ رانیاں اور ان کے ملازم جو قلعہ کے پچھلے حصے میں بسے ہوئے تھے اور دوسرے راج بھون کی رانیاں اور ان کے نوکروں کا ایک لشکر۔

بیوہ رانیاں جو داتا یا رانی ماں کہلاتی تھیں آپس میں بڑے چھوٹے کی دیواروں سے منقسم تھیں وہ رانیاں جو کسی راجہ کی بیٹیاں یا بہنیں تھیں ان کی جاگیریں مقرر تھیں۔ جو رانیاں جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں ان کی تنخواہیں مقرر تھیں ان جاگیروں اور تنخواہوں میں بھی مرتبے کا خیال رکھا گیا تھا۔

ان رانیوں کے علاوہ ایک قسم رانیوں کی اور بھی تھی جنھیں نہ تو رانی کہہ سکتے تھے اور نہ لونڈی۔ ان کی بہت معمولی تنخواہیں مقرر تھیں قلعہ کی زبان میں انھیں پاسوان کہا جاتا تھا پاسوانیں بیاہتا نہیں ہوتی تھیں جو لونڈی راجہ صاحب کی نظر میں مقبول ہو جاتی اس کے پاؤں میں سونے کا ایک کڑا ڈال دیا جاتا تھا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب یہ معمولی لونڈی نہیں رہی بلکہ اسے راجہ صاحب کے بستر تک پہنچنے کا پورا پورا حق حاصل ہو گیا ہے۔

ان سب رانیوں اور پاسوانوں سے بھی جب راجا صاحب کا دل بھر جاتا تو پھر وہ ریاست سے باہر تفریح کی غرض سے نکل جاتے تاکہ ریاست کے بکھیڑوں سے دور رہ کر اپنی صحت بحال کر سکیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب راجہ صاحب اپنی صحت کی بحالی کے لئے کشمیر گئے تو وہاں سے ایک معمولی حیثیت کی کشمیری لڑکی کو رانی بنا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ سترہ اٹھارہ سال کی یہ کشمیری لڑکی حسن کا ایک نادر نمونہ تھی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن پہ مخمور رہتی تھیں اور گالوں پر ہمیشہ گلاب کھلے رہتے۔

راجہ صاحب بھی اپنی سدھ بدھ بھول کر اسی کے ہو رہے ایک سے ایک قیمتی ہیروں اور جواہرات سے رانی کا جسم سجا دیا۔ اطلس و کمخواب میں سر سے پیر تک اسے ڈھانک دیا، اشارے پر دوڑنے والے خادموں کی ایک فوج عطا کر دی، کئی گاؤں جاگیر میں مرحمت فرما دیئے۔ محل میں روز ہی کوئی نہ کوئی تفریحی پروگرام رہتا تاکہ اس آزاد پنچھی کا دل پتھر کے اس پنجرے میں گھبرا نہ جائے اور وہ خوش رہے۔

مگر نہ جانے کیوں رانی کا دل نہ ہیرے جواہرات سے خوش ہوتا نہ ناچ رنگ کی محفلوں میں لگتا اور نہ کنیزوں کے سوانگ بھرنے پر ہنستا۔ وہ اس طرح قلعہ کی ایک ایک بات کو دیکھتی۔ جیسے کوئی نوگرفتہ ہرنی اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتی ہے۔ ہاں، اگر اسے کہیں سکون ملتا تو وہ تھی اس کی منہ بولی کشمیری موسی کی قربت جس سے تنہائی میں بیٹھی وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتی۔

کیوں موسی عثمان چچا کے کھیت کے مصری کا کے بھٹے کتنے میٹھے ہوتے ہیں۔

"اب تو میری بھیڑ نے میمنا دے دیا ہوگا۔ اسی کی طرح ہوگا۔ گدگدا سا سفید روئی کے گالے کی طرح۔

"موسی، تجھے وہ کشمیری ملن کا گیت یاد ہے جس کی دھن الغوزہ پر چندر بجایا کرتا تھا؟

"موسی، چندر نے قسم کھائی تھی کہ وہ میرے سوا کسی سے . . ." اور موسی گھبرا کر اس کے نازک لبوں پر ہاتھ رکھ دیتی پھر ادھر ادھر دیکھ کر سمجھاتی بیٹی۔ پچھلی باتیں بھولنے میں ہی بھلائی ہے۔ سنجوگ تو مقدر کی بات ہے اور ایک ہندو عورت تو اپنے خاوند کے سوا کسی اور کا دھیان کرنا بھی پاپ سمجھتی ہے۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ بھگوان نے تمھیں اتنی بڑی رانی بنا دیا۔ ایسے کس کے بھاگ ہوتے ہیں اور پھر راجہ صاحب تمھارا کتنا دلار کرتے ہیں بھگوان تمھارا سہاگ امر کرے۔"

مگر زبردستی کا سہاگ امر ہوتا تو کجا زیادہ دن قائم بھی نہ رہ سکا۔ دو سال کے اندر ہی اندر راجہ صاحب پرلوک سدھار گئے اور رانی کو، جو حسن وشباب کا ایک چھلکتا ہوا جام تھی، مجبوراً بیوگی اور بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر رانی ماں کا خطاب قبول کرنا پڑا۔ ساتھ ہی راج بھون خالی کر کے قلعہ کے پچھلے حصے میں منتقل ہونا پڑا۔ کیونکہ رسم کے مطابق راج بھون میں ریاست کا راجہ اور اس کی رانی ہی رہ سکتے تھے راجہ کے مرنے کے بعد ان کا گود لیا ہوا لڑکا راجہ بن کر راج بھون میں آ گیا۔ کہتے ہیں اسی وارث نے راجہ صاحب کو کسی طوائف کے ہاتھوں زہر دلا کر ختم کرا دیا تھا اور پھر طوائف کو ہزاروں روپئے دے کر بھوپال اسٹیٹ بھجوا دیا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور اس کی رفتار نے قلعے کے رہنے والوں کو یہ بھی بھلا دیا کہ کبھی اس راج بھون میں ایک کشمیری رانی کا راج تھا جس کا منظور نظر بننے کے لئے وہ نہ جانے کیا کیا ہتھکنڈے کھیلا کرتے تھے۔ ملازم اس کے حکم کو بجا لانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور اگر کسی دن ملازم کا نام لے کر اس سے کسی کام کو کہتی تو وہ دن بھر دوسروں سے یہ بات کہتے نہ تھکتا تھا کہ آج سرکار رانی نے فلاں کام خاص طور سے مجھ سے کرایا۔

آج یہ سب کچھ صرف ایک خواب تھا۔ راج محل کی بساط سیاست الٹ چکی تھی۔ اب اس کی جگہ نئی بساط اور نئے مہروں نے لے لی تھی۔ مگر اچانک ایک واقعہ نے سب کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

ایک دن مہاراج صبح سویرے اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک کنیز خاموشی سے آ کر پیچھے کھڑی ہوگئی۔ جیسے ہی مہاراج گھومے اس نے آگے بڑھتے ہوئے ان کے چرن چھو کر کہا۔

"مہاراج کی جے ہو۔" اور پھر خاموش کھڑی ہوگئی۔

مہاراج نے سوالیہ نگاہوں سے کنیز کی طرف دیکھا مگر جب وہ بدستور سر جھکائے خاموش رہی تو پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"اَن داتا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"سرکار وہ ... چھوٹی ماں ہیں نا۔" لونڈی گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟ کیا ہوا چھوٹی رانی ماں کو؟" مہاراج نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"سرکار، میری زبان نہیں کھلتی مگر ... آپ کی ریاست کی آن خطرے میں ہے۔" لونڈی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"صاف صاف کہو، کیا بات ہے؟ ڈرو نہیں، تمھیں کچھ نہ ہوگا۔"

"اَن داتا، چھوٹی رانی ماں کے پاس رات کو کوئی آدمی ... ؟"

"خاموش" راجہ نے کڑک کر کہا۔ اُن کی بھنویں تن گئیں اور غصّے سے آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر بے چینی سے ٹہلتے رہے پھر کچھ سوچ کر کنیز کے پاس رک گئے، جیسے اندر اندر کسی بات کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

"اگر یہ بات غلط ہوئی تو؟" انھوں نے کنیز کو مخاطب کیا۔

"اَن داتا ہمارے مائی باپ ہیں۔ میری گردن اڑا دیجئے گا۔"

"ہوں تمھیں کیسے معلوم ہوا۔؟"

"سرکار مجھے سنتری نے بتایا تھا کہ وہ کئی روز سے دیکھ رہا ہے کہ قلعے کے پیچھے دروازے سے دو کنیزیں خالی کلسہ سر پر رکھے اور گھونگھٹ نکالے نکل جاتی ہیں اور تین بجے واپس آتی ہیں ان کے سر پر گھونگھٹ ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرد ہے۔ سرکار رات بڑی رانی ماں کے کہنے سے میں نے دروازے پر کان لگا کر سنا تو اندر سے کسی مرد کے بولنے کی آواز آ رہی تھی ان کے کہنے پر ہی میں آپ کے پاس

"تم جا سکتی ہو۔" راجہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور لونڈی اس طرح بھاگی جیسے سولی پر چڑھتے چڑھتے ایک دم معافی کا پروانہ مل گیا ہو۔

رات کی تاریکیوں نے قلعہ پر اپنا سایہ ڈال کر اسے ایک ہیبت ناک دیو کی شکل میں بدل دیا تھا۔ سردی غضب کی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے کمروں میں بند آتش دانوں کے پاس بیٹھے آرام کر رہے تھے صرف چھوٹی رانی ماں اس سردی سے بے نیاز کسی سے محو کلام تھی۔

"چندر، آج تو نہ جانے کیوں تمھارے الغوزے پر وہی پرانا ملن کا گیت سننے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"نہیں کمو، میں یہاں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا جس سے کسی کو شک ہو۔ اپنے دیس پہنچ لینے دو۔ پھر ملن سیج پر ہی وہ راگ سناؤں گا" چندر نے شرارت سے رانی ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اور رانی شرما کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"چندر، بھگوان جانے، ہمارے سپنے کبھی پورے بھی ہوں گے یا نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اڑ کر اپنے دیس چلی جاؤں۔ یہ قلعے کی اونچی اونچی دیواریں، پہرہ دار، بندوق رکھے ٹہلتا ہوا سنتری، یہ سب ہمیں کیسے نکلنے دیں گے چندر؟"

"بھگوان کے لئے اتنی اداس نہ ہو کمو۔ جب میں ان سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں آسکتا ہوں تو تمھیں باہر بھی لے جانے کی مجھ میں ہمت ہے بس دو تین دن کی بات ہے۔ شیام آ جائے تو پھر بندوبست کر لوں گا۔ ارے، یہ برفی کھاؤ تو شوق سے منگی کھاتی ہے نا آج ایک

بڑی دکان پر رکھی دیکھ کر مجھے یاد آگیا۔ چندر نے بنی کا دونا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

" دھت ۔ رہا دہی گھا مڑ کا گھا مڑ ۔ ارے مجھے یہاں کوئی بنی کی کمی ہے آتنی کھائی ہے کہ جی بھر گیا ہے۔" اب تو رانی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اس کے دانت ہونٹوں پر اس طرح سج گئے جیسے گلاب کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے ۔

اچانک ایک گرجدار غصے سے کانپتی آواز نے اس کی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔

دروازہ کھولو چھوٹی ماں ۔ کواڑوں پر مکے برساتی ہوئی آواز پھر گونجی اور رانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آواز راجہ کے سوا کسی کی نہیں تھی ۔ وہ ایک دم خوف سے زرد پڑ گئی ۔ جیسے کسی نے جسم کا خون چوس لیا ہو بڑی مشکل سے بولی کون ہے ؟ لال (چھوٹی رانیاں راجہ کو لال کہتی تھیں) ؟ ۔"

" ہاں ، میں دروازہ توڑ دوں گا ۔ چھوٹی ماں جلد کھولو۔"

" مگر میں کپڑے تو پہن لوں ۔" لرزتی آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی ۔

اور جیسے ہی دروازہ کھلا ، غضبناک راجہ مع اپنے دو شکاری کتوں کے اندر داخل ہوا اس کی متجسس نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں ۔ اچانک نظریں کمرے میں رکھے ایک بڑے صندوق پر رک گئیں ۔ بجلی کی طرح جھپٹ کر راجہ نے صندوق کا پٹ اٹھایا ، اوندھے پڑے گنہگار کو بالوں سے پکڑ کر راجہ نے باہر گھسیٹا اور اپنے شکاری کتوں کی زنجیر چھوڑ دی ۔ صبح سے بھوکے رکھے گئے یہ خوفناک کتے آن واحد میں اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے ۔

" نہیں ، نہیں " چھوٹی رانی پاگلوں کی طرح کتوں پر جھپٹی مگر بیچ ہی میں راجہ کے مضبوط ہاتھوں نے اسے روک لیا اور وہ ان مضبوط ہاتھوں میں بے ہوش ہو کر جھول گئی ۔

صبح ریاست میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ رات چھوٹی رانی ماں کو سانپ نے ڈس لیا ۔ ارتھی کے ساتھ خود راجہ صاحب ننگے سر تھے صرف قلعے کی دو وفادار کنیزیں یہ جانتی تھیں کہ جب وہ اپنی بد نصیب رانی کو سویرے اٹھانے گئیں تو اس کے کمرے میں خون اور ہڈیوں کے بچے کھچے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے اور رانی دلھن کی طرح سجی اپنی مسہری پر مردہ پڑی تھی ، مسہری کے نیچے جھولتے ہوئے ہاتھ کی انگوٹھی سے وہ بڑا اور قیمتی ہیرا غائب تھا جسے وہ ہمیشہ پہنے رہا کرتی تھیں ۔

مصطفیٰ زیدی

حمد

ہم نے اُس قوتِ محسوس کو دیکھا نہ سنا — ہم نے اُس گوہرِ ناسفتہ کو پرکھا نہ چُنا
اک سواری کہ شناسا نہ تھی گھر پہ اُتری — اک تجلّی تھی کہ تہذیبِ نظر پہ اُتری
جلوے دیکھے جو کبھی شاملِ ایماں بھی نہ تھے — اور ہم ایسے تن آساں تھے کہ حیراں بھی نہ تھے
دل کے آغوش میں اک نور جھمکتا گذرا — ایک لمحہ کئی صدیوں پہ چمکتا گذرا
وہم و تشکیک سے الہام کی باری نہ رکی — شب سے شہزادۂ خاور کی سواری نہ رُکی
پتھروں کے صدفِ تیرہ سے ہیرے اُبھرے — بے کراں موج سے بے نام جزیرے اُبھرے
آیتیں گونج اٹھیں حکمتِ گویا کے بغیر — مشعلیں جلنے لگیں شعلۂ سینا کے بغیر
اجنبی شہر سے اک خوشبوئے دم ساز آئی — دم بہ خود، مہر بہ لب وقت سے آواز آئی

رات کا کرب بھی میں، صبح کا آرام بھی ہیں — حمد و تمجید بھی میں بے نام بھی ہیں، نام بھی ہیں
سنگ و سنجاب بھی ہوں شعلہ بھی ہوں خاک بھی ہوں — میں ترا وہم بھی ہوں میں ترا ادراک بھی ہوں
میرا ہی سوز خموشی ہے ہر آہنگ کے ساتھ — میری ہی نرمی تسلسل ہے رگِ سنگ کے ساتھ
میری روداد وہی ہے جو جہاں پر گذری — لامکاں پر بھی وہ گذری جو مکاں پر گذری

گردشیں تجھ سے ملیں تو مرے پاس آئیں بھی
میں ترا جسم بھی ہوں میں تری پرچھائیں بھی

رئیس امروہوی
زاویے۔ حیدر آباد پاک۔

ارضِ افسوں و افسانہ

چل اے دل سوئے شہرِ جانانہ چل — بصد شب روی ہائے مستانہ چل
یہی ہے تمنائے خواب و خمار — سوئے ارضِ افسون و افسانہ چل
یہی ہے تقاضائے شعر و شباب — سوئے خاکِ مہتاب و میخانہ چل
بہ تعمیلِ منشورِ مے خانہ اُٹھ — بہ تجدیدِ پیمانِ پیمانہ چل
مبارز طلب ہیں حوادث تو کیا — رجز چھیڑ کر رزم خوابانہ چل
مصائب ہیں ہنگامہ آرا تو ہوں — علم کھول کر فتح مندانہ چل
جو مقصودِ خاطر ہے تنہا روی — تو ان جان راہوں میں تنہا نہ چل

اٹھا دلق و کشکول و کاسہ اُٹھا — قلندر صفت چل فقیرانہ چل
دف و چنگ و طاؤس و طنبور دے — بہ قانونِ شہر رو دوستانہ چل
شتربانِ لیلیٰ کو زحمت نہ دے — رہِ شوق میں بے حجابانہ چل
ابھی منزلیں منزلوں تک نہیں — ابھی دور ہے شہرِ جانانہ چل
ابھی حسن کی خیمہ گاہیں کہاں؟ — ابھی اور ویرانہ ویرانہ چل

ابھی شہرِ جاناں کی راہیں کہاں؟ — ابھی اور بیگانہ بیگانہ چل
جبل در جبل دشت در دشت ابھی — جواں مردِ کہسار! مردانہ چل
وہ بنتِ قبیلہ نہ ہو منتظر — ذرا تیز اے عزمِ مستانہ چل
وہ سلمائے صحرا نہ ہو مضطرب — رہِ دوست میں عذر خواہانہ چل
حریفوں کی چالوں سے غافل نہ ہو — کٹھن وادیوں میں حریفانہ چل
غزالوں کی آبادیاں ہیں قریب — غزل خوانیاں کر غزالانہ چل
بہت اجنبیت ہے اس شہر میں — چل اے دل! سوئے شہرِ جانانہ چل

عابد حشری
اوراق ۔ لاہور

برف کے بیٹے

روح بکھرے ہوئے احساس کے زنداں میں اسیر
راکھ کے ڈھیر میں خوابوں کی دلہن سوئی ہوئی
الجھے ماحول کی پُرہول و خنک تاب ہوا
روح میں اتری تو جم جائے گی اک برف کی تہ
ذات کے خول میں چھپ جائے گی ہر دل کی گھٹن

کائناتِ تنگ دو اور سمٹ جائے گی
زندگی سرد خیالات میں بٹ جائے گی
روشنی وقت کی گھٹ جائے گی۔
خلوتِ شب کے گراں سرد نہاں خانے سے
کبھی باہر بھی نکل کے دیکھو۔
صبح کی دھوپ میں ایک کیف بھی ہے رنگ بھی ہے
گرمئ شوق کا آہنگ جنوں ساز بھی ہے
ہمسفر شعلۂ آواز بھی ہے
وقت خاموش نہیں۔
سوز بھی ہے، ساز بھی ہے۔
فکرِ انجام سے دامن کو چھڑا کر دیکھو
صرف ابھی لذتِ آغاز ہے اور کچھ بھی نہیں
زندگی صرف تگ و تاز ہے اور کچھ بھی نہیں۔

اویس احمد دوراں
شاعر ۔ بمبئی

ویت نام

ہم نشیں دیکھ یہی خطۂ برباد ہے وہ
جسکے خوں گشتہ فسانے ہیں بہت درد بھرے
جسکے بربط کا ہر اک تار ہے زخمی اب تک
جسکی محفل کے ترانے ہیں بہت درد بھرے
جو اک آواز ہے اپنے ہی لہو میں ڈوبی

آہ مقتل کی یہ لاشیں، یہ شہیدانِ وفا
کس سے پوچھیں انہیں کس جرم کی تعزیر ملی
دل میں آزادئ گلشن کی تڑپ کتنی بھی تھی
جاں نثاروں کو مگر موت کی زنجیر ملی
جبر کے ہاتھ جب اٹھے تو اماں مل نہ سکی

قاتلوں کو یہ جنوں ہے کہ فدایانِ جمال
حسن و آرائشِ محفل کا کبھی نام نہ لیں
قافلے گم رہیں تاریک بیابانوں میں
راہروِ عشرتِ منزل کا کبھی نام نہ لیں
لالہ زاروں میں نہ ہو کچھ بھی شراروں کے سوا

ایک آندھی کہ جو مغرور بھی منحوس بھی ہے
در و دیوار کو مسمار کئے جاتی ہے
ایک بپھری ہوئی ڈائن ہے جو آنگن آنگن
بے گناہوں کا فقط خون پئے جاتی ہے
روح بیتاب ہے حریتِ انساں کی قسم

انجم اعظمی
سیپ۔ کراچی

انوکھی بات

اک آگ سے دو چہرے ابھرے
وہ چہرے کون تھے ؟ میں اور تو
جو بھٹک رہے تھے وقت کے اندھے رستے پر
اور جگ کے میلے کے اندر
میں ڈھونڈ رہا تھا برسوں سے
(تجھ کو ہی) مگر
انجان بہت
معلوم نہ تھا، کیا کھویا ہے
یہ دھرتی تھی، کچھ موسم تھے اور آشا کے سپنے دل میں
چلتے چلتے
ہم پہنچ گئے
اک دور کنارے ساگر کے
میں جنم جنم کا پیاسا تھا
دیکھا، کوئی پیاسا اور بھی ہے۔
پھر کیسی انوکھی بات ہوئی۔
اس ساحل پر
میں نے تجھ کو، تو نے مجھ کو پہچان لیا۔

ادیب کاکوی
سیپ۔ کراچی

دوستو، ساتھیو، رہزنو، رہبرو

جاں سے محبوب تر جان کے دشمنو
تم میں کتنے ہیں جن کو پیمبر کہیں
تم میں کتنے ہیں جن کو سگِ زر کہیں
تم میں کتنے ہیں جن کا لقب ہے امیں
بن کہے بھی کوئی بات بنتی نہیں

اپنے ہی سائے سے تم ہراساں ہو کیوں
خوں بداماں ہو کیوں حشر ساماں ہو کیوں
رسمِ انسانیت سے گریزاں ہو کیوں
دوستو، ساتھیو، رہزنو، رہبرو

جستجو

جستجو صبح کی جستجو شام کی
جستجو نام کی جستجو جام کی
جستجو نے سرِ راہ رسوا کیا
جستجو سے ہراساں ہے دار و رسن

نظیر صدیقی فنون۔لاہور تحسین سروری ماہ نو۔کراچی

محرومی

میں نے اک خواب تو دیکھا تھا مگر
لیکن اس خواب میں ایسی تو کوئی
بات نہ تھی
جو حقیقت نہ بنے اور فسانہ ہی
رہے
ہاں مگر شومیٔ تقدیر مری کام آئی
وہ فسانہ ہی رہا اور حقیقت نہ بنا
میں تہی دست یہاں آیا تھا
اور شاید تہی دامن ہی چلا جاؤں گا

گریز

کتنے دن بیت گئے، میں نے تجھے چاہا تھا
برق بنگرافیِ روح پہ لہرائی تھی
تو کسی خواب کی جنت سے اتر آئی تھی
کیا بیاں کیجیے۔ کیا حالِ دلِ شیدا تھا

ذرۂ خاکِ قدم تیرے دمک اٹھتے تھے
تیری زلفوں، ترے گلنار بدن کی خوشبو
پھیل جاتی تھی، چمن زار مہک اٹھتے تھے
دیکھنے والوں کی نظروں سے بچا کر میں نے
کس تمنا سے، محبت سے تجھے دیکھا تھا

اب یہ دن ہیں کہ تجھے دیکھ بھی لیتا ہوں اگر
بھول جاتا ہوں، کبھی میں نے تجھے چاہا تھا

ظفر حمیدی
شب خون ۔ الٰہ آباد۔

ذکر اس پری وش کا.....

آج ایک محفل میں دوستوں کا مجمع تھا
ایک معتبر ساتھی ہم جلیس و ہم مشرب
دوستوں کی محفل سے آج غیر حاضر تھا
اک رفیق کو اپنے دوست کا خیال آیا
گفتگو کا رخ بدلا ذکر چھڑ گیا اس کا
ایک محترم بولے "وہ بڑا منافق ہے"
دوسرے نے کی تردید "آپ اس سے بدظن ہیں"
تیسرے کی تھی آواز "وہ بڑا شرابی ہے"
اور کہا یہ چوتھے نے "وہ بڑا کمینہ ہے"
درمیاں میں اک خاتون کی سنی گئی یہ بات
"وہ شریف انساں ہے اور وفا کا پتلا ہے"
دوسری کا تھا اعلان "وہ فراڈ کرتا ہے"
تیسری کا تھا فرمان "وہ ہوس کا بندہ ہے"
اپنے مخلصوں کے ساتھ جنگ کرتا رہتا ہے
ایک اور صاحب نے منکشف کیا یہ راز
"دوستوں سے اکثر وہ قرض لیتا رہتا ہے
اور پھر کبھی ان کو کچھ ادا نہیں کرتا
جھوٹ بات کہنے میں عار ہی نہیں کرتا
ہر گھڑی اسے اپنی کم تری کا ہے احساس
اس لئے ہمیشہ وہ پوز کرتا رہتا ہے"
دور ایک گوشے سے اک بزرگ علامہ
مستند دلائل کی روشنی میں یہ بولے
"وہ غریب جاہل ہے یعنی ایک چوپایہ
ڈگریوں، کتابوں کا بوجھ پیٹھ پر لادے
مرغزار دانش کی گھاس چرتا رہتا ہے"
دفعتاً ہوئی آہٹ اور معتبر ساتھی
روبرو نظر آیا، زیرِ لب تبسم تھا
پُرخلوص لہجے میں دوستوں نے فرمایا
"بور ہو رہے تھے ہم مرحبا کہ تم آئے
آج بس تمہارا ہی ذکرِ خیر جاری تھا"

عشرت انجم

عکس لطیف۔ کراچی

پیشہ ور

کچھ خدایانِ سخن ہیں جو بصد جاہ و جلال
چاہتے ہیں کوئی صورت ہو مٹا دی جائے
بربطِ روح سے تا حدِ ربابِ احساس
کوئی آواز جو ابھرے تو دبا دی جائے

شعر گوئی سے انہیں دور کی نسبت ہی نہیں
گفتگو ایسی کہ پتھر سے بکھر جاتے ہیں
تنگ دل تنگ نظر تنگ ہے دامن بھی مگر
اک نئی شان سے مسند پہ نظر آتے ہیں

یہ ذہانت کے پجاری یہ اندھیروں کے نقیب
جانتے ہی نہیں ماحول کا لہجہ کیا ہے
بولیاں بولتے رہتے ہیں سرِ شاخِ فریب
ان کا اس عہدِ سحر تاب سے رشتہ کیا ہے

لذتِ شعر سے اے دوست یہ واقف ہی نہیں
اہلِ کردار کو کس شہر میں بدنام کیا
ان کا ایمان ہے ادب میں بھی سیاست ہی رہے
جی حضوری کو سمجھتے ہیں بڑا کام کیا

روز و شب رہتی ہے انکو کسی گاہک کی تلاش
اپنے اندازِ تبسم کو دعا دیتے ہیں
مجمعِ اہلِ سخن جب بھی میسر ہو جائے
شعر پڑھتے ہیں ترنم کو دعا دیتے ہیں

جن کو تم نے نظر انداز کیا صدیوں میں
ان خیالوں سے نئے شعر بنا لیتے ہیں
اور جب کچھ بھی میسر نہیں ہوتا ان کو
کبھی لہجہ کبھی الفاظ چرا لیتے ہیں

صبحِ نو جن کے لئے زہر ہے بینائی کا
وہ شگوفے تو سرِ شام ہی کھل جاتے ہیں
کیوں پریشان ہوئے جاتے ہو ان سے یارو
پیشہ ور لوگ تو ہر دور میں مل جاتے ہیں

اثر لکھنوی — نیا دور، کراچی

آیئے وقت اب نہیں ناز کا یا حجاب کا
عجز گہ نیاز میں دخل ہے اضطراب کا
ضبط کیا تو کیا ہوا رنگ شکستہ نے کہا
قصۂ غم فراق کا، حال دلِ خراب کا
ذرّ دلِ بے قرار سے درد بھرا ہے اس قدر
برق کو ایک آہ سرد، درس ہے اضطراب کا
راہ ثواب اور ہے، مسلک عشق اور ہے
خوف وہاں عتاب کا، شوق یہاں عتاب کا
عقل کی بحث چھوڑ اثر، مکتب دل میں درس لے
دفتر روزگار ہے اک ورق اس کتاب کا
فروغ حسن دوست سے یہ رنگ ہے نقاب کا
کہ جیسے موج بحر میں ہو عکس آفتاب کا
حدیث رخ سے کم نہیں نکات زلف پرشکن
لکھا ہے ایک منتہی نے حاشیہ کتاب کا
ملا تو اس طرح ملا کہ مجھ سے مجھ کو کھو دیا
اثر ہوا تو یہ ہوا دعائے مستجاب کا
کہیں جو نسخہ وفا میں لفظ اجر آ گیا
دلِ غیور نے ورق الٹ دیا کتاب کا
وہ حال پوچھیں پوچھ کے فرمائیں بھی اثر
کیا پوچھنا ہے اب دل خانہ خراب کا

ظہیر کاشمیری

سیپ کراچی

اب ہے کیا، لاکھ بدل چشمِ گریزاں کی طرح
میں ہوں زندہ ترے ٹوٹے ہوئے پیماں کی طرح

کوئی دستک، کوئی آہٹ، نہ شناسا آواز
خاک اڑتی ہے درِ دل پہ بیاباں کی طرح

تو مری ذات، مری روح، مرا حسنِ کلام
دیکھ اب تو نہ بدل، گردشِ دوراں کی طرح

میں نے جب غور سے دیکھا تو وہ پتھر نکلا
ورنہ وہ حسن نظر آتا تھا انساں کی طرح

اب میں کس ناز پہ کہہ دوں کہ اسے کرلے قبول
دل تو صد چاک ہے مفلس کے گریباں کی طرح

ابھی کچھ کارِ محبت ہے مجھے دنیا میں
زندگی ختم نہ ہو صحبتِ یاراں کی طرح

اپنی صورت پہ مجھے تیرا گماں ہونے لگا
جب سے تو آیا نظر مجھ کو مری جاں کی طرح

برق بن کر مرے خرمن کو جلانے والے
تو ہی برسا تھا کبھی ابرِ بہاراں کی طرح

شاعر لکھنوی

عیاں ہے میرا لہو سُرخیٔ شفق کی طرح
چمک رہا ہوں سرِ دار حرفِ حق کی طرح
کتابِ عشق کے صورت نما ہیں ہم دونوں
ملے ہیں پھر بھی جدا ہیں ورق ورق کی طرح
خیالِ دوست کی خاطر کبھی کبھی ہم نے
خوشی بھی کی ہے گوارا مگر قلق کی طرح
اسی نگاہ کو کچھ رنگ آشنا کہئے
ٹھہر گئی کسی چہرے پہ جو رمق کی طرح
کہیں سے یاد ہے مجھ کو کہیں سے یاد نہیں
حیات ہے کسی بھولے ہوئے سبق کی طرح
چمن کو ہم نے جگر کا لہو پلایا ہے
بہ زمانگ رہے ہیں ہم اپنے حق کی طرح
نگارِ زیست کا عالم نہ پوچھئے شاعر
تڑپ رہی ہے کسی قلبِ نیم شق کی طرح

افکار۔ کراچی

شاعر لکھنوی

جام نو کراچی

بن جاتے ہیں آئینہ ہم ان کے سوال سے پہلے ہی
آنکھیں سب کچھ کہہ دیتی ہیں پرسشِ حال سے پہلے ہی
مرہم سے مانوس ہوا ہے خودداری کا زخم کہیں
رنگ اڑ جاتا ہے چہرے کا دستِ سوال سے پہلے ہی
دیدہ و دل کی قیمت کیا ہے فکر و نظر کی وسعت کیا
ٹوٹ گیا ہے ہر آئینہ ترے خیال سے پہلے ہی
ان لمحوں کو ہجر کہیں ہم یا عنوانِ وصال کہیں
وہ لمحے جو بیت گئے ہیں ہجر و وصال سے پہلے ہی
رنگ کہاں کا خوشبو کیسی پھول ہے کیا آئینہ کیا
ہر تمثیل کا چہرہ فق ہے تری مثال سے پہلے ہی
شاید یہ بھی ہو اے شاعر ایک فراری کیفیت
رخ پہ تبسم آجاتا ہے گردِ ملال سے پہلے ہی

علی جواد زیدی

شب خون، الٰہ آباد

جو نامراد کشاکش میں مبتلا نہ رہا
خودی تو خیر، خدا کے بھی کام کا نہ رہا

بجھے گا کوئی دیا، کوئی پھول ٹوٹے گا
مجھے بھلا کے نہ سمجھو کہ مسئلہ نہ رہا

ہزار آندھیوں میں اک چراغِ فکر و نظر
گھڑی گھڑی ہی دھڑکتا رہا، رہا نہ رہا

کسی نے چھیڑ دی وہ دھن اندھیری راتوں میں
کہ زندگی کا کوئی ساز بے صدا نہ رہا

یہ پیلا چاند، یہ شب خوں کا بے زباں شاہد
اداس ہے کہ جوانوں کا قافلہ نہ رہا

ہزار زخمِ تمنا کھلے ہوئے تھے، مگر
وہ اس طرح سے ملے ہیں کہ اب گلہ نہ رہا

کہیں تو کس سے کہیں جان دی کہاں ہم نے
وہ قتل گہ کہ جہاں شورِ مرحبا نہ رہا

وہی ہوا، وہی قطرہ، وہی سمندر ہے
جو سر اٹھا کے چلا تھا وہ بلبلا نہ رہا

سنا ہے ترے سوا اے غرورِ بے باکی
جہانِ نو کے لئے کوئی آسرا نہ رہا

ترے لبوں سے جو دل نے ہنسی چرا لی ہے
ہجومِ غم میں بھی رونے کا اب مزا نہ رہا

جہاں بہا تھا لہو حرفِ حق سنانے پہ
اسی گلی میں کوئی آج آشنا نہ رہا

وہ ناشناسوں کے جمگھٹ تھے جلوہ گاہوں میں
اداشناسوں کے چلنے کو راستا نہ رہا

کچھ اس طرح کی بھی تنہائیوں سے گذرا ہوں
قدم قدم پہ یہ لگتا رہا، خدا نہ رہا

یہی تو منزلِ سرمستی و جوانی ہے
کہ لغزشوں کے سوا کوئی رہنما نہ رہا

وجودِ ہوش تھا اک ریگ زار کا جلوہ
سرکتی ریت پہ دم بھر بھی نقشِ پا نہ رہا

صلیب و دار گزرگاہِ آرزو ہیں، مگر
مزا ہی کیا ہے اگر وہ کبھی دیکھتا نہ رہا

میں ایک زخم بہ دل اجنبی، سہی، لیکن
جو مڑ کے دیکھ لیا تم نے پھر گلہ نہ رہا

سحر سے تا بہ سحر یہ بھی ہو گیا معلوم
چراغ بجھ تو گیا تھا، مگر بجھا نہ رہا

شعور سوز کو ترسے ہوئے زمانے میں
کمی ہی کیا ہے جو زیدی سا بے نوا نہ رہا

نہ حقیقتوں میں ہیں تلخیاں نہ لطافتیں ہیں مجاز میں
مگر آج بھی ہے وہی تڑپ دلِ آشنائے نیاز میں
جو ہیں کم نظر انھیں کیا خبر وہ ہنسا کریں مرے حال پر
میں ہوں مطمئن یہی سوچ کر تری جستجو تو ہے راز میں
تمہیں کیا خبر تمہیں کیا پتہ یہ ہے اہل دل کا معاملہ
کوئی اہل دل ہی بتائے گا جو ہے فرق راز و نیاز میں
کبھی آتشِ غم عشق تھی کبھی آتشِ غمِ زندگی
مرے دل میں آگ لگی رہی کٹی عمر سوز و گداز میں
وہ عجم رہا ہے نہ وہ عرب، ہیں مٹے مٹے سے نقوش سب
نہ وہ سوز ہے کسی دل میں اب نہ وہ نغمہ ہے کسی ساز میں
غم زندگی کا ہے یہ اثر کہ بھٹک گئی ہے مری نظر
کشش آج بھی ہے وہی مگر تری چشم فتنہ طراز میں
جو ادا شناسِ جنوں رہا کسی راہ میں نہ بھٹک سکا
جو فریب عقل میں آگیا ہوا گم نشیب و فراز میں
تری بے رخی میں مزہ جو تھا وہ عنایتوں نے مٹا دیا
نہ وہ کیف بادۂ غم رہا نہ وہ لطف عرض نیاز میں
رہا شمسؔ حال یہ بزم کا کہ ہر اک کو ان سے گلہ رہا
کوئی منہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا جو آتے محفل ناز میں

شاذ تمکنت

نگہِ تصورِ عشق اب تری حیرتیں بھی نہیں رہیں
کسی آئنے سے گلہ نہیں کہ وہ صورتیں بھی نہیں رہیں

مرے دل کو بھی کبھی خوف تھا، کہیں راہ میں ہو سامنا
مگر آج کوئی ملا تو کیا وہ ندامتیں بھی نہیں رہیں

یہ ستم یہ جبر یہ روز و شب مجھے ہو چکے ہیں قبول سب
ترے بعد تلخیِ دل کی اب وہ نزاکتیں بھی نہیں رہیں

کہیں تجھ سے اپنی تری سنیں، کبھی آپ اپنے پہ بھی ہنسیں
کہیں بیٹھ کر کبھی رو بھی لیں، یہ فراغتیں بھی نہیں رہیں

کوئی مر کے جی اٹھا بارہا کبھی جیتے جی ہی گذر گیا
مگر اب وہ جلنے پہ کیا ہوا کہ یہ عادتیں بھی نہیں رہیں

کوئی پھر سے شہر میں آ بسا نہیں مجھ میں دید کا حوصلہ
مری بے بسی کوئی دیکھتا کہ مسافتیں بھی نہیں رہیں

ہو یقیں تو کوئی کرے بیاں سنے کون شاذ یہ داستاں
ہمیں جن پہ جھوٹ کا تھا گماں وہ صداقتیں بھی نہیں رہیں

مزاج بھوپال

شہاب جعفری

مشاعرہ بمبئی

گلِ نو کے ہاتھ سے دم بدم جو صبا نکلتی چلی گئی
تو چمن چمن تھی وہ تشنگی کہ بہار جلتی چلی گئی

میں مسافرِ رہِ درد تھا، ہر امید دستِ سوال تھی
یہ حیات موجِ سراب تھی، مرے ساتھ چلتی چلی گئی

تری یادِ گلشنِ خواب تھی کہ مری نواؤں کے دشت میں
یہ بہارِ شمعِ خیال تھی سرِ شاخ جلتی چلی گئی

تری آرزو تو نہ تھی مگر تو کہاں ہے میرے نگارِ حسن
تری جستجو کے بغیر بھی رہِ دل بدلتی چلی گئی

ترے گیسوؤں کی کہانیاں جو سنیں تو نیند سی آ چلی
سفرِ حیات میں سخت تھی مری رات ڈھلتی چلی گئی

نظر آئی منزلِ آرزو تو ہر اک نشیب و فراز پہ
یہ قدم بہکتے چلے گئے وہ نظر سنبھلتی چلی گئی

عبیداللہ علیم — صدف۔ کراچی

زبیر رضوی — نقوش۔ لاہور

دکھے ہوئے ہیں ہمیں اور اب دکھاؤ مت
جو ہو گئے ہو فسانہ تو یاد آؤ مت

خیال و خواب میں پرچھائیاں سی ناچتی ہیں
اب اس طرح تو مری روح میں سماؤ مت

زمیں کے لوگ تو کیا دو دلوں کی چاہت میں
خدا بھی ہو تو اسے درمیان لاؤ مت

تمہارا سر نہیں طفلانِ رہ گذر کے لئے
دیارِ سنگ میں گھر سے نکل کے جاؤ مت

سوائے اپنے کسی کے بھی ہو نہیں سکتے
ہم اور لوگ ہیں لوگو ہمیں ستاؤ مت

کہاں کا شہرِ سبا، قصۂ سلیماں کیا
گئے دنوں کے فسانے ہمیں سناؤ مت

ہمارے عہد میں یہ رسمِ عاشقی ٹھہری
فقیر بن کے رہو اور صدا لگاؤ مت

وہی لکھو جو لہو کی زباں سے ملتا ہے
سخن کو پردۂ الفاظ میں چھپاؤ مت

سپرد کر ہی دیا آتشِ ہنر کے تو پھر
تمام خاک ہی ہو جاؤ کچھ بچاؤ مت

اپنے گھر کے در و دیوار کو اونچا نہ کرو
اتنا گہرا مری آواز سے پردا نہ کرو

کل نہ ہو یہ کہ مکینوں کو ترس جائے یہ گھر
دل کے آسیب کا ہر ایک سے چرچا نہ کرو

جو نہ اک بار بھی چلتے ہوئے مڑ کے دیکھیں
ایسی معذور تمناؤں کا پیچھا نہ کرو

اپنی پہچان کے سب رنگ مٹا دو نہ کہیں
خود کو اتنا غمِ جاناں سے شناسا نہ کرو

عشق آثار زلیخاؤں کی اس بستی میں
صاحبو پاکیٔ داماں پہ بھروسا نہ کرو

ہو اگر ساتھ کسی شوخ کی خوشبوئے بدن
راہ چلتے ہوئے ہمسایوں کو دیکھا نہ کرو

چہرہ غیروں کی طرف روئے سخن میری طرف
حالِ دل یوں سرِ احباب تو پوچھا نہ کرو

تازہ غزلوں کو رسائل میں نہ چھپواؤ زبیر
کوئی کہتا ہے مرے نام کو رسوا نہ کرو

اختر ہوشیارپوری | فنون ۔ لاہور

دل میں اک جذبۂ بیداد و جفا ہی ہوگا
وہ خداوند بھی ہوگا تو خدا ہی ہوگا
گرد سی اڑتی نظر آتی ہے، آندھی ہوگی
دور تک نقشِ قدم ہیں، کوئی راہی ہوگا
کون جیتا ہے تمنا کے لہو ہونے تک
اُجلی صبحوں کا نشاں رنگِ قبا ہی ہوگا
کہیں گرتی ہوئی دیواریں کہیں جھکتی چھتیں
آپ کہتے ہیں تو یہ قصرِ وفا ہی ہوگا
پھول سے ترشے ہوئے لوگ خرابوں میں کہاں
دشتِ وحشت میں کوئی آبلہ پا ہی ہوگا
ہم سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو، ورنہ کل کو
کس کو اندازۂ ناکردہ گناہی ہوگا
جلتے جاتے مرے دروازے کے پٹ کھول گئی
یہ بھی اختر کوئی اندازِ صبا ہی ہوگا

رضی اختر شوق | سیپ ۔ کراچی

ترے قریب بھی دو چار ساعتوں میں رہوں
پھر اس کے بعد جنوں کی حلاوتوں میں رہوں
گذر رہا ہوں تو خوشبو ہی بن کے گذروں میں
بکھر رہا ہوں تو کچھ دیر وسعتوں میں رہوں
ہجومِ شورِ سگاں سے تو ہے یہی بہتر
تمام عمر خود اپنی ہی خلوتوں میں رہوں
دلِ کشادہ و فکرِ بلند رکھنے کا
صلہ یہی ہے کہ کوتاہ قامتوں میں رہوں
ہزار شیوہ ہے دنیا مگر کہوں کیونکر
یہ انتہائے سخن ہے کہ حیرتوں میں رہوں
تمہارے دور کا شاعر ہوں مہرباں لوگو
میں نکہتوں میں رہوں یا کثافتوں میں رہوں
ہے شوق اک شجرِ سایہ دار ہمدانی[1]
خدا کرے کہ میں اس کی رفاقتوں میں رہوں

[1] میرے دوست احمد ہمدانی مراد ہیں۔

اطہر نادر

سیف - کراچی

دل نشیں اس کی ہر ادا بھی ہے
وہ جو اک شخص بے وفا بھی ہے

دل جو پہلے اداس رہتا تھا
اب ترے غم سے کھیلتا بھی ہے

جو بظاہر ہے بے خبر مجھ سے
وہ مرا حال جانتا بھی ہے

لوگ جس کو ضمیر کہتے ہیں
دیکھئے تو وہ آئینہ بھی ہے

اک تری یاد ہے کہ باقی ہے
ورنہ یہ عمر بے وفا بھی ہے

کیلاش ماہر

سیف کراچی

منہ دیکھے کی باتیں ساری، وعدے رنگیں خواب سنہرے
دلی جاکر بھول نہ جانا، پھول بدن یہ چاند سے چہرے

تم کو تو اپنا سمجھا تھا، تم سب سے بیگانے ٹھہرے
تم نے دل میں جھانکا ہوتا، کتنے زخم ہیں کتنے گہرے

لاکھ پجاری دیپ جلائیں، خوں ٹپکائیں، جی سے جائیں
بت خانے میں رین سدا کی، سارے صنم ہی گونگے، بہرے

بیتا ہوا ہر لمحہ مجھ سے اپنی قیمت مانگ رہا ہے
کیسی بھیانک تنہائی ہے، چاروں اور ہیں ہنستے چہرے

اپنی ہی صورت دیکھ کے ملتر پیروں، پہروں لٹتے جسم
کس کو اپنا مسیحا بنائے لوگ تجارت پیشہ ٹھہرے

گنگا پرشاد پانڈے

سریتا۔ دہلی

یہ ہے لیڈری

ایک عرصے کے بعد جب میں نے ہزاری کو دیکھا تو میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے کھدر کے سفید چوڑی دار پاجامے کے اوپر ایک بڑھیا قسم کی سلک کی شیروانی زیب تن کر رکھی تھی اور پیر میں شولا پوری چپّل۔ اس کی بغل میں دو تین اور لوگ سفید براق کھدر کے ملبوس پہنے بیٹھے تھے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے کچھ معلوم کروں اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ فوراً اٹھ کر میرے پاس آیا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی مجھے کچھ دور لے جا کر کان میں پھسپھسایا۔ "معاف کرنا بھیّا، بڑی ضروری باتیں کر رہا ہوں۔"

"میں کیوں دخل دوں گا۔ مگر یہ چولا کیسے بدل دیا۔؟"

"سب بتاؤں گا، ذرا اطمینان رکھو۔ یہ چولا بدلنے کی بڑی لمبی کہانی ہے اچھا یہ بتاؤ، رہتے کہاں ہو؟" اس کے بعد اس نے میرا پتہ نوٹ کیا اور ضرور آؤں گا۔ کہہ کر پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

میں نے اشارے سے بیرے کو اپنے پاس بلا کر ایک کپ گرم کافی کا آرڈر دیا۔

بیرا چلا گیا۔ میں ہزاری کے بارے میں سوچتا رہا صحبت کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے آج ہزاری کو دیکھ کر اپنے نظریئے کی سچائی کا قائل ہونا پڑا۔ جو آدمی ہر طرح سے آوارہ اور نکما ہو، زندگی کے آخری موڑ پر یک بارگی چمک جائے تو یہ ستارے کی بلندی ہی تو ہے ایک عرصہ تک یہ بیٹھے بیٹھے مکھیاں مارتا رہا اور اب اس کے ٹھاٹ ہی نرالے تھے۔

اس دوران بیرے نے کافی لا دی۔ ایک گھونٹ پی لینے کے بعد جب اس کی طرف میں دیکھتا تو وہ ایک عجیب سے لیڈرانہ انداز میں انہیں کچھ سمجھا سا رہا ہوتا۔ میں نے جلدی سے کافی ختم کر دی، بل ادا کیا اور چلتے وقت نمستے کہہ کر ایک بار پھر اس کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔ اس نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میرے گھر آئے گا کیونکہ اس کا آنا کوئی ضروری بھی نہیں تھا۔ مجھ کیا لینا دینا مگر نہیں، وہ اسی رات تقریباً دس بجے آ ٹپکا۔ اس نے کنڈی کھٹ کھٹائی دروازے پر جا کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔

"ارے! تم! ایسی کیا جلدی تھی بھائی کل آ جاتے۔"

"کل کو کہاں فرصت ہے جناب! سوچا چلو ہوتا آؤں اور پھر جب آپ مل گئے تو ایک سے دو بھلے۔"

"کیا مطلب ہے میں سمجھا نہیں۔"

ایسی بھی سمجھنے کی کیا جلدی ہے بھائی زندگی میں ایک بار کچھ سمجھ میں آجائے تو سمجھ لو کہ ناؤ کنارے لگ گئی۔

اس نے چاروں طرف کمرے میں نظر ڈالتے ہوئے کہا کہاں پڑے ہیں آپ بھی! اچھا پہلے کہانی سنو، یہ بات پھر ہوگی۔"

"کیسی کہانی؟"

"بھول گئے۔ میں نے کہا تھا ناکہ گھر آکر میں تمھیں اپنی کہانی سناؤں گا اس چوڑی دار پاجامے اور شیروانی کی کہانی۔"

میں بھی جم کر بیٹھ گیا اور وہ کہانی سنانے لگا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ گھر والے مجھے نکما سمجھتے تھے۔"

"مگر اب کون کہے گا؟"

"خیر اب کی بات چھوڑو، اب تو عقل آہی گئی۔"

"ہاں لگتا تو ہے" میں نے بات آگے کھسکائی۔

"تو ایک دن گھر سے تنگ آکر میں اپنے ایک دوست کے یہاں گیا، جس کا ایک گاؤں میں شراب کا ٹھیکہ چلتا ہے اور بڑے بڑے نیتا اس کے دوست ہیں میں نے اسے اپنی رام کہانی سنائی جسے سن کر اسے مجھ پر ترس آگیا۔ اس نے مجھے اپنے ہی پاس ٹھہرا لیا۔ رات کو ایک آدمی ٹھرا پینے آیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے پاس بلا کر کہا، دیکھو یہ میرا آدمی ہے اور مصیبت زدہ ہے اس کی مدد کرو۔ اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور بولا کل اسے میرے پاس بھیج دینا۔ اس کے رہنے کھانے کا انتظام کرادوں گا۔ فی الحال گاؤں گاؤں کتابیں بانٹے گا اور لوگوں کو نیکی کی راہ پر چلنے کی ترغیب دے گا۔ عقل سے کام لے گا تو کچھ بن جائے گا۔

"میں تعجب سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد ٹھرے کا ایک کوزہ چڑھا کر وہ چت ہوگیا۔ دوسرے دن میں پہنچا تو اس نے مجھے کام بتایا اور کام کے طریقے بھی۔"

"کام کے طریقے؟" میں بھونچکا سا اس کی تقریر سن رہا تھا۔

"ہاں اس نے بتایا کہ کام کا طریقہ ہوتا ہے، کردکم کہو زیادہ۔ دوسروں کے کام میں برائی نکالو۔ اس طرح اس کی صحبت میں تقریباً تین برس رہا اس عرصہ کو میں اپنی زندگی کی کریم سمجھتا ہوں میں نے اس خدمت کے دوران تجزیہ کیا کہ واقعی میں بڑا نا معقول ہوں اور جو کام مجھے پندرہ برس پہلے کر لینا چاہیئے تھا جس طریقے سے اسے اب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہیں میں نے یہ بھی سیکھا کہ اگر آدمی ترقی کرنا چاہتا ہے تو تین چیزوں سے مرنے تک زبانی تعلق رکھے کیوں کہ آگے بڑھنے والوں کے راستے کی یہ تین بڑی دشواریاں ہیں۔ ایمانداری، لگن اور بھلائی، ترقی چاہنے والوں کے لئے یہ تین باتیں بہت ضروری ہیں۔ عیب جوئی، چاپلوسی اور خود نمائی۔ ہاں، ایک مزے کی بات اور بتاؤں کہ میں نے نیک چلنی کا اصلی مطلب بھی وہیں سمجھا۔"

"وہ کیا؟" میں نے متعجب ہوکر پوچھا۔

"ایک دن استاد بیٹھے ہوئے تھے۔"

"استاد کون؟" میں نے اسے ٹوکا۔

ارے بھائی جس نے پریشانیوں کے عذاب سے نجات دلا کر ایک نئی زندگی بخشی۔"

"اچھا اچھا، سمجھا۔" دراصل مجھے اس کی باتوں میں بڑا لطف آرہا تھا۔

وہ کہنے لگا "میں نے ٹھرے کی برائی کردی، ٹھرا پینا نیک چلنی کے خلاف ہے بس پھر کیا تھا استاد سیخ پا ہوگئے۔ نیک چلنی جانتے بھی ہو کیا

ہوتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ شراب پینا نیک چلنی کے خلاف ہے دنیا میں کوئی چیز نیک چلنی کے خلاف نہیں۔ ہر چیز اسی کے اردگرد گھومتی ہے، مجھ میں اتنا فہم کہاں کہ ان سے بحث کرتا۔ انھوں نے کہا دشستر، نیک چلنی کا مطلب ہے جو ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیشہ کیا قائم رہے؟ چار چیزیں، پیسہ، شعرا، عورت اور عیش۔ یہ چاروں چیزیں کسی کو نصیب نہیں ہوں گی، اِلّا ماشاءاللہ کی اور بات ہے اتنا تو میں سات پشت میں بھی نہ جانتا اسے کہتے صحبت کا پھل

وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا تو میں نے ٹوکا۔ "ابھی کتنی لمبی ہے کہانی؟"

"ارے بھائی اصلی کہانی شروع ہی کہاں ہوئی۔ اچھا لو اب اسے شروع کرتا چلوں" اس کے بعد وہ اطمینان سے بولنے لگا "اس طرح تین سال تک میں اس کے پاس رہا مگر تجربے کے سوا اور کچھ حاصل نہ کر سکا، بس شام کو گھوم کر آنے کے بعد چند سکے ہی میری جیب میں ہوتے۔ ویسے کھانے پہننے کے لئے کوئی کمی نہیں تھی۔ ساتھ میں کئی بہنیں بھی کام کرتی تھیں اب دھیرے دھیرے میرے دل میں ایک سے ایک اونچے خیال پیدا ہونے لگے زندگی کا اصلی لطف اور عیش کے موقعے تو ابھی رہ ہی گئے تھے اس لئے میں نے ایک دن استاد سے عرض کیا، کیا میں یوں زندگی بھر لوگوں کو نیکی کا درس ہی دیتا رہوں گا؟

وہ بولے، کیوں، کیا تھک گئے۔ ابھی کچھ دن اور رکو، پھر وہ کسی کام میں لگ گئے۔

دوسرے دن میں نے انھیں چھیڑا تو وہ مجھے ایک منتری کے پاس لے گئے۔ پہلے مجھے باہر روک دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اندر گیا تو لگا کہ چکر کھا رہا ہوں، سچ مچ وقت بہت طاقتور ہے۔ وہ منتری مجھے دیکھتے ہی پہچان تو گیا مگر اس وقت کچھ بولا نہیں۔ میری بھی ہمت نہیں ہوئی کہ کچھ پوچھوں کیوں کہ ایک جیسے بہت سے آدمی ہوا کرتے ہیں۔ استاد نے تعارف کرایا، سرکار اس خادم کا نام ہزاری ہے تین سال سے بھلائی کا پرچار کر رہا ہے دیواروں پر نشہ بندی کے اشتہار چپکاتا ہے اس پر کچھ نگاہِ کرم ہو جائے، اس نے ایک بار میری طرف گھور کر دیکھا اور مڑ کر بولا اچھا، تم جاؤ، اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

"استاد چلے گئے اور میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بھی اندر چلا گیا اور اس کے بعد ایک ٹپ ٹاپ اردلی کے ذریعے مجھے اندر بلوایا اس کی رہائش گاہ میں پہنچتے ہی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے سنا ہے کہ جنت بڑی پُر لطف جگہ ہے مگر وہ مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے اس وقت میں زندہ ہی جنت میں تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا دیکھو تمھارا نام ہزاری ہے نا۔؟ اس کی بے تکلفی سے میں جھینپ گیا۔

جھینپ کیوں رہا ہے بھائی؟ مجھے پہچانتا نہیں، چمن کو بھول گیا؟"

"بھولا نہیں مگر . . . ."

اگر مگر چھوڑ یار، یہ سب تو وقت کی مہربانی ہے، سنا آج کل کیا کرتا ہے؟ یہاں کیسے پہنچ گیا؟ پہلے کیوں نہیں آیا ادھر؟، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ آخر بڑی مشکل سے کہا، مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ چمن لال تم ہی ہو، میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کہیں ــ"

مر کھپ گیا ہوں گا ہے نا؟ اس نے جواب دیا، ہزاری تو بدھو ہی رہا۔ جب وقت دروازے پر دستک دیتا ہے تو اچھے دن آنے دیر نہیں لگتی اب تیرا بھی وقت آ گیا ہے۔

"میری بھی جھینپ مٹتی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا، مگر یہ بتا اس طرح کا موقع تیرے پاس کیسے آ گیا، جیل تو تو کبھی گیا نہیں ملک کی خدمت کبھی کی نہیں تو پھر؟"

"ہاں، یہی تو عجیب کھیل ہے قسمت کا، ہزاری، مگر اب تو دنیا جانتی ہے کہ میں نے ملک کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا جیل گیا تھا اور سرکاری گورے افسروں کو مار کر ایک لمبے عرصہ کے لئے فرار رہا تھا۔ مجھ پر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

" مگر یہ سب کیسے ہو گیا ؟ "

" ہو نہیں گیا، کرنا پڑا یہ سب۔"

" وہ کیسے ؟ "

" سنو، بتاتا ہوں۔ دراصل آزادی کے بعد قسمت نے اصلی شہیدوں کو نظر انداز کر کے دیگر لوگوں کے دروازوں پر دستک دی۔ وہ جو ایمانداری کا لبادہ اوڑھ کر وطن کے دیوانے بنے رہے اور اس موقعے کو پہچان نہ سکے اور ان میں سے ڈھیر سارے اب تک ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ جو چالاک تھے انھیں یہ موقع بہت سازگار آیا اس وقت میں سادھو کے بھیس میں نیپال کے پہاڑوں میں چھپا بیٹھا کرتا تھا۔ تم ہی کیا پوری بستی جانتی ہے کہ کس طرح ایک بے قصور آدمی کو مار کر فرار ہو گیا تھا۔ گھر بار قرق ہو جانے کی خبر اخباروں میں آئی مگر پھر بھی میں نہیں آ سکا آٹھ برس تک اِدھر اُدھر دھکے کھاتا رہا اور جب ملک آزاد ہوا تو بڑی مشکل سے کھدر کے ایک دھوتی کرتے کا انتظام کیا اس کے بعد پارٹی کے دفتر میں جا کر اپنا نام لکھوایا اور یہ بھی بتایا کہ میں مفرور ہوں اور میں نے ایک انگریز افسر کا قتل کیا تھا۔ نام درج کرنے والے نے مجھے بڑی عزت بخشی بس اسی دن نئے چمن کا جنم ہوا۔

اب تو وقت میرے دروازے دستک دے رہا تھا۔ میں پارٹی کی خدمت میں جی جان سے جٹ گیا اور اگلے الیکشن میں اکثریت سے چن لیا گیا لوگ تین بار مہاتما گاندھی کی جے کے بعد ایک بار چمن لال کی جے کے نعرے لگانے لگے۔ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے میں آسمان پر اٹھ گیا پھر لوگوں کے طفیل سے میں منتری بھی بن گیا۔ منتری بننے کے بعد مجھے ایک عالی شان بنگلہ ملا۔ اس میں بے شمار تحفے آئے۔ جن چیزوں کو میں خواب میں بھی نہ دیکھ سکتا تھا وہ سب مجھے ملیں۔ گھر بار کا لگاؤ تو بہت پہلے ہی ترک کر چکا تھا اس لئے لوگوں کے لئے میں مرا ہوا ہی بنا رہا۔ وہ بھی کون گیا تھا اس کے بعد میری ایک تمنا اور رہ گئی تھی۔"

" وہ کس کی ؟ " میں نے متعجب ہو کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ اب یہ بھی بتاؤں کیا ؟ "

میں نے اس کے بالوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ خوب ہنسا " اس سے کیا ہوتا ہے ہزاری دل تو جوان ہے ہی۔ مگر میرا خادم جو کبھی کسی انگریز کا اردلی تھا مجھ سے بولا سرکار گھر بار کی محبت ختم کرو۔"

" لیکن . . . . "

" اس کی آپ کیا فکر کرتے ہیں مالک، ہر رات ایک نئی آ سکتی ہے ویسے اگر گھر بار میں پھنس گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے ابھی آپ کنوارے ہیں یہی ٹھیک ہے، کوئی کچھ شک بھی نہیں کرے گا "

" میں نے اس کی نیک صلاح مان لی اور شادی نہیں کی۔ کام چلتا رہا۔ اور اب جدھر بھی نظر ڈالو زیادہ تر نیتا غیر شادی شدہ ہی ملیں گے میں نے گرہ لگائی کہ نیتا کا کنوارا رہنا ہی ایک خوبی ہے میں نے کبھی تنہائی کا احساس نہیں کیا تمھیں بھی نہیں محسوس ہو گا اچھا اب تم تھک گئے ہو گے

اسی درمیان ایک حسین لڑکی دو گلاس انار کا رس لے آئی۔ ایک اس نے لیا ایک میں نے۔ پھر وہ اٹھا کیوں کہ کسی افتتاح کے لئے اسے باہر جانا تھا۔ نوکروں سے تاکید کر دی۔ " دھیان رکھنا، اس کے بعد وہ خوب بن ٹھن کر بڑی شان سے شیورلیٹ کار میں جا بیٹھا۔"

میں کافی بور ہو رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ جلد اپنی رام کہانی ختم کرے۔ مگر وہ پھر کہنے لگا " تو جناب میں اس کے یہاں قریب ایک مہینہ رہا۔ میں نے اس کی ہی زبانی سنا کہ اس کا کروڑوں کا بزنس ہے کئی کمپنیوں کا حصے دار ہے اس نے بے شمار پرمٹ تُڑوا لیے ہیں۔

(باقی ص[illegible] پر)

ایس شری دھر
سریتا۔ دہلی

سب سے بھلے نکمے

اس وقت میری عمر ۲۲ سال تھی اور حساب جیسے مضمون میں مجھے ایم اے کی ڈگری بھی مل چکی تھی میں بہت خوش تھا مگر اس ڈگری کو حاصل کرنے کے لیے اتنے امتحان پاس کرنے پڑے تھے کہ میں بور ہو چکا تھا اس وجہ سے آئی اے ایس کے چکر میں پڑنے کی میری ہمت نہیں پڑی۔ جب کہ یہ امتحان دینا نوجوانوں کا مشغلہ بن چکا ہے۔

آئی اے ایس امتحان نہ دینے پر بھی میں سرکاری نوکری کرنا چاہتا تھا پشتوں سے میرے خاندان کے لوگ سرکاری گزیٹڈ افسر ہوتے آئے ہیں پھر بھلا میں اپنی خاندانی روایات سے الگ رہنے کی بات کیسے سوچ سکتا تھا۔

ایک وزارت میں اسسٹنٹ کے عہدے پر کام کرنے کے ایک اشتہار کے جواب میں میں نے بڑے جوش وخروش سے درخواست بھیجی۔ جان پہچان والے کچھ بڑے لوگوں نے بتایا کہ سرکار جلد ہی ایک نیا شعبہ کھولنے جا رہی ہے اور ابھی سے اس میں لئے جانے والوں کے لئے بعد میں بڑا افسر بننے کا اچھا موقع رہے گا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی انٹرویو ہوا اور میں کامیاب ہوا۔ پھر میرا میڈیکل ٹیسٹ ہوا اور مجھے ایک ہفتے تک اپائنٹ منٹ آرڈر کے لئے منتظر رہنے کے لئے کہا گیا۔

آخرکار میں نے سرکاری نوکری حاصل کر ہی لی۔ مجھ سے زیادہ خوش نصیب بھلا کون ہوگا؟ میں نے جو چاہا وہ حاصل کر لیا تھا جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ میرا جوش سرد پڑتا گیا اور فکر بڑھنے لگی۔ ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی میرا اپائنٹ منٹ آرڈر نہیں آیا۔ جب پندرہ دن گزر گئے تو مجھے شک ہوا کہ کہیں میرا سلیکشن رد تو نہیں کر دیا گیا۔ جب زیادہ انتظار نہیں ہو سکا تو میں نے اس شعبے کے افسران سے ملنے کی ٹھانی انھوں نے میری بات بہت اطمینان سے سن کر کہا "میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ آپ کام کرنا شروع کر چکے ہیں یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے آپ جا کر متعلقہ افسر سے ملیے۔ ان کے پاس آپ کی فائل ہے وہ آپ کو بتائیں گے کہ کیا بات ہے؟"

متعلقہ افسر کے پاس جاتے وقت میں سوچنے لگا کہ وہ افسر جس نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ میرا سلیکشن کر کے چھٹی پا گیا اس نے اس بات کی طرف دھیان بھی نہ دیا کہ میں آیا بھی ہوں یا نہیں۔ اب مجھے کام پر بلانا کسی دوسرے افسر کا کام ہوگا۔ متعلقہ افسر کے پاس پہنچ کر میں نے بتایا کہ میرا اپائنٹ منٹ آرڈر ابھی تک نہیں پہنچا ہے انھوں نے تپاک سے جواب دیا۔ "تو بھلا میں کیا کروں؟ میڈیکل رپورٹ آج ہی آئی ہے دو تین دن میں تقرری کی اطلاع بھی پہنچ جائے گی۔"

میری جان میں جان آئی اور میں گھر لوٹا۔ عجیب بات تھی کہ ڈاکٹروں نے میری جانچ تو گھنٹے بھر میں کر لی مگر رپورٹ بھیجنے میں آتنی دیر لگا دی

تڑپی... دن کے ساتھ میں انتظار کرنے لگا۔ سبز سوٹ بڑی بے چینی سے گذر رہا تھا۔ میری الجھن بڑھ رہی تھی۔

ایک ہفتہ گذرا، دس دن بیتے، پھر بھی آرڈر نہیں آیا۔ میں متعلقہ افسر کے پاس پھر گیا۔ وہ بولے۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر لیکن انتخاب کئے ہوئے لوگوں کی لسٹ گم ہو گئی ہے، ابھی ڈھونڈتا ہوں آپ دو دن انتظار کیجئے۔"

اس طرح اس نے مجھے پھر لوٹا دیا۔ میرے دوست سوچنے لگے کہ میں نے اپنی نوکری کی بات جھوٹ موٹ ہی اڑا دی ہے جب کبھی میں ان سے کچھ دن اور انتظار کرنے کے لئے کہتا، ان کا شک یقین میں بدل جاتا تھا ان دو دنوں میں تو خوشی کے مارے میرا کھانا پینا تک چھوٹ گیا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔

میں پھر اس افسر کے پاس گیا تو وہ بگڑ اٹھے، جیسے غلطی ان کی نہیں میری ہی ہو۔ لیکن اس بار میں اپائنٹ منٹ آرڈر مانگنے کے لئے نہیں بلکہ اسے جلدی نکلوانے کے لئے گیا تھا۔ میں نے انھیں ۵۰ روپئے دیئے، جو انھوں نے بنا کسی حیل و حجت کے لے لئے، یہاں تک کہ شکریہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ پھر دوسرے ہی دن وہ لفافہ میرے یہاں پہنچ گیا جس کا میں اتنے دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔

اپائنٹ منٹ آرڈر پانے کے دوسرے ہی دن ٹھیک ساڑھے نو بجے، میں کام شروع کرنے کے لئے آفس جا پہنچا۔ لیکن وہاں مجھے خالی عمارت ہی ملی صرف ایک بوڑھا چپڑاسی دکھائی دیا۔ جو کمرے دوسری کے فرش جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "دفتر دس بجے کھلتا ہے یا بعد میں۔۔؟"

میری طرف دیکھے بغیر پنجابی میں اس نے جواب دیا "نئے لگتے ہو یہاں! یہاں تو کوئی وقت پر نہیں آتا۔ سب آدھا گھنٹہ دیر سے آتے ہیں اور آدھا گھنٹہ پہلے چلے جاتے ہیں۔"

راز کی یہ بات بتا کر وہ چلا گیا۔ میں نے آدھا گھنٹہ ان انجان میز کرسیوں اور رجسٹروں کے بیچ گزارا۔ اپنی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے کبھی اپنے بٹنوں سے کھیلتا رہا تو کبھی چشمہ صاف کرتا رہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد سرکاری نوابوں کا آنا شروع ہوا۔ سب ایک سے ایک گندے کپڑے پہنے ہوئے تھے ان میں سے کچھ کے کپڑوں میں سے خاص طرح کی بو آ رہی تھی کسی نے بھی میری طرف مسکرا کر نہیں دیکھا اور نہ کوئی بات ہی کی۔ ان کے بیچ مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی میری خواہش ہو رہی تھی کہ میں بھاگ جاؤں اور شتر مرغ کی طرح زمین میں اپنا منہ چھپا لوں سب سے بعد میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی آفس میں داخل ہوئے۔

"گڈ مارننگ سر"۔ سب نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

تو یہ ہیں میرے افسر! دوسرے لوگوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھ کو خشکنے لگے۔

"آپ ہیں ہمارے نئے ساتھی؟" انھوں نے پوچھا۔

"جی ہاں" میں نے انھیں خوش کرنے کے ڈھنگ سے کہا۔ "اجازت دیجئے کہ مجھے کہاں بیٹھنا ہے اور کیا کرنا ہے؟"

"ادھر آؤ بھئی ادھر آؤ! ارے یہ فوج کا دفتر نہیں ہے جو تم تنے تن کر کھڑے ہو۔ یہاں ہم لوگ آرام سے کام کرتے ہیں بغیر اپنے آپ کو تھکائے ہوئے۔"

میں کچھ مطمئن ہوا تو انھوں نے کہا۔ "بھئی ابھی تمہارے کام کے لئے کچھ سوچا نہیں گیا ہے، اس لئے کچھ کام نہیں ہوگا۔"

میرے لئے کوئی میز کرسی بھی نہیں تھی، اس لئے دن بھر کینٹین میں بیٹھا رہا یا برآمدوں میں چکر لگاتا رہا اور کرتا بھی کیا! کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بغیر کوئی کام دھندا کئے میں نے دو دن کی تنخواہ بنا لی۔

تیسرے دن مجھے کمرے میں ایک نئی میز کرسی دکھائی دی۔ میرا ٹھکانہ بن ہی گیا۔ افسر نے مجھے بلا کر کچھ چارٹ اور کچھ اعداد و شمار دیئے

"ان کی ٹیبل بناؤ۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن سس۔۔۔سر!" میں نے کچھ ہکلاتے ہوئے کہا "میں نے پہلے کبھی یہ کام نہیں کیا ہے اگر کوئی سمجھا دے تو۔۔۔"

"غلطی کرکے سیکھا جاتا ہے۔" انھوں نے مجھے صلاح دی اور ہاتھ کے اشارے سے واپس جانے کو کہا۔

اس طرح میرا کام شروع ہو گیا کام کرنے پر مجھے پتہ چلا کہ کام کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں محنت اور ایمانداری سے کام کرتا تھا پھر لگا کہ میرے دوسرے ساتھیوں میں یہ بات نہیں ہے وہ باتیں کرتے تھے اور ہنسی مذاق کرتے تھے اور ایسی گندی باتیں کرتے تھے کہ میرا سر جھکا جاتا تھا۔ جب جس کا دل چاہتا چائے پینے نکل جاتا۔ دو گھنٹے میں میں نے اپنا کام پورا کرکے افسر کو دے دیا۔

"تم نے اتنی جلدی کیوں کر لیا؟" وہ بولے "یہ کام تو تمھیں دو دن کے لئے دیا گیا تھا۔ اب تمھیں اور کیا کام دوں؟ ابھی تو کچھ ہے نہیں تم جوان ہو جاکر کہیں موج کرو۔"

میں سجلا کیا کہتا، سر جھکا لیا۔ اب چونکہ میرے افسر بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور میرے ساتھی میری پریشانی کا مزا لے رہے تھے اس لئے میں نے بھی بوریت دور کرنے کے لئے کینٹین میں جاکر ایک پیالہ کافی پینا ٹھیک سمجھا۔ جب میں لوٹا تب بھی کوئی کام نہیں کر رہا تھا لیکن وہ پہلے سے کچھ خاموش دکھائی دیتے تھے۔ مجھے حاضری کا رجسٹر دیا گیا اور لوگوں کی حاضری بھرنے کے لئے کہا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کام کے لئے ایم اے پاس کی کیا ضرورت تھی۔

جب کسی طرح وہ دن گزرا تو میں گھر جانے کے لئے اٹھا۔ دوسرے لوگ رکے رہے افسر نے مجھے بتایا کہ سبھی پینڈنگ کاموں کو پورا کرنے کے لئے رک رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس کام کو دن میں کیوں نہیں کیا گیا جب کہ سب بے کار بیٹھے رہے یا چائے پیتے رہے؟ انھوں نے ناراض ہو کر مجھے ایسے دیکھا، جیسے، یہ سمجھئے، ڈانٹ کر مجھے نکال دیا ہو۔ کسی کو بھی دفتر کے بعد رکنے کے لئے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی سب خود بخود رک جاتے تھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی سب کو اوور ٹائم کرنے کا پیسہ ملتا تھا۔

ایسے ماحول میں، کچھ دن بعد، میں نے تجربہ کیا کہ میں بھی اس سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہوں۔ ایک دن میں نے دیکھا، سب کے سب خوب زوروں کے ساتھ کام کر رہے ہیں مجھے تعجب ہوا۔ افسر سے پوچھا تو پتہ چلا کہ اوٹی میں ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس میں ہم میں سے ایک کو جانا ہے۔ اس لئے سب کے سب اپنی قابلیت دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں مجھے یہ سب پسند نہیں تھا، اس لئے میں نے اوٹی جانے کے لئے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ کچھ دن بعد میرا نام کانفرنس میں جانے کے لئے تجویز کیا گیا۔ پہلے تو مجھے تعجب ہوا۔ مگر جلدی ہی وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ کانفرنس اوٹی میں نہ ہو کر دلی میں ہونے والی تھی۔

آفس میں کلرک ہی نہیں، افسر بھی سوتے تھے اس کانفرنس کے لئے پروگرام کی لسٹ بنا کر ہم لوگوں نے ڈائرکٹر کے پاس بھیج دی تھی ایک ہفتے تک وہ ان کی میز پر پڑی رہی۔ ہفتہ بیت جانے پر وہ گرجتے ہوئے ہمارے کمرے میں آئے اور بولے، "تم لوگ کتنے بے وقوف ہو! کوئی بھی ہوش مند آدمی اتنی غلطیاں نہیں کر سکتا۔ چاہے تم سب کو رات بھر جاگ کر کام کرنا پڑے لیکن یہ کام کل سویرے تک مجھے ٹھیک حالت میں ملنا چاہیئے۔"

ہمارے افسر نے کہنے کی کوشش کی کہ یہ کام ایک ہفتہ پہلے بھیجا گیا تھا پہلے کیوں نہیں دیکھا گیا؟ مگر ڈائرکٹر صاحب ان سنی کرکے لوٹ گئے۔ پھر کیا تھا۔ ہم لوگوں نے رات بھر کام کیا۔ کام پورا ہو جانے پر ہمارے افسر نے ڈائرکٹر کو فون کرکے پوچھا کہ کیا پروگرام کی لسٹ آپ کے پاس بھیج دی جائے؟ انھوں نے کہا کہ وہ اسے دوسرے دن صبح دیکھیں گے پھر ہم لوگوں سے رات بھر اتنی محنت کیوں کرائی گئی؟ اگلے دن صاحب نے معذرت آمیز لہجے میں کچھ کہا اور سب نے ان کی تعریف کی۔

ایک بار مجھے ایک چارٹ بنانے کے لئے کہا گیا۔ مجھے ریسرچ کا کچھ تجربہ تھا اس لئے میں نے وہ کام بہت اچھی طرح کیا۔ جب انڈر سکریٹری نے یہ جاننا چاہا کہ وہ کام کس نے کیا ہے تو میرے افسر نے خود کو پیش کر دیا۔ اور میری طرف ایسے اطمینان دلاتے ہوئے دیکھا جیسے میرے لئے پھر کبھی موقع آئے گا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی اپنے ساتھیوں جیسا ہی ہو گیا۔ افسر کے جانے کے بعد مجھے تعجب ہوا کہ ایک نئے ملازم سے میں نے بھی ٹھیک وہی کہا جو میرے افسر نے مجھ سے کام پر آنے والے دن کہا تھا۔ میں نے تو اس سے بھی آگے ایک صلاح دے ڈالی۔

"اگر تم کام نہیں کرو گے تو سست کہلاؤ گے اور اگر کرو گے تو ہوشیار۔ ویسے سست بنے رہنا ہی اچھا ہے، کیونکہ ہوشیاری دکھائی تو سب کام تم ہی پر ڈال دیا جائے گا۔"

میں اب ڈائرکٹر ہوں میری عمر ۴۵ برس کی ہے اور میرا خاندان سکھی ہے میرا لڑکا ۱۶ برس کا ہے ابھی سے وہ اتنا ہوشیار اور چالاک ہو گیا ہے جتنا کہ میں ۲۵ برس میں تھا۔ وہ کہتا ہے "میں انجینئر یا ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بنوں گا میں تو آپ کی طرح کسی دفتر میں سرکاری نوکری کرنا پسند کروں گا۔" میں اسی کش مکش میں ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

بقیہ ص ۱۶۲

ہزاری رکا تو میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا "اب تم کیا کر رہے ہو؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں ایک دن میں چمن لال کے پاس بیٹھا تھا وہ مجھ پر بہت مہربان سا لگ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا، ہزاری اب بیوقوفیاں چھوڑ دو۔ آدمی بننا چاہتے ہو تو ایک کام کرو۔ مجھ سے خرچ لو اور عوام کی بے لوث خدمت کرو۔ اگلے الیکشن میں صرف دو سال اور رہ گئے ہیں ٹکٹ میں تمہیں دلا دوں گا۔ پارٹی کی طرف سے میں سب انتظامات کرا دوں گا تم فوراً چن لئے جاؤ گے۔ پھر تمہارا موقع آ جائے گا اور تم آدمی بن جاؤ گے ابھی یہ ملک اس لائق ہے کہ اسے لوٹا کھایا جا سکتا ہے، سمجھے!"

تب سے میں جنتا کی سیوا کر رہا ہوں میرے ساتھ والے میرے مددگار ہیں۔ سچ کہتا ہوں بھیا، آج ترقی کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔

ہزاری چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا، میری آنکھوں میں نیند تھی مگر میں کافی دیر تک نہیں سو سکا۔

بقیہ ص ۱۱۰

ہے اور ہر ایک سے ساحل کا پتہ پوچھ رہی ہے۔ کیونکہ اس کے اردگرد، آس پاس، دور و نزدیک کوئی ستون کوئی سہارا، کوئی چھاؤں نہیں۔ اور اسے اکیلی پاکر فرزانہ ہر ہر طرح اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ جیسے جو دھوکا اس نے نصرت کے ساتھ مل کر فرزانہ کو دیا۔ اس کا پورا پورا انتقام لینا چاہتی ہو۔ اور واقعی ایسے غمناک موقعے پر بھی فرزانہ اس تصور کے ساتھ ہی بے اختیار مسکرا پڑی۔ اور اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔

رجسٹرڈ نمبر ایس ۱۵۱۹

نقش
کراچی
اردو ادب کا ڈائجسٹ

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی ای/ جی وی/ ۵۸۰۳-۵۱۰۰۲-۶۰/ مورخہ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

اردو ادب کا ڈائجسٹ

نقش کراچی

۱۲-۱۱/۶۷

مدیر

شمس زبیری

قیمت	سالانہ
ایک روپیہ پچاس پیسے	پندرہ روپے

کاشانۂ اردو، ۳۰۲ پوسٹ بکس کراچی ۲

فون نمبر ۷۰۱۵۴

ترتیب

افسانے

نظمیں

غزلیں

مضامین

طنزیے

عصمت چغتائی

شمع۔ دہلی

محبوب

محبوب! میری مراد فلم فار گرز محبوب سے نہیں جنھوں نے مدر انڈیا بنائی تھی، اور نہ اس محبوب کا ذکر ہے جس کی تعریفوں میں شاعر اور ادیب زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتے ہیں، جس کے فراق میں عاشقوں کی سٹی گم رہتی ہے جس کی زلفوں میں گھٹائیں الجھی ہوتی ہیں، چہرے پر چاند جھلملاتا ہے۔ ہونٹوں پر گلاب کی پنکھڑیاں، اور آنکھوں میں عاشقوں کے دلوں کو تاک کر گرنے والی بجلیاں لہری ہوتی ہیں۔ میں تو فقط اپنے باورچی طول عمرہٗ کا ذکر کر رہی ہوں۔ ان کی زلفوں پر گھٹاؤں کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ جمعہ کے جمعہ چاند گھٹاتے تھے۔ آنکھوں میں بجلیاں نہیں کوند سکتیں کیونکہ ان کے آنکھیں نہیں، صرف ایک اکلوتی آنکھ تھی۔ اس مرحوم آنکھ سے بھی کوئی رومانی داستان وابستہ نہیں، کیونکہ چیچک میں بیٹھ گئی تھی، اور بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

نہ جانے ماں باپ نے خوگیری کی بھرتی میں سے صرف ان کا نام محبوب رکھنے میں کیا مصلحت دیکھی۔ محبوب کسی زمانے میں بھی کسی کو محبوب نہ رہے۔ وہ تو صرف چھ بچوں کے باپ اور ایک مدد مد قوق بیوی کے شوہر تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے بدخو اس قسم کے آقاؤں کے باورچی بھی رہ چکے تھے۔ ہانڈیاں پکانے اور پوریاں بکوریاں تلنے کی بجائے وہ قسمت کے مارے آقاؤں کو زیادہ خوش اسلوبی سے تل دیتے تھے۔ دنیا میں جہاں اور چیزیں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوتی جا رہی ہیں، اسی طرح باورچیوں کا بھی کال پڑتا جا رہا ہے۔ محبوب ہر پیشہ اختیار کرنے کے بعد اسے اپنے وجود کیلئے قاتل پاکر باورچی گیری پر آ ٹکے۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ اس فن میں ماہر تھے۔ جہاں تک مہارت کا تعلق ہے وہ گورکن بھی ہو سکتے تھے۔

محبوب کھانا پکانے کے معاملے میں بالکل ایک منہ موجی فنکار کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا فن نہایت جدید اور کچھ تجریدی آرٹ کے اسکول سے تعلق رکھتا تھا۔ جیسے جدید پینٹنگ کو دیکھ کر آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ عورتیں کھڑی ہیں یا گنے کا کھیت ہے، بالکل اسی طرح محبوب کے پکائے ہوئے کھانوں کو چکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قورمہ ہے، قلیہ ہے یا کھڑے مسالے کا گوشت ہے۔ جہاں تک مسالوں کا تعلق، وہ کھڑے بیٹھے مسالے کا سالن پکانے کی بجائے کچھ اچھلتے کودتے اور اودھم مچاتے مسالوں کے کھانے پکاتے تھے۔ سیاسی پارٹیوں کی طرح ہر مسالہ بالکل اکیلا اور اچھوتا اپنا رنگ ڈھنگ اور زور دکھاتا نظر آتا۔ لہسن، پیاز، ہلدی دھنیہ سب جدا جدا اتراتے۔ مجال ہے جو ایک مسالہ بھی اپنی منفرد بو باس یا پھلاند پر دوسرے کے خواص کو حاوی ہونے دے۔ صرف اتنا فرق ہو جاتا کہ اس ظاہری سمجھوتے کی اندرونی پھوٹ اور نااتفاقی کی وجہ سے ہر بدبو زیادہ سے زیادہ ناگوار ہو کر ابھرنے لگتی اور کھانے والا اس نفاق بھری ہانڈی کے نوالے کو سانپ کے منہ کی چھچھوندر کی طرح اپنے جبڑوں میں دبا کر گم صم رہ جاتا۔

محبوب کو بندھے ٹکے سماجی اصولوں اور ضابطوں سے قلبی بغض تھا۔ اس لئے وہ کبھی موسم کی تازہ ترکاری نہیں لاتے تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کے بے موسم کی نایاب ترکاریاں لاتے۔ اگر مٹر کا موسم ہوتا تو وہ سیموں کی تلاش میں سرگرداں پیر پسینہ کر دیتے۔ شلجم کے زمانے میں گوبھی کیلئے سرگرداں رہتے، پالک کے موسم میں خرفہ

تلاش کر کے لاتے اور اگر بہت سی ترکاریوں کا موسم ہو تو وہ مجبور ہو کر دال گوشت پکا لیتے ۔

گھر کی ساس سے محبوب کو جنم جنم کی پرخاش تھی ۔ شاید صدیوں سے ان کے ساتھ پیدا ہو کر وہ ہانڈیوں کے بہلنے ان کا جی جلاتے ، بھونتے اور جھلستے چلے آرہے تھے ۔ بے چاری نے کسی جنم میں کوئی نہایت ڈراؤنا پاپ کیا ہوگا جس کی سزا میں محبوب ان پر عذابِ الٰہی بن کر نازل ہوئے اور شاید بقیٔ دنیا تک یوں ہی نازل ہوتے رہیں گے ۔ اگر اگلے جنم میں انھوں نے بکری کا روپ دھارا تو محبوب قصائی کی چھری کی صورت میں پیدا ہو کر ان کے گلے پر پھیر جائیں گے ۔

مگر وہ جنتی بی بی کی طرح صبر و شکر کے ساتھ محبوب کو جھیلا کرتیں ۔ قسمت کا لکھا سب کو بھوگنا پڑتا ہے ۔ انسان کی مجال نہیں جو سزا اور جزا سے بچ جائے وہی مثل تھی "اسے ٹھور نہیں انھیں اور نہیں" ۔ باورچیوں کی قلت نے محبوب کو رزق کا مالک بنا دیا تھا ۔ کئی بار ان سے بچنے کی کوشش کی گئی دوسرا باورچی آیا ، مگر جلد ہی بھاگ گیا اور رکشہ کھینچنے لگا ۔ یا کسی فیکٹری میں گم ہو گیا ۔ محبوب رکشا کھینچنے میں خود اتنے زیادہ کھینچ جاتے کہ بس ! ماشاء اللہ بھلی بیبیاں جب رکشا میں بیٹھتی تھیں تو ان کے وزن کی کھنچائی کے لئے دو خچروں کے دم والا پہلوان بھی گھٹنے ٹیک دیتا ۔ یہ کام ٹٹوؤں اور بھنبیریوں کے قبیلے کے انسان کی بس کی بات نہیں ۔ چنانچہ جب وقتاً فوقتاً ایک ایک کر کے شہر کی تمام شریف بیویوں کو وہ نالے میں گرا چکے تو رائے عامہ ان کی رکشا بازی کے خلاف ایک زبردست محاذ بنا کر کھڑی ہو گئی ۔ تب قائل ہونا پڑا کہ ڈارون تو نرا خبطی تھا ، اور انسان بندر کے علاوہ بھنگوں اور پتنگوں کی نسل سے ترقی (یا تنزل ؟) کر کے یہاں تک پہنچا ہے ۔

لہٰذا تمام رکشائیں اوندھانے کے بعد وہ پھر باورچی کے پیشے کی طرف لوٹ آئے ۔ جب کبھی انھوں نے کسی اور پیشے پر دستِ شفقت پھیرنا چاہا تو کوئی نہ کوئی قیامت آگئی ۔ انھوں نے پھلوں کی چابڑی لگائی تو ہیضہ ، جو شاید تاک میں بیٹھا تھا ، شہر پر ٹوٹ پڑا اور میونسپلٹی والے محبوب پر ٹوٹ پڑے ۔ انھوں نے ملائی کی برف کا کاروبار شروع کیا تو فوراً کالی کھانسی اور ہچکی کی وبا شہر میں پھیل گئی ۔ لوگ انکی قلفیوں کو دیکھ کر ایسے بدکنے لگے جیسے وہ لذیذ قلفیاں نہیں بم دوت کی بندوق سے نکلی ہوئی گولیاں ہوں ۔ انھوں نے خربوزوں کی فالیز کا ٹھیکہ لیا تو اولے پڑ گئے ۔ سنگھاڑے کی تال پر آس لگائی تو جونکوں کی وبا نے بڑا کر دیا ۔ جو سنگھاڑے وہ بیچتے ان میں سنگھاڑے کم اور جونکیں زیادہ تول دیتے ۔ جب کوئی دھندا بیٹھ جاتا تو وہ سستانے کیلئے پھر باورچی گیری پر لوٹ آتے ۔ اتفاق سے ان کا جب بھی دیوالہ نکلتا ، اللہ ان کا غم غلط کرنے کیلئے انھیں ایک عدد اولاد عطا فرما دیتا ۔ مگر دیوالوں کی رفتار کا نہ تو ان کی بیوی مقابلہ کر سکتی تھیں نہ خدا کی قدرت ۔ بچہ ان پر سال میں ایک ہی نازل ہو سکتا تھا ، جب کہ دیوالہ خدا کے فضل و کرم سے سال میں چھ مرتبہ نکل جاتا تھا

محبوب کا وزن اسّی اور بیاسی پونڈ کے آس پاس رہتا تھا ۔ کبھی تولہ دو تولہ بڑھ جاتا تو کوئی عارضہ انھیں لاحق ہو جاتا اور وزن سیروں گھٹ جاتا بکری جیسی سوکھی ٹانگوں کے باوجود وہ ہمیشہ چست ٹخنوا پاجامہ اور فوجی قطع کی قمیض پہنتے ۔ کیونکہ انھیں ایک دفعہ ڈسپوزل سے فوجی قمیص مل گئی تھیں ، اسکے بعد عید بقرعید پر نئی قمیضیں بھی انھوں نے اسی فیشن کی سلوائیں ۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس قمیض سے ان کی شخصیت ضرورت سے زیادہ مرعوب کن ہو جاتی تھی ۔ تنگ پاجامے کا راز گھر کی ساس نے ایک دن معلوم کر لیا ۔ واضح رہے یہ پاجامہ اوپر سے خلل ڈھیلا ہوتا ، مگر پائنچے وہ اوپر سے سی کر چست کر لیتے ۔ یوں ایک نہایت آرام دہ اسٹور روم تیار ہو جاتا ۔ ساس کا خیال تھا کہ اناج ، سبزی ترکاری سے لے کر گوشت کی بوٹیاں اور سردیوں کے دنوں میں مکھن اور گھی کی ڈلیاں تک اس میں بڑے اطمینان سے اسٹور کی جا سکتی ہیں ۔ کھانے کے سامان اور جنس میں سے جو وہ کمیشن منہا کرتے وہ جمع ہوتا رہتا ۔ اور دوپہر کے کھانے کے بعد اور رات کو تھیلیاں جھاڑ لی جاتیں ۔

کھانے کے سامان میں سے تراش خراش کے جو نایاب نسخے انھیں یاد ہیں اگر وہ کتابی صورت میں جمع کئے جائیں تو ایک شاہکار تیار ہو جائے ۔ جس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا ۔ گھر کی ساس کی سنسر پالیسی جب اتنی سخت نہ تھی تب تو محبوب نہایت غیر شاعرانہ طریقے سے آٹا ، دال اور گھی چرا کر لے جایا کرتے تھے ۔ مگر جب سے ساس نے دال چاول کے دانے گن کر دینے شروع کر دیئے ، محبوب نے بھی مدافعت کا ایک وسیع چارٹ تیار کر لیا مثلاً جب ہر چیز تول کر دینے کے بعد بھی سالن کی صورت پر پھٹکار ہی برستی رہی تو ساس بیچاری باورچی خانے کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گئیں ۔ مگر جب کھانا

نکل کر میز پر آیا تو سب کے پسینے چھوٹ گئے۔ محبوب ضرور کسی جن کو قابو میں کئے ہوئے تھے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آنکھوں کے سامنے گھی ڈالا جائے اور محبوب پر تار نہ نظر آئے۔

بڑے داؤ پیچ کے بعد آخر معمہ حل کر ہی لیا گیا۔ محبوب نے ایک چھوٹی سی پیالی کونے کی ٹھیا میں چھپا دی تھی۔ چمچ چلاتے چلاتے وہ نہایت چابک دستی سے ہر بار تھوڑا سا گھی اس پیالی میں ٹپکا دیتے تھے۔ بڑا صبر آزما کام تھا۔ مگر محبوب کی جدت کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ ترکاری کا بھی انھوں نے انتظام کر لیا چھیلتے وقت آلو کے موٹے موٹے چھلکے اتارتے۔ ذرا سا کترا ہوا آدھا آلو کاٹ کر پھینک دیتے۔ چھلکوں میں دو دو مٹر چپکے چھوڑ دیتے۔ بوٹیاں چونکہ بازار سے آتے ہی چیک کر کے گن لی جاتی تھیں، اس لئے وہ کبھی تو غائب نہ ہوتیں، ہاں ذرا سکڑ کر چھوٹی ہو جاتیں جیسے انھیں کسی نے ذرا ذرا سا کتر کر گول کر دیا ہو۔ گھر والی کوڑے کے ڈبے جھانکتی پھرتیں۔ بوٹیاں حسرت سے ٹٹولتیں۔ ان کی نقاہت پر ان کا خون خشک ہونے لگتا۔ ترکاری کے موٹے موٹے چھلکوں کے غم میں سوکھتی جاتیں۔ گھر جاتے وقت محبوب کوڑے کے ڈبے میں سے ترکاری کے چھلکے وغیرہ پوٹلی میں بھر کے لے جاتے۔

محبوب کی آنکھ چیچک میں کچھ اس بھونڈے پن سے بیٹھی تھی کہ اس میں شیشے کی آنکھ اٹکانا بہت مشکل تھا۔ کوئی آنکھ فٹ ہی نہیں بیٹھتی تھی۔ پہلے آنکھ کچھ ڈھیلی تھی، کہیں گر پڑی۔ کچھ دن یونہی آنکھ میچاتے گھومتے رہے، اس کے بعد جو عیدی کی بخشش جمع کر کے آنکھ لائے تو اتنی بڑی کہ پپوٹے تن گئے۔ باہر کو ابلی پڑتی تھی اور سوتے میں بھی سائیکلوپ کی آنکھ کی طرح کھلی رہتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ نیلے رنگ کی تھی جب کہ ان کی اصلی آنکھ چندھی کیچڑ کے رنگ کی تھی۔

"بی سرکار بہت سستی مل گئی۔" اگر سستی مل گئی تو پھر تو اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ گو اس آنکھ کو لگانے کے بعد وہ کافی سے زیادہ بھیانک لگنے لگے۔ لوگوں کے خیال میں وہ جادو کی آنکھ تھی۔ کیونکہ اسے لگانے کے بعد وہ بالکل ہی قزاق بن کر لوٹنے لگے۔ گو وہ سراسر قسمیں کھاتے تھے کہ ایک چیز بھی چرائی ہو تو کفن کو ترسیں۔ ظاہر ہے ترکاریاں اور گھی کسی شریف آدمی کے کفن کو نہیں لگ سکتا۔ لہٰذا ان کی قسموں سے ان کی ایمانداری کو سہارا نہ ملا۔ ویسے خدا کی قسم پر لوگ اس زمانے میں بھروسہ بھی نہیں کرتے۔ اس لئے آپا انھیں بچوں کی قسمیں کھلاتیں۔

"منے کی قسم" : وہ پیٹ سے منے کی قسم کھا جاتے۔

"واہ واہ منے کی قسم کھا رہا ہے۔ سرور کی قسم کھا" : آپا چکروں میں آنے والی آسامی نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ منا پیدائشی ٹنجا ہے۔ پسلی سا پیٹ، دستوں کا منبع، ڈیڑھ آدمی کی خوراک پھونک دیتا ہے۔ مرنے کا قطعی ارادہ نہیں رکھتا۔ خواہ کتنی بھی جھوٹی کوئی قسمیں کھا لے، وہ ڈٹا رہے گا۔ ڈاکٹروں نے جو علاج بتائے وہ اگر محبوب کی سات پشتیں بھی زندہ ہو کر زور لگائیں تو نہیں ہو سکتا۔ سب کو معلوم ہے وہ کبھی اٹھ کر نہیں بھاگے گا، کبھی کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس کی زندگی ایک بے معنی نقطہ، جس کے آگے پیچھے کوئی پر معنی جملہ نہیں۔ اور محبوب بڑی فراخ دلی سے اس کی جھوٹی قسمیں کھا سکتا تھا۔

مگر سرور جو نویں جماعت میں پڑھتا ہے، جس کے انگریزی فیشن کے بال تھے اور نیکر پہنتا تھا، خاندان میں ولی عہد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی جھوٹی قسم بھی دلاؤ تو محبوب کی اکلوتی آنکھ میں خون اتر آتا۔ پھر اس کی گونگی آنکھ بھی سسکیاں بھرنے لگتی۔ اور وہ نوکری چھوڑنے پر تیار ہو جاتا۔ سرور ہی کی خاطر وہ چوڑی دار لکھنوا پاجامہ پہنتا اور کوئلے کی ٹنکی میں گھی کی کٹوری چھپاتا۔

ایک آنکھ سے محروم ہونے کے علاوہ محبوب کچھ اونچا بھی سنتے تھے۔ ایک دن باہر سے آکر میں نے پوچھا "محبوب! ڈاکٹر گھوش آئے تھے؟"

"جی ہاں سرکار!" انھوں نے دال بگھارتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"جی سرکار اردی!"

"کیا؟"

"جی ہاں تل کر ڈالی ہیں"

"اے کم بخت کیا بک رہا ہے؟ میں پوچھ رہی ہوں موئی گوشت کو اور تو انڈیاں تل رہا ہے۔"

"اے سرکار، میں سمجھا گوشت کو پوچھ رہی ہیں"

مگر میری آپا کہتی تھیں وہ بنتا ہے۔ وہ تو اس کے کانے پن کو بھی بناوٹ کہہ دیتیں۔ اگر اس کی نیلی آنکھ ایک مرتبہ باورچی خانے کی نالی میں پڑی نہ ملتی۔ اس دن سے آپا نے اس نیلی آنکھ کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔ "یہ آنکھ یقیناً کسی کانے انگریز کے لئے بنی ہوگی، اس لئے ان کا خیال تھا کہ اس کو لگانے کے بعد محبوب بالکل برٹش شاہی زمانے کا لاٹ صاحب بن جاتا، اور باورچی خانے کو نوآبادیات کی طرح لوٹنے لگتا۔ روٹیاں قحط زدہ مخلوق کی طرح دہاں پان ہونے لگتیں، بوٹیوں کو سوکھے کا آزار ہو جاتا اور شوربے کا حال پتلا پڑ جاتا۔ یہی نہیں وہ برٹش پالیسی کو مکمل طور پہ کامیاب بنانے کیلئے ساس بہو میں پھوٹ ڈلوا کر اپنی چاندی بھی کر لیتا۔

"بڑی بیگم صاحب گوشت میں کیا پڑے گا؟" وہ ساس سے پوچھتا۔

"میتھی پالک۔ اور ہاں ہری مرچیں بیچ میں سے چیر کے ڈالنا۔ ہمیشہ کی طرح بند نہ ڈال دینا موئی نرو ٹھا سی ہو جاتی ہیں" ساس جواب دیتیں۔

پھر وہ احتیاطاً بہو سے پوچھتا۔ "دلہن بی گوشت میں کیا پڑے گا؟"

"ٹماٹر۔ اور دیکھو ہری مرچیں نہ جھونک دینا، صاحب کو نفرت ہے" بہو حکم دیتیں۔

وہ ساس بہو کی مختلف پسند کے چکر میں پڑ کر کدو گوشت پکا کر اس میں کھڑی مرچیں ڈال لیتا۔ ظاہر ہے کدو دیکھ کر پورا گھر بھڑکنے لگتا۔ محبوب کی پکار پڑتی اور وہ قطعی بت کافر بنا ہوا حاضر ہوتا۔

"کیوں رے کم بخت پالک میتھی کے بجائے یہ اپنا سر ڈال دیا گوشت میں!" ساس چلاتیں۔

"سرکار دلہن بی نے کہا تھا ٹماٹر ڈالیو"

"تو پھر ٹماٹر کیوں نہیں ڈالے؟" بہو پوچھتی۔

"حضور بڑی بیگم نے کہا تھا پالک میتھی پڑے گا"

"تو پالک میتھی کیوں نہیں ڈالا مردے" ساس پوچھتیں۔

"اب سرکار میری تو بڑی مصیبت ہے۔ میتھی پالک ڈالتا تو بہو بیگم چیختیں اور ٹماٹر ڈالتا تو بڑی بیگم چلاتیں۔ آپ ہی بتلایئے کس کا حکم مانوں" وہ چڑھ کر جواب دیتا۔

"اس لئے تم نے کدو ڈال دیا" صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔

"جی سرکار اور کیا کرتا۔ ویسے کدو ٹھنڈا ہوتا ہے دماغ کو تراوٹ پہنچاتا ہے"

تب سارا گھر کدو کی طرح سرد پڑ جاتا۔ محبوب کو معلوم تھا کہ کدو کوئی نہیں کھائے گا۔ وہ نہایت اطمینان سے بھر کٹورا سالن گھر لے جاتا۔ اس وقت بے اختیار سب کے مونہہ سے نکل جاتا۔

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ

میری چھٹیوں میں گئی تو گھر میں ایک قیامت بھی ہوئی تھی۔ چھوٹی باجی اپنے ساتھ لکھنؤ سے کوئی چودہ پندرہ برس کی لونڈیا لے کے آئی تھیں۔ بس پٹاخہ تھی لونڈیا۔ دن بھر ہلو ہلو کرتی پھرتی۔ نہ جانے کیا جوڑ توڑ کے محبوب نے کر پیر بھاری ہو گیا۔ چھوٹی باجی تو بھو کا ڈنک چھوڑ سسرال بھاگیں۔

اور لوگوں کی سٹیاں گم ہو گئیں۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ کیا کیا جائے۔ ایک دن شام کو گھر لوٹی تو محبوب نے چائے کی ٹرے سامنے رکھ دی پھر نہایت شرماتے مسکراتے ہوئے انداز میں تیل کی بساندی جلیبیوں کی پلیٹ سرکا دی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جب بھی محبوب کی بیوی کی آبادی میں اضافہ کرتی مجھے خفقان ہونے لگتا۔

"لڑکا یا لڑکی؟" میں نے بکس کر پوچھا۔

محبوب چھوئی موئی کی طرح ڈھلک گئے۔

"اے ہے بولتا کیوں نہیں؟ چیز ُقتاتی"

"میں نے ظہورن سے نکاح پڑھوا لیا"

"ایں؟" میں ایسے اچھلی کہ چائے کی پیالی لڑکھڑا کے رہ گئی۔

"تو کیا کرتا سرکار؟" محبوب نے دانت نکوسے اور میرے کلیجے کو احمق کی بڑ سمجھ کر ٹال گئے۔ ایک دق کی ماری منحوس بیوی تو سنبھالی نہیں جاتی مردے سے۔ ایک اور کرلی اور وہ بھی بھری نالی کی بند دق سے۔ یا خدا اب یہ ڈبل رفتار سے دھرتی کا بوجھ بڑھانے پر تل جائے گا۔ رحم کر خدایا۔

کئی سال میرا جانا اُدھر نہ ہو سکا۔ یونہی اڑتی ہوئی خبر سنی کہ محبوب کی پہلی بیوی مر گئی۔ بچے مسجد کے سامنے بھیک مانگتے ہیں۔ ترو بیٹی بھاگ گیا۔ پھر سنا کہ محبوب بھی بمبئی آ گئے ہیں۔ کسی فلم کے دفتر میں چپراسی ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک دن فیس میں ملے۔ کہنے لگے گھاٹ کوپر میں ایک کھولی مل گئی ہے۔ سرور آوارہ نکل گیا۔ منا ماں کے ساتھ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظہورن حرافہ کسی کرم کی نہیں۔ وہی چست پاجامہ پہنے ہوئے تھے، ملٹری نامیشن پر بھوری گاندھی کیپ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دو سال بعد ملے تو ایک دوسری چھوٹی سی کمپنی میں کچھ پروڈکشن منیجر کے عہدے پر مامور نظر آئے انداز بھی بدلے ہوئے تھے۔ دو سال پہلے چھی بی بی کہتے تھے اب آپا جی کہنے لگے۔

ابھی پچھلے اتوار کو محبوب پھر مل گئے۔ میں تو پہچان بھی نہ سکی، چست پاجامہ تو وہی تھا مگر اس پر نہایت بیل اچکن ڈانٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پانچ سو پچپن کا ڈبہ تھا۔ آنکھ کے بھینگے پن کو کالا چشمہ ڈھکے ہوئے تھا۔ "بے بی کو کام مل گیا ہے" انھوں نے کھیسیں نکال کر پاس کھڑی ہوئی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

اور میری اکل قلابازی کھا گئی۔ وہ بھی ذرا دیر کو ایسے بوکھلا گئے جیسے میں نے انھیں تھیلے میں گوشت کی بوٹی چھپاتے پکڑ لیا ہو۔

"ظہورن!" میرے ذہن میں چھلاوہ کی شکل کوند گئی۔ محبوب میاں سنبھل کر بولے "نمستے کرو آپا جی کو موہنی بالا"

وہ سوکھی سی ظہورن!

ان دنوں موہنی بالا ہماری فلم میں سائڈ ہیروئن کا کام کر رہی ہے۔ عام فلمی ہیروئن کی طرح اس پر چربی کی تہیں چڑھ گئی ہیں۔ شام کو لمبی موٹر میں جین اور بش شرٹ پہنے، کالا چشمہ لگائے نکلتی ہے تو لوگ موٹر کے سامنے آ جاتے ہیں۔ محبوب میاں کو وہ انکل کہتی ہے۔

اور جب محبوب میاں بے بی کے سیٹ پر آ جاتے ہیں تو سارا عملہ سروقد کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر ان کے جاتے ہی لوگ پھٹ پڑتے ہیں "بڑا بدمعاش ہے۔ تین چوتھائی بلیک لیتا ہے۔ الٹک بیٹھک الگ کرواتا ہے" پروڈیوسر کہتے ہیں۔

بچے شاندار اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ سرور موٹا دنبہ ہو گیا ہے۔ موٹر دوڑاتا پھرتا ہے اور ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتا ہے۔ دو فلیٹ باندرہ میں ہیں۔ ایک پیڈر روڈ پر۔ تھانے کے پاس زمین لے کر فلم اسٹوڈیو بنانے کا ارادہ ہے۔

مگر میں جب بے بی کا بلیک کا روپیہ انھیں چوری چھپے دینے جاتی ہوں تو بے اختیار نگاہیں ان کے چست پاجامہ پر جم جاتی ہیں۔

یقیناً اب وہاں آٹے دال اور ترکاری کے چھلکوں کے بجائے کڑکڑاتے نوٹ بھرے ہوں گے۔

کراچی
نیا دور

راجندر سنگھ بیدی

گفتگو بمبئی

جنازہ کہاں ہے

کہیں سے سسکیوں آواز آرہی ہے کہیں کوئی رو رہا ہے اور میں گھبرا کر جاگ اٹھتا ہوں۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے ہیں۔ نہیں تو۔ میرا لڑکا تو سو رہا ہے شاید۔ میں اس کے بیڈ روم میں جاکر اپنا کان اس کے منہ کے پاس لے جاتا ہوں۔ وہ سو رہا ہے مزے کی نیند۔ پھر یہ کس کے رونے، کس کے سسکیاں لینے کی آواز ہے؟ ایسی ہی ایک آواز بلکہ آوازیں میں نے برسوں پہلے سنی تھیں۔ وہ دن وہ قہر کا عالم، آپ کو بھی یاد ہوگا۔ جب دن کو سورج ڈوبا تھا اور ہر چار سو ہائے ہائے کی آوازیں سنائی دی تھیں، جب گاندھی جی کا قتل ہوا تھا یہ آواز۔ کہیں خفتی، میری بیوی کی تو نہیں؟ نہیں، اس کی آواز کیسے ہو سکتی ہے یہ؟ وہ تو یہاں بمبئی سے ہزاروں میل دور پنجاب کے کسی گاؤں میں بیٹھی ہے۔ اپنے بھائی کے پاس۔ ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ اسی کی آواز ہو۔ جو زمان و مکان کی وسعتوں کو چیرتی پھاڑتی ہوئی میری سماعت میں چلی آئی ہو، کیونکہ میں نے قریب قریب اسے چھوڑ رکھا ہے۔ میں کیا کرتا؟ وہ بہت زیادہ بکواس کرنے لگی تھی اور سوال سے پہلے ہی جواب دینے لگی تھی اس لئے میں نے اس کا نام خفتی رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ دلاری ہے، ایک سیدھی سادی گھریلو عورت۔ لیکن کیا آج کی عورت کے لئے صرف گھریلو ہونا کافی ہے؟

گھریلو عورت: گھریلو عورت وہی ہوتی ہے نا جو گھر ہی میں رہے میاں کے لئے روٹی پکائے۔ سفر سے اس کی واپسی پہ اس کے ہونٹ کے تبسم کو لے اس کا بستر بچھائے اور اشارہ پاتے ہی اس پہ چلی آئے۔ نتیجہ؟ ۔ بچے، پھر اور بچے۔ لیکن باہر کی ہوا اسے نہ لگنے پائے جس سے پھپھوندی لگ جائے۔ جب اسے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تو کیا وہ دیواروں سے لڑے گی۔ دیواروں سے ٹکرائے گی؟ کچھ دن بعد یوں معلوم ہوگا۔ جیسے آپ نے عورت سمجھ کے شادی کی تھی وہ پھپھوند نکلی۔ آج کی بیوی۔ جانے کیا ڈر بیٹھ گیا ہے اس کے دل میں کہ وہ دنیا کی ہر گلی بات کے لئے خود کو دوشی سمجھنے لگی ہے، ورنہ ہر بات میں وہ یوں مداخلت پر اتر آئے؟ اور اب جب کہ عاجز آکر میں نے اس سے کنارہ کشی کر لی ہے تو وہ گاؤں میں بیٹھ کر اپنی یا میری جان کو رو رہی ہے کیوں نہ روئے؟ ہم مرد بھی تو ہر بار کسی تازہ عورت کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ تازہ۔ جیسے وہ عورت نہیں سبزی ہے۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ شاید اس لئے کہ بچپن ہی سے ہم نے تجرد پر پڑھ رکھا ہے اور جب شادی ہوئی تو بیوی کے ساتھ پیار کرنے پر کانپتے ہیں۔ خیر میں بھی اس عورت کے ساتھ واس رچا کر اس کے بارے میں اپنے سے سوال کرتا ہوں۔ کیا یہ بیوی کے فرائض انجام دے سکتی ہے؟ تو اندر سے ایک مسکت جواب ملتا ہے نہیں۔ تو پھر؟ اگر میری بیوی کو اتنا ہی دکھ ہے تو وہ مجھے لکھتی نہیں؟ شاید وہ دنیا کی ہر بیوی کی طرح سمجھتی ہے کہ ایک دن میں جھک مار کے لوٹوں گا اور اس کے پاؤں پکڑ لوں گا اور اسے منا کے لے جاؤں گا۔ عجیب بھونڈا اعتماد ہے اسے میری محبت پہ۔ جیسے اس دنیا میں نر کی کلب ہے نہ

سیما تماشے، نہ ہوٹل، نہ قہوہ خانہ، نہیں شاید مجھ سے غلامی پاکر نہ خوش ہو بہتی ہو، ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے نہیں، اسی نے مجھے چھوڑ دیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا روٹھنا دھونا میرا وہم ہو اور یا پھر خواہش ہو میری ہی۔

ارے کہیں میں خود تو نہیں رو رہا ؟ یہ جنھیں میں سانس سمجھ رہا ہوں، کہیں میری اپنی ہی سسکیاں تو نہیں ؟ شاید۔ کیا بیہودگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے میں خبط الحواسی کا مریض ہو گیا ہوں۔

عجیب جذبے ہیں، عجیب خواہشیں اور ان سے زیادہ عجیب ڈر۔ مثلاً کل ہی شام ہم نے چند البیلوں کے ساتھ کوکا دا چینی ریستوران میں کھانا کھایا۔ ہم اپنے سٹلمنٹ آفس کے کچھ دوست، پرتگیزی چرچ کے سامنے تلے، ایک مرٹی گوانی عورت کے گھر میں ملے جو چودری کی شراب بیچتی تھی اس نے ہمیں تیز سیرا پلائی اور میرے دوست نند لال کے ہاتھ کچھ اسمگل کی ہوئی گھڑیاں بیچ دیں۔ میں نے صرف ایک سگریٹ لائٹر خریدا وہ تو نند لال کو ایسا سونا بھی بیچ دیتی۔ مگر اس غریب کے پاس صرف پانچ سو روپے تھے جو آج دفتر میں ایک ریفیوجی بڑھیا کا کیس "ٹھیک" کرنے کے سلسلے میں اس نے اینٹھے تھے۔ بہرحال سیرا سے دھت ہو کر ہم نے لیے ایک گجراتی دوست سے کار مانگی جو اس نے کسی سفارت خانے کی معرفت امپورٹ کی تھی۔ اگر وہ کسی کے نام پر گاڑی خرید سکتا تھا، تو کیا ہم اس کے نام پہ اسے چلا بھی نہ سکتے تھے ؟ چنانچہ ہم سب بے کار دوست اس گجراتی کی چمکیلی گاڑی میں بیٹھ کر چلے۔ راستے بھر ہمیں ایک پل کے لئے بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ گاڑی ہماری اپنی نہیں ہے۔ کوکا دا پہنچے تو اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بیرے نے مجھے سلام کیا، جس سے ایک عجیب سی گدگدی میرے اندر پیدا ہوئی۔ کیونکہ میں سلام لینے کا نہیں دینے کا عادی تھا کھانے میں ہم نے شارک فن ملے ہوئے کیکڑے کا سوپ پیا، جس سے مردمی بڑھتی ہے پھر بھنے ہوئے چاولوں کے ساتھ ہم نے کھٹی میٹھی جھینگا مچھلی کھائی اور دوسرا بہت کچھ الم غلم۔ اس پہ نند لال نے نوڈل کا آرڈر دے دیا۔ ہم سب کا پیٹ چھٹ رہا تھا، اس پہ بھی اس نے نوڈل کیوں منگوا لیے؟ اب ہمارے سامنے وہ نوڈل بے شمار کیچوؤں کی طرح پڑے تھے اور ہم انھیں کھا نہ سکتے تھے۔ لیکن نند لال کو ایک عجیب طرح کی تسلی تھی۔ یہ گھر پہنچ کر ہماری سمجھ میں آیا کہ ہم نے اس قدر پیٹ کیوں ٹھونسا ؟ اتنا جھوٹا کیوں چھوڑا۔؟ بات یہ تھی، صبح میں نے نند لال نے اور دوسرے سب دوستوں نے بہار میں اور یوپی کے کچھ ضلعوں میں سوکھے کی خبریں پڑھی تھیں اور وہ تصویر بھی دیکھی تھی جس میں ایک ڈھانچہ سا لڑکا کھڑا تھا اور کسی پیڑ کی چھال کھا رہا تھا۔ اسی بھوک کے خیال نے شاید ہمارے دماغ میں کوئی اونٹ کا سا کوہان پیدا کر دیا، جسے ہم نے ہفتوں کے کھانے سے بھر لیا۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟ کیوں ہو رہا ہے ؟ خفتی جانے سے دو دن پہلے مجھ سے لڑی تھی۔ ہمارا جس بات پہ جھگڑا ہوا وہ ایک نہایت فضول سی چیز تھی۔ مٹی کا تیل، جو گھر میں چولھا جلانے یا خودکشی کے کام آتا ہے خفتی کہے جا رہی تھی۔ تیل کی ایک بوند نہیں ہے۔ پھر مجھے مت کہنا۔ کھانا نہیں پکایا۔ میں نے کہا، میں نہیں کہوں گا۔ بھوکا مروں گا پر تمھیں نہیں کہوں گا۔ مجھ سے تیل کے کیو میں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ میں دراصل عورت کے اس جذبے سے فائدہ اٹھا رہا تھا جس سے وہ مرد کو کبھی بھوکا نہیں دیکھ سکتی وہ لڑے گی جھگڑے گی۔ گالیاں دے گی لیکن پھر کہیں سے بھی بندوبست کر کے آپ کا پیٹ بھرے گی، پھر دہی کرے گی۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں مرد جب بچہ ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو اس کے لئے روٹیاں پکاتی ہے اس کی ہر بھوک کا سامان کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کسی کے گھر میں جائیں تو یہ عورت ہی ہے جو سب سے پہلے پوچھے گی۔ آپ کیا کھائیں گے ؟ کیا پئیں گے ؟ بعض وقت تو پوچھے گی بھی نہیں اور گھر میں جو سب سے اچھی چیز بنی ہے آپ کے سامنے رکھے گی آپ یہ نہ سمجھئے کہ وہ آپ پر کوئی احسان کر رہی ہے۔ کھا کر اپنی بھوک مٹا کر الٹا آپ اس پہ احسان کر رہے ہیں۔

چنانچہ اس دن میں مٹی کا تیل نہیں لایا۔ لیکن گھر لوٹا تو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ صبح جب میں دفتر جانے کے لئے نکلا تو میرے ہاتھ میں اخبار تھا جسے میں آج کل کے حالات جاننے کے لئے کم اور اجابت کے لئے زیادہ استعمال کرتا ہوں۔ ہاں، اخبار ساتھ لے جائے بغیر

مجھے ٹھیک سے یاد معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس دن کے اخبار میں سیاسی خبروں کے ساتھ معمول کے قتل، دھوکا دہی اور ریل کے ایکسیڈنٹ وغیرہ کی خبریں چھپی تھیں۔ ریل کے ایکسیڈنٹ تو خیر ریل کام گاروں، سیاسی پارٹیوں کے ڈسپلن کی وجہ سے روز ہوتے ہیں مگر ایک بات جو مجھے خدائی قہر سے بھی زیادہ لگی، وہ بمبئی میں پانی کا قحط تھی۔

پانی کا قحط؟ جی ہاں، یہ بیسویں صدی کے ہندوستان کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، ورنہ ہم نے اپنی تاریخ میں ابھی پلے کے قحط تک ہی ترقی کی تھی بمبئی کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر اور یہاں پانی کا کال، ہمیں نیتا عورث کے اس آدمی کی یاد دلاتا ہے۔ جو نیچے ہونٹ تک پانی میں ڈوبا ہوا ہے لیکن جب پینے کے لئے اپنا منھ نیچے کرتا ہے تو ساتھ ہی پانی کی سطح بھی نیچی ہو جاتی ہے اور وہ پانی میں پیاسا مر جاتا ہے ایک ہی دن پہلے میں نے خفتی کو بتایا کہ کچھ دلشیں بھگت بمبئی سے اتری لوگوں کو پانی نہ ہونے کی وجہ سے نکال رہے ہیں تو وہ مجھ پہ برس پڑی، جیسے میرا قصور تھا اس میں پھر وہ اپنے آپ کو خود گالیاں دینے لگی۔ جیسے میں نے اس پر کوئی بہت بڑا الزام لگا دیا۔ اس میں الزام کی کیا بات تھی؟ زندگی خود ایک الزام ہے بھائی۔ ایک بہت بڑی تہمت جو مرد پہ کم اور عورت پہ کچھ زیادہ ہی لگائی گئی ہے پھر اتنے بڑے ملک، اس کے اتنے بڑے کلچر فلسفے، پرانی تاریخ کا وارث ہونا ہے تو یہ قیمت تو دینا ہی پڑے گی۔ نہیں دینا تو جائیے امریکہ، جہاں کی اصلی تاریخ ہی تین سو سال پرانی ہے کیسے وہ پاگل کی طرح دوڑتے ہیں۔ مادی ترقی کی پریڈ گراؤنڈ پہ۔ آخر روحانی ترقی بھی تو کوئی چیز ہے۔

ہم جائیں گے تو کہاں جائیں گے؟ — خفتی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ انیس برس ہوئے ہم خوشاب، پنجاب سے نکلے، اپنے پتروں کی مرجاوا، ان کی سیپتی چھوڑ کر، راستے میں مرے کٹے، کنوئیں ہماری لاشوں سے پٹے، پر چلتے رہے۔ نظر ایک ہی طرف تھی کہ بھارت کی شش شاملا، اس کی ہری بھری گود میں جائیں گے تو سب دکھ دلدر دور ہو جائیں گے۔ یہاں آئے تو صرف جوتے کھائے۔ بھگوڑے کہلائے، کچھ کھانے کو نہیں، ہر چیز کو آگ لگی ہے آج ایک چیز کے دام پندرہ پیسے ہیں تو دس ہی دن میں پچاس پیسے ہو جاتے ہیں۔ چادر چھوٹی مانس لمبا۔ آدھا ڈھانپے پر بھی پورا ننگا۔ تم ہی مجھے یہاں لے آئے۔ بمبئی میں بزنس بہت ہے اب کر دبزنس۔ میں تو ہوں ہی سبھاگوں جلی، جو ایک تمہارے ساتھ چلی، دوجے اس سر کے دیس میں باسا کیا۔ اپنی ناک تو کٹے ہی کٹے۔ ہم نے یہاں آٹا پیسہ لگایا، کھون پسینہ بہایا اور کھار کی سی کھاڑی، کھاسی جمین، کولابہ کی آنار کلی بنا دیا۔ اور اب ادھر کے گھاٹی لوگ بولتے ہیں۔ مومبئی کنّے چی؟ ہم چی۔ تم پنجابی، سندھی لوگ جاؤ۔ اب ہم کدھر جائیں، بولو؟ اپنا بھارت دیس کدھر ہے بولو جی۔؟

میں کیا بولتا؟ بنگال بنگالیوں کا، گجرات گجراتیوں کا، دکن دکھنیوں کا، ہمارا تو کچھ بھی نہیں۔ ہم تو تیرتی ہوئی آبادی کہلانے لگے، کچھ دیر بعد اڑتی ہوئی کہلائیں گے۔ میں اخبار ہاتھ میں لئے دفتر جانے کے لئے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں باہر چالی کے میدان میں نل خون کے آنسو رو رہا ہے مٹی میں ملا ہوا ایک قطرہ ٹپکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہیں مٹی کا تیل ہی نہ ہو۔ لیکن نہیں وہ پانی ہے نل اپنی سانس روک کر سوں سوں کرنے لگتا ہے۔ اس کے نیچے لوٹش کمپنی کا ایک خالی ٹین رکھا ہوا ہے اور اس کے بعد لائن میں کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ مٹکے۔ بالٹیاں، مٹکیاں پڑی ہیں اور کچھ نہیں تو پتھر پڑے ہیں۔ جو کسی کی باری کی نشانی ہیں ان کے مالک یا مالکن آئیں گی تو برتن کے آگے پیچھے ہو جانے سے ایک دوسرے کے بال نوچیں گی لڑتی ہوئی چھچھوندریں معلوم ہونگی۔ خفتیاں سب کی سب۔

اس سنسار کا سارا سوندریہ انسان کے کارن ہے اور جب انسان نہ ہو تو اس کی چیزیں کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہیں آپ نے کسی مرنے والے کی پشواز دیکھی ہے؟ میں نے دیکھی ہے۔ یہ ہندو مسلم فسادات کے بعد کی بات ہے۔ میں ان دنوں جموں میں تھا اور ایسے ہی چلتے ہوئے توی دریا کے کنارے جا نکلا۔ وہاں ریتے میں ایک ڈھانچہ پڑا تھا جس کا … گوشت نہ تھا اور کچھ باہر۔ ڈھانچہ دیکھنے سے کیا پتہ چلتا ہے کہ وہ مرد کا ہے یا عورت کا۔ ایک عام آدمی کو پلوس ر … سے اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن صاحب اس ڈھانچے کی ٹانگوں کے ساتھ لپشواز

کے چیتھڑے چپکے ہوئے تھے اور ایک بازو کی ہڈی پہ چوڑیاں تھیں جو آب دھوا اور باد و باراں سے کالی پڑ چکی تھیں۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا جیسا کہ میں حقیقت کو دیکھ کر ہمیشہ کرتا ہوں۔ لیکن بھارت دیش ہی اتنا بڑا ہے کہ جہاں سے بھاگیں وہ بھارت اور جہاں پہنچیں وہ بھی بھارت اور پھر بھارت کہیں نہیں۔ ہاں، تو میں اِن برتنوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہ برتن موجود اور برتن والیاں غائب۔ اِن میں پانی شاید دو بجے چھوٹتا تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب منظر انگڑائیاں لے کر جاگے گا۔ اور پھر لوپر ہو جانے کے جھگڑے ہوں گے، مار پٹائی ہوگی اور پھر لکے کہیں خون پانی ہوگا۔ جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ کیونکہ اس مردہ ہول سے وہ زندہ ہول اچھا۔ وہ خالی برتن جن کے منہ کھلے تھے اور کنارے تڑے مڑے، ٹوٹے ہوئے، جیسے محبت کی پے در پے ضربوں سے کسی چھنال کے ہونٹ۔ میں اخبار ہاتھ میں لئے وہاں سے بھی بھاگ نکلا

بس کا کیو خاصا لمبا تھا اور دفتر سے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ اس پر بھی کیو میں لگے بغیر چارہ نہ تھا۔ ڈر کے کارن وہ کیو مجھے ایک بہت بڑا اژدہا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں ڈر اور اژدہے میں کیا فرق ہے؟ انسان کے من میں دونوں چیزیں ہیں۔ ڈر اور امید۔ اندھیرا اور روشنی۔ اسی لئے ڈر کی صورت ہمارے مذہبی پیشواؤں نے اژدہے کی بنائی ہے، جو منہ پھاڑے، دانت نکالے اپنے چار پاؤں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہم پہ رینگ آتا ہے۔ کیونکہ ہم گناہ گار ہیں۔ زندگی کے گناہ سے آلودہ اگر ہم اژدہے کے کھلے ہوئے منہ، اس کے بڑے بڑے دانتوں اور آگ برساتی ہوئی آنکھوں سے بچ بھی جائیں تو اس کی دم کی مار سے کہاں بچ سکتے ہیں جو کوریا سے لے کر چین، جاپان اور بیچ میں ہندوستان سے لے کر لنکا تک پھیلی ہوئی ہے لیکن یہ کیو ایک عجیب اجگر تھا جو سرکتا ہی نہ تھا اور ہم جہاں کے تہاں کھڑے تھے معلوم ہوتا تھا حالات کی جادوگری نے انسان کو کمبھ بنا دیا اور دیوار پہ لگا دیا۔ پھر کیو تھوڑا سا ہلا جیسے مرے ہوئے سانپ کی دم ایکا ایکی کسی بدنی اضطرار سے اپنے آپ ہل جاتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ ساکت ہو گیا۔ کیونکہ بس نہیں آئی تھی ایسے میں اخبار کا وہ حصہ بہت کام آتا ہے جس میں کوئی اسکینڈل چھپی ہوتی ہے اور ایک ادیب کی تحریر کے ساتھ تقریباً ننگی لڑکی کی تصویر۔ میں اس ننگی لڑکی میں اتنا غرق ہو گیا کہ کوئی ہوش ہی نہ رہا جبھی سامنے سے آواز آئی۔

"ٹین کہاں ہے؟"

"ایں ۔۔۔؟" میں نے اخبار سے سر اٹھایا۔ "ٹین؟"

"ہاں ہاں ۔۔۔ ٹین، کنستر، کنستر۔"

جبھی مجھے پتہ چلا کہ میں مٹی کے تیل والے کیو میں لگ گیا ہوں۔ شاغفتی کی بات میرے دماغ کے کسی کونے میں رہ گئی۔ جیسے کوئی معروف شاعر کے دماغ میں رہ جاتا ہے جبھی میرے ساتھ والے نے مجھ سے کیوں پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟ جی ہاں، جی نہیں ۔۔۔" میں نے جواب دیا "میں صرف شدہ ہوں اور پھر دکاندار سے کچھ ایسی ہی مہمل بکتے ہوئے میں وہاں سے بھاگا اور بس کے کیو میں جا لگا جو تیل کی دکان کے برابر تھا

دفتر سے اور بھی دیر ہو جانے کی وجہ سے اب مجھ سے اخبار بھی نہ اٹھایا جا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر پھر اس کے آخری صفحے پہ ڈالنے کی کوشش کی۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا، انہی چند لمحوں کے بیچ کسی نے اس ننگی لڑکی کو کپڑے پہنا دیئے ہیں اور تصویر کے ساتھ چھپی ہوئی ادبی تحریر فحش معلوم ہو رہی ہے۔

میری پریشانی، میری حیرانی تو تھمتی ہی نہیں۔ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کہا بھی تو صرف اتنا سا۔ "گمن سنگھ آج تم پھر لیٹ آئے!"

"ایسے ہی، اسرانی صاحب ۔۔۔" میں نے فکر سے معذرت کرتے ہوئے کہا "بات یہ ہے کہ آج میں غلطی سے کیو میں لگ گیا ہی اور" ساتھ ہی میں دل میں سوچ رہا تھا کہ دو بار نفی کا استعمال مثبت ہو جاتا ہے۔!

"ہو جاتا ہے ۔۔" اسرانی نے کہا۔ "کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

"کیا ایسا ہو جاتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی۔ زندگی میں آدمی کبھی غلط کیو میں بھی لگ جاتا ہے۔" اور پھر اسرانی اپنے آپ کو کسی فائل میں ڈبو دیا اور میں اپنے ٹیبل پر لوٹ آیا کسی بیوہ کا کیس تھا جسے ڈھونڈنے کے لئے میں نے پرانے ریکارڈوں کی سب خاک اپنے سر پر ڈال لی تھی بات یہ ہے کہ لنک فائلیں نہیں مل رہی تھیں۔ بیوہ کے کئی دیور جیٹھ تھے جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے ایک لینس ڈون کی چھاؤنی میں ٹھیکہ دار تھا دوسرا لنگ میں کہیں سرٹیک رہا تھا اور ایک تو ہانڈلی میں تھا پھر ایسے ہی کئی بہنیں تھیں، جن میں سے ایک نے تیسرا شوہر کر لیا تھا اور تینوں میں سے دو دو تین تین بچے تھے، شاید چار بھی ہوں۔

مجھے اپنا آپ ایک ہاتھی لگا جو پہلے تو سونڈ سے سب مٹی، سب کوڑا کرکٹ اپنے بدن پر پھینک لیتا ہے اور ارنف ارنف کرتا ہوا پانی میں چلا جاتا ہے اور پھر ویسے ہی سونڈ کی مدد سے پانی کے فوارے کو اپنے بدن پر چھوڑنے لگتا ہے بیوہ کی مدد تو میرے لئے گنگا اشنان سے بھی زیادہ تھی، چنانچہ میں نے سب لنک فائلیں جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ نکالیں۔ کیس کے باقی کو بڑے سیدھے کئے اور اس کا کلیم خود جا کر کمشنر صاحب پاس کروا دیا۔ لیکن وہ بیوہ صرف شکریہ ادا کر کے چلتی بنی۔ بیوہ جو ہمیشہ مجھے ایکسائیٹ کرتی ہے۔ جاتے ہوئے اس نے ایک مسکراہٹ بھی تو میرے آگے نہ ڈالی، شاید وہ مسکرا ہی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے ہونٹوں کے ارد گرد کی رگیں اور پٹھے ایک مسلسل مصیبت میں جامد ہو چکے تھے اور ہمراہ رو محبت نے اس کے لئے محبت کے حسین و جمیل جذبے کو ایک بے معنی سی گردان بنا دیا تھا۔

جبھی مجھے سپرنٹنڈنٹ اسرانی کی ہمدردی سمجھ میں آئی اس نے ریز میری بجائے نندلال کو دلوایا تھا جو بہت چالو آدمی تھا نندلال اوپر سے جو کچھ کماتا تھا اس میں اسرانی کی بھی پتی تھی۔ میرا لیٹ آنا تو صرف ایک بہانہ تھا۔ پھر نندلال نے اسرانی سے خاندانی تعلق پیدا کر رکھا تھا اور مہینے میں دو تین بار اپنی بیوی کے ساتھ اسرانی کے کنوارے کوارٹرز میں جاتا تھا۔

سٹیلمنٹ آفس اچھا خاصا کبوتر خانہ تھا۔ اس میں زیادہ تر تو سندھی اور پنجابی ہی کام کرتے تھے لیکن اب کچھ مدراسیوں نے آنا شروع کر دیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ایک بار دفتر میں مدراسی آ جائیں تو پھر پورا دفتر مدراسیوں سے بھر جاتا ہے۔ مگر یہ تو بنگالیوں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے اور مراٹھوں کے بارے میں بھی۔ اس سلسلے میں پنجابی بہت اچھا ہے وہ ایک بار کسی دفتر میں آ جائے تو مجال ہے جو کسی اور پنجابی کو پاس بھی پھٹکنے دے، چاہے وہ کتنا ہی قابل ہو۔ دفتر میں آزادانہ ایک دوسرے کی ماں بہن ہوتی تھی اور ہر قومیت قوم بننے کے کرب میں مبتلا تھی۔

وہ دن بہت گندہ تھا یا شاید مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اسرانی نے میری ترقی کے سب راستے روک دیئے تھے اور میری بیوی بدصورت اور بوڑھی ہو گئی تھی اور مجھے مسکراہٹوں کو سکے میں ڈھالنے کا فن نہ آتا تھا۔ دفتر میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہندو مسلم فسادات سے کہیں زیادہ تھا قتل سے زیادہ تھا اور خون سے بھی زیادہ۔ بعض وقت تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کسی چیز، کسی جذبے کی ضرورت سے زیادہ نفی کرنا ہی اسے قبول کرنا ہے۔ ہندو جتنا زیادہ اس دنیا کو مایا سمجھتا ہے۔ اتنا ہی وہ پیسے کا پجاری ہے۔ ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اس نے دولت کو ایک دیوی لکشمی دیوی نہ بنا دیا ہو اور ایک گندے اور بھونڈے طریقے سے اس کی پوجا نہ کی ہو۔ وہ پوجا ہمیشہ اس کی پوجا کرتا ہے۔ دیوالی میں پوجا، دسہرے میں اپنی کار پہ صد رنگ کے ہار ڈالتا ہے جو دنیا کا کوئی بشر نہیں ڈالتا کیسے موتی پوجا اور پیسے کی پوجا آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں بہرحال اپنے دیس میں ایک نیا ضمیر جاگا ہے ایک نئے اتا کرن نے انگڑائی لی ہے۔

اور پیسہ ہے کہ دن بدن میلا ہوتا جا رہا ہے کبھی جو نیا چھپا ہوا نوٹ ہاتھ آتا ہے تو اپنا آپ کتنا ستھرا اور کتنا صاف معلوم ہوتا ہے یا شاید میرا اپنا من گندہ ہے جب بھی میرے ہاتھ میں میلا اور جرجر سا نوٹ آتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے دق کے مریض نے چھوا ہے یہ زندگی کے کس [illegible] سے آیا ہے لیکن جب حوصلہ کر کے اسے ہاتھ میں لیتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے میرے ہاتھ میں روپیہ نہیں،

چھ آٹھ آنے ہیں، جنھیں میں چار آنے میں نکال دینا چاہتا ہوں۔

وہ تنخواہ کا دن تھا اور مجھے وریز،کی اُمید تھی۔ امید کیا۔ میری باری تھی۔ لیکن میں پیسے ہاتھ میں لئے ہوئے نکلا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں عورت ہوں اور ابھی ابھی میری آبرو ریزی ہوئی ہے میں نے اپنی مرضی اپنی خوشی اور محبت سے اپنے بدن کو پیار کرنے والے کے حوالے نہیں کیا۔ بلکہ کسی نے زبردستی میری عزت لوٹی ہے۔ بدن کی بات چھوڑیئے، روح کے تجربہ کا کیا ہوا۔ شاعر کے لفظوں میں ہم تو کوچہ و بازار کا مال ہو گئے۔ جو بھی نگاہ ہم پہ اٹھتی ہے خریدار کی طرح سے اٹھتی ہے۔ رونا دل سے اٹھتا ہے مگر آنسو کہیں گلے میں پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ اردگرد کے سب لوگ رنڈیاں ہیں جو اپنے اپنے دھندے کے سلسلے میں گاہکوں کو پھنسا رہے ہیں آنکھ مار رہے ہیں اور بیچ بیچ میں اپنے بدن کے وہ حصّے دکھلاتے ہیں جن سے مرد کے دماغ میں ایک محشر بپا ہو جاتا ہے۔

دفتر سے لوٹنے پر معلوم ہوتا ہے جیسے بازار ٹ پکاسو نے بنایا ہے۔ آرٹ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا آرٹ ہے اس میں، ہوٹل میں اسٹیشنری دکھائی دے رہی ہے اور کہیں فولاد کی لیتھ پر کوئی حسینہ الاریو ناچ رہی ہے۔ پرائمری رنگوں میں وصال کسی ربط سے نہیں۔ وہ دیکھتے سے ہیں۔ ایسے ہی ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ اگر آپ نے نیل کو نارنجی میں حل ہوتے نہیں دیکھا تو چلئے میں دکھاتا ہوں غالباً آپ نے بمبئی میں سمندر کے بیچ حاجی علی حسین مسجد پہ شالیمار بسکٹوں کا بڑا سا نیون سائن نہیں دیکھا جس نے خدا کو بسکٹ بنا دیا۔ وکٹوریہ والے کی وہ گالی نہیں سنی۔ جو ٹھمری کے ریکارڈ، جمنا کے تیرا پہ سُپرامپوز ہو رہی ہے۔ میری قمیص پہ یہ گلکاری کسی حسینہ کی کشیدہ کاری نہیں پان کی پیک ہے جو کسی نے چلتی بس پر سے مجھ پر پھینکی ہے۔ سڑک پر کیلے کے چھلکے اور ردی کاغذ دیوالے کی دستاویزیں بنے اڑتے پھر رہے ہیں اور یہ کتاب جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہیں۔ گرما گرم نسخہ ہے جو سڑک کے کنارے والا اسٹال کا مالک میرے ہاتھ میں تھما گیا ہے اسے پڑھیئے اور پھر آجائیے ٹیگور، ٹالسٹائی اور چیخوف۔

اپنے جسمانی اور ذہنی افلاس کی وجہ سے میں بہت سی ادھر ادھر کی چیزیں خریدتا ہوں۔ میں پیسہ رکھ ہی نہیں سکتا نا۔ پیسہ وہی رکھتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو۔ اب میں ٹِل ہٹ میں جاؤں گا اور رِیتا کا ناچ دیکھوں گا جو اپنے بدن پر انجیر کا پتّہ اور صرف انجیر کا پتہ لٹکائے پھرتی ہے ایک گلابی تلمگے سے جو بدن کا ہم رنگ ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں، نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گا خفتی ناراض ہو گی۔ جب مجھے کیا پتہ تھا۔ وہ پھر بھی ناراض ہو جائے گی اور پورے دیس کا الزام خود پہ لیتی ہوئی گاؤں جاکر بھائی کے پاس بیٹھ جائے گی اور پھر کبھی نہیں آئے گی اور میں اپنی خفت کو مٹانے کے لئے سب سے کہتا پھروں گا۔ میں نے خفتی کو نکال دیا۔ بہت بک بک کرنے لگی تھی وہ . . .

میں گھر تک پیدل جانے کی سوچتا ہوں ایسے ہی اپنے آپ کو اذیت دینے کے لئے جیسے یوگی اپنے چاروں طرف آگ جلا کر بیچ میں تپ کرنے بیٹھ جاتا ہے یا اپنے آپ کو زندہ درگور کر لیتا ہے۔ خود کو اذیت دینے کے لئے کون سا کام ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا۔ آپ آج سے کھانا چھوڑ دیجئے۔ دیکھئے کیسے گنۂ ہتھیا بند نہیں ہوتی؟ ایک مربعے کے دو یا دو کا ایک نہیں بن جاتا؟ سرکش طالب علم بکری بن کر اپنے کلاس روم میں لوٹ نہیں جاتے؟ چنانچہ اسی تپسیا کے عمل میں اپنے وجود سے نکلنے والی برقیات کی مدد سے بھارت کا بجوشیہ سنوارتے ہوئے میں چلتا گیا۔ جبھی گہرے رنگ کی مرسڈیز کار کا مجھے دھکا لگا اور میں بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرایا۔ اب برقی رویں میرے بدن سے نکلنے کی بجائے الٹا میرے بدن میں آرہی تھیں۔ ہندوستان کا مستقبل ستیاناس ہو رہا تھا۔ فٹ پاتھ پہ جا گرا تھا جو کہ میری اصلی جگہ تھی۔ خون نکلا تھا مگر تھوڑا سا۔ وہ زیادہ نکلنا چاہیئے تھا۔ فصد کچھ اور بھی کھلنا چاہئے تھی۔ ہاں، میری اذیت پسندی یہی چاہ رہی تھی اور اسی میں ملک اور قوم کا بھلا تھا۔ اس لئے میں تو نہ چاہتا تھا کہ کار کے مالک کو کچھ بھی کہا جائے لیکن لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور مارنے لگے۔ اب جو بھی آتا تھا اسے ایک ہاتھ لگا کر چل دیتا تھا۔ یہ کوئی نہ پوچھ رہا تھا، قصور کس کا ہے؟ حالانکہ قصور میرا تھا۔ سراسر میرا۔ جب میں اپنی اصلی جگہ کو چھوڑ کر سڑک

پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن لوگ ۔ جانے کہاں کی مار نکال رہے تھے وہ اندر سے کتنے ممنون نظر آ رہے تھے کہ میں نے انھیں ایک موقع دیا۔ وہیں نہیں ایک طرف سے کوئی ٹوٹا پھوٹا بوڑھا پارسی چلا آیا۔ جس کے بدن میں رعشہ تھا۔ اس نے بھی ایک ہاتھ سے اپنا دوسرا ہاتھ پکڑا اور اس غریب امیر کے جڑ دیا ۔ وہ مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ہت ۔ نے ۔ آئیں شوں کر لیو؟ ہت، تے آئیں شو کر لیو؟ جانے یہ کیسی نامردی تھی جس کا وہ بدلہ لے رہا تھا۔

جبھی میری نظر کار کے مالک پہ پڑی اور اپنے ماتھے سے خون پونچھتے ہوئے میں لپک کر کھڑا ہو گیا اور چلانے لگا۔ چھوڑ دو ۔ ۔ چھوڑ دو اسے اب اس کے خون بہہ رہا تھا ۔ غالباً اتنا ہی جتنا میرے بہا ۔ بے شک کوئی تول کے دیکھ لے ۔ سر پہ سے خون بہنے سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں جنھیں پونچھتے ہوئے اس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔

شانتی ۔ میں نے پکارا۔

شانتی لال نے کانپتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔ گجن! مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ اور پھر دہشت کے عالم میں وہ مجھ سے لپٹ گیا لوگ حیران ہو رہے تھے اور جو حیران نہیں تھے مجھے ماں بہن کی گالیاں دینے لگے۔

تم کہاں، شانتی ۔ ۔ ۔ یہ کار؟

" ہاں یار " ۔ ۔ ۔ وہ ابھی تک کانپ رہا تھا۔

" یہ کس کی کار ہے " ؟

" میری ! "

" تم ۔ ۔ ۔ " ؟

" میں سوچ رہا تھا کہ جس آدمی نے میرے ساتھ فاقے کیے ہیں اور ریے روڈ کے ایک گندے سے ہوٹل میں میرے ساتھ رہا ہے کار کا مالک کیسے ہو گیا ہو لیکن جلد ہی بات میری سمجھ میں آ گئی ۔ وہ مرکز میں کسی ڈپٹی منسٹر کا بھانجا تھا۔"

شانتی نے بہت منت کی کہ میں اس کی کار میں چلا آؤں لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ؟ یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ شاید شانتی ڈر رہا تھا کہ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس نے جیب سے دس روپے نکال کر دو کانسٹبلوں کو دے دیئے اور مجھے ٹاٹا کہہ کر چل دیا ۔ قاعدے سے مجھے چاہیئے تھا وہاں جاتا اور اینٹی ٹیٹانس انجکشن لیتا۔ لیکن میں تو چاہتا تھا کہ مجھے ٹیٹانس ہو جائے ۔ خود کو بچانے کا جو فطری جذبہ انسان میں ہوتا ہے، میں اور میری قبیل کے ہندوستانی اس سے بہت آگے نکل چکے تھے۔

سڑک پر چل رہے جا رہے تھے اور چھچھوندریں کسی چوہے نے سوٹ پہن رکھا تھا اور چھچھوندر کا نٹا لگائے گھوم رہی تھی۔ ان میں سے کسی کے چہرے پر رونق نہ تھی ۔ کہیں خون کے آثار نہ تھے اور میں سوچ رہا تھا جب بمبئی میں پانی ختم ہو جائے گا تو یہ سب کیسے بھاگیں گے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، نوچتے، کاٹتے ۔ ۔ چھ ہے !

جبھی میں پریل کے علاقے میں جا پہنچا۔

بیس پچیس آدمی سر گرائے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک سست سی رفتار سے، ان کے چہروں پر ماتم تھا۔ ضرور ان غریبوں کا کوئی مر گیا تھا اور یہ اس ماتمی جلوس کا حصہ تھے ۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے کوئی ارتھی، کوئی جنازہ دکھائی نہ دیا۔ تھوڑا آگے، ان سے کچھ ہی فاصلے پر تیس پینتیس آدمی اور دکھائی دیئے جو ویسے ہی سر جھکائے ہوئے جا رہے تھے ضرور وہ ان پہلے آدمیوں کا حصہ ہوں گے ۔ ضرور ان کا کوئی بہت ہی محبوب، بہت ہی چہیتا مر گیا ہو گا، ورنہ سوائے لیڈر کے ایک عام آدمی کے جنازے کے ساتھ بمبئی میں اتنے لوگ کہاں جمع ہوتے ہیں؟

میں نے گھوم کر دیکھا لیکن مجھے پھر کوئی جنازہ دکھائی نہ دیا۔

ہمت کرکے میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔ آپ لوگ۔ جنازہ کہاں ہے؟

جناجا؟ اس نے حیرانی سے کہا۔

ہاں ہاں، جنازہ، ارتھی! ۔ کوئی مر گیا ہے نا۔؟

نہیں۔ اس نے ہر قسم کے جذبے سے عاری بے رنگ سا چہرہ اوپر اٹھا کے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ مجود ہتا۔ ل سے آیا نا، کیا؟

میں اسی طرف جا رہا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا۔ انہی لوگوں کے ساتھ جا رہا ہوں جن کا جنازہ بھی غائب ہے۔

قرۃ العین حیدر

شمع۔ دہلی

اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

رات گئے، شہر کے نیلگوں اندھیرے میں دُور کہیں ایک سُریلی دل دوز بانٹ دار آواز بلند ہوتی ہے "کبھی ہم میں... تم میں بھی راہ تھی ..... تمہیں یاد ہو... ... کہ نہ یاد ہو... ..." رفتہ رفتہ یہ صدا دُور ہوتی ہے اور بجن میاں اپنے خوبصورت گھر کی آرام دہ خواب گاہ میں پلنگ پہ کروٹ بدل لیتے ہیں اور چپ چاپ پڑے پڑے دیوار کو تکتے رہتے ہیں۔ بجن میاں کی چہیتی بیوی رقیہ بچّے کے رنگین گجراتی پنگوڑے کی ڈوری پہ ہاتھ رکھے رکھے سو جاتی ہے، کلاک کی ہری سطح پر سفید سوئی آگے سرکتی رہتی ہے۔ رات یوں ہی گزر جائے گی۔

بجن میاں لیڈر، فلسفی، شاعر، ادیب، انٹلکچول، ہیرو، کچھ بھی نہیں ہیں، بے حد معمولی، غیر معروف، سیدھے سادے آدمی ہیں، مگر کیا ایک سیدھا سادا آدمی زندگی کی ناقابلِ فہم بھول بھلیاں پر غور نہیں کر سکتا؟ بجن میاں ایک مرنجان مرنج انسان ہیں (ان کا اصلی نام جان کر کیا کیجیے گا) اٹھارہ برس سے بمبئی میں ملازم ہیں۔ ماموں کی بیٹی سے بیاہ ہوا ہے۔ تین بچّے ہیں۔ بڑا لڑکا علی گڑھ میں پڑھ رہا ہے۔ منجھلی لڑکی میٹرک میں ہے۔ چھوٹا بچہ ابھی شیر خوار ہے۔ بجن میاں کا بقیہ کنبہ "وطن" یعنی شمالی ہند میں رہتا ہے۔ دو سال میں ایک بار جا کر وہ سب سے مل آتے ہیں۔ زندگی آرام سے کٹ رہی ہے۔ بجن میاں ان لاکھوں انسانوں میں سے ہیں جو صبح کو بسوں اور لوکل ٹرینوں میں بیٹھے دفتر جاتے نظر آتے ہیں شام کو سینما دیکھ لیتے ہیں اور اتوار کے روز بیوی بچوں کے ساتھ آرے کولونی کی سیر کر آتے ہیں بجن میاں کی زندگی کی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں مگر بہر حال......

بجن میاں جب آج سے اکیس سال پہلے علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے ہاں رائے بریلی چلے گئے۔ ماموں کی لڑکی رقیہ سے ان کی ٹھیکرے کی مانگ تھی اور وہ ان سے سخت پردہ کرتی تھی۔ بجن میاں اس رشتے سے بہت خوش تھے، اور آج بھی خوش ہیں، اور وہ بیس سال کی رفیق اس کھڑکی کے نیچے بستر پر لیٹی غنودگی کے عالم میں بچّے کا گجراتی پالنا جھلا رہی ہے۔ باہر ناریل کے پتّے سرسبز لہرا رہے ہیں۔ دیوالی آنے والی ہے محلے کے بچے "ایٹم بم" چلاتے چلاتے تھک کر اپنے اپنے گھروں میں سو چکے ہیں۔ رات بڑی سنسان ہے۔ اتنے بڑے بھیانک پرچھائیوں کے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

بجن میاں کے ماموں کی کوٹھی رائے بریلی کی سول لائنز میں تھی۔ (ماموں سب جج تھے اور حال ہی میں تبدیل ہو کر لکھیم پور کھیری سے رائے بریلی آئے تھے) رقیہ نے پردہ کر کر کے ناک میں دم کر رکھا تھا اور ماموں کے باقی بچّے خورد سال تھے۔ بجن میاں جب گھر میں پڑے پڑے اکتا جاتے تو سائیکل اُٹھا کر سایہ دار سڑکوں پر سے گزرتے دیہات کی طرف نکل جاتے اور سنسان راستوں پر پہنچ کر اونچی آواز میں گانا شروع کر دیتے۔ انہیں موسیقی کی دھت

تھی۔ علی گڑھ کی نمائش میں اکثر لاؤڈ اسپیکر پر گایا کرتے تھے۔ کلاسیکل میوزک بھی سیکھ رکھی تھی۔

ایک روز نجن میاں اسی طرح سائیکل پر ہواخوری کرتے ہشاش بشاش ترو تازہ شہر سے بہت دور آموں کے باغ میں پہنچ گئے۔ بادل گھر آئے تھے اور بارش آنے والی تھی۔ نجن میاں سائیکل سے اُتر کر سستانے کے لئے باغ کی سمت بڑھے۔ وہاں انہیں ایک پُرانی باؤلی نظر آئی۔ باؤلی کی منڈیر پر ایک بہشتی چپ چاپ اکڑوں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ نزدیک ہی برگد کے نیچے کسی فقیر کا تکیہ تھا اور ایک بزرگ کھاٹ پر بیٹھے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر نیا پختہ کنواں تھا اور رہٹ چل رہا تھا۔

باؤلی کے قریب پہنچ کر نجن میاں نے ارادہ کیا کہ بہشتی سے ایک کٹورا پانی مانگیں کہ اچانک آم کے جھنڈ میں سے کوئل کی کوک جیسی ایک آواز بلند ہوئی اور رامپوری چاقو کی طرح سیدھی ان کے دل میں اُترتی چلی گئی۔ اور وہ گیت بھی کیا تھا ــــ دقیانوسی "چھا رہی کالی گھٹا..... جی ہاں..... چھا رہی کالی گھٹا....... جیا مورا لہرائے ہے"

نجن میاں نے مبہوت ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ سوتے سوتے بھیگے بھیگے سناٹے میں باغ کے پتے پتے کو نیند سی آ رہی تھی۔ نجن میاں نے آہستہ آہستہ شروع کیا۔ جدھر سے گیت کی آواز بلند ہو رہی تھی ــــ باؤلی اور پگڈنڈی کے درمیان ایک ہری بھری کھائی سی تھی جس میں جولائی کے پودے اُگ آئے تھے کھائی کی دوسری طرف سنسان کچی سڑک کے کنارے ایک بھورا مکان کھڑا تھا۔ مکان کے پچھواڑے کی دیوار سڑک کے رُخ پر تھی۔ اس دیوار میں کائی لگے پرنالوں کے درمیان چار ہرے روشندان نظر آ رہے تھے۔ باہر سے صرف یہ روشندان ہی دکھائی دیتے تھے ــــ جس طرح ہمیں کبھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں کے اندر کیا کچھ گزرتا رہتا ہے۔

گیت اسی روشن دانوں والے کمرے میں گایا جا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ پہلو میں ایک شکستہ چبوترے پر کھلتا تھا۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ چبوترے کے برابر آنگن کی اونچی دیوار تھی اور ڈیوڑھی۔ ذرا فاصلے پر احاطے کے کچے، نم صحن کے ایک کونے میں شاگرد پیشہ تھا۔ اس کے صحن کی اینٹوں کی دیوار پر باہر ایک مشک کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ صحن کے اندر بٹول کی نارنگیوں کا پیڑ کھڑا تھا۔ احاطے کے پیچھے آم کا گھنا باغ تھا۔

گیت دفعتاً ختم ہو گیا۔ چند لحظوں بعد گانے والی نے ایک اور دقیانوسی غزل شروع کر دی جو ایک زمانے میں گلی کے لونڈے گاتے پھرتے تھے "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا..... اجی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو..... وہی یعنی وعدہ...... ارے ہاں نباہ کا....."

نجن میاں ٹھٹھک کر سُنا کئے۔

"وہ جو مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تمھارے حال پہ ــــ مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا...... تمہیں یاد ہو اجی کہ نہ......"

گھٹائیں جھوم کر اُٹھیں اور چھاچھم مینہ برسنا شروع ہو گیا۔ نجن میاں گھبرا کر ایک چھتنار درخت کے نیچے ہو لئے۔

"سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا ایک آپ نے وعدہ تھا..... سو نباہنے کا تو ذکر کیا..... تمہیں یاد....."

"حق اللہ!" درگاہ کی طرف سے جگر پاش نعرہ بلند ہوا۔ نجن میاں نے چونک کر اس طرف دیکھا، اور پھر بھورے مکان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی......"

بھورا مکان، ہرے روشن دان اندھی آنکھوں کے ایسے، بٹول کی نارنگیوں کا پیڑ، آم کے جھنڈ، باؤلی اور تکیہ اور برگد ــــ سب ایک ناقابل برداشت نحوست، ویرانی اور الم کی دُھند میں لپٹے پانی میں بھیگا کئے ــــ

"کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو...... جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا.. ....."

بارش کا زور ذرا کم ہوا۔ نجن میاں سر جھکائے سائیکل کی طرف بڑھے اور سول لائنز روانہ ہو گئے۔

رات بھر وہ آواز نجن میاں کے حواس پہ چھائی رہی۔ دوسرے روز دوپہر کو انہوں نے پھر اس گاؤں کا رُخ کیا۔ آدھے راستے میں انہیں بارش نے آلیا۔ نجن میاں بھیگتے بھاگتے باؤلی پر پہنچے۔ سامنے مکان خاموش پڑا تھا۔ نہ بہشتی۔ نہ کبوتر والے بزرگ۔ نہ وہ اَنوکھی سی آواز۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ میاں پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اب ان پر انکشاف ہوا کہ وہ اس آواز پر عاشق ہو گئے ہیں۔ مُغنیہ کون ہے۔ اس سے ان کو کوئی غرض نہ تھی۔ گرہستن؟ کُبتریا۔ میراسن یا ڈومنی؟ — نجن میاں حیران پریشان باؤلی کی منڈیر پر بیٹھے رہے اور گھنٹہ بھر بعد بے نیل مرام واپس گھر آگئے۔

تیسرے روز سہ پہر کو نجن میاں گانا سُننے کی اُمید میں پھر وہاں جا پہنچے۔ جی میں سوچ لیا تھا کہ اگر کسی نے پوچھا کہ روز کیوں آتے ہو تو کہیں گے درگاہ پر منت ماننے آتے ہیں۔ اِتنے میں گانے کی آواز پھر بلند ہوئی۔ سنگیت کے بھیّے رسیا نجن میاں بے اختیار کھنچے ہوئے جاکر مکان کی دیوار کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ لڑکی نے انترہ اُٹھایا تو نجن میاں جھنجلا گئے — لڑکی گوڑ سارنگ کا پڑلیہ دے رہی تھی۔ "بی بی ما تیور لگاؤ — تیور!" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس ڈانٹ پر کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھلا، دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے درز میں سے جھانکا اور پٹ زور سے بند ہو گیا۔ خاموشی چھا گئی — نجن میاں نے ذرا نڈر ہو کر آہستہ سے دستک دی۔ "بی بی قدرت نے تمہارے گلے میں نور بھر دیا ہے۔ بس ذرا سرگم پر محنت کر ڈالو —" انہوں نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ نجن میاں چند منٹ تک دیوار کے نیچے کھڑے رہے، پھر باؤلی کی سمت چل پڑے۔ ایک بار پلٹ کر دیکھا کھڑکی بدستور بند تھی۔ ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر بہشتی سائنگر دیپنے سے نکلا اور باؤلی پر آکر ڈول اُٹھانے میں مصروف ہو گیا۔

"سلام علیکم"۔ نجن میاں نے کہا۔

"وعلیکم سلام"۔ بہشتی نے جواب دیا۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں اور ساری انگلیاں زخمی تھیں اور زخم بہت بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔

"تمہارے ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے میاں بہشتی؟" نجن میاں نے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔ قریب کے کنوئیں کا پانی شرر شرر کرتا شفاف نالیوں میں سے گزر کر باغ میں جا رہا تھا۔

"ساری عمر رسے کی رگڑ لگتی رہی ہے میاں"۔ بہشتی نے چرخی پر سے رسہ کھینچ کر ڈول باہر نکالتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ گویا پہلی بار اپنے زخم اسے نظر آئے ہوں۔ اس کے بعد اس نے نجن میاں پر نظر ڈالی۔ "میاں آپ تو کل پرسوں بھی اِدھر آئے تھے۔ کیا کام ہے؟"

"کچھ نہیں — میں نے سُنا تھا یہ — یہاں درگاہ پر ایک شاہ صاحب رہتے ہیں —"

"ہاں۔ ہاں۔ حاجی کبوتر شاہ۔ وہ سامنے بیٹھے ہیں چھپر تلے — چلے جائیے۔ مگر آج کون دن ہے — جمعرات؟ وہ آج کسی سے بولتے چالتے نہیں۔ اذکار کے بعد سیدھے مراقبے میں چلے جائیں گے —" بہشتی نے مشک بھری۔ اسے پھرتی سے پیٹھ پر لادا اور سیڑھیاں اُترنے لگا۔ نجن میاں کی ہمت نہ پڑی کہ اس مکان کے باسیوں کا کچھ اتہ پتہ لگا سکیں۔ بہشتی سیدھا مکان کی طرف بڑھ گیا۔ نجن میاں جھنجلاتے ہوئے تکیے کی طرف بڑھے۔ شاہ صاحب منڈیر پر بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔ نجن میاں قریب جاکر بظاہر بڑی عقیدت سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب تسبیح پھیرا کئے۔ نجن میاں جاجا کر کچھ دیر بعد گھر لوٹ آئے۔

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ دو تین روز بعد نجن میاں پھر آم کے باغ پہنچے (اس گاؤں کا نام کریم گنج تھا) اور مکان کے نیچے جاکر سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ کھڑکی ذرا سی کھلی اور پھر بند ہو گئی۔ عجب بات تھی۔ کیا اس مکان میں بھوت رہتے تھے؟ کوئی آدم زاد نظر ہی نہیں آتا تھا — نجن میاں

آخر علی گڑھ سے کھلنڈر سے تھے۔ کھڑکی کے قریب جا کر کہا:۔

"بی بی ہم تمہاری آواز کے مُرید ہیں۔ ایک گلاس پانی بھجوا دو۔"

"اِدھر دروازے پر آجائیے۔" اندر سے جواب ملا۔

نجن میاں گھوم کر دروازے پر پہنچے۔ کواڑ ذرا سا کھلا۔ مرادآبادی کٹورا سرکا کر باہر رکھ دیا گیا۔ نجن میاں ہاتھ تک کی جھلک نہ دیکھ سکے۔

پانی پی کر انہوں نے پوچھا "گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"اباّ اماں ہیں ــــ اور کون ہوتا؟"

"تمہارا نام کیا ہے بی بی؟"

"جہاں آرا" ساتھ ہی تلخ سی ہنسی۔

"گانا کس سے سیکھتی ہو؟"

"کسی سے بھی نہیں، مجھے گانا سکھانے کون آئے گا؟"

"گھر میں گراموفون ہے؟"

"ہے ــــ ٹوٹا پھوٹا، اللہ مارا۔"

"تمہیں جو ریکارڈ چاہئے ہوں، بتا دو میں لا دوں گا۔" ــــــــ "کیا کیجئے گا ریکارڈ لا کر"

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"ابا ــــ؟ جی میں منصرم تھے۔ فالج گر گیا۔ کھاٹ پر پڑے ہیں ــــ"

"بہن بھائی ــــ؟"

"دو بھائی تھے۔ خدا کو پیارے گئے۔ بہن کوئی نہیں، بس میں ہی ہوں، اللہ ماری۔"

اس ویرانے میں کون جوان لڑکی اپنی زندگی سے نالاں نہ ہوگی ــــ نجن میاں نے دل میں سوچا۔ بارش گہری کھڑی تھی۔ وہ لڑکی کو خدا حافظ کہہ کر اور اس کے چہرے کی ذرا سی جھلک بھی دیکھے بغیر جلدی سے سائیکل سنبھال کر گھر بھاگے۔ دوسرے روز وہ لکھنؤ گئے اور امین آباد سے اپنی پسند کے چند ریکارڈ خرید کر واپس رائے بریلی پہنچے۔ ریکارڈوں کا ڈبا کیریر سے باندھ کر پہنچے سیدھے کریم گنج ــــ منصرم صاحب کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ ذرا سا کھلا۔ چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ نجن میاں نے ریکارڈوں کا ڈبا اندر سرکا دیا۔ جہاں آرا بے حد ممنون معلوم ہوئی ــــ نجن میاں کو ایسا لگا جیسے اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں کیونکہ جب وہ بولی تو اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"شکریہ" اس نے کہا تھا۔

"تمہارے والدین کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

"کچھ نہیں کہیں گے" جہاں آرا نے بلا جھجک جواب دیا ــــ اور نجن میاں کو ذرا تعجب ہوا۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا "تم بے حد سخت پردہ کرتی ہو؟"

"جی ہاں" جہاں آرا نے اسی بے حد زندگی بھری آواز میں جواب دیا۔ اب ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چپکے چپکے سسکیوں سے رو رہی ہو۔

"اچھا تو میں کنویں پر جا کر بیٹھتا ہوں، تم کچھ گاؤ، میں صرف تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔"

"کیا گاؤں؟" جہاں آرا نے فرماں برداری سے پوچھا۔

"جو دل چاہے" بجن میاں نے کہا اور سر جھکائے کنویں پر چلے گئے۔

"تجھے ہو سیر چمن مبارک اگر یہ رازِ چمن بھی سن لے   کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے"

لڑکی نے اس طرح اچانک گانا شروع کر دیا، جیسے گراموفون ریکارڈ پر سوئی رکھ دی جائے۔ برگد تلے کبوتر شاہ آنکھیں بند کئے جھومنے لگے۔ دو دیہاتی مرید چولہے پر ان کے افطار کے لئے زردہ تیار کرنے میں معروف تھے۔ کیونکہ کبوتر شاہ سال کے بارہ مہینے روزہ رکھتے تھے۔ برسات کی بھیگی فضا میں بھیگا بھیگا دھواں اور پر انتشار بہشتی نے اپنے دروازے سے سر نکالا اور پھر اندر غائب ہو گیا۔ باغ میں کوئل زور سے کوکی۔ جمال آرا کی آواز بہت روشن دالوں والے کمرے سے بلند ہو کر سارے باغ میں پھیل گئی۔ گڑے کمان کے تیر ایسی آواز موسمِ برشگال کی دھندلی سیال آوازوں پر حاوی آگئی۔

کہاں کہاں اڑ کے پہنچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے   ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

مرید چولہا سلگاتے سلگاتے آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"جمالا بٹیا شاہ صاحب کے لئے کھیر دے گئی ہیں" ایک مرید نے تام چینی کی رکابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سویرے بجا گئی تھیں۔ رندو خاں کے ساتھ لالہ کی دوکان پر کھڑی رو رہی تھیں۔ لالہ نے ان کا طوق بھی مار لیا۔ دے سود پر سود۔ دے سود پر سود۔ اللہ کی سان ہے"

"ہاں چچو بھائی۔ اللہ کی سان ہے"

بجن میاں غور سے سننے لگے۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ سخت پردے میں رہتی ہے۔ اور نہ جانے یہ لالہ کی دوکان اور سود کا کیا قصہ تھا؟

"یہ نالہ کیوں ہے، یہ نغمہ کیوں ہے یہ آہ کیسی یہ واہ کیسی   یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے، نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے"

دفعتاً بجن میاں کا جی بھر آیا وہ جلدی سے سائیکل کی طرف لپکے اور گھر جاتے ہوئے طے کر لیا کہ اب کریم گنج اور اس المناک ماحول کا رخ نہ کریں گے۔ آدمی کے لئے اپنی پریشانیاں ہی کیا کم ہیں جو پرائے دکھ بھی سمیٹ لئے جائیں۔ جانے کیا جھمیلا ہے کیا نہیں۔ مگر یہ آواز ہمیشہ یاد رہے گی۔

دوسرے روز بجن میاں کے والدین شادی کی تاریخ مقرر کرنے علی گڑھ سے رائے بریلی آ گئے۔ بڑا ہنگامہ اور چہل پہل رہی۔ ہفتہ بھر بعد علی گڑھ روانہ ہونے سے پہلے وہ آخری بار کریم گنج گئے۔ باغ پر حسبِ معمول سناٹا طاری تھا جس میں ڈول سے پانی گرنے، رہٹ چلنے اور نالیوں میں پانی بہنے کی مدھم آوازیں سرسرا رہی تھیں۔ بھورے مکان کی ڈیوڑھی پر بچہ کھڑا تھا۔ ایک چار سالہ بچی سرخ غرارہ پہنے بڑے سلیقے سے سر ڈھانپے ڈیوڑھی کے اندر جا رہی تھی۔ بہشتی کے دروازے پر چند عورتیں کھڑی تھیں۔

چند منٹ بعد ایک بارش بزرگ میلی سی شیروانی پہنے بھورے مکان کے اندر سے نکلے اور یکہ پر بیٹھ گئے۔ یکہ کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا بڑھ گیا۔ تو بہشتی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا۔ اس کی نظر بجن میاں پر پڑ گئی جو برگد تلے دل گرفتہ سے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بہشتی بڑبڑاتا ہوا ان کی جانب آیا۔

"سلاملے کوم" اس نے درشتی سے کہا۔

"سلام علیکم" بجن میاں نے علی گڑھ کے انداز میں جواب دیا۔

"آئیے بیٹھئے میاں" بہشتی نے اپنے گھر کے سامنے پڑی ہوئی کھاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ بجن میاں اس کے ہمراہ چلتے ہوئے آکر کھاٹ پر بیٹھ گئے۔

"آپ روز روز جمالا بٹیا کا گانا سننے اتنی دور سے آتے ہیں" بہشتی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا۔ بجن میاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کبوتر شاہ کا ایک مرید حقہ گڑگڑاتا آکر کھاٹ کی پائنتی بیٹھ گیا۔ پیچھے کے چھپر پر کبوتروں نے غوں غوں کر کے ایک آفت مچا رکھی تھی۔

"حکیم صاحب کا کیسا رہے؟" مرید نے بہشتی سے پوچھا۔

"حالت نازک ہے۔" بہشتی نے جواب دیا۔ اور سر اٹھا کر پیپل کے سنتروں کی ڈالیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ماتھے پر انگلی دو دفعہ بجائی "مکتب۔ مقدر کے آگے میں بھائی کسی کی نہیں چلتی۔"

مرید نے لمبا سانس لے کر زور سے نعرہ لگایا "اللہ ہو۔" بجن میاں لرز گئے۔

"کیا ہوا۔ خیریت ہے؟" انھوں نے بہشتی سے سوال کیا۔

"خیریت ___؟ ارے چل چلاؤ ہے۔"

"کس کا؟"

"منعم صاحب کا۔ اور کس کا۔ اب آگے اللہ کا نام ہے۔"

"چل چلاؤ ہے۔ سب کا چل چلاؤ ہے۔" مرید نے آنکھیں بند کر کے ذرا جھومتے ہوئے زیر لب دہرایا۔

بہشتی نے دفعتاً سر اٹھا کر کہا "جائیے میاں۔ آپ اپنے گھر جائیے۔"

"بند و خاں۔" مکان کے صحن میں سے ایک عورت نے پکارا "اے تم پہ اللہ کی سنوار۔ سارے گھڑے خالی پڑے ہیں، اور تم بیٹھ گئے مسکوٹ کرنے۔"

بہشتی نے کھاٹ سے اٹھ کر دیوار پر ٹنگی ہوئی مشک اتاری اور بجن میاں پر نظر ڈالے بغیر پھرتی سے باؤلی کی سمت چل دیا۔

بجن میاں نے گھڑی دیکھی ٹرین کا وقت قریب تھا۔ انھوں نے ایک بار بند کھڑکی اور ہرے روشن دانوں پر نظر ڈالی اور سائیکل پر سوار ہو گئے۔ "تم جو کچھ بھی ہو اور جو کوئی بھی ہو۔ بے چاری بچی۔ اللہ کے حوالے۔" انھوں نے دل میں کہا اور تیزی سے سائیکل چلاتے ہوئے بریلی جانے والی سڑک پر آ گئے۔

بجن میاں کو اس وقت یہ احساس اتنی شدت سے نہ ہوا تھا۔ کہ وہ جو کوئی بھی اور جو کچھ تھی اس کی انھوں نے اس کے کوئی مدد کیوں نہ کی پشیمانی اور جرم کا یہ احساس عمر پختہ ہونے پر، زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ان کو ستانے والا تھا۔ بجن میاں کی شادی ہو گئی کچھ عرصے بعد بمبئی میں ملازمت مل گئی اور وہ بیوی سمیت وہاں آ گئے، اور یہاں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ انھوں نے کسی سے اپنے اس احساسِ جرم کا ذکر نہیں کیا۔ رقیہ سے بھی نہیں۔ شریف اور نیک دل ہونا بھی ایک عذاب ہے۔

اتنے عرصے بعد، ایک ہفتے سے بجن میاں کو یہ آواز روزانہ رات کو خواب میں سنائی دے رہی تھی۔ آج رات وہ جاگ اٹھے اور چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں خاموش سڑک کی نیلی روشنی میں درختوں کے پتے جھلملا رہے تھے۔ دو رویہ عمارتیں خوابیدہ تھیں۔ گلشن ہند ریستوراں، شیریں کھمبا ٹاؤن، نورانی بلڈنگ، چٹ پٹ ڈرائی کلینرز۔ سارا شہر، لیمپوں کے ان کھمبوں کے نیچے، اکثر رات کو کوچہ گرد گویئے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہارمونیم، دو تارہ یا وائلن بجا بجا کر بھیک مانگتے ہیں۔ بجن میاں بستر سے اٹھ کر کھڑکی میں آ گئے۔ مگر سڑک خاموش پڑی تھی۔ یقیناً یہ گانا میں نے خواب ہی میں سنا ہے۔ انھوں نے سوچا اور واپس آ کر پلنگ پر لیٹ رہے۔

کئی مہینے شاید ایک برس گزر گیا۔ وقت بھی عجب مسخری شے ہے۔ ہم اتنے مزے سے کہتے ہیں وقت گزر گیا، حالانکہ وقت گزرنا اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم قبر کے زیادہ نزدیک پہنچ گئے اور کتنی زندگی گزار کے؟ کتنی بے انصافیاں اور ذلتیں سہہ کے؟ زندگی یا قدرت یا قسمت کی کتنی ستم ظریفیوں کا نشانہ بن کے؟ اور جب مر جائیں گے تو سب کی قبریں ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔ دکھ سہنے کے لیے بھی تو بار بار تھوڑا ہی پیدا ہوں گے۔

ایک روز بجن میاں دفتر سے لوٹ کر سب معمول سیدھے اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئے۔ کیونکہ دفتر سے گھر تک ٹرین کا سفر شام کے بھیڑ بھڑکے میں ہلکان کر دیتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے حسب عادت منتظر تھے کہ رقیہ اندر آ کر گرم گرم چائے کی پیالی انھیں تھما دے گی۔ مگر رقیہ پچھلے برآمدے میں دلی والی پڑوسن اور دوسری ہمسایوں کے ساتھ مل کر کسی بات پر قہقہے لگانے میں مصروف۔ شاید یہ بھول ہی گئی تھی کہ میاں دفتر سے آ گئے۔

اچانک قہقہوں کو پھاڑتی ہوئی ایک بے حد تیکھی آواز نے للکار کر کہا۔ ہائے بیگم۔ نام بڑا اور درشن۔ آخ تھو۔ ہتنے بڑے گھر کی رانی اور ریاکے سوالی کو کیا دیتی ہیں۔ حاتم کی قبر پر لات مارنے والی۔ اے دیکھنا ایک چوٹی۔ پاپوش پر مارتی ہوں تمہاری یہ چوٹی۔ آؤ بند و خان۔ چلو اٹھو۔

"اے توبہ کیا ہوا سے لڑنے والی لگائی ہے!" دلی والی نے کہا۔ بقیہ خواتین نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

کمرے کے اندر بجن میاں بور ہو کر آنکھیں بند کئے جانے کے منتظر رہے۔

"شرم کرو بیگمو۔ تف ہے۔ تف ہے" تیکھی آواز چیخی "اب جو یہ بندی ادھر کا رخ کرے تو"

"اچھا ایک غزل اور سنا دو تو پورا ایک روپیہ دیں گے" دلی والی کی بھاوج نے کہا۔

"نہیں غزل نہیں۔ لے گئی دل گڑیا جاپان کی سناؤ" دوسری پڑوسن کی لڑکی نے فرمائش کی۔

بڑا سخت شور مچ رہا تھا۔ محلے کی یہ سب عورتیں اکٹھی ہو جائیں تو کس قدر چائیں چائیں کرتی ہیں۔ بجن میاں نے کروٹ بدلی۔ جہاں ان کا پلنگ بچھا تھا وہاں دروازے میں سے برآمدے میں جمع عورتیں تو نظر آ رہی تھیں مگر جس عورت سے وہ سب مخاطب تھیں وہ دیوار کی اوٹ کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"اچھا وہ غزل سنا دو جو پہلے سنائی تھی ابھی" مجراتن ہمسائی نے ہاتھ بڑھا کر روپے کا نوٹ سرکایا۔

فوراً کوئل کی سی آواز بلند ہوئی "کبھی ہم میں تم میں بھی ... اجی راہ تھی ..."

بجن میاں سُن سے رہ گئے۔ ان کو لگا جیسے ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ وہ لیٹے لیٹے اپنا سر بھی نہ اٹھا سکے۔

گانا ختم ہوا۔ عورتیں ایسا معلوم ہوتا تھا شاید مسحور سی ہو چکی تھیں۔

ایک دم پھر غل مچا۔

"اب گڑیا جاپان کی" ایک لڑکی چلائی۔

"اور تم شادی کس سے کرو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کوئی بے نظر میں؟" ایک اور پڑوسن نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"اے ہے۔ اللہ کے غضب سے ڈرو لڑکیو کیوں اس غریب کو تنگ کر رہی ہو" یہ دلی والی کی بوڑھی ساس کی آواز تھی جو شور و غل سن کر اپنے فلیٹ سے نکل کے صحن میں آگئی تھیں۔

"سلام بیوی۔ سلام" گانے والی نے ذرا ممنون آواز میں ضعیفہ کو سلام کیا۔

"سلام۔ سلام" دلی والی کی ساس مونڈھے پر بیٹھ گئیں "اے ہے نگوڑی کمبخت۔ دکھیا ماری! اے لڑکیو۔ تم کو اس کا مذاق اڑاتے شرم نہ آئی۔ اے تیری کتنی عمر ہوگی بختوں جلی؟"

"بیالیس برس۔ بیگم صاحب"

"بیالیس برس!" خواتین کا حیرت زدہ کورس ہوا۔

"اللہ کی شان ہے!" رقیہ نے کہا۔

"ہاں اللہ کی شان ہے" دلی والی نے کہا۔

"اور نام کیا ہے تمہارا؟" رقیہ نے پوچھا۔

"آنکھوں کے اندھے، نام نین سکھ۔ میرا نام جمال آرا ہے بیگم صاحب"

"بڑا جگرا ہے تمہارا بیوی۔ گلی گلی گھوم کر دنیا بھر کی باتیں سنتی ہو۔ مذاق برداشت ہو جاتا" دلی والی کی ساس نے کہا۔

"جب قدرت نے میرے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیا ہے بیگم، تو میں دنیا والوں کے مذاق اڑانے کی کیا پرواہ کروں؟ اور گلی گلی گھوموں تو کھاؤں کیا اپنا سر؟ ذرا یہ تو بتاؤ؟" عورت نے چمک کر جواب دیا۔

"کہاں کی رہنے والی ہو۔ ادھر کی تو معلوم نہیں ہوتیں۔"

"ضلع رائے بریلی تھا ہمارا گنج۔"

"ماں باپ ہیں، مر گئے؟ کیا کرتے تھے؟ عورتوں کی عادت ہے کہ ہر بات کی کرید۔"

"مر گئے نگوڑے۔ ذرا زردہ دینا۔ اے ہے، لکھنؤ کا زردہ ہے۔ ابا منعرم تھے ہمارے۔ مانو نہ مانو۔ مجھے کون پروا ہے۔ آجاؤ بندو خاں، چلیں۔"

"اے ہے۔ ٹھہر تو کم بخت کہاں بھاگی جاتی ہے۔ کون سا تیرے گھر پہ تیرا خصم اور بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہاں اور بتا اپنے حالات۔" دلی والی کی بھاوج نے جن کو افسانے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟ اپنا کلیجہ؟ اے بندو خاں، ادھر آجاؤ، اندر۔ سناؤ رام کہانی۔ یہاں بڑی محفل لگی ہے۔ نقشے جمے ہیں۔"

اب ایک بوڑھے آدمی کی کھنکار کی آواز آئی جو شاید اب تک باہر پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ اس نے صحن میں آکر گلا صاف کیا اور اس میکانکی انداز سے جیسے سینکڑوں مرتبہ یہ داستان دہرا چکا ہو کہنا شروع کیا۔

"بیگم صاحب ان کو تین برس کی عمر میں جر جست بخار آگیا تھا۔ بخار اتر گیا مگر اس کے بعد قد بڑھنا بند ہو گیا۔ حکیم، بید، اور اس کا نام لیجئے — واکدر۔ او جھے، سیانے: سب ترائی کئے ان کے باپ نے۔ مگر نصیبوں جلی اتنی بڑی ہی رہ گئی۔ کیا کرو۔ مکدر۔ آبادیوانی کی عدالت میں ملازم تھے۔ اپنا ذاتی مکان تھا۔ سب کچھ تھا۔ بس قسمت نہیں تھی۔"

"چچ چچ چچ۔" سامعین نے کہا۔

"پھر بیگم صاحب، ان کے باوا کو لقوہ مار گیا۔ وہ مر گئے۔ پھر بیتاری چل بسیں پھر میں اور میری گھر والی ان کو اپنے ہاں لے آئے۔"

"تم کون ہو اس کے۔ ان کے؟" رقیہ نے پوچھا۔

"ان کے گھر کا بہشتی ہوں۔ برسوں ان کا نمک کھایا ہے۔"

"چچ چچ۔ ہا۔" دلی والی کی ساس بولیں۔ ان کے لہجے میں سچی ہمدردی کی جھلک محسوس کر کے بوڑھے نے داستان جاری رکھی۔ "مکان بیس روپیہ مہینہ کرائے پر اٹھا دیا۔ میں سقہ ہوں ذات کا۔ میرے لڑکے آوارہ نکل گئے۔ لکھنؤ جا کر وہ تو بن گئے شہدے۔ ادھر میرے ہاتھوں کے زخم بڑھ گئے تو کام چھوٹ گیا۔ سوچا بٹیا کا مکان بکوا دوں تو دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔ مہاجن کا قرضہ منعرم صاحب پر پہلے سے چڑھا ہوا تھا۔ پھر آپ جانو ہندوستان پاکستان ہو گیا۔ مکان کے دام دو کوڑی کے نہیں رہے۔ اجی مکان تو کیا بکتا منعرم صاحب کے مرنے کے بعد مہاجن نے اس کی قرکی ہی کروالی مجھے اس کے شاگرد پیشے سے نکلنا پڑا اور صاحب، بوڑھا دم اپنے کو رکا۔ پھر ہم سب جا کر کبوتر شاہ کے چھپر تلے پڑ رہے۔ یہ بٹیا جمعرات کی جمعرات نعتیں گاتی تھیں۔ اللہ کے ڈھونے والے چار پیسے دے جاتے تھے۔ پھر صاحب میری گھر والی لڑھک گئی۔ پھر کبوتر شاہ کے تکیے پر جانے کہاں سے آکر چرسیے مدکیے جمع ہونے لگے۔ تب میں نے کہا۔ میں نے کہا۔ بندو خاں اب یہاں سے کوچ کرو۔ میں نے بیگم صاحب بٹیا کو کندھے پر بٹھالا اور بھیک مانگنے نکل پڑے دونوں جنے۔ مگر جس شہر میں باپ منعرم تھے اس میں بٹیا کو بھیک مانگتے لاج آتی تھی۔ ہم لوگ لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں کئی برس بھیک مانگی۔ پھر کسی نے بتایا کہ بمبئی بڑے دھنوانوں کا شہر ہے۔ وہاں چلے جاؤ، تو ٹکٹ کٹا کر یہاں چلے آئے۔ درلی پر جھگی ڈال لی، وہاں سے میونسپلٹی والوں نے اٹھا دیا تو پھر ادھر ادھر فٹ پاتھوں پر سونے لگے۔ دن میں دو ڈھائی روپیہ کی آمدنی ہو جاتی ہے کبھی زیادہ کبھی کم۔ چلو اٹھو بٹیا، کیا یہیں سویرا کرو گی۔ رات تھوڑی سوانگ بہت۔ آؤ۔ چلیں۔"

خواتین مبہوت بیٹھی تھیں سب نے کچھ کے بھکاریوں کی طرف پھینکے جن کے فرش پر گرنے کی آواز نجن میاں کو اندر سنائی دی۔

دفعتاً عورت نے گانا شروع کر دیا ۔ میں نے لاکھوں کے بول بیچے ۔ میں نے لاکھوں کے بول بیچے ؛

گانا ختم ہو گیا تو نجن میاں نے ڈرتے ڈرتے ذرا سا اُٹھ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا ۔ ایک بونی بڑا لمبوترا سا چہرہ ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ، قد چار برس کی بچی کے برابر ، سفید غرارہ پہنے ، گلابی ململ کے دوپٹے سے سلیقے کے ساتھ سر اور ماتھا اس طرح ڈھانپے جیسے عورتیں نماز پڑھتے وقت سر اور ماتھا ڈھانپتی ہیں ۔ صحن کے فرش پر سے ستے چین کر اُٹھی ۔ مخصوص انداز سے جھک کر اس نے بیگمات کو سلام کیا ۔ پھر بچوں کی طرح گودی میں اٹھائے جانے کیلئے بوڑھے کی سمت بانہیں پھیلا دیں ۔ بوڑھے نے یادستگیر کا نعرہ لگایا تھا ۔ سفید داڑھی والا سیاہ فام دیہاتی سقہ جس کی ساری عمر مشک اٹھاتے اٹھاتے کمر جھک گئی تھی ۔ اپنی آقازادی کا مختصر سا بوجھ کندھوں پر اٹھانے کے لئے سیدھا کھڑا ہو گیا ۔ بونی کو اٹھا کر اس نے کندھے پر بٹھایا ۔ بونی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسکا سر پکڑ لیا ۔ بوڑھے نے بیگمات کو سلام کیا اور پھاٹک سے باہر نکل گیا ۔

صحن میں چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی ۔ اب اندھیرا چھا چکا تھا ۔ سڑک کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں ۔ گھر گھر ریڈیو پر بے صدا اونچی آواز میں فلمی گیت گونج رہے تھے ۔ دیوالی آنے والی تھی ۔ اور بلیک مارکیٹ کرنے والے سیٹھوں کے بچے سڑک پر " ایٹم بم " چھوڑ رہے تھے جن کے بھیانک سے دل دہل دہل اچھل پڑتا تھا ۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ساری زندگی میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گئی ہے ، زندہ لاشوں کے پرخچے اُڑ رہے تھے اُڑ رہے ہیں ، انسان اپنی لاشیں خود اپنے کندھوں پر اٹھائے اس جہنم زار میں سرگرداں ہیں ۔ گلی میں انار چھوٹ رہے تھے پھلجھڑیاں ، پٹاخے اور مزید " ایٹم بم " ۔

آتش بازی کے ان دھماکوں کے بعد چند منٹ کے لئے ذرا خاموشی چھائی اور پھر سڑک کے نکڑ پر سے بونی کی آواز بلند ہوئی ۔

" وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر ۔ وہ کرم کہ تھا مرے حال پر ۔ مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا ۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو " آواز دور ہوتی چلی گئی اور " ایٹم بم " کے لرزہ خیز دھماکوں میں کھو گئی ۔

" اے ہے ! اس نگوڑی خدائی خوار بونی کے چکر میں چائے کا وقت بھی نکل گیا ۔ میرے ہزبینڈ آفس سے آتے ہی تیز گرم سبز چائے پیتے ہیں ۔ " نقیہ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دلی والی پڑوسن سے کہہ رہی تھی ، گجراتی ہمسائی کے لڑکے نے نجن میاں کی کھڑکی کے عین نیچے ایک اور " ایٹم بم " چھوڑا جس سے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں لرزنے لگیں ۔

پھر سکوت چھا گیا ۔

ناشر .... شمس زبیری

سرِ ورق .... ظہیر حسین

طباعت .... ضیاء برقی پریس کراچی

اشاعت .... نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء

مقامِ اشاعت

کاشانۂ اردو ۶/۲-۲ اکبر روڈ ۔ کراچی ۲

فون :- ۴۰۱۵۶

اپندر ناتھ اشک

سیپ۔ کراچی

للّن

نل کی چوکور مینڈ پر خاکی سا لنگوٹ پہنے (جو غالباً کسی نیکر کا بچا ہوا حصہ تھا) ہرّیا اپنی پتلی پتلی ٹانگیں اطمینان سے پھیلائے مزے سے بیٹھا تھا۔ اس کا سر قدرے جھکا ہوا تھا اور للّن اس کے بدن پر زور زور سے صابن مل رہی تھی۔ اپنے دوست پروفیسر سین کے گھر جاتے ہوئے ملہوترہ صاحب عموماً اسی راستے سے گزر جاتے تھے۔ یوں وہ ریل کی پٹڑی کے برابر جانے والی سڑک بھی اختیار کر سکتے تھے اور ساؤتھ روڈ بھی۔ لیکن انہیں ریلوے کے دو منزلہ کوارٹروں کے بیچ سے ہو کر جانے والی سڑک کا یہ ٹکڑا نسبتاً پسند تھا۔ بائیں جانب دو منزلہ کوارٹر تھے، جن میں مسٹر میڈلی کے کوارٹر کے برابر نوکروں کے لئے پبلک نل لگا ہوا تھا اور دائیں جانب دس کوٹھریاں تھیں جن میں نچلے طبقے کے ملازم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ یہ لوگ کوارٹروں کے آگے بنے ہوئے دروازوں پر بیٹھے عموماً سبھی گھریلو کام کرتے، عورتیں بال سکھاتیں، کپڑے پہنتیں، ننگ دھڑنگ بچوں کو ٹاٹ پر اُلٹا سیدھا لٹا کر اُن کے بدن پر تیل ملتیں، اناج چھانتیں پھٹکتیں، کھانا پکاتیں، لڑتی جھگڑتیں۔ یہ سربازار انسان کی "پرائیویسی" کی نمائش ملہوترہ صاحب کو نہ جانے کیوں اچھی لگتی ——— پھر اسی قطار کی آخری کوٹھری میں للّن رہتی تھی ——— للّن ——— ان کی نئی نوجوان بھنگن ——— اگرچہ اب تو وہ بھی پرانی ہو چلی تھی، لیکن شربتیا کی بہ نسبت وہ ان کے لئے ابھی نئی تھی۔

کبھی ملہوترہ صاحب چھٹی کے دن بارہ ایک بجے ادھر سے گزرتے تو للّن نل پر نہا رہی ہوتی۔ کبھی گیلی دھوتی میں اُبھرا بدن چھپاتی ہوئی اپنی کوٹھری کی طرف آ رہی ہوتی۔ ملہوترہ اُدھر دیکھ کر بھی نہ دیکھتے۔ کبھی ایسے میں اس کا شوہر ہرّیا اپنی کوٹھری کے آگے بیٹھا بیڑی پی رہا ہوتا۔ اس کے سکڑے سمٹے چہرے پر تصویری چینیوں سی مونچھیں ہونٹوں کے دونوں طرف نیچے کو الف کی طرح لٹکی رہتی ہیں۔ ملہوترہ صاحب کو دیکھ کر ایک مجبور سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔ اس کے پچکے گلوں میں جھرّیاں پڑ جاتیں۔ الف قوسین کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ ہاتھ کی بیڑی کو مٹھی میں چھپا کر انہیں سلام کرتا۔ نہ جانے اس مسکراہٹ میں کیا بات تھی کہ پروفیسر ملہوترہ کو اس میں کچھ عجیب سی بیچارگی، لیکن اس کے باوجود ایک نامعلوم مخالفت کا احساس ہوتا۔ ملہوترہ صاحب کبھی اس کے سلام کے جواب میں خاموش رہ جاتے۔ کبھی ذرا سا سر ہلا دیتے اور کبھی ہنس کر کہتے ——— "کہو بھائی ہرّیا! کیسے ہو؟" ——— لیکن وہ اس کے جواب سننے کے لئے کبھی نہ رُکتے۔ برابر آگے بڑھتے چلتے۔

دُور ہی سے ہرّیا کے صابن لگے جسم سے پھسلتی ہوئی پروفیسر ملہوترہ کی نگاہ للّن پر گئی۔ اس کا رنگ کچھ اور سنولا گیا تھا

بالوں کی پریشان لٹیں چہرے پر لٹک رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے سائے سرک آئے تھے، اور ابھی اس کی عمر پچیس کے ایک سال ادھر ادھر ہی تھی۔ اور ملہوترہ صاحب کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ چند سال پلک جھپکتے گھوم گئے ــــــ اور انہیں وہ دوپہر یاد آگئی جب پہلی بار شربتیا کے پیچھے پیچھے للّن ان کے کمرے میں آئی تھی۔

سہ پہر کے تین ساڑھے تین کا وقت ہوگا۔ ملہوترہ صاحب اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھے ایک تھیسس دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیوی نے آکر کہا ــــــ "شربتیا نئی مہترانی لائی ہے" ــــــ اور پھر مڑکر اسے پکارا تھا ــــــ "آؤ شربتیا!"

شربتیا، ان کی پرانی جمعدارن تھی۔ کچھ دن پہلے اس نے یکایک نوٹس دے دیا تھا کہ وہ لوگ گاؤں جا رہے ہیں اور انہیں چھٹی دے دی جائے۔ ملہوترہ صاحب سمجھتے تھے کہ شاید وہ تنخواہ بڑھوانا چاہتی ہے لیکن جب ایک آدھ روپیہ تنخواہ میں اضافے کے لالچ سے بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور ملہوترہ صاحب کو یقین ہوگیا کہ وہ لوگ واقعی گاؤں جا رہے ہیں تو انہوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے عوض کوئی دوسری قابل اعتماد مہترانی لگا دے تو اسے چھٹی دے دی جائے گی۔

پردہ اٹھاکر شربتیا اندر آئی اور اس کے پیچھے اس کے ساتھ لگی لگی گول چہرے اور کاجل لگی آنکھوں والی پتلی چھریری سانولی سی نوجوان لڑکی داخل ہوئی۔ اس نے دھوبی کی دھلی چھپی ساڑی اور ریشمی بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے گلے سے چاندی کی ہنسلی اور کانوں میں بُندے جھم جھم کر رہے تھے۔ شربتیا بے حد گورے رنگ اور دراز قد کی عورت تھی، خوبصورت بھی تھی اور جوان بھی، مگر اس میں کچھ عجیب سا ڈھیلا پن تھا۔ یہ لڑکی اپنے سانولے پن کے باوجود اپنے جسم کی ساخت بڑی بڑی آنکھوں کے پھیلاؤ، لباس کے انتخاب اور کھڑے ہونے کے کچھ عجیب سے انداز کے باعث اس سے کہیں حسین نظر آتی تھی۔ وہ شربتیا کے ساتھ نہ آئی ہوتی تو ملہوترہ صاحب یقیناً اسے کسی بھلے گھر کی ملازمہ یا تمبولن سمجھتے۔

یہ کیا مہترانی کا کام کرے گی! ــــــ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ لیکن اس سے سوال کیا ــــــ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"للّن۔"

"تو تو بھئی اتنی بنی سنوری ہے۔ تو کیا یہ سب کام کر لے گی؟" ــــــ للّن شرما گئی۔

شربتیا نے جواب دیا ــــــ "صاحب! اس کی ابھی مہینہ پہلے سادی بھئی ہے۔ کام کرنے میں ہُسیار ہے، آپ پھکر نہ کریں!"

"تم تو جانتی ہو شربتیا۔ ہمارے یہاں سب کچھ کھلا رہتا ہے۔ ہمیں مہترانی بھروسہ والی چاہیئے۔"

"آپ فکر نہ کریں صاحب۔ آپ کو شکایت نہ ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے کیا کیا کام کرنا ہوگا، اور کتنا روپیہ مہینہ ملے گا، یہ سب تم اسے سمجھا دو!"

اور دونوں چلی گئیں۔ بیوی کو ملہوترہ صاحب نے اشارے سے روک لیا۔

"بھئی اتنی بناؤ سنگار والی لڑکی، مجھے امید تو نہیں کہ یہ ٹھیک سے کام کرے گی!" ــــــ انہوں نے کہا ــــــ "شربتیا کمبخت رہ جاتی، تو کتنا اچھا ہوتا!"

"وہ تو رُک نہیں سکتی!" ــــــ ان کی بیوی بولی۔ "مگر اس نے یقین دلایا ہے کہ للّن کام کرنے میں چست ہے اور قابل اعتماد بھی ہے۔ دور کے رشتے سے وہ اس کی نند ہوتی ہے۔!"

بیوی چلی گئی۔ ملہوترہ بھی تھیسس پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔ مگر ان کی آنکھوں میں للّن کی بڑی بڑی کاجل لگی آنکھیں۔ کمر کا بَل اور کانوں کے جھمجھاتے آویزے لہراتے رہے۔ . . . . . کر چکی کام۔ یہ مہترانی!

لیکن ان کے اندیشے یک سر غلط ثابت ہوئے۔ للن نے نہ صرف وہ کام سنبھال لیا جو شربتیا کرتی تھی، بلکہ وہ کمروں کی صفائی بھی کرنے لگی۔ ملہوترہ صاحب کی اسٹڈی جھاڑنے پونچھنے، میز کا سامان سجانے اور کتابیں الماری میں ٹھیک جگہ قرینے سے رکھنے لگی۔ ان کے، ان کے بیوی بچوں کے جوتوں پر پالش کرنے لگی، روز بدلے جانے والے کپڑے دھونے لگی۔ اور جیسے جیسے وہ کام سنبھالتی گئی، اس کی تنخواہ بھی بڑھتی گئی۔ کموڈ صاف کرنے کے بعد کسی کپڑے دپٹے کو ہاتھ لگانے سے قبل وہ ہمیشہ ہاتھ اور کہنیوں تک بانہیں صابن سے دھو لیتی۔ سہ پہر کو جب وہ آتی تو ہمیشہ نہا کر صاف دھوتی پہنے ہوتی۔ وہ نہ صرف خود صاف رہتی بلکہ گھر کو بھی صاف ستھرا رکھتی تھی —— مسز ملہوترہ تو اس کے کام سے اتنی خوش تھیں کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ صبح کام کر کے جاتی ہے اور نہا کر کھانا پکاتی ہے تو انہوں نے اسے دو دھوتیاں لے دی تھیں کہ ان کے گھر وہ آئے تو ہمیشہ نئی دھلی دھوتی پہن کر آئے اور ایک دن تو انہوں نے اپنے شوہر سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر للن بھنگن کا کام نہ کرے تو وہ اسے گھر میں اوپر کے کام کاج کے لئے رکھ لیں۔

للن کو آئے ہوئے چار پانچ ماہ ہی ہوئے تھے کہ پروفیسر ملہوترہ بری طرح بیمار ہو گئے۔ فروری کا مہینہ تھا مگر دھوپ میں کچھ تیزی آ گئی تھی۔ ایک دن انہوں نے پیریڈ دو بجے لینا تھا۔ ۱۲ بجے کے قریب انہیں کچھ ایسی گرمی محسوس ہوئی کہ انہوں نے پوری آستین کا کارڈیگن اتار دیا۔ یونیورسٹی جاتے وقت صرف قمیص پر کوٹ پہن گئے۔ انہیں خیال تھا کہ صرف ایک پیریڈ پڑھا کر دھوپ دھوپ میں چلے آئیں گے لیکن یونیورسٹی کی ایک میٹنگ میں وہ پکڑ لئے گئے۔ اس دوران نہ جانے کہاں سے بادل گھر آئے اور بوندا باندی ہونے لگی۔ ایک تو سردی دوسرے پانی اور تیسرے تیز ہوا۔ وہ بری طرح بھیگ گئے۔ اگرچہ آتے ہی انہوں نے سوٹ اتار کر نئی قمیص پتلون، پوری آستین کا کارڈیگن اور اوور کوٹ تک پہن لیا لیکن انہیں برابر سینے کے دائیں طرف چبھن سی محسوس ہوتی رہی۔ تمام رات وہ کھانستے رہے صبح اٹھنے لگے تو ان سے اٹھا نہ گیا۔ سر میں درد تھا، گلا درم کر آیا تھا اور بدن ٹوٹ رہا تھا۔ تھرما میٹر لگایا تو ٹمپریچر ۱۰۱ تھا۔ ڈاکٹر کو بلوایا تو اس نے کہا کہ انفلوئنزا ہے۔

لیکن اس انفلوئنزا نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی کہ ملہوترہ دو ماہ تک صاحب فراش رہے۔ وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے، اسی بیماری میں کب للن ان کے پیر دبانے لگی، یہ انہیں یاد نہیں۔

دوپہر کو جب وہ سونا چاہتے اور انہیں نیند نہ آتی اور پیروں اور پنڈلیوں میں عجیب سی کسمساہٹ ہوتی، بدن ٹوٹتا اور وہ بے حد بے چین ہو جاتے تو اپنی بیوی سے ذرا بدن دبانے کی فرمائش کرتے۔ ان کی بیوی ایکزیکیٹو انجینئر باپ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ گورا گدرایا، نرم و نازک ان کا جسم اور نازک نازک ان کے ہاتھ تھے۔ وہ دبانے کی کوشش کرتی مگر اس کے ہاتھ دکھنے لگ جاتے، اور ملہوترہ صاحب کو ذرا بھی راحت نہ ملتی، اور وہ جھلا جاتے۔ اسی وقت للن شام کو صفائی کرنے کے لئے دوسری بار آتی۔ اسے دیکھ کر مسز ملہوترہ کہتیں —— "للن ذرا ہاتھ دھو کر صاحب کے پاؤں دبا دے!" —— اور للن ان کے پاؤں دبانے لگتی۔

لیکن یہ تو بیماری کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ بعد میں تو ملہوترہ صاحب براہ راست اسی سے کہہ دیتے۔

للن اگرچہ پتلی دبلی نازک اندام تھی، مگر اس کے ہاتھوں میں فولادی قوت تھی۔ وہ پہلے ان کی پنڈلیاں دباتی۔ پھر ٹخنے، پھر ایڑیاں، پھر تلوے، پھر انگلیاں اور ناخون۔ ان سب کے بعد وہ ان کی انگلیوں کو چٹخا کر پورے کا پورا پیر دبا دیتی۔ کبھی کبھی وہ ان کے گھٹنے اور کمر بھی دباتی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس سے درد کی گٹھلیاں جیسے چور چور ہو کر بکھرنے لگتیں۔ ساتھ ہی وہ بہت میٹھے لہجے میں ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور اس کی باتیں سنتے سنتے وہ سو جاتے۔

ایک دوپہر للن پھر دھوبی کی دھلی رنگین دھوتی پہنے آئی۔ شاید اس روز اس نے ابٹن مل کر غسل کیا تھا۔ اس کا چہرہ چمک

سا اتھا، ماتھے پر سیندور کی بڑی سی بندی تھی اور گال میں پان دبا ہوا تھا جس کی سرخی سے ہونٹ تر تھے۔ اس دن ملہوترہ صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ للّن اگر بھنگن کا کام چھوڑ دے تو واقعی وہ گھر کے اوپر کے کام کاج کے لئے رکھی جا سکتی ہے۔

اور جب وہ ان کے پاؤں دبا رہی تھی تو انہوں نے اس سے اپنی بیوی کی خواہش کا ذکر کیا۔

"ہم تو آ جائیں صاحب!" — للّن نے سنجیدگی سے کہا — "پر جمعدار نہیں مانے گا!"

اور اس نے بتایا کہ جمعدار — یعنی ہر تیا قطعی نکما، شرابی اور جواری ہے۔ وہ ان کے ہاں سے جو تنخواہ پاتی ہے اسی سے گھر کا خرچ چلاتی ہے۔ وہ تو اپنی تنخواہ میں سے کوڑی بھی نہیں دیتا۔

"تمہارے باپ نے دیکھ بھال کر نہ کی تھی شادی؟" ملہوترہ صاحب کو یکایک اس سے ہمدردی ہو گئی۔

"ہم تو چار برس کے تھے صاب! جب ہماری سادی ہو گئی تھی۔ گونا ابھی ہوا ہے۔"

"تو کیا تم کو تنخواہ بھی نہیں دیتا —؟"

"دیئی کا صاب! الٹا ہمیں سے مانگت ہے۔ نہیں دیتے تو مارے دوڑت ہے!"

"کہاں اڑاتا ہے اپنی تنخواہ —؟"

"ایک ہی حرامی ہے صاب، اِ دارو پیّت ہے اور جوا کھیلت ہے!" — للّن نے کہا — "کل ہنسلی مانگت رہا، گروی رکھے کو، ہم انکار کیا تو اس نے ہنسلی پر ہاتھ رکھا۔ ہم کھانا پکاوت رہے، چولہا سے جلتی لکڑی کھینچ کے ہم کہا کہ ہاتھ ہٹائے لے، نہیں تو بانہہ توڑ دیب، تب لگا بانہہ چھوڑ کر گریانے۔ ہم تو صاب، سب گہنا پتہ اماں کے پاس رکھ دیا ہے۔"

ملہوترہ صاحب نے کروٹ بدلی اور پیٹ کے بل لیٹ گئے — "للّن! ذرا میری کمر دبا دے!"

"صاب ہم کو اب چھٹی دیں۔ ابھی ہمیں سارا کام دیکھے کا ہے۔ دیر ہو جائے گی تو جمعدار چلّائے گا۔"

"ذرا سا دبا دے!" — ملہوترہ صاحب نے بڑی عاجزی سے کہا — "اس بیماری نے خون چوس لیا ہے۔ ذرا بھی طاقت نہیں رہی" — پھر وہ ذرا ہنسے — "عمر بھی تو ڈھل گئی ہے۔ بڈھا ہو گیا ہوں!"

للّن بھی ہنسی — "ارے صاب! ابھی کہاں بڈھا ہو گیا۔ ہمارا جمعدار تو دیکھنے میں تم سے بھی بڈھا لگتا ہے!"

"کتنی عمر ہے اس کی —؟"

"ہم سے چار چھ سال بڑا ہوئی —!"

"تو مجھ سے کیسے بڈھا ہو گیا؟ — میں تو چالیسواں پار کر رہا ہوں!"

"ارے صاب! چالیس پچاس سے کا ہوت۔ تم تو ابھی دو سادی اور کر لو!"

اور وہ ہنسی —

"ایک ہی بنی جائے تو بڑی بات ہے!" — ملہوترہ صاحب بھی ہنسے۔

للّن چپ چاپ ان کی کمر دبانے لگی۔ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف جو گٹھلیاں سی پڑی ہوئی تھیں وہ للّن کے ہاتھوں کے دباؤ سے آہستہ آہستہ بکھرنے لگیں مگر کولہے، ران، للّن دباتی گئی اور ملہوترہ صاحب چاہتے رہے کہ وہ دباتی رہے، ان کے درد کی گٹھلیاں پگھلتی رہیں۔ ایک لطیف سی راحت ان کے جسم کو ملتی رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ یکایک اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"صاب! ہم جائت رہے۔"

"اسے ذرا پیروں کی انگلیاں توچٹخا دے!" ——— انہوں نے کروٹ بدلی۔
للّن کی آنکھوں میں کچھ عجیب سا حجاب تھا، اور اس کے رخسار تمتما آئے تھے۔
"نہیں صاب! اب ہم جائت ہے!"
اور وہ بھاگ گئی ——— !

شام کو ملہوترہ صاحب سیر سے لوٹے، تو بنگلے کے پیچھے گودام اور کچن کی طرف انہیں شور سا سنائی دیا۔
ان کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ بخار پندرہ بیس دن قبل ٹوٹ گیا تھا۔ انہوں نے کھانا کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور دوپہر کو ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد وہ چہل قدمی بھی کرنے لگے تھے شور سن کر وہ بنگلے کے پچھواڑے گئے۔ گودام کے برآمدے میں ستون کی آڑ میں للّن کھڑی تھی اور ایک تپلا دُبلا مریل سا آدمی باہر کھڑا چلا رہا تھا۔
ملہوترہ صاحب سمجھ گئے کہ وہ کون ہے۔ لیکن انہوں نے ڈپٹ کر کہا ——— کون ہو تم؟ کیوں چلا رہے ہو؟"
"جی، میں ہریا ہوں!"
"کون ہریا ———؟"
"جی، آپ کا جمعدار!"
"تو چلا کیوں رہے ہو ———؟"
"جی، یہ للّن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
وہیں ستون کے پیچھے سے للّن چلائی ——— صاب! یہاں سے کام کر کے جانے میں جرا دیر ہوئے جات ہے تو گریا وت ہے ہاتھ اٹھاوت ہے!"
ہریا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ملہوترہ صاحب گرجے ——— بکو مت، بھاگو یہاں سے!
شہ پا کر للّن ستون کی آڑ سے ذرا سا نکلی ——— "مارو صاب اس کے دو جوتے!" ——— اور پھر ہریا سے بولی ———
"ہم ناجاب، ایہیں رہب، جا بھاگ جا!"
ملہوترہ صاحب نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا، اپنے شوہر کو اس کا یوں دھمکانا انہیں کچھ خاص ناگوار نہ گزرا۔ لیکن اسے دو جوتے لگانے کو کہنا انہیں نہایت نامناسب لگا۔ پھر ان کی نظر ہریا پر گئی ——— ٹوٹے بٹنوں والی قمیض کے گریبان میں اس کے دھنسے ہوئے سینے کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے کمر میں میلی سی لنگی لپیٹ رکھی تھی۔ سر اور پیر سے ننگا تھا۔ سوکھے سکڑے چہرے پر چینیوں کی سی مونچھیں اور گٹھئی دانت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہیں کچھ عجیب سی گھن معلوم ہوئی اور جہاں ان کے دل میں للّن کی بدزبانی کے لئے کچھ غصہ پیدا ہوا تھا، وہاں دونوں کو ایک نظر دیکھ کر اس سے کچھ ہمدردی ہی ہوئی۔ انہوں نے جمعدار کو ڈانٹا کہ وہ اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا ہے، کھانے پینے کو نہیں دیتا، اپنی سب کمائی شراب میں اڑا دیتا ہے۔ وہ کیسے اس کے گھر رہے گی۔ وہ ایک دم وہاں سے دفعان ہو جائے۔ ورنہ وہ اسے چار جوتے لگائیں گے اور پولیس کو بلوا کر حوالات میں بند بھی کرا دیں گے۔
ہریا جھٹ ان کے قدموں پر گر گیا، اور گڑگڑانے لگا کہ وہ للّن کو کچھ نہ کہے گا، ساری تنخواہ لا کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیگا اور شراب قطعی چھوڑ دے گا۔
اب ملہوترہ صاحب یہ نہ سوچ سکے کہ وہ کیا کہیں۔ جمعدار ان کے قدموں میں جھکا ہوا تھا ——— انہوں نے للّن سے

بھاگ کے گھر جانے اور اگر جمعدار پھر اسے تنگ کرے تو وہ ان سے کہے۔ للن نے ایک دو بار تو انکار کیا لیکن پھر ان کے سمجھانے بجھانے پر وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

ملہوترہ صاحب مطالعہ کے کمرے میں آ بیٹھے اور میز پر پاؤں رکھ کر اسپرنگ دار کرسی پر پیچھے کو نیم دراز ہو گئے۔ ان کی بیوی ان کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی ـــــ

"للن یہاں آ رہے تو میں سچ مچ دوسری مہترانی رکھ لوں گی!" ـــــ اس نے کہا۔

ملہوترہ صاحب نے بے پروائی سے پوچھا ـــــ "رہے گی کہاں؟"

"گودام کے برآمدے میں!

"سردی نہ لگے گی"؟

"اب سردیاں ہیں کتنے دن! ـــــ اگلے ماہ لوگ باہر سونے لگیں گے۔ اور پھر ٹاٹ لگا دیں گے برآمدے میں!"

"لیکن وہ گھر میں کیسے رہ سکتی ہے؟" ـــــ ملہوترہ صاحب نے کہنا چاہا ـــــ "مہترانی ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے رشتہ دار ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن مسز ملہوترہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ان کے ایگزیکٹیو انجینئر پتا کے یہاں مسلمان خانساماں تھا۔ بولیں ـــــ "یہ سب بیرے، خانسامے کیا اونچی ذاتوں کے ہیں؟ یہی پاسی چمار یا مہتروں سے بنے ہوئے عیسائی! میں تو جب مالک مکان کی بیوی کو دیکھتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور مہترانی سے عیسائی بنی ہے۔ مسٹر ہولڈن خواہ خالص انگریز ہوں، مگر وہ کالی کلوٹی میم تو یقیناً پیدائشی مہترانی ہے، یہ للن اس سے کیونکر بری ہے! اور ہم مسز ہولڈن کے ہاں چائے بھی پی لیتے ہیں اور کھانا بھی کھا لیتے ہیں۔ للن یہ کام چھوڑ دے تو میں ضرور رکھ لوں۔"

بیوی ایک ہی سانس میں یہ ساری باتیں کہہ گئیں۔ ملہوترہ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا ـــــ یہ عورتیں کتنی بے وقوف ہوتی ہیں۔ جذبات کے آگے حقائق کو قطعی فراموش کر دیتی ہیں۔ ناک کے آگے چار قدم پر کیا ہے، یہ نہیں دیکھتیں! ـــــ انہوں نے ایک لمحہ کو آنکھیں بند کر لیں۔ بیوی کی بات ان کے کانوں میں گونج گئی ـــــ للن یہاں آ کر رہے تو میں دوسری مہترانی رکھ لوں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ للن یہاں آ کر رہے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ للن یہاں آ کر رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاف ستھری سگھڑ للن، جو تھکے ہوئے جسم کو دبانے میں مشاق تھی درد کی گٹھلیوں کو نامعلوم طریقے پر پگھلا دیتی تھی۔ جو شیریں زبان تھی (شوہر سے خواہ کیسی ہی جھگڑتی ہو مگر ان کے گھر میں ہمیشہ نہایت نرمی سے منمناتی رہتی تھی)، کاجل لگی بڑی بڑی آنکھوں والی تھی۔ اور جس نے نہ جانے کیسے اجنتا کی حسیناؤں کے سے انداز میں کمر کو خم دیکر تربھنگی مدرا میں کھڑی ہونا سیکھ لیا تھا۔ اجنتا میں ان سانولی سلونی دوشیزاؤں کو (جو راج کماریاں تھیں) ملہوترہ صاحب نے جب اس انداز میں دیکھا تو انہیں خیال ہوا تھا کہ یہ انداز محض فن کار کے تخیل کی پرواز ہے۔ کمر کو ایسا بل دے کر کوئی نازنین کھڑی نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہاں یہ للن ۔ ۔ ۔ یہ جاہل گنوار مہترانی کبھی کبھی اس انداز میں کھڑی بالکل اجنتا کی دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔ بس اگر اس کے بالوں کا جوڑا بھی ویسا ہو تو کوئی فرق نہ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ للن یہاں آ کر رہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کے تصور میں للن وہاں آ کر رہنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے تخیل نے ایک اور پرواز کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن معاً ان کے تمام جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی اور وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی ٹانگیں میز کے نیچے آ گئیں، کمر سیدھی ہو گئی اور تھیسس کا مسودہ ان کے آگے آ گیا۔

ان کی بیوی ابھی وہیں کھڑی تھیں۔

"تم بے وقوف ہو!" ـــــ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا ـــــ "للن کیسی بھی صاف ستھری کیوں نہ ہو، کتنا ہی

اچھا کام کیوں نہ کرتی ہو۔ ہم ذات پات میں کتنا ہی کم اعتقاد کیوں نہ رکھتے ہوں۔ مگر وہ میاں آکر رہنے لگی تو میرا ایک بھی رشتہ دار یہاں کھانا نہ کھائے گا!

اور پروفیسر ملہوترہ تعیس میں ڈوب گئے۔

چند دن بعد ایک شام للن پھر بھاگ آئی۔ اب کے ہریا سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ اس شام کے بعد اس نے شراب کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ لڑتی ہے۔۔۔۔

"اب صاب ہم گریب بہترا ___ ہریا بولا ___ "دھوبی کا دُھلا کپڑا کہاں پہن سکت ہے، بار بار کیسے ہاتھ پاؤں دھوتے سکت ہے!"

للن سے معلوم ہوا کہ اس نے پھر اس پر ہاتھ چلایا ہے اور اس کے جھمکے چھین کر انہیں رہن رکھ آیا ہے۔

اس بار للن کا باپ بھی پہنچا اور اسے سمجھا بجھا کر لے گیا۔ دوسرے دن سہ پہر کو للن ملہوترہ صاحب کا بدن دبا رہی تھی کہ انہوں نے پوچھا ___ "للن! تم کیوں لڑتی رہتی ہو روز ہریا سے؟"

"صاب، دارو پیت ہے۔ ہمارا گہنا اٹھا کر رہن رکھ دیت ہے، کچھ کہیں تو مارے دوڑت ہے!"

"وہ تو کہتا ہے کہ اس نے شراب چھوڑ دی ہے!"

"کھاک چھوڑ دیہس ہے۔ ابھی رات لڑا اور کھوب دارو پی آیا۔"

"کیا بات ہوئی؟"

"کچھ نہیں صاب۔۔۔۔" اور وہ خاموش ہو گئی۔

"پھر بھی؟"

"صاب گندا سندا کپڑا پہنے رہت ہے۔ بولت ہے تو گاری دے لگت ہے، کہت تم وہیں صاب کے جلئے رہو۔ ان سے کہو تمہیں بنگلہ بنائے دیں ___ اور کھوب دارو پی آوت ہے۔ ایک ہی حرامی ہے صاب۔۔۔۔"

للن بڑی تن دہی سے ان کی پنڈلیاں دبا رہی تھی۔ ملہوترہ صاحب لمحہ بھر خاموش رہے، پھر قدرے ہنس کر انہوں نے کہا۔

"اب تم اسے اپنے قریب نہ آنے دو گی تو لڑے گا نہیں! دارو نہ پئے گا، اور تمہارے ساتھ تمہارے صاب کو بھی گالی نہ دے گا؟"

"نہیں صاب، آپ کا گالی کیسے دے سکت ہے؟ مجال ہے اوکر!"

ملہوترہ صاحب نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں، اسی طرح ہنستے ہوئے ذرا دھیمی آواز میں بولے ___ آخر بات کیا ہے للن، تمہیں کیوں نفرت ہے اس سے؟"

للن ہچکچائی۔ پھر ناک بھوں چڑھاتی ہوئی سرگوشی میں بولی ___ "صاب، گندھات ہے!"

اب ملہوترہ صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں ___ وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسے اور بولے ___ "صندل سوپ کی ٹکیا باتھ روم سے لے جا! اسے نہلا دھلا! ٹھیک ہو جائے گا!"

"صابن نا اُسے ملیں گے، جوتا ماریں گے!" ___ للن بولی ___ ایسے ہی ہم کو تنگ کرے گا تو ہم اپنی ماں کے گھر چلے جائیں گے، پنچائت کریں گے اور چھٹی کر لیں گے۔ بابو کہت رہا، ڈدی سوسیاکادی کا پڑی میم صاب کہتی ہیں، للن تم بیاہ کر لو۔ میم صاب ہمری کچھ مدد کریں، تو ہم او حرامی سے چھٹی پائے جائیں۔!"

"ہاں، تم اس سے طلاق لے کر کسی دوسرے اپنے من پسند ساتھی کے گھر جا بیٹھو!"

"صاب! اپنے بھاگ میں جب سکھ نہیں، تو کہاں ملی، ہمری جات میں سب دارو پیت ہیں، گاری دیت ہیں اور عورت کا پیٹت ہیں۔ آپ صاب ہمیں چھٹی دلائے دیں تو ہم یہاں آپ لوگن کی سیوا کریں!"

اور للن بڑی عقیدت سے ملہوترہ صاحب کے گھٹنوں کے جوڑ دبانے لگی۔ گھٹنوں کے جوڑوں کے دونوں طرف دباتے دباتے وہ ذرا اوپر ران دبانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کے دباؤ سے ملہوترہ صاحب کو بہت راحت ملنے لگی۔ چارپائی کی پٹی کے دوسری طرف کی ران دبانے کو وہ کچھ اور جھک گئی تھی، اور بڑی لگن سے دبا رہی تھی کہ یکایک ملہوترہ صاحب نے ٹانگیں سکوڑ لیں ——

"للن اب تم جاؤ تمہیں دیر ہو جائے گی۔"

"نہیں صاب ہم دبائے دیت ہے تم سوئے جائے۔" اور اس نے تلوے دبانے کو ان کے پیر کھینچے۔

"نہیں للن، تم جاؤ۔ تمہیں دیر ہو جائے گی تو جمعدار چلائے گا۔ اب میں ٹھیک ہوں، سو جاؤں گا۔"

للن ان کے پیر کی انگلیاں چٹخانے لگی تھی کہ انہوں نے پیر بھی کھینچ لیا —— "بس، اب تم جاؤ!"

اور کمبل تھوڑی تک اوڑھ کر انہوں نے کروٹ بدل لی۔

اس دن کے بعد ملہوترہ صاحب نے پھر للن سے پیر نہ دبوائے۔ ان کا کمرہ تو وہ ہمیشہ ان کی عدم موجودگی میں جھاڑتی تھی۔ مگر اگالدان عموماً ان کے سامنے ہی لے جاتی۔ ملہوترہ صاحب کبھی اس کی طرف نہ دیکھتے اور کام میں مصروف رہتے۔ کچھ دن بعد بیوی سے انہیں معلوم ہوا کہ للن اپنے باپ کے ہاں آگئی ہے —— پھر معلوم ہوا کہ ہریا پنچائت بلانے کو کہہ رہا ہے۔ ان کی بیوی نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ دو سو روپے دے دیں تو للن بے چاری کو اس شرابی جواری ہریا سے نجات مل جائے!

ملہوترہ صاحب نے بیوی کی بات سن کر بھی ان سنی کر دی اور اپنے کام میں مصروف رہے —— پھر کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ ہریا نے پنچائت بلائی ہے —— پھر سنا کہ اس نے پنچوں کے سامنے عہد کیا ہے کہ وہ شراب نہیں پئے گا اور للن کے سب زیورات بھی واپس لا دے گا، اور پنچوں اور والدین کے زور دینے پر للن بادل ناخواستہ ہریا کے ساتھ چلی گئی ہے —— پھر کچھ دن بعد خبر ملی کہ للن حاملہ ہے۔

للن کے لڑکا ہوا۔ ایک ماہ وہ نہیں آئی۔ اس درمیان اس کی ماں اور بھاوج کام کرنے کو آتی رہیں۔ دونوں گندی اور میلی کچیلی تھیں۔ ملہوترہ صاحب کی بیوی انہیں گھر کے اندر نہ آنے دیتی۔ وہ باہر ہی باہر صفائی کر کے چلی جاتی۔ ایک دن للن کی ماں ملہوترہ صاحب کی نظر کے سامنے پڑ گئی۔ اگرچہ اس نے فوراً گھونگھٹ سرکا لیا۔ تاہم اس کا رنگ، تیکھا ناک نقشہ اور نیلی نیلی آنکھیں انہوں نے دیکھ لیں۔ یقیناً اس کی رگوں میں کسی انگریز کا خون ہے۔ انہوں نے سوچا — اس علاقے میں آزادی سے پہلے انگریز ہی تو رہتے تھے۔ للن نے انگریز کا رنگ و روپ نہ سہی مگر مزاج ضرور پایا ہے۔

اور ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم آگیا۔

ایک ماہ بعد للن آنے لگی۔ صبح وہ لڑکے کو ماں کے پاس چھوڑ آتی۔ شام کو کبھی اس کی بہن اسے گود میں لئے ساتھ آتی۔ کبھی ہریا اسے کندھے سے چپٹائے آجاتا۔ ملہوترہ صاحب کی بیوی کو ہریا کی صورت سے نفرت تھی۔ وہ اسے بنگلے کے اندر بھی نہ آنے دیتیں۔ وہ بچے کو کندھے سے لگائے بنگلے کے باہر گیٹ کی پلیا پر بیٹھا رہتا۔ کبھی ایسے میں ملہوترہ صاحب یونیورسٹی سے واپس ہوتے تو وہ بچے کو لئے اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے سوکھے سکڑے چہرہ پر مسکراہٹ کی جھریاں پھیلا کر اپنے کتھئی دانت دکھاتا ہوا انہیں سلام کرتا۔

ملہوترہ صاحب "کہو کبھی ہریا! کیا حال چال ہے" کہتے ہوئے اس کا جواب سنے بغیر بڑھے چلے آتے۔ کبھی للن انہیں راستے میں مل جاتی یا ان کے کمرے میں اگالدان اٹھانے آتی تو ان کی نظر اس پر پڑ جاتی اور انہیں حیرت ہوتی کہ ایک بچے کی ماں ہونے کے بعد بھی للن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے انگیا نما بلاؤز کے نیچے اس کی کمر ویسی ہی پتلی چھریری تھی۔ اس کا پیٹ ویسا ہی پچکا اور تنا تھا۔ سینے کا ابھار قدرے بڑھ گیا تھا۔ رنگ نکھر گیا تھا ـــــــ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی کی تصویر آجاتی، جس کی کمر ایک بچے کی پیدائش کے بعد ہی اپنی تمام لچک کھو بیٹھی تھی۔

لیکن ان کی بیوی نے پھر کبھی للن کو آیا بنا کر رکھنے کی خواہش کا اظہار نہ کیا۔ اس کا اپنے بچے کو ساتھ لے کر آنا مسز ملہوترہ کو بے حد ناگوار ہوتا۔ مگر ملہوترہ صاحب کو اب پھر کبھی کبھی خواہش ہوتی کہ للن ان کے پیر دبائے۔ گرمیوں کی دوپہر میں جب ان کی پنڈلیوں میں کسمساہٹ ہوتی اور انہیں نیند نہ آتی تو یہ خواہش اور شدید ہو جاتی۔ لیکن دوپہر کو جمعدار ساتھ آتا تھا۔ پھر عموماً اس کا بچہ باہر پڑا روتا رہتا۔ اسے کام نمٹا کر جانے اور بچہ کو دودھ پلانے کی عجلت ہوتی اور ملہوترہ صاحب کروٹیں بدلتے رہتے۔

بچہ کی پیدائش کے بعد اگرچہ للن کے جسمانی حسن میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا، لیکن اس کا وہ سجنا سنورنا ختم ہو گیا تھا۔ ملہوترہ صاحب کو اس کا وہ بچہ ایک آنکھ نہ بھاتا۔ بچہ تو بچہ ہوتا ہے، خواہ وہ بھنگی کا ہو، یا چمار کا۔ بچہ تو گدھے کا بھی کدکڑے لگاتا ہوا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ مگر للن کا یہ بچہ ملہوترہ صاحب کو ذرا بھی اچھا نہ لگتا۔ وہ نہ اپنی ماں پر تھا، نہ نانی پر۔ وہ اپنے باپ پر تھا یا شاید دادا پر، کیونکہ ناک تو ہریا کی بھی تیکھی تھی۔ اس بچے کی ناک بہت پھیلی تھی۔ اور چہرہ بالکل سفس تھا۔ للن نے بڑے پیار سے اس کا نام رکھا تھا 'رام دُلارے' ـــــ جب یہ رام دلارے ایک سال کا ہو گیا تو للن صبح بھی اسے اپنے ساتھ لانے لگی۔ وہ زمین پر ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا کر ایک میلا سا گدا ڈال دیتی اور اسے لٹا دیتی۔ اس کے پاس وہ اپنی چھوٹی بہن کو بٹھا دیتی اور اپنا کام دیکھتی۔ رام دلارے خوب روتا۔ لڑھکتا ہوا گدے اور ٹاٹ کے نیچے مٹی میں لوٹنے لگتا۔ ناک بہہ کر اس کے ہونٹوں پر آجاتی اور اس پر مٹی لگ جاتی اور ملہوترہ صاحب کو اس سے بڑی گھن آتی۔ پہلے للن ان کے مطالعہ کے کمرے کے باہر پورچ میں اسے لٹا دیا کرتی تھی، پھر ملہوترہ صاحب کے کہنے پر وہ اسے پیچھے گودام کے برآمدے میں لٹانے لگی۔ ملہوترہ صاحب جب بھی للن کو دیکھتے ان کے سامنے اس گندے بچے کی تصویر آجاتی اور وہ آنکھیں پھیر لیتے۔ جب تک للن وہاں رہتی وہ کبھی بنگلے کے عقبی حصے میں نہ جاتے اور اگر کبھی وہ بچے کو گود میں لئے ان کے سامنے آجاتی تو وہ منہ دوسری طرف کر لیتے۔

للن کا یہ بچہ تین برس کا تھا کہ بدلتی رُت میں اُسے خسرہ نکل آئی۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے یا دوا پلانے کے بجائے وہ اسے کلیانی دیوی کے مندر پر ماتھا ٹکانے لے گئی۔ مندر میں ماتھا ٹکا کر وہ گنگا اشنان کرنے چلی گئی۔ بچہ سردی کھا گیا، اور اس وقت جب وہ سمجھ رہی تھی کہ خسرے کو آرام آرہا ہے، دراصل بچہ کو نمونیہ ہو رہا تھا۔ یہی نمونیہ ڈبل نمونیہ میں بدل گیا، اور ہفتہ کے اندر ہی اندر بچہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

للن ہریا کو خواہ چاہتی ہو یا نہ چاہتی ہو۔ مگر رام دلارے کو بہت پیار کرتی تھی۔ اس کے پیار میں اس نے ہریا کے خلاف اپنے غم و غصہ کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ ہریا گھر میں کچھ دیتا ہے یا نہیں۔ اس کی فکر اس نے چھوڑ دی تھی۔ وہ دن رات اپنے رام دلارے میں مگن رہتی تھی۔ بچہ کی موت کا اسے بے حد غم ہوا۔ روتے روتے وہ آدھی بھی نہ رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں گڈھے پڑ گئے۔ اور جسم ڈھلک گیا۔

اس بار گنگا بہت شدید پڑی۔ ایک ماہ قبل لُو لگ جانے سے شہر میں کئی موتیں ہو گئیں۔ ملہوترہ صاحب بھی ایک دن

تو کھا گئے، اور کئی دن تک بخار میں بھنتے رہے۔ جب بخار اترا تو انہیں بہت کمزوری محسوس ہوئی۔ گھٹنوں میں یوں بھی ان کی پنڈلیاں دُکھنے لگتی تھیں۔ کمزوری نے اور پریشان کر دیا۔ ان کی جان بھی ٹوٹنے لگی۔ ایک دن انہوں نے بیوی سے ذرا پیر دبانے کو کہا۔ بیوی نے للن سے کہا، اور وہ پھر ان کے پیر دبانے لگی۔ ملہوترہ صاحب نے اس بار محسوس کیا کہ للن کے ہاتھوں کا لوچ کچھ کم ہو گیا ہے۔ انہوں نے جب اسے کچھ زور سے پنڈلی دبانے کو کہا تھا۔ تو وہ بولی —— "صاب، اب ہم بھی بڈھا ہو گیا ہے۔ اب وہ سکت نہیں رہی آ——" اور وہ پھیکی سی ہنسی ہنسی۔

"کہو، اب تمہارے جمعدار کا کیا حال ہے؟" —— ملہوترہ صاحب نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا —— "اب تو نہیں مارتا پیٹتا۔ نوچتا کھسوٹتا؟"

"وہ تو اب ادھر آوت ہی نہیں" —— للن کی آواز میں جانے کیسی اداسی تھی، جو ملہوترہ صاحب کے دل کو لگ گئی۔

"کہاں رہتا ہے؟" —— انہوں نے پوچھا۔

"ادھر پادری کے ہاں چلا جات ہے"۔

"پادری کون ہے؟"

"کوئی لوس صاب ہیں۔ کرسچین کالج میں پڑھاوت ہیں۔ ان کی مہترانی نمبری چھنال ہے صاب۔ وہی کے چکر میں پڑا ہے۔ کام ختم کر کے وہیں چلا جات ہے۔ وہی کا ساری پگار دیت ہے، وہیں کھات پیت ہے۔"

للن کی آنکھوں اور اس کے لہجے میں ملہوترہ صاحب کو ایک خفیف سی رشک کی جھلک نظر آئی۔

"تو کیا وہ خوبصورت عورت ہے؟" —— انہوں نے پوچھا۔

"ہم کا جانیں صاب۔ ہم تو کبھی اُدھر گئے نہیں۔ اتنا سنا ہے کہ ہم سے دس بارہ برس بڑی ہے۔ چھنال ہے صاب، پھانس لئے ہوئی۔ ادھر سال بھر سے جمعدار وہیں رہت ہے۔"

ملہوترہ صاحب کو اس کے لہجے میں ہلکی سی حسرت کا بھی احساس ہوا۔ وہ خاموشی سے ان کے پیر دباتی رہی اور ملہوترہ صاحب اس دوسری عورت کے بارے میں سوچتے رہے۔

ملہوترہ صاحب پروفیسر نوئل کولس کو جانتے تھے۔ کیوں کہ وہ بھی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، کوئی خاص دوستی نہیں تھی لیکن تعارف تھا۔ ایک دن شام کو وہ بیوی کے ساتھ پروفیسر کولس کے گھر گئے۔ چائے پیتے ہوئے انہوں نے کولس صاحب کے باغیچے کی خوب تعریف کی۔ کولس صاحب چائے کے بعد انہیں اپنے باغیچے میں لے گئے۔

"گرمیوں میں پھولوں کی وہ بہار کہاں! جو جنوری فروری میں ہوتی ہے!" —— پروفیسر کولس نے کہا "لیکن میں نے پیٹونیا کی اتنی قسمیں لگا رکھی ہیں کہ دن بھر رنگ رنگ کے پھول کھلے رہتے ہیں۔ پھر جتنا بڑا بیلا میرے یہاں ہے، شاید سارے شہر میں نہ ہو۔"

ملہوترہ صاحب نے انہیں لقمہ دیا، سرو جیسے ان چھوٹے چھوٹے پودوں کی تعریف کی جو لان کے نیم دائرے میں دو رد یہ لگے تھے اور ان کا نام پوچھا۔

"اسے پوچیا یا مور پنکھی کہتے ہیں!" —— پروفیسر کولس نے پر مسرت لہجے میں کہا —— "آپ یہ دیکھئے کہ سب ایک سے پودے ہیں، ذرا چھوٹے بڑے نہیں!" —— اور وہ بتانے لگے، کیسے پانچ سو پودوں میں سے انہوں نے ایک جیسے

پودے چُن کر گملوں میں لگائے ہیں۔

وہ اپنے باغ کے جوہی، موتیا، چمپا، سورج مکھی، بلو بینیا اور نہ جانے کس کس پودے کی تعریف کرتے رہے، ملہوترہ صاحب نے کچھ نہیں سنا۔ یونہی ہوں ہاں کرتے رہے۔ جب باغیچہ اور بنگلہ دکھاتے دکھاتے وہ پیچھے شاگرد پیشے کی طرف گئے تو یکایک ملہوترہ صاحب کی دل چسپی گویا بیدار ہوئی۔ انہوں نے انگریزوں کی اس عادت کی خوب خوب تعریف کی کہ انہوں نے ہر بنگلے میں ملازموں کی رہائش کی جگہ رکھی، کچن ہمیشہ بنگلے سے دور رکھا اور ملہوترہ صاحب نے اس سسٹم کی بے شمار خوبیاں گنا ڈالیں۔

پروفیسر کولس نے انہیں بتایا کہ ان کے چار ملازم ہیں، خانساماں، بیرا، مالی اور مہترانی ـــــ اور وہ سب ان کے بنگلے ہی میں رہتے ہیں۔

ملہوترہ صاحب کوارٹروں کے آگے سے گزر رہے تھے کہ وہ یکایک ایک کوارٹر کے آگے رُک گئے۔ دروازہ کھُلا تھا، اور اندر ہریا زمین پر آب خورہ رکھے ایک موٹی بھدی عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے آب خورہ چارپائی کے نیچے سَرکا دیا۔

" ارے ہریا!" ـــــ ملہوترہ صاحب نے چونکنے کی ایکٹنگ کی ـــــ " تم یہاں کیسے ؟" ـــــ اور وہ بے ساختہ اندر بڑھ گئے۔

ہریا کے سُوکھے سکڑے چہرے کے دونوں الف توسین بن گئے اور اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے انہیں سلام کیا۔

ملہوترہ صاحب نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اس سے ہٹ کر ان کی نظر اس کے قریب بیٹھی ہوئی بھدی مہترانی پر گئی۔ للّن نے کہا تھا کہ وہ اس سے دس سال بڑی ہے، لیکن انہیں تو وہ اس کی ماں کی عمر کی معلوم ہوئی۔

تم یہاں کیا کر رہے ہو"؟ ـــــ انہوں نے یکایک ہریا سے پوچھا۔

نیچے فرش پر نظریں گڑاتے ہوئے اس نے گویا ان کے پہلے سوال کا جواب دیا۔

" آپ کی رشتہ داری ہے"!

" اِدھر آؤ ذرا"! ـــــ اور ملہوترہ صاحب باہر نکل گئے۔ کولس صاحب اور سین سے انہوں نے کہا کہ ان کا مہتر ہے اور اس سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔

وہ ہریا کو کچھ فاصلے پر لے گئے اور انہوں نے اسے ڈانٹا کہ وہ اپنی اتنی اچھی بیوی کو چھوڑ کر اس چڑیل کے پیچھے لگا ہے۔ وہ نہ للّن کو چھوڑتا ہے نہ اسے سُکھ دیتا ہے اور انہوں نے دھمکی دی کہ آئندہ اگر اُسے یہاں دیکھا تو کسی نہ کسی الزام میں جیل بھجوا دیں گے، تم جانتے ہو، پولیس کے بڑے کپتان میرے دوست ہیں، تھانے میں وہ بے بھاؤ کی پڑے گی کہ ساری بدمعاشی دھری کی دھری رہ جائے گی، جیل الگ جاؤ گے اور نوکری سے الگ ہاتھ دھونا پڑے گا۔!

ہریا نیچی نگاہ کئے خاموشی سے سنتا رہا۔

"کیا کہتے ہو"؟ ـــــ انہوں نے کڑک کر پوچھا ـــــ نہیں مانتے، تو کہوں کولس صاحب سے کہ اس چشٹریل نے یہاں چکلہ کھول رکھا ہے"!

" ہم مہتر جات ہیں سرکار، اور للّنیا مین جیسی باتیں کرت ہے"! ـــــ ہریا نے شکایت کی۔

" ارے تمہیں صاف واف رہنے کو کہتی ہوگی۔ وہ تمہیں تنگ کرے تو ہمیں بتانا۔ ہم اسے سمجھا دیں گے"! ـــــ ملہوترہ صاحب

اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے مُڑے ۔

اور دو دن پہلے، ان کے پیر دباتے دباتے للّن نے بتایا تھا کہ ہریا گھر آگیا ہے ۔ اور اس نے ملہوترہ صاحب سے پانچ روپے مانگے تھے کہ وہ اس کے لئے کرتا پاجامہ سلوائے گی ۔

" اپنے آدمی کو قابو میں رکھا جاتا ہے " ـــــ انہوں نے اسے پانچ کا نوٹ دیتے ہوئے سمجھایا تھا ـــــ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ وہ صاف نہیں رہتا، تو خود اُسے صاف رکھو ۔ وہ کپڑے نہیں دھوتا، تو خود دھو! باہر کھانے پینے تو اچھا ہے کہ تیرے سامنے کھائے پیئے "

للّن ان کے پاؤں دبا کر چلی گئی تو انہوں نے سُنا کہ وہ ان کی بیوی سے باتھ روم میں پڑی " انگریجی " صابن کی ٹکیہ مانگ رہی ہے ۔

نل تک پہنچتے پہنچتے ملہوترہ صاحب کی نگاہوں میں تمام واقعات کوند گئے ـــــ اسی وقت ہریا کی نظر ان پر پڑی ۔ اس کے تمام جسم پر جھاگ ہی جھاگ تھا ۔ چہرے پر ایک شاہانہ تبسّم تھا جس میں نہ پرانی بے بسی تھی نہ مخالفت ۔ اور اس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے انہیں سلام کیا ۔

ملہوترہ صاحب نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا ۔ انہوں نے ایک نظر للّن پر ڈالی جو سَر جھکائے نہایت انہماک سے اس کی پیٹھ اور پسلیوں پر صابن مل رہی تھی ـــــ اور ایک دن اس نے کہا تھا ۔

" صابن نہ ملیں گے، جوتا ماریں گے "!

اور ملہوترہ صاحب کے اپنے لبوں پر ایک مجبور سی مسکراہٹ پھیل گئی

محمد احسن فاروقی

سیپ۔ کراچی

عجیب چکر

جب بھی وہ میرے سامنے آتی تو بُری لگتی اور جتنی دیر سامنے بیٹھی رہتی زیادہ سے زیادہ بُری معلوم ہوتی جاتی آخر کوئی چیز بھی تو اس کی حسین دلکش اور جس جس چیز کو بھی جتنے ہی غور سے دیکھتا جاتا اتنی ہی وہ بُری لگتی۔ نہایت معمولی بال اور ان کو وہ بناتی بھی عجیب عام طریقہ پر تھی جس سے عامیانہ پن ٹپکتا تھا۔ ماتھا چھوٹا تھا اور بالوں کا بھوؤں سے قرب بھیانک معلوم ہونے لگتا تھا آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ہنستے وقت گالوں میں چھپ جاتی تھیں اور چھوٹی ہی معلوم ہوتی تھی غرض سڈول تو کسی طرح نہ تھی۔ چہرا چوڑا تھا۔ دور سے گول معلوم ہوتا تھا قریب سے چوکور، اس کا مجموعی تاثر غور سے دیکھنے پر بھدے پن ہی کا تھا ہونٹ پتلے تھے اور الگ سے دیکھنے پر اچھے لگتے مگر پورے چہرے پر اندر کو دھنسے ہوئے اور بدنما لگتے۔ مگر جب وہ میرے پاس سے جانے لگتی یا میں اس کے پاس سے آنے لگتا اور مڑ کر وہ ایک چھب مجھے دکھاتی یا میں مڑ کر ایک نظر اس کو دیکھتا تو ایک عجیب دلکش تاثر میرے دل پر قائم ہوتا۔ اس کا پورا مجسمہ اور خاص طور سے چہرہ پُر اسرار طریقہ پر دلکش ہو کر سامنے تصور میں قائم ہو جاتا۔ ہر چیز حسین لگنے لگتی۔ جتنی دیر میں اس سے دور رہتا یہ چہرہ آنکھوں میں کھیلتا رہتا اور حسین سے حسین تر ہوتا جاتا۔ کئی کئی دن ملاقات نہ ہوتی اور ایسا وقت آجاتا کہ میرے تصور کا چہرہ مجھے حسین ترین چیز معلوم ہوتا۔ میں بے قرار ہوتا اور اسے دیکھنے جاتا مگر اس کے پاس پہنچ کر سب جذبات ٹھنڈے ہو جاتے تصور میں بنی ہوئی تصویر اپنے اصل کے مقابلے میں آ کر مٹ جاتی یا دھندلی پڑ جاتی۔ میں دل میں کہتا "کیا اسی پر میں سر دھن رہا تھا۔ کیا اسی کے لئے تڑپ رہا تھا؟ کیا حماقت!" مگر پھر اس سے الگ ہو کر اس کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی اور پھر وہ وقت آجاتا جب میں اسے دیکھنے کیلئے بیتاب ہو جاتا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد میں اس چکر سے عاجز آنے لگا اور دل میں یہ طے کر لیا کہ اسے نہ دیکھوں گا اور اس کے پاس نہ جاؤں گا مگر کچھ ہی دن جبر کرتے ہوئے تھے کہ وہ خود میرے پاس آگئی اور شکایت کی "آپ آئے نہیں؟" میں نے بہانا کر دیا۔ اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بُری لگتی رہی مگر احساس ہوا کہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ میری طرف راغب ہے اور یہ خیال آتے ہی میری اس کی طرف رغبت میں اضافہ ہو گیا اس روز واپس جاتے وقت جب اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تو وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھی معلوم ہوئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز عجیب تھا اور اس کی آنکھیں کچھ زیادہ کھلی کچھ زیادہ بڑی معلوم ہوئیں اب جو میرے تصور میں اس کی صورت بنی وہ پہلے سے زیادہ جاندار تھی۔ وہ اب مجھے اور بھی زیادہ زور سے کھینچتی تھی۔ میں نماز پڑھنے کھڑا ہوتا تو اس کا چہرہ سامنے آجاتا اور اصل سے ہی نہیں بلکہ پہلی نقل سے بھی زیادہ حسین معلوم ہوتا ایک طرف اس سے ملنے کی ہوک دل میں اُٹھتی پھر خیال آتا کہ ملنے سے کہیں یہ حسین تصور نہ غائب ہو جائے۔ میں اس سے ملنے سے گریز کرتا مگر وہ میرے پاس آجاتی اور پھر میرے جذبات پر اوس پڑ جاتی۔ عجیب عالم تھا۔ نہ ہنستے بن پڑتی تھی نہ بڑھتے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مکمل کرنا چاہتی ہے۔ مگر میں سوچتا کہ اگر آگے بڑھا اور یہ گلے کا ہار بن گئی تو اس سے زیادہ عرصہ نہ بن پائے گی۔

اس لئے اس کے متعدد اِشاروں پر بھی میں آگے نہ بڑھ سکا جب وہ سامنے نہ ہوتی تو موقعوں اور اس کے اشاروں پر غور کرتا اور افسوس کرتا کہ میں نے کیوں کمزوری دکھائی اور تہیہ کرتا کہ اب کی کوئی موقعہ ملا تو خالی نہ جانے دوں گا۔ مگر موقعہ مِلنے پر دل کہتا کہ "کس حماقت میں پھنس رہے ہو، اس جھنجٹ کو ختم ہی کردو"
کہہ نہیں سکتا کہ اس کے میری طرف کیا جذبات تھے۔ بڑھتی تو وہ بڑی بیباکی سے تھی اور قریب سے قریب تر آنے کی اس نے کوشش بھی کی تھی۔ مگر میری پسپائی اور بے دلی سے شاید مایوس ہوگئی یا پھر کوئی اور زور اس پر پڑا جس کی وجہ سے کنارہ کش ہوگئی۔ عرصہ تک میری اس کی ملاقات ہی نہ ہوئی۔ میں نے اسے بالکل بھول جانا چاہا مگر وہ زیادہ سے زیادہ یاد آتی گئی۔ میں نے سُنا اس کی شادی ہوگئی اور اب میرے دل میں جذبۂ رقابت بہت زور سے ابھرا عجیب غم و غصہ کے عالم میں آکر میں سرگرداں پھرا ایک جی کہتا کہ اس سے جاکر کہوں کہ "تو نے یہ کیا کیا" مگر دو مراجی جواب دیتا کہ وہ یہی کہے گی "میں نے اپنے کو تمہیں پیش کیا مگر تم نے قبول ہی نہ کیا۔ میں آخر کب تک انتظار کرتی" یا یہ کہے گی کہ "میں اپنے خاندانی اثرات سے مجبور تھی" بڑا افسوس کرتا کہ ہاتھ میں آئی ہوئی چیز میں نے خود ہی جانے دی۔ اب اس قصے کو بھول جاؤں کہیں اور دل لگاؤں۔ مگر دل کہیں ماننے والا تھا اس میں تو وہ ایسی سمائی تھی کہ نکالے نہیں نکلتی تھی۔ وہ میری پہلی محبوبہ نہیں تھی مگر جن دو کو میں نے اس سے پہلے چاہا تھا وہ مجھ سے دُور ہی رہی تھیں۔ وہ بھی کچھ زیادہ حسین نہ تھیں مگر معلوم زیادہ حسین ہوتی تھیں۔ مگر یہ تو بہت ہی قریب آگئی تھی اور اس کی ہر ہر ادا کا میں نے بغور مطالعہ کیا تھا کوئی ادا اچھی نہیں معلوم ہوئی تھی۔ مگر عجیب پُر اسرار لگاؤ ہوگیا تھا۔ تصور میں اس کی تصویر اور بھی زیادہ دلکش ہوگئی تھی اور اس سے ملنے کی خواہش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔

میں نے طے کیا کہ میں بھی شادی کرلوں اور میرے والدین نے اپنی پسند کی ایک لڑکی سے میری شادی کر بھی دی۔ یہ لڑکی اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اور مجھے بہت بھائی مگر اس کا خیال دل سے کسی طرح نہ نکل سکا۔ بیوی کے پاس بھی اس کا دھیان ضرور آتا اور بیوی اس کے مقابلے میں پھیکی معلوم ہوتی۔ یہ کیا پاگل پن تھا میں کہہ نہیں سکتا، اکیلے میں وہ یاد آتی اور جی چاہتا کہ جاکر اس کو دیکھوں مگر خیال ہوتا کہ اب ہم دونوں بہت ہی دور چلے گئے ہیں وہ اپنے گھر بار میں محو ہوکر مجھے بھول بھی چکی ہوگی اور اب یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اس سے ملوں تو اس کا میاں خار کھائے اور کسی ناچاقی کی صورت پیدا ہو میری خواہش بالکل عقل کے خلاف تھی، اخلاق کی قاطع تھی گُناہ تھی۔ مگر میں کیا کرتا کہ وہ میرے دل سے نکل ہی نہ پاتی تھی جتنی زیادہ کوشش کرتا اتنی زیادہ بے بسی محسوس ہوتی۔ اکثر لیٹے لیٹے اس کا تصور کرتے کرتے اٹھ کھڑا ہوتا۔ کئی دفعہ بیوی کے پاس سے اُٹھ کر میں نے ایسا کیا۔ وہ تعجب میں آکر بولی "یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟" میں نے سوچا کہ اس سے بتادوں مگر پھر یہ خیال کرکے اس کو رقابت محسوس ہوگی خاموش رہا اور بات ٹال دی۔ خیال کرتا تھا کہ وقت کے ساتھ یہ مرض جاتا رہے گا مگر یہ عجیب چکر تھا جو وقت کے ساتھ اپنی رفتار تیز کرتا ہی گیا۔

سال بھر سے زیادہ ہوگیا میری بیوی کے یہاں ایک بچہ بھی ہوگیا اور ہم دونوں بچے کیلئے کچھ چیزیں خریدنے کیلئے بازار گئے۔ ایک دوکان میں داخل ہوئے تو وہ اپنے میاں کے ساتھ دکھائی دی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی عجیب طرح سے کھِل گئی اور اپنے میاں سے میرا تعارف کرایا میں نے اپنی بیوی کا ان دونوں سے تعارف کرایا۔

میری بیوی بولی "میں اپنے بچے کے لئے کپڑے لینے آئی ہوں"

"ہم بھی اپنے بچے کے لئے کپڑے لینے آئے ہیں" اس نے کہا۔ اور پھر میری طرف رُخ کرکے پورے طور پر کھِل کر بولی۔ "آپ کے بچہ بھی ہوگیا۔ میں اسے دیکھوں گی"

میری بیوی نے اسے شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ اور کچھ نہیں کہا۔

میں نے کہا "جب جی چاہے آؤ۔ تم دونوں آؤ۔ عرصے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی ہے"

"نہیں پہلے آپ دونوں آیئے ہمارے یہاں" وہ بولی۔

اس کا میاں بولا "آپ دونوں کل شام کھانا ہمارے ساتھ کھایئے"

میری بیوی نے کہا: "مجھے کل اپنے میکے جانا ہے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ میری بیوی ان لوگوں سے ملنا نہیں چاہتی۔ وہ دونوں دوکان سے باہر نکلے اس نے مجھے اس طرح مڑ کر دیکھا جیسے کہ ہمیشہ دیکھا کرتی تھی۔ اب وہ زیادہ تندرست تھی اور پہلے سے زیادہ جاذبِ نظر ہو گئی تھی۔ میں نے تو بہت [illegible] دیکھا۔ میری بیوی نے زور کی آواز میں کہا "ادھر دیکھو یہ کیسا رہے گا۔"

میں کچھ گم سم سا تھا مگر بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا گیا۔ گھر پہنچ کر جب ہم دونوں اطمینان سے بیٹھے تو بیوی نے کہا: "یہ کون تھی یہ تم پر عاشق معلوم ہوتی ہے۔"

"ہونہہ" میں نے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میاں بچے والی عورت اور پھر میں بھی بال بچے والا۔ اور پھر مجھے اس کی صورت شکل کبھی اچھی نہیں لگی، کوئی صورت بھی ہو۔ تم نے دیکھا؟"

"مگر وہ تمہارے اوپر ریجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور تم نے بھی اسے جس طرح دیکھا وہ بھی میں دیکھ رہی تھی۔"

میں نے اپنے تئیں مجرم محسوس کیا مگر جرم کو چھپانے کیلئے بن کر ہنسا اور بولا "تم لوگ احمق ہی ہوتی ہو کہاں سے کہاں نکل جاتی ہو۔"

وہ خاموش ہو گئی اور میں سوچ میں پڑ گیا میرا دل شدت سے چاہنے لگا کہ میں اس کے گھر جاؤں اور بیوی کو ہرگز نہ لے جاؤں۔ اسی وقت سے اس عجیب چکر کا نیا دور شروع ہوا۔ دل کی خواہش جو کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی اب بڑے زور سے ابھری اور اس کو چکر میں ڈالنے والے اب میری بیوی اور بچے بھی ہو گئے۔ پہلے تو محض اپنی طبیعت کا ایک پہلو ہی روکتا تھا۔ اب اپنے گھر بار کے بگڑنے کا خیال بھی روکنے لگا اور اس کی بنی بنائی زندگی میں رخنہ پڑنے کا بھی خیال آیا عقل اب دُگنے زور سے کہتی "اے دل جانے دے اس زلفِ مسلسل کا خیال: جان کر کوئی گرفتارِ بلا ہوتا ہے۔" مگر اس کا تصور اب اور بھی زیادہ حسین ہو گیا تھا۔ اور اب اسی تصور کے اصل میں بھی ایک عجیب کشش دکھائی دے گئی تھی جو بڑی شدت سے دل کو کھینچتی تھی۔ جتنے زیادہ ہم دونوں کے درمیان رخنے تھے اتنی ہی زیادہ میرے دل میں خواہش کی شدت تھی۔ چکر اپنے کمال پر پہنچ رہا تھا اور مجھے زیادہ سے زیادہ گم کر رہا تھا۔ یہ عالم بیوی پر روشن ہو گیا اور اسکے بار بار سوالات نے اور بھی چکر میں ڈالا۔ وہ اور بھی سخت ہوتی گئی اور میری خواہش کی شدت بڑھتی گئی۔

اس کے میاں سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہر ملاقات پر وہ ہم دونوں کو دعوت ضرور دیتے، میں بھی رسماً ان دونوں کو پہلے بلانے کے خیال کا اظہار مگر دل میں سوچتا کہ میری بیوی ہرگز نہ چاہے گی کہ اس طرح ربط بڑھے اور روز دفتر سے واپس ہوتے وقت یہ سوچتا کہ اپنے گھر جانے کے بجائے اسکے گھر جاؤں۔ مگر ہمت نہ بندھتی بس کچھ نہ کچھ ایسا ہی ہو جاتا کہ اپنے ہی گھر پہنچتا۔ بیوی سے ریاکاری برتنے میں پورے طور پر کامیاب تھا مگر ضمیر سے بس نہ چلتا تھا اور نہ خواہش سے۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے عجیب چکر لگاتے دکھائی دیتے جو ختم ہی نہ ہوتا۔ کبھی سوچتا کہ یہ کچھی عقل ہے جب وہ چمٹ جانے کو تیار تھی تو ہاتھ بڑھا کر اسے نہ چمٹا لیا اور اب جب کہ ایسا کرنے سے تمام نظامِ عالم درہم برہم ہوتا دکھائی دیتا ہے تو اسے چمٹانے کیلئے بیتاب ہوں۔ عجیب چکر تھا۔ میں خلوص سے اسے ختم کرنا چاہتا تھا مگر وہ اور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے نماز روزہ کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ہر نماز میں اس کی تصویر سامنے آ جاتی اور روزے میں تو اس کا تصور اس شدت سے بندھتا کہ بے قرار ہی کر دیتا۔ میں نے بڑے عزم کے ساتھ اس چکر کو ختم کرنے کی کوشش کی اور کئی دن تک یہ محسوس ہوا کہ کامیاب ہو رہا ہوں۔ میں اور میری بیوی ساتھ ساتھ سیر کرنے نکل جاتے سینما دیکھنے جاتے اور مجھے اپنے سر کا سودا کم ہوتا ہوا معلوم ہوتا۔

مگر ایک دن ہم دونوں سینما میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ وہ دونوں آ گئے۔ اس کے میاں نے مجھے دیکھا اور پھر وہ آگے آگے اور میاں پیچھے پیچھے ہماری طرف بڑھتے چلے آئے۔ وہ بڑے خاص انداز سے سنگھار کئے ہوئے تھی اور ہال کی روشنی میں خاص انداز سے چمکی۔ پاس آ کر کھیلتی ہوئی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا اور میری بیوی کے پاس بیٹھ گئی اس کا میاں اس کے بعد کرسی پر بیٹھا تاکہ دونوں عورتیں ہم دونوں مردوں کے درمیان ہو جائیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سر کے چکر کو اب کسی نے بے انتہا تیزی سے چلا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے دیکھے ہی جاؤں مگر میری بیوی کی شبہ بھری قاتل نگاہیں بڑھی

رہی درست۔ روک کا کام کرتی رہیں۔ پہلے وہ سامنے آنے پر کتنی معلوم ہونے لگتی تھی مگر اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہر ہر ادا ایک عجیب توازن میں ہو کر حسن کا ایک عجیب پر کشش نمونہ بن گئی تھیں۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ موٹی ہو گئی تھی۔ گال پھول پھول نظر آ رہے تھے اور گالوں کا آنکھوں کے نیچے کا حصہ کچھ زیادہ ابھرا اور الگ دکھائی دے رہا تھا۔ دانتوں کا چوکا کچھ باہر نکل آیا تھا۔ اور ہونٹوں کے چھپائے نہ چھپتا تھا۔ مجھے یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ ڈھل رہی تھی اور کچھ عرصے میں اس کا سن نکل آئے گا۔ باوجود اس سب کے میں عجیب عالم میں پہنچ گیا۔ چکر کا بھی احساس جاتا رہا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ چکرا کر گر پڑا۔ ہال میں اندھیرا ہوا فلم چلتا رہا مگر میں گم ہی رہا۔ انٹرول میں اس کے میاں نے رستوراں میں چلنے کی دعوت دی اس نے بھی چہرے کو دکھلا کر کہا "چلیے"۔ مگر مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا اور کافی ہماری سیٹوں پر منگا لی گئی۔ فلم پھر شروع ہوا اور اب میں چونچال ہوا اور سوچنے لگا کہ میں کس حماقت میں مبتلا ہوں۔ شاید چکر اپنی حدوں کو پہنچ چکا تھا اور میں اس سے باہر آ رہا تھا۔ تماشہ ختم ہونے پر سب باہر آئے اس نے سفید چادر اوڑھ لی تھی جس سے اسکے چہرہ پر سرخی اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ اپنے موٹر میں سوار ہوتے ہوئے اس نے پھر کر مجھے اسی ادا سے دیکھا جو میرے دل میں کھب جایا کرتی تھی اور میرے چکر کی رفتار کو بڑھا جایا کرتی تھی۔ مگر اس وقت اسی ادا نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کیا۔

میں اپنا موٹر چلاتا ہوا گھر آ رہا تھا تو محسوس ہوا کہ وہ کوئی ایسا تصور نہیں چھوڑ گئی تھی جس پر میں سر دھننے لگوں۔ کیا وہ چکر ختم ہو گیا تھا؟ کہہ نہیں سکتا۔ اس کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اب وہ غائب ہو جانے پر تصور میں اتنی اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھی جتنی کہ سامنے آنے پر معلوم ہو رہی تھی اور جاتے وقت بھی وہ اتنی اچھی نہ لگی جتنی پہلے لگا کرتی تھی۔ موٹر سے تشبیہ لیتے ہوئے دل نے کہا کہ چکر اب ریورس میں چل رہا ہے:

"آخر اسے چلنے ہی کیوں دیا جائے؟" ایک دل نے پوچھا۔

"آخر چلنے دو ہرج کیا ہے؟" دوسرے دل نے جواب۔

"آخر ضرورت کیا ہے؟"

"آخر ضرورت کا سوال ہی کیا ہے؟ یہ چیز اپنی جگہ پر ہے۔ اس کو مٹانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ اسے یوں ہی چلنے دو۔"

میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ چکر عجیب پر اسرار عجیب چیز ہے جس کو نہ میں نے چلایا اور نہ میں روک سکتا ہوں۔ اور میرا گھر آ گیا۔

بچے کی صحت، ماں کی خوشیاں
آسٹرملک کے زمانے کو مسرتوں سے بھرپور کر دیتی ہیں۔
OSTERMILK
DRIED MILK FOOD PRODUCT WITH VITAMIN D AND IRON
جب بچے کی پرورش آسٹرملک پر ہوتی ہے تو بچہ تندرست اور خوش و خرم، ماں مسرور و مطمئن رہتی ہے۔
آسٹرملک خاص طور پر منتخب کئے ہوئے اعلیٰ اور خالص دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد ملایا گیا ہے تاکہ بچوں کے جسم میں خون کی کمی نہ ہونے پائے۔ ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بنانے کے لئے اس میں وٹامن ڈی بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسی لئے ذمہ دار مائیں دودھ چھٹ جانے پر یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے آسٹرملک پر بھروسہ کرتی ہیں۔
یاد رکھئے آسٹرملک ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل ہے۔
آسٹرملک
ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل
اب آسٹرملک • ہاف کریم • بھی دستیاب ہے
مفت! • آسٹرملک کی کتاب • جو بچوں کی پرورش و نگہداشت پر ایک مستند رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب اردو میں دستیاب ہو سکتی ہے۔ ۵۰ پیسوں کے ٹکٹ بھیجئے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔ پتہ: پی۔ او۔ بکس نمبر ۔ ۴۷۶۴ ۔ کراچی ۔ ۲

اوراق - لاہور

ابنِ سعید

برف باری کے بعد

برف کئی روز سے مسلسل گر رہی تھی۔

مری بلکہ مری سے بہت آگے تک حد نظر تک، پہاڑوں کے تمام سلسلوں پر برف ہی برف نظر آتی۔ پنڈی پوائنٹ پر کھڑے ہو کر شمال کی طرف دیکھو تو تمام لینڈ اسکیپ، ایک لمبے چوڑے کرسمس کارڈ کی مانند نظر آتی۔ برف کے گالوں سے ڈھکے ہوئے چیل کے درختوں کی لامتناہی قطاریں، مکانوں، عمارتوں اور کاٹجوں کی کھپریل کی چھتوں پر جمی ہوئی برف کی سلیں، سڑکوں کے کنارے کنارے برف اور کوڑے کے ڈھیر، سڑکوں کے بیچوں بیچ جہاں برف کو صاف کر کے رستے بنا دیئے گئے تھے وہاں رکشا گاڑیوں اور بسوں وغیرہ کے پہیوں کے نشان دور تک رینگتے ہوئے نظر آتے۔

پنڈی پوائنٹ کی دوسری جانب یعنی پہاڑیوں کے سلسلوں کے قدموں میں۔ جب کبھی مطلع صاف ہوتا تو نیچے بہت نیچے راولپنڈی کے قریب رواں جھیل ایک بہت بڑے کٹورے کی مانند دمکتی ہوئی نظر آ جاتی، مگر جب بادل گھر آتے اور برف باری شروع ہو جاتی تو یہ چاندی کا کٹورا بھی کہرے کی دبیز چادر میں چھپ جاتا۔

پنڈی پوائنٹ پر جہاں سڑک سانپ کی مانند کنڈلی مار کر دوبارہ مال روڈ کی سمت مڑتی تھی وہاں پہاڑی کے ایک گوشے میں بنے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی دہلیز اور ریلنگ، اور سرخ کھپریل کی چھت، سب پر برف کی موٹی موٹی تہیں خوشنما تکونی اور مستطیلی بن گئی تھیں۔

پروفیسر نوریلی نے ریسٹ ہاؤس کی فرنچ ونڈو کا شیشہ اَن گنت بار صاف کر کے بے دلی کے ساتھ باہر جھانکا مگر ان کو ایک بار پھر باہر پھیلی ہوئی برفیلی لینڈ اسکیپ میں ایک گہری دلچسپی محسوس ہوئی۔ ان کو گمان ہوا کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو واقعی یہ لینڈ اسکیپ ایک سچ مچ کا وہ جیتا جاگتا کرسمس کارڈ بن جائے گی اور یہیں کہیں ان کو سانتا کلوس کی گاڑی نظر آ جائے گی، رینڈیروں کے گلوں میں پڑی ہوئی چاندی کی گھنٹیاں سچ مچ بجنی شروع ہو جائیں گی اور دور عقب میں گرجا گھر کا گھنٹہ گھر مسلسل ٹن ٹن کرنے لگے گا۔

"ٹو میری این ود لو! میری این کو محبتوں کے ساتھ!"

کرسمس کارڈ کی پشت پر خوشنما روشنائی میں لکھا ہوا تھا۔ "ٹو میری این ود لو!"

میری این! جس سے پروفیسر نوریلی سب سے پہلی مرتبہ مدت ہوئی ویلز کی وادیوں میں کوہ پیمائی کرتے ہوئے ملے تھے، کیمبرج میں

ان کے ایک پروفیسر نے ان سے کہا تھا۔ "اگر تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو ایک سوٹ کیس کتابوں سے بھر کر ویلز چلے جاؤ اور وہاں صرف وادیوں میں آوارہ گردی کرتے رہو اور کتابیں پڑھتے رہو یوں شاید تم پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل بن جاؤ! یونیورسٹی میں تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔"

اور پروفیسر نوریلی جو اس وقت تک پروفیسر کے لقب سے غیر ملوث تھے واقعی فلسفے اور ادب کی کتابوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس لے کر کیمبرج سے بھاگ گئے اور ہفتوں ویلز کی وادیوں میں آوارہ گردی کرتے رہے۔ وہیں کسی جگہ ایک روز ان کی میری این سے ملاقات ہوگئی اور ان کی زندگی ایک نئی اور غیر متوقع ڈگر پر پڑ گئی۔

میری این ایک کالج پروفیسر کی بیٹی تھی اور قدیم یورپی تاریخ میں آنرز کر رہی تھی۔ اس کی سپید جلد پر ان گنت چھوٹے چھوٹے بھورے بھورے تل تھے لیکن اس کی آنکھوں میں بارش کے بعد کے دھلے دھلائے آسمان کی سی نیلاہٹ تھی ایک لامحدود نیلاہٹ جو اب سے بہت پہلے اپنے بچپن میں پروفیسر نوریلی نے اپنے وطن راولپنڈی میں بارشوں کے بعد آسمان میں دیکھی تھی۔

راولپنڈی پروفیسر نوریلی کا آبائی وطن تھا۔ یہیں پر چھاؤنی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں وہ لڑکپن کی منزل طے کر کے نوجوانی کی اولین منزل میں داخل ہوئے تھے یہیں پر ان کو پہلی مرتبہ اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ان کا باپ ایک دفتر میں معمولی درجے کا کلرک تھا اور اونچے درجے کے انگریز فوجی افسروں سے بھرپور چھاؤنی میں ایک معمولی کلرک کی قطعی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جیسے ان کے اپنے اور ان بدیسی بچوں کے درمیان جو ہارسنگھار سے لدی ہوئی بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے تھے ایک ناقابل عبور خلیج حائل تھی کبھی کبھار یہ سفید فام بچے ہارسنگھار کی بیلوں اور مہندی کی باڑھ کو عبور کر کے کلب کے قریب میدان میں آن کر کٹ کھیلتے اور نوریلی اپنی تماش کے اور بہت سے بچوں کے ساتھ مل کر ملکہ کے بت کی کرسی پر چڑھ کر کرکٹ کا کھیل گھنٹوں دیکھتے رہتے۔

پروفیسر نوریلی اس وقت محض ایک شرمیلے سے خاموش سے لڑکے تھے۔ ان کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے ان کے باپ نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا تھا جنھوں نے ان کو اس بات کی بشارت دی تھی کہ ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر بہت ہنرمند ثابت ہوگا اور خواب میں آنے والے ان بزرگ نے نوریلی کے باپ سے کہا تھا کہ تم اپنے لڑکے کا نام نور علی رکھنا۔ اس کی شہرت دنیا کے کونے کونے میں نور کی طرح پھیلے گی۔ چنانچہ ان کی پیدائش پر ان کے والد نے بہت اہتمام کیا۔ علی الصباح اٹھ کر اپنے ہاتھ سے چھاؤنی کی مسجد میں جھاڑو دی، مسجد کے فرش کو دھویا اور پھر فجر کی نماز سے بھی پہلے دو نفل شکرانے کی پڑھی۔ نور علی کی سالگرہ پر وہ بالوشاہی اور امرتیاں خرید کر خواب میں آنے والے ان بزرگ کے نام پر نیاز دیتے اور ان کو یقین کامل تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور نور علی کی شہرت تمام دنیا میں نور کی مانند پھیل جائے گی۔

مگر یہ سب آج شاید کوئی پچاس سال پہلے کی باتیں تھیں، اس پچاس سال کے عرصے میں راولپنڈی کی فضا میں ایک انقلاب سا آگیا۔ ہارسنگھار کی بیلوں اور مہندی کی باڑھوں سے آراستہ پرانی وضع کی کوٹھیاں اکثر اجڑ سی گئیں۔ ان میں بسنے والے انگریز فوجی افسر اور ان کی میم صاحبیں اور سفید فام بچے اپنے وطن واپس چلے گئے۔ ان کی جگہ ایک نئی نسل نے لے لی۔ مال روڈ کے چوراہے پر ایستادہ ملکہ کا بت غائب ہو گیا بس کی کائی آلودہ کرسی خالی خولی باقی رہ گئی اور نور علی کا نام انگریزیت کی نذر ہو کر نوریلی میں تبدیل ہو گیا۔ نوریلی نے ایک طویل عرصہ انگلستان اور امریکہ کی یونیورسٹی میں بسر کیا اور ایک بہت بڑے طویل وقفے کے بعد جب وہ ایک مرتبہ راولپنڈی واپس آئے تو ان کو بے ساختہ آسمان کی وہ نیلاہٹ یاد آگئی جس کا شعور ان کو بہت بچپن میں ہوا تھا اور جس کی ایک جھلک انھوں نے ویلز کی ایک وادی میں میری این کی آنکھوں میں دیکھی تھی

کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی لینڈ اسکیپ کو پروفیسر نوریلی نہ جانے کتنی دیر تک محویت سے تکتے رہے اور گو کہ اس اثنا میں ان کو سچ مچ کے جیتے جاگتے کرسمس کارڈ سانتا کلوس کی گاڑی کہیں نظر نہ آئی لیکن گزرے ہوئے بے گنتی کرسمسوں کا طلسم ان کے شعور اور تحت الشعور کے ساتھ برابر آنکھ مچولی کھیلتا رہا ساتھوں نے اس سال بھی حسب دستور میری این کو ایک حسین سا کرسمس کارڈ روانہ کیا تھا جس میں اسی طرح کی

ایک برفانی لینڈ اسکیپ بنی ہوئی تھی اور برف پر سانتا کلوس کی گاڑی کے پہیوں کے نشانوں کے بجائے خون کی سی ایک سرخ لکیر تھی انھوں نے کارڈ کی پشت پر بہت سنبھال سنبھال کے لکھا تھا۔

"میری این کو محبتوں کے ساتھ!۔"

میری این جب قدیم یورپین تاریخ اور کلچر میں آنرز کر چکی تو لندن کے ایک کالج میں ریسرچ اسکالر ہو گئی، اور اس نے ساؤتھ کنگٹن ٹیوب اسٹیشن کے قریب ہی پروفیسر نوریلی کے مختصر سے فلیٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ ان دونوں کو یہ بندوبست بہت سہولت آمیز معلوم ہوا۔ یوں وہ ایک دوسرے کو اپنے اپنے علمی مشاغل میں مدد دے سکتے، پھر میری این نے کئی قسم کے ہندوستانی کھانے پکانے بھی سیکھ لیے تھے اور وہ پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ پروفیسر نوریلی کے لئے ویجی ٹیبل کھانا پکاتی اور وہ دونوں مل کر ہندوستان کی آزادی کے لئے پمفلٹ اور کتابیں لکھنے کے منصوبے بناتے۔

اس زمانے میں پروفیسر نوریلی نے کئی بار میری این سے شادی کی تجویز پیش کی۔ لیکن ایک تو میری این کو یہ ڈر تھا کہ شادی کرنے کے بعد ان دونوں کے علمی اور ادبی مشغلوں میں ایک رکاوٹ پیش آجائے گی۔ دوسرے اس کو فی الحال پروفیسر نوریلی سے ایک روایتی رشتہ قائم کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہ آئی کیوں کہ اس نے تو روایت کے خلاف ایک زبردست جنگ شروع کر رکھی تھی اور وہ لندن کی بلومبری تحریک میں بھی زور شور سے شرکت کرتی، ان حالات میں شادی جیسے روائتی رشتہ کا سہارا لینا کچھ مہمل سا تھا۔

بعض دفعہ پروفیسر نوریلی کے دماغ پر ایک بے وجہ افسردگی سی چھا جاتی، ان کو گمان ہوتا کہ شاید میری این کے دل میں بھی وہ پرانا گورے اور کالے کی تفریق کا جذبہ موجود تھا اور اسی لیے شاید وہ شادی پر رضامند نہ ہوئی۔ پھر ان کو زندگی میں ایک شدید مایوسی جھلک آتی اور وہ خود کو بہت مجبور اور تنہا محسوس کرنے لگتے۔ مگر پھر میری این ان کے جذبات کے رخ کو تاڑ جاتی۔ وہ کہتی "ابھی ابھی تم کو اور مجھ کو اس زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ تمہارے وطن کی آزادی کی جدوجہد کرنی ہے۔ روایت پرستی کے خلاف جدوجہد کرنی ہے روایت پرستی کے خلاف جنگ کرنی ہے انسان کو انسان کے ساتھ مساوات برتنے کا طریقہ سکھانا ہے۔ جلدی کیا ہے جب ہم اپنی نظریاتی زندگی سے اکتا جائیں گے یا مایوس ہو جائیں گے تو شادی کر لیں گے فی الحال تو یہ غیر روائتی بندوبست ہی بہتر ہے!" میری این کی اس بات پر پروفیسر نوریلی اس کو شک اور یقین کے ملے جلے جذبے کے ساتھ دیکھتے اور کہتے۔

"ڈارلنگ میری این جی تمہارے جذبات کی بہت قدر کرتا ہوں، لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے اور تمہارے درمیان ایک زبردست خلیج حائل ہے ایک گہری خلیج جو تمہارے بزرگوں نے حاکموں کی حیثیت سے، میرے بزرگوں پر حکومت کر کے قائم کی تھی۔" اور وہ کچھ اور بھی بجھے بجھے سے نظر آنے لگتے، مگر پھر میری این۔ "او ڈونٹ بی سلی! ڈارلنگ!" کہہ کر ان کو بہلا لیتی اور اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ایک زبردست نسوانی حسن جھلک آتا اور پروفیسر نوریلی سوچتے کہ شاید وہ غلط سمجھ رہے تھے۔ میری این اپنی رنگت کے باوجود ان سے حقیقی محبت کرنے کی اہل تھی!

اس زمانے میں پروفیسر نوریلی انتھک دس دس بارہ بارہ گھنٹے کام کرتے کبھی برٹش میوزیم میں کبھی انڈیا آفس کی لائبریری میں کبھی ہیرالڈ لاسکی کی پرائیویٹ لائبریری میں انھوں نے اس زمانے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات کے مضمون اور کہانیاں اور ناول لکھ ڈالے وہ اپنی ایک ایک تحریر کو درجنوں مرتبہ بدل بدل کر لکھتے، لندن کے شراب خانوں میں نوجوان شاعروں اور ادیبوں سے بحثوں میں الجھتے لیکن ان کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ انگلستان کا کوئی پبلشر ان کی کوئی کہانی یا ناول چھاپنے پر آمادہ نہ ہوتا اور ان کو خیال آتا کہ شاید وہ زندگی بھر ایک گمنام ریسرچ اسکالر یا غیر مطبوعہ کہانیوں کے ایک غیر معروف مصنف ہی رہیں گے اور ان کے والد کی توقع کہ ان کی شہرت دنیا بھر میں نوبل کی انتہا

پھیلے گی، پوری نہ ہو پائے گی۔

پھر ایک روز اچانک میری این نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان کا فلیٹ چھوڑ کر بی بی سی کے ایک پروگرام پروڈیوسر کے فلیٹ میں منتقل ہو گئی اور یوں میری این جس نے ان کا نام نور علی سے نوریل کیا تھا۔ ان کے دل میں ایک کانٹا، ایک مسلسل خلش بن گئی اور غالباً اسی بنا پر ان کی تحریروں میں ان کے دل میں ایک ایسا پُر خلوص جذبہ جھلک آیا جس کو یکے بعد دیگرے کئی نقادوں اور کئی پبلشروں نے سراہا اور یوں ان کی زندگی میں ایک اور انقلاب رونما ہو گیا۔ ان کی کہانیاں اور ناول ایکا ایکی پبلشروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ سب سے پہلے سڈنی ویب کی وساطت سے ایک ترقی پسند پبلشر نے ان کا ایک ناول چھاپا۔ پھر کیمبرج کے ایک پبلشر نے ان کی کہانیوں کا مجموعہ چھاپا اور پھر انگلستان اور امریکہ کے کئی پبلشروں نے ان سے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا اور پاکٹ سیریز والوں نے بھی ان کی کتابوں کے ایڈیشن شائع کرنے شروع کر دیئے۔

ایک روز ہاؤس آف کامنز کے باہر پروفیسر نوریل کے ایک ہم وطن آزادی کے علمبردار نوجوان لیڈر کی گرفتاری کے سلسلے میں مظاہرہ کیا تھا اور پروفیسر نوریل بھی ایک ابھرتے ہوئے مشرقی ادیب کی حیثیت سے اس میں شریک تھے انھوں نے اچانک مجمع میں میری این کو بھی دیکھا وہ اپنے براڈ کاسٹر دوست کے ساتھ اور چند اور نوجوان سفید فام لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ مظاہرے میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ شرکت کر رہی تھی اور باغیانہ قسم کے پلے کارڈ لئے کھڑی تھی پروفیسر نوریل کو امید تھی کہ چونکہ اب وہ ایک اچھی خاصی بین الاقوامی شہرت کے مالک بن چکے تھے تو شاید میری این ان کی جانب خاص طور پر متوجہ ہوگی۔ لیکن میری این اور اس کی ساتھی لڑکے اور لڑکیاں ان سے بالکل اجنبی طور پر ملے اور پھر مجمع میں ادھر اُدھر بکھر گئے ایک لمحے کے لئے جب مظاہرے کے دوران پروفیسر نوریل نے خود کو میری این کے قریب پایا تو انھوں نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ دیکھو میں نے ٹھیک ہی سمجھا تھا نا۔ ہمارے اور تمھارے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہے! لیکن میری این نے ان کو ایسے دیکھا جیسے وہ کسی اجنبی سے ناقابل فہم زبان میں گفتگو کر رہے ہوں۔

اس کے بعد پروفیسر نوریل کی میری این سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ ویسے وہ کبھی کبھی ان کو کسی دور دراز ملک سے ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھیج دیتی یا پھر کسی دوست کے ذریعہ ان کو میری این کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات موصول ہو جاتیں لیکن نوریل خود ہر کرسمس پر پابندی کے ساتھ ایک خوبصورت سا کارڈ خرید کر اس کے پیچھے لکھتے "میری این کو محبتوں کے ساتھ" اور ڈاک سے روانہ کر دیتے۔

میری این نے صرف ایک بار ان کے کارڈ کی رسید بھیجی۔ وہ بھی بہت مختصر اور اکھڑے اکھڑے الفاظ میں۔ "کارڈ ملا بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔ شکریہ! ویسے میں اب شعوری طور پر مذہب سے بہت دور ہٹ گئی ہوں! پھر بھی ایک انسان کی حیثیت سے تمہاری اور یسوع مسیح دونوں کی بہت قدر کرتی ہوں! شکریہ۔ محبتوں کے ساتھ! ۔ میری این!"

اب میری این کی یادگار، پروفیسر نوریل کے پاس چند دھندلی دھندلی تصویریں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک تصویر وہ تھی جو ان دونوں نے آج سے برسوں پہلے ویلز کی وادیوں میں کوہ پیمائی کرتے ہوئے ایک سستے سے بازاری فوٹو گرافر سے کھنچوائی تھی وہ دونوں اپنے موٹے موٹے لبادوں اور بڑے بڑے وزنی جوتوں میں بہت بے ڈھب سے نظر آ رہے تھے ایک تصویر اور تھی اس میں وہ اور میری این اور ان کے ہم عمر اور بہت سے لڑکے اور لڑکیاں انڈیا آفس کے باہر پلے کارڈ لئے کھڑے تھے اس تصویر میں میری این بالکل اجنبی نظر آ رہی تھی کیونکہ اس کے علاوہ اس تصویر میں بہت سے کالی رنگت والے لوگ تھے۔

اپنے مختلف لوگوں کے خطوں سے پروفیسر نوریل کو میری این کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات ضرور مل جاتیں۔ ان کو پتہ چلا کہ کچھ عرصہ بعد میری این اپنے بی بی سی والے دوست سے بھی علیحدہ ہو گئی اور انتہائی روائتی انداز میں ایک انگریز افسر سے شادی کر کے کینیا چلی گئی۔ پھر کینیا میں اس کو ایک جرمن شکاری سے محبت ہو گئی اور وہ گھر بار سب کچھ فراموش کر کے اس کے ساتھ افریقہ اور ملایا کے جنگلوں میں برسوں ماری ماری پھرتی رہی۔ پھر وہ ایک اور امریکی سیاح کے چکر میں آ گئی اور اس کے ساتھ پوری دنیا کا چکر لگانے کے بعد سنگاپور میں بچوں کے ایک اسکول میں انگریزی

پڑھانے پر مامور ہو گئیں اور یوں تیس سال کے قریب گزر گئے۔

تیس سال ایک طویل مدت تھی اس اثنا میں میری این کی سفید کھال پہ بے شمار جھریاں اُبھر آئیں اس کے گول گول خوشنما شانوں میں جھول آگیا۔ وہ تقریباً ہر شام وسکی اور سوڈا پی کر اپنے دیسی نوکروں سے غلیظ غلیظ مذاق کرنے شروع کر دیتی۔ قدیم یورپین تاریخ اب اس کے لئے ایک مہمل سی داستان بن کے رہ گئی تھی، اور شاید اسی بھولی بسری داستان میں کہیں ایک مختصر سی جگہ پروفیسر نوربلی والے رومان کو حاصل تھی۔

پروفیسر نوربلی ایک عرصے تک انگلستان اور امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں سے وابستہ مجرد زندگی بسر کرتے رہے اور جب وہ اس اکیلے پن کی زندگی سے بُری طرح اکتا گئے تو انھوں نے اپنے ہی وطن کی ایک پارسی عورت سے عشق شروع کر دیا۔ لیکن جب اس کے اور ان کے درمیان بھی مذہب کی دیوار حائل ہو گئی تو انھوں نے مانچسٹر یونیورسٹی کی ایک اوسط درجے کی انگریز طالب علم لڑکی کو مسلمان کر لیا اور اس سے شادی کر لی۔ لیکن اب کی مرتبہ قسمت نے پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ قدرے فربہ جسم والی اور گھریلو اطوار و عادات کی انگریز عورت چند سال بعد کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ گئی اس کی نشانی اب پروفیسر نوربلی کے پاس ان کی اکلوتی اولاد ایک لڑکی تھی جس کا نام انھوں نے شہربانو رکھا تھا لیکن جس کو وہ پیار سے "شہری" کہتے۔

نور علی کے متوسط درجے کے کلرک باپ کے خواب میں جو رنگ آئے تھے اب ان کی یاد بھی نوربلی کے دماغ سے محو ہو چکی تھی لیکن ان کی پیشین گوئی ضرور پوری ہوئی اور ایک دھڑلے کے ساتھ پوری ہوئی۔ پچھلے تیس سال کے عرصہ میں ان کی شہرت انگلستان اور امریکہ میں اور انگریزی لکھنے پڑھنے والے تقریباً ہر ملک میں نور کی مانند پھیل گئی، بلکہ روس اور فرانس میں بھی ان کی کئی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور ان کے اپنے وطن میں اکثر ریلوے بک اسٹالوں پر ان کے ناولوں کے سستے سستے ایڈیشن درجنوں کی تعداد میں نظر آنے لگے اور انگلستان یا امریکہ کے بعض میگزین جب مشرقی ادب یا کلچر سے متعلق کوئی خاص مضمون چھاپتے تو سب سے پہلے پروفیسر نوربلی سے ہی مشورہ کرتے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جب برٹش کونسل نے کامن ویلتھ ملکوں میں اپنی کلچرل کارروائیاں شروع کیں تو اس نے پروفیسر نوربلی کو ان کے وطن کا ایک دورہ کرنے کی غرض سے بھیجا۔ تقریباً بیس سال بعد وہ اپنے وطن لوٹے تھے اور ان کو ہر چیز میں ایک گہری اجنبیت نظر آئی اور کبھی کبھی ان کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ اپنے وطن ہی میں ایک غیر ملکی سیاح کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی ان کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ان کے اپنے ملک میں بھی ان کی کتابوں کی زبردست مقبولیت حاصل تھی جگہ جگہ ریلوے بک اسٹال پر جب ان کو اپنے کسی ناول کا سستا ایڈیشن نظر آتا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو جاتے لیکن پھر اپنے وطن میں چند مہینے بسر کرنے کے بعد پروفیسر نوربلی ایک اور طویل مدت کے لئے واپس انگلستان چلے آئے۔ اور رفتہ رفتہ ان کی کتابیں آؤٹ آف پرنٹ ہوتی چلی گئیں اور جب کوئی دس سال جلاوطن رہنے کے بعد ایک بار پھر راولپنڈی پہنچے تو ان کو ایک بار پھر اس بات کا شدید احساس ہوا کہ اب ان کو پہچاننے والے چند پرانی وضع کے ادھیڑ عمر کے لوگ رہ گئے تھے اور نئی نسل کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کی تحریروں سے کوئی لگاؤ نہ تھا جو وہ اپنے پچھلے سفر کے دوران انھوں نے محسوس کیا تھا اور نہ بک اسٹالوں پر ان کو اپنی کتابوں کے سستے ایڈیشن نظر آتے اور ان دمکتے ہوئے چہروں والے نوجوان طالب علموں کی یاد ان کو بُری طرح ستانے لگی جن سے اپنے پچھلے سفر پر وہ جگہ جگہ ملے تھے اور جو ان سے ملتے ہی اپنے کالج کی یونین میں تقریر کرنے کی فرمائش کر دیتے تھے۔ اس گہری تبدیلی کو محسوس کر کے پروفیسر نوربلی کو اپنے دل میں ایک قسم کی ٹیس محسوس ہوئی لیکن انھوں نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں خود کو تسکین دلائی۔ "وقت ہمیشہ ایک جگہ نہیں ٹھہرا رہتا۔ ماضی کی یادوں پر آنسو بہاتے رہنا ایک دقیانوسی ذہنیت کی نشانی ہے۔"

اس مرتبہ پروفیسر نوربلی کے ساتھ ان کی لڑکی شہربانو بھی آئی تھی۔ شہربانو کے بھاری بھرکم مشرقی نام سے لندن

میں اس کے احباب بہت کم واقف تھے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں اور پبلیسی میں بسنے والے آرٹسٹوں اور ایکٹروں کے حلقے میں وہ محض شیری کے نام سے ہی پکاری جاتی۔ لیکن جب پروفیسر نوریلی کا جہاز مارسیلز کی بندرگاہ سے روانہ ہوا تو انھوں نے بہت شعوری طور پر شیری کو شہر بانو کہنا شروع کر دیا اور انھوں نے اس کو اپنے وطن کی دور افتادگی پر جذباتی لیکچر دے ڈالے۔ مگر نہ جانے کیوں شہر بانو اپنے اصلی نام کو اپنی شخصیت سے پورے طور پر وابستہ نہ کر پاتی، اور جب پروفیسر نوریلی بہت جما جما کے اس کا نام شہر بانو پکارتے تو وہ کچھ چونک سی پڑتی۔

راولپنڈی کے ہوائی اڈے سے آتے ہوئے پروفیسر نوریلی نے ٹیکسی کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا اور ان کو یہ دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی کہ مال روڈ کے کنارے کنارے جو کچی سڑک انھوں نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی جس پر اس زمانے میں انگریز فوجی افسر اپنے گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے اب غائب ہو چکی تھی اور جگہ جگہ پرانی وضع کی کشادہ برآمدوں والی کوٹھیوں کے بجائے اب سیمنٹ کی دو منزلہ دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ سڑکوں پر بھی اب وہ سکون نہ تھا جس کے لئے راولپنڈی پنشن یافتہ اینگلو انڈین پولیس سارجنٹوں اور ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ کے نچلے درجے کے افسروں میں بہت مقبول تھا اس کی جگہ اب موٹروں اور اسکوٹروں کی ٹریفک نے لے لی تھی۔ شہر کی پرانی آبادی میں مکانوں اور منڈیروں پر برسوں کی کائی جمی ہوئی تھی۔ کئی جگہ بچے نالیوں پر بیٹھ کر اپنی ضروریات سے فارغ ہو رہے تھے اور کھانے پینے کے سامان پر مکھیوں کی زبردست یلغار تھی شیری شاید ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد ایک چبھتا ہوا سا جملہ کس دیتی لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے ڈارلنگ پروفیسر نوریلی کو لاڈ سے ڈاکہتی) کی چمکدار آنکھوں پر ایک سایہ سا منڈلا رہا ہے۔ لہٰذا وہ خاموش ہی بیٹھی رہتی۔

پھر بھی ہوٹل کے لاؤنج میں اپنا آکسفورڈ اسٹریٹ کی ایک فیشن ایبل دکان سے خریدا ہوا وزنی اونی کوٹ اتارتے ہوئے شیری نے سوچا کہ نہ جانے ڈاکو اس موسم میں راولپنڈی آنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہاں سینٹرل ہیٹنگ قطعی مفقود تھی اور اکثر مکان دکان اور ہوٹل اس آرٹ سے ناواقف تھے جس کو انٹیریئر ڈیکوریشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ہوٹل کے لاؤنج میں مسلسل تیز برفیلی ہوا کے جھکڑ آوارہ گردی کر رہے تھے اور ہوائی ٹھنڈک اس کی ہڈیوں کے اندر تک سرایت کر رہی تھی اور گو کہ لاؤنج میں دو بڑے بڑے آتشدان تھے جن میں موٹے موٹے لکڑ سلگ رہے تھے مگر سردی کی شدت خاصی ناقابل برداشت تھی۔

"ممکن ہے مری میں برفباری ہو رہی ہو!" ۔ پروفیسر نوریلی نے آگ کے شعلوں کو تکتے ہوئے کہا۔ آگ کے شعلے لمبی لمبی زبانوں سے آتشدان کی دیوار کو چاٹ رہے تھے دھواں ایک دھیمی دھیمی سنسناہٹ کے ساتھ رینگ رینگ کر اوپر جا رہا تھا لاؤنج کے دوسرے آتشدان کے قریب ایک نوجوان آگ کی جانب پشت کئے کھڑا تھا وہ شیری اور پروفیسر نوریلی کو گھور گھور کے دیکھنے لگا۔ شیری جزبز ہو گئی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا! "تہذیب تہذیب تو شاید انھوں نے سیکھی ہی نہیں!" اور اس کی جانب سے پشت کر کے ایک آرام کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئی۔

اس نوجوان کے قریب چمڑا منڈھی ہوئی کرسیوں پر دو ایک عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے جو آپس میں اونچی آوازوں میں بے تکان باتیں کر رہے تھے، ایک عورت جس کی پشت شیری اور پروفیسر نوریلی کی جانب تھی کافی بنانے میں مشغول تھی اور کافی بنانے کے ساتھ ساتھ اونچی آواز میں بے تکان بولے جا رہی تھی۔ "وہ ۔ برف! بس برف سے تو مجھے عشق ہے!

!جب ہم بچپن میں شملہ میں رہتے تھے تو برف باری شروع ہوتے ہی ہم ربڑ کے بڑے بڑے جوتے پہن کر گھر سے نکل پڑتے تھے اور برف کی گیندیں بنا بنا کر ایک دوسرے کو مارتے۔ پھر صحن میں برف کا آدمی بناتے! اسی لئے میں نے کمال سے کہا کہ میں اب کی سردیوں میں ضرور برف باری دیکھنے مری جاؤں گی!" ہم کب چلیں گے اوپر ڈارلنگ" ۔ لیکن کمال نے اس کے سوال کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور بدستور شیری اور پروفیسر نوریلی کو گھورنے میں مصروف رہا اور وہ عورت ایک بار پھر کافی بنانے اور باتیں کرنے میں منہمک ہو گئی۔

ایکا ایکی کمال نے چونک کر کہا۔ "ہاجرہ یہ پروفیسر نوریلی ہیں۔ پروفیسر نوریلی!۔"

"پروفیسر کون!۔" اس عورت نے کافی انڈیلتے ہوئے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"بھئی پروفیسر نوریلی اور کون؟" کمال نے جھنجھلا کر کہا۔ "بین الاقوامی شہرت کے مصنف۔ مفکر۔ ناول نگار!۔ ان کی پہلی کتاب انگلستان میں اس وقت چھپی تھی جب تم شاید پرائمری کلاس میں پڑھ رہی ہوگی۔"

ہاجرہ نے ایک لمحے کے لئے مڑ کر پروفیسر نوریلی اور شیری کو دیکھا، مگر پھر غالباً اس کو ان لوگوں میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہ ہوئی اور وہ دوبارہ اپنی کافی میں منہمک ہوگئی اور چہک چہک کر پہاڑوں اور برف باری اور جاڑوں کے موسم کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

کمال کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر پروفیسر نوریلی خفیف سا مسکرا دیئے اور اس سے پوچھنے لگے۔ "کچھ معلوم ہے مری کا کیا حال ہے!۔ برف باری شروع ہوئی کہ نہیں!۔"

کمال ان کی توجہ سے دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور ان کے قریب آگیا۔ اس نے کہا کہ "جی سنا تو یہی ہے کہ وہاں مسلسل کئی دن سے برف پڑ رہی ہے!۔ میرا نام کمال ہے!۔ آپ پروفیسر نوریلی ہیں نا!۔"

پروفیسر نوریلی مسکرا دیئے۔ ان کو یہ دیکھ کر ایک گونہ مسرت ہوئی کہ اب بھی ان کو محض تصویروں سے دیکھ کر پہچاننے والے لوگ راولپنڈی میں موجود ہیں۔ کمال بے تکلفی کے ساتھ بولنے لگا۔ "میں نے تو ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ میں نے آپ کی کتابوں کے ڈسٹ جیکٹ پر بارہا آپ کی تصویر دیکھی ہے!۔"

پروفیسر نوریلی نے اٹھ کر بہت گرمجوشی کے ساتھ کمال سے ہاتھ ملایا، پھر وہ کمال کا تعارف اپنی بیٹی سے کرانے لگے! "میری بیٹی شہر بانو۔ اس کی خاطر ہی میں اس موسم میں یہاں آیا ہوں، تاکہ اپنی زندگی میں اس کا تعارف اپنے وطن کی سرزمین سے کرادوں! میرے دل میں مری کی برف باری کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ میں نے سوچا کہ شیری بھی یہ حسین منظر دیکھ لے۔!"

شیری رسماً مسکرا دی اور پھر آتش دان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو محویت کے ساتھ تکنے لگی، کمال پروفیسر نوریلی سے تن دہی کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہوگیا۔ اس نے کہا "کتنا دلچسپ اور اچھا اتفاق ہے مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اپنے کالج کے زمانے کے آئیڈیل مصنف سے میری ایک روز راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں ملاقات ہوگی اور میں اس کے دو بدو بات چیت کرسکوں گا!۔ "میں آپ کے ناولوں کو اس عظیم دور کی یادگار سمجھتا ہوں۔ جب ہمارا وطن انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ہم لوگ فرسٹ ایئر میں داخلہ لیتے ہی آپ کی کتابوں کے سستے ایڈیشن ضرور خریدتے تھے! ویسے شاید ان خاتون کے لئے (شیری کی جانب متوجہ ہو کر) یہ سب باتیں محض ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہوں گی۔!"

پروفیسر نوریلی مسکرا مسکرا کر باتیں سنتے رہے۔ شیری بھی ایک دو بار رسماً مسکرا دی۔ پھر پروفیسر نوریلی نے دھیمے دھیمے لہجے میں کہا "یقیناً اب تمہاری نسل کے لوگ ان باتوں کو محض تاریخ سمجھنے لگے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کالونیل حکومتوں کا خاتمہ ہوجانے کے بعد وہ تاریخ کی کتابوں کا ایک باب بن گیا ہے اس وقت کے مسائل اور تھے اور موجودہ دور کے مسائل کچھ اور ہیں اس دور کا سب سے اہم مسئلہ آزادی تھا موجودہ دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان ایٹم بم اور ایٹمی جنگ کے خطرے کے باوجود امن کی زندگی کیسے بسر کرے! جب تک اس دور کا نوجوان بم اور جنگ کے خلاف احتجاج نہ کرے۔ اس کو بالغ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی دو سال ہوئے جب میری بیٹی شیری نے برٹرنڈرسل کی تحریک میں پہلی مرتبہ حصہ لیا تھا تو مجھے اس بات کا یقین ہوا تھا کہ یہ واقعی ذہنی طور پر بالغ ہو چکی ہے۔!"

شیری ایک بار پھر رسماً مسکرا دی اور کمال کو خواہ مخواہ خیال آیا کہ ایک ہی دنیا ایک ہی صدی میں سانس لینے کے باوجود شیری اور

ہاجرہ میں کس قدر فاصلہ ہے!

پروفیسر نوریلی جو اپنے جذبات کے ریلے میں بہہ نکلے تھے۔ تقریر کرنے کے انداز میں کہنے لگے۔ "مجھے معلوم ہے کہ اب میری نسل کا زمانہ ختم ہو چکا ہے ہم لوگ ایک گزرے ہوئے دور کی یادگار، ایک کھنڈر بن چکے ہیں، مگر اکثر مجھے یہ سوچ کر بھی بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہماری نسل نے تم نوجوانوں کی نسل کے ساتھ بہت بے انصافی کی۔ دو ہولناک جنگیں۔ ایٹم بم۔ ہیروشیما۔ کیا سوغات ہے جو ہم نے تم کو دی۔" پھر بولتے بولتے ان کی آواز رندھ سی گئی اور وہ خاموشی کے ساتھ آگ کے شعلوں کو تکنے لگے۔

شیری نے موضوع بدلنے کے خیال سے پوچھا۔ "ڈا۔ مری کب چلیں گے!"

کمال چونک پڑا۔ اس نے کہا۔ "اچھا تو آپ لوگ بھی مری جا رہے ہیں، تب تو ہم اکٹھے چل سکتے ہیں۔ ہم نے ایک بہت اچھے ریسٹ ہاؤس میں بندوبست کیا ہے۔ مجھے یقین ہے وہاں آپ لوگوں کو بھی بہت آسانی سے جگہ مل جائے گی!" پھر وہ ہاجرہ کو اٹھا کر اس طرف لے آیا جہاں پروفیسر نوریلی اور شیری بیٹھے تھے۔ "میری بیوی ہاجرہ" اس نے جلدی جلدی تعارف کرایا۔ ہاجرہ نے شیری کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ پہلی ملاقات میں ہی اس کی تمام شخصیت کا اندازہ لگا لینا چاہتی ہو! شیری نے بھی جواباً ہاجرہ کو ایسی ہی نظروں سے دیکھا اور ہاجرہ کو بیّن طور پر محسوس ہوا کہ شیری کی نگاہوں میں ایک ڈھکا چھپا سا چیلنج ہے!

اگلے روز وہ سب مل کر ایک کرائے کی اسٹیشن ویگن میں اکٹھے مری کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے بھر ان کا ڈرائیور بے تکان بولتا رہا اور اسٹیشن ویگن بل کھاتی ہوئی سڑک پر بے خطر دوڑتی رہی۔ کئی بار ہاجرہ کو خیال آیا کہ اگر وہ ڈرائیور یونہی بے کار بک بک کرنی بند کر کے گاڑی چلانے کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائے تو بہت بہتر ہو اور پھر شاید یہ پہاڑی راستہ اس کو اس قدر خوف زدہ نہ کرے لیکن وہ برابر بے تکان بولتا رہا۔ اپنے بارے میں اپنے پیشے کے بارے میں اس دور افتادہ سرزمین کے بارے میں جو اب سرحد کے پار تھی اور جہاں ایک گھاٹی میں چیلوں کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان اس کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہ ہر دور افتادہ خبر کے بارے میں ایسے مسلسل بول رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے وطن سے یہاں پہنچا ہو۔ برسوں پہلے کی یادیں اس کے ذہن پر تصویروں کی طرح نقش تھیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھے مردوں کے گرتے پڑتے قافلے، بلّم اور تلواریں اٹھائے ہوئے ہاتھ راستوں کے کنارے جھاڑیوں میں سڑتی ہوئی انسانی لاشیں۔

اس نے کہا "صاحب! جب انگریز کی جنگ شروع ہوئی تو میرا بڑا بھائی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے یاد ہے کہ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت بہادری سے لڑا۔ اور اسی بہادری کے نتیجے کے طور پر اس کا ایک بازو ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا۔ پھر جب انگریز چلا گیا تو وہ گاؤں واپس آ گیا۔ اسی زمانے میں فسادات شروع ہو گئے اور وہ سب گاؤں والوں کی حفاظت کا پلان بناتا رہتا۔ لیکن صاحب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک بے کار بازو والا آدمی کہاں تک کسی کی حفاظت کر سکتا ہے۔ ایک روز وہ جمعہ کی نماز کے لئے برابر والے گاؤں کی مسجد گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی نوجوان تھے وہ بھی واپس گاؤں نہیں آئے پھر روتے روتے میری ماں اندھی ہو گئی اور ہم سب میرا باپ۔ میری اندھی ماں۔ میرے بھائی بہن۔ محلے والے ہم سب ایک قافلے کے ساتھ مظفر آباد آ گئے۔ صاحب میں اس وقت بہت ہی چھوٹا تھا چلتے چلتے میرے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے برسات کے زمانے میں ان میں اب بھی پیپ پڑ جاتی ہے" پھر وہ چند لمحوں کیلئے خاموش ہو گیا اور اسٹیشن ویگن ایک سرعت کے ساتھ پہاڑی راستوں پر دوڑتی رہی اور خوبصورت بل کھاتی ہوئی سڑک چیل کے درختوں کی خاموش قطاریں کہیں کہیں پہاڑ کے دامن میں بہتی ہوئی جھرنیاں ہر چیز پوری لینڈ اسکیپ پانی کی طرف دوڑتی رہی۔

ایکا ایکی ڈرائیور نے پھر پروفیسر نوریلی کو مخاطب کیا! "صاحب میرا باپ کہتا تھا یہ سب جھگڑے فساد انگریز کی شرارت تھی میرا باپ بہت سیانا آدمی تھا اس نے سری نگر کے بڑے کلب میں بیرے کا کام کیا تھا۔ صاحب وہ انگریز کو خوب سمجھتا تھا۔"

شیری دل ہی دل میں چڑ گئی۔ اس نے انگریزی میں کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "تم لوگ اپنی ہر مصیبت کے لئے انگریز پر الزام دھرنے

کی عادت کب چھوڑ دو گے!۔"

کمال اس کے "تم لوگ" کہنے پر بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو طے پا گیا کہ تم ہم لوگوں میں شامل نہیں ہو۔" اور شیریں اور بھی چڑ گئی اور بے دلی کے ساتھ ماضی کی سمت دوڑتی ہوئی زمین اور پہاڑی سڑک کو گھورنے لگی۔ جب بل کھاتی ہوئی سڑک کسی پہاڑی کے گرد ایک پورا چکر لگانے کے بعد کئی فٹ اور بلندی پر نکل آتی تو کھڈوں اور گھاٹیوں اور درختوں کی پھننگوں پر بیٹھے ہوئے بادل بہت نیچے رہ جاتے! اور نیچے بہت نیچے کسی سوکھے ہوئے چشمے میں پتھروں کی رنگت یکسر بدل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ سورج بھی کہیں بہت دور بہت نیچے اپنے سنہرے جال سمیت رہ گیا ہے اور اوپر اب صرف بادل اور دھند اور نیم تاریکی ہے!

مری کے بسوں اور ٹیکسیوں کے اڈے تک پہنچتے پہنچتے ان کو کافی وقت لگا کیوں کہ جوں جوں وہ اوپر آتے گئے سڑکوں پر برف کی تہہ موٹی ہوتی چلی گئی اور گو کہ جگہ جگہ مزدوروں کے جھنڈ برف کو توڑ توڑ کر راستہ بنانے میں لگے ہوئے تھے پھر سڑک پر ٹیکسی کے پہیئے بار بار ہٹ جاتے، اور گاڑی کا اوپر چڑھنا دوبھر معلوم ہونے لگتا۔

مری کے گرد و نواح اور مری میں برابر برف باری ہو رہی تھی اور سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے مکانوں اور دکانوں پر کھڈوں کے کنارے کنارے نصب ریلنگ پر کھپریل کی چھتوں پر، درختوں کی شاخوں پر، ہر جگہ برف کی ایک موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔

وہ سب لوگ بسوں کے اڈے پر پہنچ کر اسٹیشن ویگن سے اتر پڑے اور قلیوں کے سروں پر اپنا سامان رکھوا کر ریسٹ ہاؤس کی سمت پیدل چل پڑے۔

اور پھر مری میں ریسٹ ہاؤس میں پڑاؤ کئے ہوئے پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ برف باری تمام وقت جاری رہتی جیسے اس سیزن میں برف اپنا ایک نیا ریکارڈ قائم کئے بغیر دم نہ لینا چاہتی تھی اور مری بلکہ مری سے بہت اوپر تک جہاں تک نگاہ جاتی تھی برف ہی برف نظر آتی شروع شروع میں برف ننھے ننھے نقرئی ذرات کی مانند گرتی۔ مگر پھر دو ایک دن کی برف باری کے بعد ہوا ایک دم سے بہت تند اور تیز ہو گئی اور اب برف کے بڑے بڑے گالے ایک آوارگی کے ساتھ فضا میں ہر وقت تیرتے پھرتے اور پروفیسر نوری اور شیریں، کمال اور ہاجرہ ریسٹ ہاؤس میں مقید سے ہو کر رہ گئے۔ اکثر وہ سب مل کر بڑے کمرے کی فریج ونڈو کے قریب بیٹھ کر گرم گرم کافی پی کر اپنا وقت گزارتے مگر برف کے گالوں کی بے آواز چاپ ان کے تحت الشعور میں ایک زبردست گونج کی مانند گردش کرتی رہتی اور وہ فریج ونڈو اور کافی ایک دوسرے کے وجود سے بیزار ہو جاتے۔ پھر کبھی کبھی وہ لوگ موٹے موٹے برساتی کوٹ اور ربڑ کے ڈھیلے ڈھالے بوٹ پہن کر باہر نکل پڑتے لیکن باہر بھی برفانی لینڈ اسکیپ کی یکسانیت ان کے اعصاب پر ایک بار بن جاتی اور وہ ایک دوسرے سے کچھ روٹھے روٹھے واپس ریسٹ ہاؤس کو چلے جاتے۔

کبھی پروفیسر نوری خود کو دوسروں کا گائیڈ سمجھنے لگتے۔ اور پھر وہ باقی سب کو محض مری کے پہاڑی راستوں کے پیچ و خم کے رموز و نکات سے ہی آگاہ نہ کرتے بلکہ بار بار وقت کی ڈگر پر الٹے قدم بھی چلنا شروع کر دیتے اور ان کی یہی خواہش ہوتی کہ باقی لوگ بھی ان کے پیچھے پیچھے ماضی کی جانب ایک جذباتی سفر کرنے لگیں۔

ایک مرتبہ کشمیر پوائنٹ کی اونچائی پر پہنچ کر تو واقعی وہ بہت شدت کے ساتھ جذباتی بن گئے انھوں نے شمال میں ایک مبہم سی سمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ۔ ادھر۔ اس طرف کشمیر ہے! کشمیر! سری نگر!۔ یہ پہلگام!" وہ ایسے بول رہے تھے ان کی آواز خلا میں گردش کر رہی ہو۔ "جھیل ڈل۔ اونگھتے ہوئے شکارے! اہلیتر ولی میں ملبوس مانجھی! کیا بات ہے مسٹر کمال، تمہارا یہ کرشن چندر بالکل فراڈ ہے! بکواس ہے، اپنے آپ زندگی بھر لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھرا اور جب جذباتیت لگا ستانے تو

تو فوراً کشمیر کے لئے لٹو سے بہانے شروع کر دیتا ۔ فراڈ ! قطعی فراڈ ! ۔

کمال کو پروفیسر نوریلی کی بات سے کافی کوفت محسوس ہوئی، کیونکہ اس کے لئے کرشن چندر کا ادب ایک ایسے دور کی یادگار تھا جب اس میں اپنے آپ بھی ایک گہری، انڈر گریجویٹ قسم کی جذباتیت تھی ۔ آخر جذباتیت میں ایسی برائی ہے بھی کیا! ۔ لیکن پروفیسر نوریلی اپنی یادوں کے دھارے میں بہتے رہے ۔ ویسے بھی مجھے کرشن سے بنیادی طور پر ایک زبردست اختلاف ہے وہ زندگی میں صحیح اور غلط، اچھا اور برا، حسین اور بدصورت، ایسے اضافی نظریوں سے بری طرح مغلوب ہے حالانکہ پہاڑ، دریا، لینڈ اسکیپ، برف، یہ سب چیزیں اضافی نظریوں سے علیحدہ بھی اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں ! "

" ہاں قطعی، اور اس وقت ہم ان چیزوں کے ہاتھوں یہاں مری میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ بے ناشیری !"

کمال دراصل اب پروفیسر کی گفتگو سے اکتا چلا تھا۔ اس نے جلا کر ایک بار پھر شیری کو چھیڑنے کی کوشش کی ۔ " ویسے دیکھئے نا، پروفیسر صاحب شیری بھی کچھ ضرورت سے زیادہ اضافی نظریوں کے ہیر پھیر میں پھنس کے رہ گئی ہیں ۔ صلح یا جنگ، امن یا ایٹم بم، ہیروشیما یا پکاسو کی سفید فاختہ یہ بھی تو آخر اضافی نظریئے ہی ہیں ! " لیکن شیری خاموش رہی وہ غالباً اب بہت بور ہو چکی تھی اور کمال سے سنجیدہ بحث میں الجھنے کے لئے تیار نہ تھی اور پروفیسر نوریلی بھی خاموش ہوئے کیونکہ وقت کی ڈگر پر الٹے قدم چلتے چلتے اب ان کا شعور ایک ایسے نقطے پر مرکوز ہو کے رہ گیا تھا جو غالباً شیری اور کمال اور ہاجرہ سب کے لئے ناقابل فہم تھا پھر جب وہ لوگ تل روڈ کے راستے اپنے ریسٹ ہاؤس کو لوٹنے لگے تو یکا یکی جیسے پروفیسر نوریلی ایک بار پھر اپنے جذبات کی رو میں بہہ نکلے ۔ انھوں نے کہا ۔ " جب ہم سب سے پہلی مرتبہ آج سے چالیس پینتالیس برس پہلے مری آئے تھے تو یہاں پر چاروں طرف گورے ہی گورے نظر آتے تھے ۔ دراصل یہ مقام اس زمانے میں ایک ٹرانزٹ کیمپ سا تھا ۔ گورے اور نرسیں ! ۔ ان کے علاوہ بس کشمیر جانے والے دو ایک مسافر ہی یہاں نظر آتے اور میری چھوٹی بہن کو تو گوروں سے بہت شدید طور پر ڈر لگتا تھا ۔ وہ تو اگر کسی گورے کو سڑک کے دوسرے کنارے پر بھی چلتے دیکھ لیتی تو اپنی جگہ پر منجمد ہو کے رہ جاتی اور اس کی رنگت بالکل پیلی پڑ جاتی ۔ "

انگریزوں کی حکومت کا یہی تو سب سے بڑا تحفہ تھا جو ہم دیسیوں کو ورثے میں ملا تھا، ایک بے وجہ سی دہشت جو سالہا سال کی غلامی کے بعد ہمارے دلوں، ہمارے دماغوں، ہمارے ذہنوں پر حاوی ہو گئی تھی ! ۔ کمال نے قدرے تلخی آمیز لہجے میں کہا ۔ " وہ گورا اور کالا حاکم و محکوم ! ۔ "

شیری کمال کی بات پر جھلا اٹھی، اس نے کہا ۔ " مسٹر کمال ! آپ سیاسی نقطۂ نظر سے اپنے ہم عصروں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں ! گورے اور کالے کی بحث اب قطعی فرسودہ قرار دی جا چکی ہے اور محض امریکہ کی چند انتہائی دقیانوسی ریاستوں کے سوا اب دنیا میں کہیں اور کالے اور گورے کی کوئی بحث باقی نہیں ! ۔ جب ہم لوگ لندن یا پیرس یا روم میں ایٹم بم اور جنگ کے خلاف مظاہرہ کرتے تھے تو ہم سب یعنی کالے اور گورے اور براؤن اور پیلے لوگ، اکٹھے رہتے ۔ اکٹھے ہی جلوس نکالتے اکٹھے ہی اس کے لئے نعرے لگاتے اور اپنی کھال کی رنگت کی بنا پر ہم کو آپس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا ۔ دراصل اب ہماری نسل کے لئے سب سے سنجیدہ مسئلہ کولونیلزم نہیں کیونکہ کولونیلزم تو اپنی موت مر ہی چکا ہے بلکہ جنگ یا امن ہے ! شاید وہ کچھ دیر اور یونہی لیکچر دیتی رہتی، کیونکہ اس کے تحت الشعور میں خواہ مخواہ کمال کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل جاری تھا لیکن پھر اس کو یکا یکی یوں محسوس ہوا کہ گویا کمال اس کی پرمغز باتوں کے بجائے اپنی بیوی کے فرکوٹ کو سنبھالنے میں زیادہ منہمک تھا اس لئے وہ جھنجلا کر خاموش ہو گئی اور پروفیسر نوریلی ایک بار پھر آج سے چالیس پچاس سال پہلے کے کشمیر کے سفر کو یاد کرنے لگے ۔

ہاجرہ کی اس تمام گفتگو میں حیثیت ایک خاموش تماشائی کی سی تھی ۔ کبھی کبھی وہ کمال یا شیری کے کسی جملے پر خفیف سا مسکرا دیتی یا پھر کوئی بہت ہی بچکانہ قسم کا سوال پوچھ بیٹھی ۔

برف باری کئی روز اور مسلسل جاری رہی ۔

اب چاروں طرف پہاڑی پر برف ہی برف تھی تمام پہاڑی راستے بھی برف کے انبار وں سے اٹ گئے تھے۔ برف کے درمیان چیڑ کے درختوں کے سیاہی مائل تنے کالے کالے شہتیروں کی مانند نظر آتے ہیں۔ اور ان کی شاخوں پر بھی برف کے نت نئے ڈیزائن بن گئے تھے مری کی سڑکوں پر سے برف کے تودوں کو صاف کرنے والے قلیوں کے گینگ بھی اب کبھی کبھار ہی نظر آتے ہیں اور برف کے انباروں کے درمیان راستہ چلنا بالکل ہی دوبھر ہو جاتا۔

اب پروفیسر نوریلی، شیری، کمال اور ہاجرہ کا بیشتر وقت ریسٹ ہاؤس میں مقید بسر ہوتا۔ وہ کبھی کبھی رمی یا برج کھیل کر اپنا وقت گزارتے دور چلنا شروع ہو جاتا لیکن اب کافی بنانے اور پینے میں بھی ان لوگوں کو کوئی گونہ دلچسپی محسوس نہ ہوتی، جیسے ایک بیگار سی تھی جو ان کو برداشت کرنی پڑ رہی تھی، اور پیالیوں اور چمچوں کی کھنک بھی ان کو اپنے اعصاب پر گراں معلوم ہوتی۔

مال روڈ پر کام کرنے والے قلیوں سے روز وہ راولپنڈی واپس جانے والی سڑک کا حال معلوم کرتے کیوں کہ اس سڑک پر متعدد جگہ لینڈ سلائیڈ ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے واپسی کا راستہ فی الحال مسدود تھا گھوڑا گلی کے قریب تو سڑک کے عین بیچوں بیچ ایک بیس فٹ گہرا شگاف پڑ گیا تھا اور مری اور راولپنڈی کے درمیان گاڑیوں کی آمدورفت قطعی بند ہو گئی تھی اور پروفیسر نوریلی اور ان کے ساتھی اپنے آپ کو واقعی قیدی سمجھنے لگے تھے۔

"برف آلود دوزخ!" ایک روز ہاجرہ نے جھنجھلا کر مری کو ایک نیا نام دے دیا اس نام میں وہ تمام نفرت اور بے بسی بھری ہوئی تھی جو پوری برف باری کے باعث قید ہو جانے پر ہاجرہ کو محسوس ہوتی رہی۔ پروفیسر نوریلی نے سرپرستانہ طور پر مسکرا کر اس نئے نام کو قبول کر لیا کمال کو ہاجرہ کے دیئے ہوئے نام پر ایک شدید کوفت محسوس ہوئی اس کو محسوس ہوا کہ ہاجرہ کے رویئے میں ایک شکست اور پسپائی جذبہ جھلک آیا ہے اور اس کے شوہر کی حیثیت سے وہ بھی لامحالہ اس شکست اور پسپائی کے جذبے میں شریک ہے پروفیسر نوریلی اور شیری کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کسی بھی صورت میں اپنی شکست یا پسپائی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

ایک مرتبہ جب تھوڑی دیر کے لئے مطلع صاف ہو گیا اور برف باری ختم گئی تو ہاجرہ نے ریسٹ ہاؤس کی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر نیچے۔ کہیں بہت دور راولپنڈی کی جانب تکتے ہوئے کہا اب موسم صاف ہے۔ راستے کھل گئے ہوں تو چلو اس برف آلود دوزخ سے نکل بھاگیں!" اور وہ لوگ اپنے ربڑ کے جوتے برف کے تودوں پر بے دلی کے ساتھ گھسیٹتے ہوئے نیچے بسوں کے اڈے تک گئے، لیکن ان کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اڈا بالکل سنسان تھا، بس کمپنیوں کے دفتروں کے دروازوں پر موٹے موٹے قفل پڑے ہوئے تھے ایک بوسیدہ کمبل میں لپٹے چوکیدار نے ان کو بتایا کہ سڑک اب بھی بند ہے گھوڑا گلی کے قریب جو زبردست لینڈ سلائیڈ ہوتی ہے اس کی وجہ سے سڑک میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے ہیں اور بس کمپنی والے اتنے پاگل نہیں کہ وہ بسیں یا ٹیکسیاں چلانی شروع کر دیں۔

اس کے بعد ہاجرہ اور بھی شکست خوردہ نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ "دیکھئے اب کب اس برف آلود دوزخ سے نجات ملے" کمال دل ہی دل میں کچکچایا لیکن اس نے ہاجرہ کی بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا، مگر پھر دو ایک روز بعد آیکا ایکی رات کو مطلع صاف ہو گیا اور ساتویں یا آٹھویں شب کے چاند کی روشنی میں برف سے ڈھکی ہوئی لینڈ اسکیپ ایک جیتی جاگتی پینٹنگ معلوم ہو رہی تھی اپنی پوری کوشش کے باوجود سو نہ سکا اور رات گئے تک کروٹیں بدلنے کے بعد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر غسل خانے کے راستے باہر ٹیرس پر آ گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی لینڈ اسکیپ قطعی ساکت اور پرسکون تھی، اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ ہاجرہ کو بھی جگا دے تاکہ وہ بھی اس ساکت اور پرسکون لینڈ اسکیپ کو ایک نظر دیکھ آئے۔ لیکن چند لمحے پہلے جب وہ اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر آ رہا تھا تو اس نے یقینی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ گھبراہٹ اور وحشت جو دن کے وقت ہاجرہ کو گھیرے رہتی تھی فی الحال مفقود تھی

پرسکون طریقے پر سو رہی تھی، اس لئے اس نے سوچا کہ ہاجرہ کو جگانا مناسب نہ ہوگا، ممکن ہے جاگنے کے بعد وہ برف آلود دوزخ والا احساس اس کو ایک بار پھر وحشت زدہ بنا دے۔

برف آلود دوزخ!

کمال نے سوچا کہ اگر دوزخ برف آلود بن جائے تو جانے کیسی لگے گی۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو ان سب لوگوں کی زندگیاں واقعی ایک برف آلود دوزخ میں مبتلا تھیں اور پروفیسر نوریلی اور شیری اور ہاجرہ ہر ایک اپنے ساتھ اپنی ایک ذاتی دوزخ لئے پھرتا ہے اس نے سوچا کہ وہ سب غالباً ابد تک بھوتوں کی مانند اس دوزخ کی حدود میں بے مقصد طور پر گردش کرتے رہیں گے ایک دوسرے کو خالی خالی شکست خوردہ نظروں سے گھورتے رہیں گے لیکن اس دوزخ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا دانتے کا ہتھیا تخیل یا کافکا کا کوئی دہشت زدہ کر دینے والا ڈرامہ!

کمال کو یہ کافکا کے کمپ والا تصور بہت ہی مسحورکن معلوم ہوا جیسے یہ کہیں اسٹیج پر یا ٹیلی ویژن کی اسکرین پر سچ مچ اس کی آنکھوں کے سامنے کھیلا جا رہا ہو اور اس ڈرامے کا مرکزی کردار، وہ خود کمال تھا جو ہاجرہ کے سلسلے میں ایک عجیب نفرت اور ہمدردی کے دوراہے پر پہنچ گیا تھا۔ کمال نے تخیل ہی تخیل میں اس کھیل کے باقی کردار بھی قائم کرنے شروع کر دیئے۔ زنانہ کردار نمبر ایک ہاجرہ۔ جو اکثر شیری کو ایک خاص معنی خیز طریقے پر دیکھتی رہتی، جیسے اس سے پوچھنا چاہتی ہو کہ یہ جو تم اس خوبصورت فرنچ ونڈو کے پاس بیٹھ کر ایک سٹائل کے ساتھ گرم گرم کافی پیتی رہتی ہو اور مغربی موسیقی کی دھنوں پر جھومنے لگتی ہو اور ایٹم بم اور جنگ، برٹرینڈ رسل اور پکاسو، ٹرافلگر اسکوائر اور سفید فاختہ، اور نہ جانے کیا کیا الم غلم بکتی رہتی ہو۔ کیا دراصل تم بھی ان سب چیزوں کے ذریعہ اپنی دوزخ سے فرار کا رستہ نہیں ڈھونڈ رہی ہو۔! سچ سچ بتاؤ جنگ کے خلاف مظاہرہ زیادہ اہم ہے یا ایک شوہر کی تلاش! خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کہ یہ پیاری سی پیازی رنگ کی کیتلی جو پانی کھول جانے کے بعد یکبارگی ایک سریلی سی سیٹی بجانے لگتی ہے یہ تم نے کہاں سے خریدی تھی۔

اور ڈرامے کی زنانہ کردار نمبر دو، شیری ہاجرہ کے ان قلابازیاں کھاتے ہوئے جملوں سے تلملا کر رہ جاتی! لیکن چونکہ اس نے انگلستان کی فضا میں پرورش پائی تھی اور خود کو آپے میں رکھنے کی عادت اس کو ورثے میں ملی تھیں اور اس عادت کا تقاضا تھا کہ ایک عورت دوسری عورت پر جھپٹنے کے بجائے، ہر بات ایک حسین سے "تھینک یو" کے ساتھ قبول کرے۔ اس لئے وہ ہاجرہ کو زبان سے تو کچھ نہیں کہتی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی سی مسکراہٹ ہے اور غالباً وہ اس مسکراہٹ میں ایک لذت محسوس کرتی ہے! ویسے کبھی کبھی وہ بھی ایک مہذب سا جوابی حملہ کر ڈالتی، وہ کہتی! (ہاجرہ تم کو معلوم ہے کہ جب ہم نے انگلستان میں بم کے خلاف مہم شروع کی تو مائیکل وائلڈنگ کی بیٹی بھی ہماری مہم میں شریک تھی! مائیکل وائیلڈنگ، جانتی ہو نا تم! (ہاجرہ اپنے ذہن پر بہت زور ڈالتی ہے لیکن اس کو قطعی یاد نہیں آتا کہ اس نے یہ نام پہلے کہاں سنا تھا) اور پھر ہم سب کوونٹری کے گرجا گھر میں اکٹھے ہوئے تھے۔ کوونٹری! تم جانتی ہو نا کہ وینٹری کو جنگ کے سلسلے میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے، دراصل وہ جنگ کے خلاف امن کا ایک سمبل ہے! (اور ہاجرہ پھر اپنے ذہن پر زور ڈالتی ہے لیکن کوونٹری کے نام کی منفرد حیثیت کو سمجھنے سے معذور رہتی ہے کیوں کہ اس نے غالباً یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔)

اور پھر ایک مضحکہ خیز ڈرامے کے ایک اور اہم کردار پروفیسر نوریلی! حقیقت یہ تھی کہ کمال کو اس تخیل میں سب سے زیادہ دلچسپ اور گھمبیر شخصیت پروفیسر نوریلی کی ہی نظر آتی، پروفیسر نوریلی جو اپنے ماضی کے ہاتھوں ایک مدت سے اپنی ایک ذاتی یخ بستہ دوزخ میں مقید تھے۔ دراصل وہ ایک واحد انسان تھے۔ وہ بیک وقت پروفیسر نوریلی بھی تھے جن کی تصویر کمال نے متعدد بار پاوٹ ایڈیشن کے ناولوں کے گرد پوش پر دیکھی تھی اور جن کو راولپنڈی کے ہوٹل میں پہچان کر اس کو ایسی خوشی محسوس ہوئی تھی گویا اس نے کوئی گمشدہ چیز پا لی ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ دوسرے پروفیسر نوریلی بھی تھے جو تمام وقت اپنی ماضی کی لاش کو کندھے پر لادے پھرتے اور کشمیر پوائنٹ پر کھڑے ہو کر اپنے گزشتہ

زمانے کی یادوں کے ایک بے معنی سے ریلے میں بہتے چلے گئے۔

یکایک پروفیسر نوریلی بھی اپنے بیڈ روم سے نکل کر باہر ٹیرس پر آ گئے۔ وہ اپنے رنگ برنگے کشمیری پٹو کے ڈریسنگ گاؤن میں لپٹے لپٹائے ایک مافوق الانسانی ہستی نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے سر پر ایک اونی مفلر لپیٹ رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کا سر غیر معمولی [illegible] نظر آ رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر آن کر انھوں نے اردگرد پھیلی ہوئی لینڈ اسکیپ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر ایک میکانکی انداز سے اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلگایا اور پھر اسی میکانکی انداز سے واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ غالباً انھوں نے کمال کو دیکھا تک نہیں یا پھر شائد دوزخ میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک دوزخی دوسرے کو دیکھنے کے باوجود دیکھ نہیں پاتا اور صرف برف کی سفیدی ایک نور کی مانند ہر چیز کو اپنے اندر ڈھانپے رہتی ہے بس یہ ہے کہ اس شدت کی برف باری کے باوجود بھی یہ دوزخی اپنی اپنی ایک اندرونی ذاتی منفرد آگ میں بھی آہستہ آہستہ سلگتے رہتے ہیں۔

دوسرے روز آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ نکھری ہوئی تھی اور جب ہاجرہ سو کر اٹھی تو وہ غیر معمولی طور پر بشاش نظر آ رہی تھی، وہ پریشانی اور دہشت جو عام طور پر اس کے چہرے پر نظر آتی تھی، اب غائب ہو چکی تھی، اور اس کی آنکھوں میں بھی ایک قسم کی چمک آ گئی تھی جیسے اب وہ اپنے اردگرد کی دنیا میں ایک نئی دلچسپی محسوس کر رہی ہو۔!

ہاجرہ کے رویے میں تبدیلی سب سے پہلے شیریں نے محسوس کی، غالباً اس نے اپنی کسی خالص نسوانی حس کے ذریعہ بھانپ لیا کہ وہ بوجھ سا جو اب تک ہاجرہ کے اعصاب پر سوار تھا اتر گیا تھا اس نے اپنے دل ہی دل میں سوچا کہ دراصل اب تک ہاجرہ نے اپنے شوہر کی توجہ کو پورے طور پر اپنی جانب مبذول کئے رکھنے کے لئے یہ سب ڈھونگ رچا رکھا تھا۔

باہر اب مطلع بالکل صاف تھا اور سورج ایک خاصی تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا۔ جگہ جگہ برف کی سطح پر ہیرے سے جگمگا رہے تھے۔ درختوں کی شاخوں پر گھروں کے اردگرد ریلنگوں پر سرخ کھپریل کی چھتوں پر بھی یہی ننھے منے ہیرے دھوپ میں دمک رہے تھے ریسٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے دو تین مزدور پھاوڑے لئے سڑک صاف کر رہے تھے اور برف کی ڈھیریوں کی بیچوں بیچ ایک راستہ بنانے کی کوشش میں مگن تھے۔

پروفیسر نوریلی نے اپنے کمرے کی فرنچ ونڈو میں سے جھانک کر باہر دیکھا اور نکھری ہوئی دھوپ کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرائے۔ "کرسمس کارڈ!۔ بالکل کرسمس کارڈ کی سی لینڈ اسکیپ" انھوں نے کمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کبھی آرٹ قدرت کی تقلید کرتا ہے، کبھی قدرت آرٹ کی!"

لیکن کمال نے جو ان کے پاس آن کھڑا ہو گیا تھا ان کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ جیسے اب وہ پروفیسر نوریلی کی باتوں کی بناوٹ سے اکتا چکا ہو۔ پروفیسر نوریلی مایوس سے ہو گئے اور باہر پھیلی ہوئی برفانی لینڈ اسکیپ کے منظر کو خاموشی سے تکتے رہے پھر جب ہاجرہ ان کے قریب آن کر کھڑی ہو گئی تو وہ ایک دم سے چونک اٹھے ہاجرہ کی آنکھوں کی چمک کو انھوں نے بھی بیّن طور پر محسوس کیا۔ وہ اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں کہنے لگے۔

"جب میرا ایسی خوبصورت صبح سے سامنا ہوتا ہے تو ایک لمحے کے لئے میں اپنی دہریت کو بے معنی سمجھنے لگتا ہوں! شاید اگر مجھے پے در پے اس قدر حسین صبحیں نظر آتی رہیں تو میں بھی ایک دن مذہب پر اور معبود پر ایمان لے آؤں گا!"

ہاجرہ نمایاں طور پر پروفیسر نوریلی کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کر رہی تھی اور وہ مایوسی جو ایک بار پروفیسر نوریلی کو کمال کے رویے [illegible] ہوئی تھی اب دور ہو گئی۔ انھوں نے اپنے لہجے میں ایک گہری سنجیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی جیسے وہ زندگی کے ایک بہت بنیادی [illegible]

بول رہے ہوں ۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ایک مدت سے مذہب اور عبادت کے سلسلے میں اپنے آپ سے ایک شدید جدوجہد کرتا رہتا ہوں ۔ نہ جانے میری یہ جدوجہد کبھی ختم بھی ہوگی کہ نہیں ! ۔ ویسے اگر میں نے تمہارے مذہبی جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہو تو مجھے معاف کر دو ! "

ہاجرہ ویسے ہی ایک معصوم طریقے پر مسکراتی رہی اور کمال دل ہی دل میں جھنجھلاتا ہوا کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا پھر ہاجرہ نے چہک چہک کر شیری سے باتیں کرنی شروع کر دیں ۔ " ایک مرتبہ ۔ بہت عرصہ ہوا ۔ جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی ۔ میں اور میری بہت سی کزن لڑکیاں اور لڑکے مل کر جاڑوں میں برف کی سیر کرنے کے لئے مری آئے تھے ۔ یہاں سب ہوٹل بند پڑے تھے ہم لوگ ڈاک بنگلہ کا تالا توڑ کر اندر دھڑادھڑ بیٹھ گئے ۔ تب مزہ آیا ۔ رات بھر شدت کی برف باری ہوتی رہی ۔ مگر صبح ہوتے ہوتے مطلع صاف ہوگیا اور سورج نکل آیا ۔ اور دوسری رات ہم نے دیکھا کہ فل مون ہے اور ہم ٹیپ ریکارڈر بجا بجا کر تمام رات ڈانس کرتے رہے بہت مزہ آیا !"

وہ اپنی باتوں کی رو میں بہے جا رہی تھی ۔ لیکن پھر ایکا ایکی اس نے محسوس کیا کہ شیری دراصل اس کی جانب سے بالکل بے توجہ تھی اور اس کی باتوں سے زیادہ کافی پرکولیٹر کی صفائی میں منہمک تھی ۔ ہاجرہ ایک دم سے خاموش ہوگئی اور کمرے میں ایک سکوت چھا گیا ۔

چند لمحوں بعد پروفیسر نوریلی نے اس سکوت کو توڑا ۔ شاید اب راستہ کھل گیا ہو ۔ چلو واپس پنڈی چلیں ! " پھر انھوں نے کھڑکی سے باہر ایک قلی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ۔ " راولپنڈی کی سڑک کا کیا حال ہے ! راستہ کھل گیا یا نہیں ؟ "

ابھی نہیں صاحب ! قلی نے جواب دیا ۔ میں صبح صبح بس اسٹینڈ پر گیا تھا ۔ وہاں پتہ چلا کہ ابھی گاڑیوں کا راستہ بند ہے ! لینڈ سلائیڈ ہے صاحب ۔ بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ! "

" برف آلود دوزخ ! " شیری نے معنی خیز طریقے پر کہا مگر اب کی بار ہاجرہ نے بظاہر اس کی بات کا بالکل برا نہیں مانا بلکہ وہ ایک خوشگوار طریقے پر چہک کر کہنے لگی ۔ " میری ایک تجویز ہے ! بجائے اس کے کہ ہم یہاں اس ریسٹ ہاؤس میں قیدی بنے بیٹھے رہیں ، ہم آگے کیوں نہ چلیں ! "

" آگے ؟ کیا مطلب ؟ " کمال نے ترخ کر پوچھا ۔

" آگے ! نتھیا گلی ! یا پھر کوہالہ ! " یا اس سے بھی آگے ۔

آزاد کشمیر ! اگر پیچھے نہیں جا سکتے تو کیا ہے ، آگے تو رستہ کھلا ہے ؟ "

مگر شیری پھر بھی ہاجرہ کی جانب بے توجہ بنی رہی اور کافی کولیٹر کے سوئچ کو ایک اہتمام کے ساتھ کھولنے کے بعد اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو صاف کرنے میں محو ہوگئی ۔

" آگے سڑک کھلا ہے ! " پروفیسر نوریلی نے پھر کھڑکی سے باہر جھانک کر قلی سے پوچھا ۔

" ہاں صاحب جی ! آگے سڑک بالکل ٹھیک ہے ! " قلی نے بلند آواز میں جواب دیا ۔ اور پھر برف کاٹنے میں مصروف ہوگیا ۔ پروفیسر نوریلی نے مڑ کر کمال اور شیری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ۔ " اچھی تجویز ہے ! چلو اور آگے چلیں ! "

" میں تو کم از کم یہیں ٹھہروں گا ! " کمال نے جلا کر جواب دیا ۔ لیکن ہاجرہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے سچ مچ پروفیسر نوریلی کے ساتھ مل کر آگے جانے کا پروگرام بنانے لگی ۔ اس نے کہا ۔ " میں تو کہتی نتھیا گلی بھی نہیں ۔ چلو مل کر مین روڈ پر کھڑے ہو جائیں ، کسی نہ کسی گاڑی میں لفٹ مل ہی جائے گی ! ۔ "

پروفیسر نوریلی نے کہا " میرا خیال ہے نتھیا گلی کی سڑک بھی بالکل بند پڑی ہوگی آگے آزاد کشمیر کی طرف چلیں کوہالہ پر دریائے جہلم کا منظر بہت زبردست ہے ۔ جب میں ایک مرتبہ برٹش کونسل کی دعوت پر کشمیر گیا تو میں نے کوہالہ کے قریب ایک ڈاک بنگلہ میں بیٹھ کر اپنے ایک ناول کا پورا خاکہ تیار کر لیا تھا ۔ دریا کا بہاؤ بھی انسانی خیالات میں ایک زبردست طغیانی پیدا کر دیتا ہے ۔ " کیوں کمال ؟ " انھوں نے ایک بار پھر کمال کو اپنی

گفتگو میں شریک کرنا چاہا لیکن کمال نے کوئی جواب دیا۔ ہاجرہ بچوں کی طرح پکنک پر جانے کی تیاری کرنے لگی اور کمال تو بے تعلقی اور نیم بے زاری کے ساتھ اس کو پکنک کی تیاری میں مشغول دیکھتا رہا اس نے دو ایک بار پھر کہا کہ وہ قطعی کسی قیمت پر پکنک پر جانے کی موڈ میں نہیں ہے لیکن ہاجرہ کے موڈ میں کوئی فرق نہ آیا۔ جیسے وہ اپنے دل میں ایک ارادہ قائم کرنے کے بعد کمال کو فی الحال نظر انداز کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد ہاجرہ اور پروفیسر نوریلی باہر جانے کے لئے تیار ہو گئے کچھ دیر تو شیری سوچتی رہی کہ وہ ان دونوں کی بچکانی قسم کی پکنک میں قطعی شریک نہ ہو لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ تو واقعی باہر جانے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ بھی بادل ناخواستہ پکنک کے لئے تیار ہو گئی۔ کمال ان سب کو خاموشی کے ساتھ ریسٹ ہاؤس سے باہر جاتے ہوئے دیکھتا۔ لیکن جب وہ لوگ گیٹ سے باہر نکل گئے تو وہ ایکا ایکی اپنے آپ کو خواہ مخواہ بے حد تنہا محسوس کرنے لگا اور خود بھی ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ محض مین روڈ تک جائے گا اور جب ان کو کوئی گاڑی مل جائے گی تو واپس آجائے گا۔ ہاجرہ اور پروفیسر نوریلی آگے آگے تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے ان سے چند قدم پیچھے شیری تھی اور اس سے بھی پیچھے کمال، سڑک پر کام کرتے ہوئے قلی ان کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئے۔ جیسے وہ سوچ رہے ہوں کہ چار آدمیوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی میں اس قدر بے ترتیبی کیوں ہے۔

مین روڈ پر خاصا سناٹا تھا۔ ٹریفک کا نام و نشان تک نہ تھا اور برف نے سڑک کو پورے طور پر ڈھانپ رکھا تھا جگہ جگہ مزدوروں کی ٹولیاں برف صاف کرنے میں مصروف تھیں اور کہیں کہیں برف کی سفید سفید ڈھیریوں کے بیچ میں کولتار کی مٹیالی سڑک جھلک آئی تھی تھوڑی دیر بعد ایک جیپ ایک پہاڑی کے عقب سے نمودار ہو گئی۔ اس میں ایک امریکی جوڑا سوار تھا جیپ کے پہیوں پر آہنی سکڈ چین چڑھی ہوئی تھی اور وہ برف پر رینگ رینگ کر چل رہی تھی!

جیپ کو دیکھ کر ہاجرہ نے اپنی تمام نسوانیت کو ایک مسکراہٹ میں مرکوز کرتے ہوئے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ جیپ ان کے قریب آکر رک گئی۔

"ہم کو لفٹ چاہیئے کرمالہ تک!" ہاجرہ نے کہا اور وہ امریکن مسکرا کر اسے اور پروفیسر نوریلی کو دیکھنے لگا جیسے اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس عمر رسیدہ مرد اور اس نوجوان عورت کے مابین کون سا رشتہ تھا۔ رومانوی یا غیر رومانوی؟ پھر اس نے بہت بے تکلفی کے ساتھ ان دونوں کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا اور جیپ ایک دھچکے کے ساتھ چل پڑی۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی کے ساتھ ہوا کہ شیری اور کمال جو ابھی مین روڈ سے ذرا فاصلے پر ہی تھے، بھونچکا سے رہ گئے اور پروفیسر نوریلی ہاجرہ کو آواز دے کر یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ ان کا پروگرام کیا ہے اور جیپ دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں سے دور ہوتی چلی گئی اور برف کی نرم نرم سطح پر محض اس کے پہیوں کے کنکھوروں کے نشان باقی رہ گئے۔

"چلو چھٹی ہوئی! ان لوگوں نے ہم کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے!" شیری کھسیانے پن کے ساتھ کہنے لگی۔ "بس اب یہی ہو سکتا ہے کہ تم بھی کسی جیپ میں لفٹ لے لو اور خالص فلمی طریقے پر ان کا تعاقب کرنا شروع کر دو۔ کم از کم ہالی ووڈ کی فلموں میں شوہر اسی طرح اپنی بیویوں کا تعاقب کرتے ہیں" کمال دل ہی دل میں کھسیا اٹھا۔ شیری کی باتوں سے اس کو شدید کوفت ہو رہی تھی، مگر وہ کوفت کو ظاہر کرنے سے احتراز کر رہا تھا۔ ویسے اس کا دماغ ماؤف سا تھا گویا وہ کوئی بھی بات واضح طور پر سوچنے سے معذور ہو، پھر وہ بے دلی کے ساتھ ان کنکھوروں کے نشانات پر چلنے لگا جو برف پر ایک لامتناہی زنجیر کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک ابتداً سنسان تھی اور جیپ کے انجن کے شور کے بعد اب ارد گرد کی فضا پر ایک گہرا سناٹا مسلط تھا۔

شیری اسی طرح بولے جا رہی تھی وہ شاید پروفیسر نوریلی اور ماجرہ کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے پر تلی ہوئی تھی، کمال نے پہلے کبھی شیری کو یوں بولتے نہ سنا تھا وہ کہنے لگی "دادا تو سمجھے کہ رومانٹک واقع ہوئے ہیں لیکن ماجرہ۔ ماجرہ تو ایسی لڑکی نظر نہ آتی تھی۔" کمال جھلا اٹھا "وہ کیسی لڑکی!" وہ شاید آگے کچھ اور بھی کہتا۔ لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کے رہ گئے اور شیری پھر ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگی اور کمال کی کوفت میں بے تحاشہ اضافہ ہوگیا لیکن پھر عین اسی وقت ایک اور جیپ رینگتی ہوئی ان کے قریب آن کر رک گئی اس میں بھی ایک امریکن جوڑا سوار تھا۔

امریکن مرد نے کمال کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "ادھر کوئی جیپ گئی ہے ابھی ہم اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے ہیں!"

"ونڈرفل!" شیری نے قہقہہ لگایا "ہم بھی اپنے ساتھیوں سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ کتنا دلچسپ اتفاق ہے!" وہ امریکن جوڑا بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوگیا۔

کمال نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "ابھی اس طرف ایک جیپ گئی ہے بلکہ ہم کو بھی اسی طرف جانا ہے۔ تم ہم کو لفٹ دے سکتے ہو۔"

"ضرور!" امریکن مرد نے شیری کا سر سے پیر تک جائزہ لیتے ہوئے کہا، "ضرور۔ میں محبت کرنے والوں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں" اور اس نے ایک بے حیائی کے ساتھ شیری کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ ماری، پھر شیری اور کمال اس کی جیپ میں سوار ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے کمال کو خیال آیا کہ وہ اس امریکن کو صاف صاف بتا دے کہ اس کے اور شیری کے درمیان قطعی کسی قسم کا رومانس نہیں۔ لیکن پھر وہ دل ہی دل میں جھنجھلا کر خاموش بیٹھا رہا امریکن بے تکلفی کے ساتھ بولنے لگا۔ "یہاں کا موسم بھی خوب ہے! کہیں شدید گرمی اور کہیں اتنی بہت سی برف باری۔ خیر مجھے تو برف سے عشق ہے لیکن میری بیوی اس مسلسل برف باری سے بالکل بیزار ہو چکی ہے نا ہنی۔؟" امریکن عورت مسکرا اٹھی۔ اس کے بے ترتیب دانتوں پر سگریٹ کی نکوٹین کی زردی جمی ہوئی تھی اور کمال کی بیزاری میں ایک دم کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ امریکن عورت شیری سے کہنے لگی! "برف آلود دوزخ! میں تو ایسے موسم کو برف آلود دوزخ سمجھتی ہوں!" اور پھر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی جیسے اس نے کوئی بہت ہی انہونی بات کہہ دی ہو۔

کمال کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے اس کے دماغ میں بہت سی باتیں گڈمڈ ہو کے رہ گئی ہوں۔

امریکن مرد نے کہا "ہم کو بالتک جا رہے ہیں۔ تم لوگ جہاں کہو گے ہم اتار دیں گے!"

"دراصل ہم بھی کو بالتک جا رہے ہیں!" کمال نے روکھائی سے کہا، "چیئر اپ!" امریکن عورت نے چہک کر کہا "کیا تم کو بھی میری طرح برف باری سے نفرت ہے؟" لیکن کمال پھر بھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اور برف آلود سڑک پر جنگجوؤں کے سے نشانوں کی زنجیر کو کھوئی کھوئی نظروں سے تکتا رہا۔ سڑک حد نظر تک بالکل ویران اور برف آلود تھی۔

جیپ کافی سے کچھ دور آگے چل کر سڑک پر مزدوروں کا غول کام کر رہا تھا۔

"جیزز! لینڈ سلائیڈ!" امریکن مرد نے یکا یکی جیپ روکتے ہوئے کہا۔ "دی ہیو ہیڈ اِٹ!"

لینڈ سلائیڈ! شیری اور کمال دونوں کے دماغ میں ایک ساتھ گویا ایک بندوق سی چل گئی۔ وہ دونوں گھبرا کر جیپ سے باہر کود آئے۔

"کب ہوئی یہ لینڈ سلائیڈ!" کمال نے چیخ کر ایک مزدور سے پوچھا۔ پہاڑ کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ٹوٹ کر عین سڑک کے وسط میں آن گرا تھا اور سڑک میں آر پار ایک گہرا شگاف ہوگیا تھا۔ جیسے کسی نے ایک بہت بڑے چاقو سے سڑک کے دو ٹکڑے کر دیئے ہوں سڑک کا شگاف ایک تازہ زخم کی مانند بہت گہرا اور بھیانک تھا۔ شیری دیوانوں کی طرح اس شگاف کے اندر جھانکنے لگی۔ مگر شگاف کی تاریکی میں اس کو

بڑے بڑے پتھروں اور خاک دھول اور درختوں کی جڑوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ اس کی رنگت ایکا ایکی بالکل پیلی پڑ گئی اور اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

"کب ہوئی یہ لینڈ سلائیڈ!" اس نے دیوانہ وار چیختے ہوئے ایک مزدور سے پوچھا۔

"ابھی ابھی! میم صاحب!" مزدور نے جواب دیا "کوئی پانچ منٹ ہوئے!"

"ادھر کوئی جیپ تو نہیں آئی تھی!" کمال نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"آئی تھی - کچھ دیر ہوئے - شکر ہے لینڈ سلائیڈ اس کے گزرنے کے بعد ہوئی ورنہ تو جیپ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا!" مزدور نے جواب دیا اور شیری کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ وحشت جو سڑک کے اس گہرے شگاف کو دیکھ کر اس کے اعصاب پر طاری ہو گئی تھی ایک دم سے زائل ہو گئی اور وہ ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی اور امریکن مرد اور عورت اس کو اور کمال کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"دیکھیں اب ٹی آ کب تک کوہالہ کے ڈاک بنگلے میں مقید رہیں گے!"

"شیری نے اپنی ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ممکن ہے وہ اب ایک بار پھر اپنے کسی ناول کا پورا خاکہ دریائے جہلم کے کنارے بیٹھ کر مکمل کر ڈالیں! بلکہ میں تو ابھی سے نیوز آف دی ورلڈ کی قسم کے اخباروں کی سرخیاں بھی بتا سکتی ہوں!

پانچ کالم کی ہیڈنگ اور اس کے ساتھ ہی تین کالم کی تصویر! "مفکر اور ماہر ثقافت نے اجنبی شادی شدہ لڑکی کے ساتھ جہلم کے کنارے ویک اینڈ بسر کیا!" اور اپنی بات پوری کر کے وہ ایک ہذیانی سی ہنسی ہنسنے لگی پھر گویا وہ دوبارہ اپنی بات میں ایک مصنوعی سنجیدگی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ "خیر اچھا ہے کم از کم ڈاکٹر بچارے اکیلے تو نہیں ہیں!"

کمال پر اب مکمل سکتہ طاری تھا۔ شیری کی باتوں کے طنز کو وہ اپنے شعور پر کچوکے دیتے ہوئے محسوس کر رہا تھا، لیکن اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اس کی باتوں کا جواب دے سکتا۔

چلو واپس چلیں! برف آلود دوزخ ہماری منتظر ہے!" امریکن عورت نے ایکا ایکی کمال کو چونکا سا دیا اور کمال کھوئی کھوئی نظروں سے اس خلا کو تکنے لگا جو لینڈ سلائیڈ کے باعث سڑک کے عین وسط میں پیدا ہو گیا تھا۔ ایک لامتناہی خلا۔ کسی کافکا سکتیل کی ہیبت ناک تخلیق

"چلو مری واپس چلیں!" امریکن مرد نے بھی پکار کر کمال کو مخاطب کیا۔ "اب اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں!"

"ہاں چلو برف آلود دوزخ کو!" شیری نے کمال کا بازو پکڑتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ اور کمال ایک میکانکی انداز سے خاموش جیپ میں آن کر بیٹھ گیا۔

امریکن مرد نے شیری کی جانب دیکھ کر ایک بار پھر بے حیائی کے ساتھ آنکھ ماردی "دوزخ اور ہنی مون! کتنا رومانٹک خیال ہے۔ ہے نا ہنی؟" اور پھر اس نے ایک بلند آواز قہقہہ لگاتے ہوئے جیپ کو گھمایا اور جیپ کے موٹے موٹے پہیے ایک بار پھر گھمبیر بھنوروں کے نشانوں کی ختم نہ ہونے والی زنجیر پر رینگنے لگے۔

ادب کے چار مینار

الف لیلہ

عربوں کی وہ فقید المثال تخلیق جس کے ہر عنوان سے فرد ہی خیال کا ایک باب کھلتا ہے ۔ افسانوی ادب کا ایک ایسا شاہکار جس کی بنیادوں پر مغرب کا افسانوی قصر ادب تعمیر ہوا اور سینکڑوں سال بعد آج بھی جدت طرازی اور ندرت آفرینی کا ایک معجزہ ہے ۔

" الف لیلہ " صرف ایک ہزار کہانیوں ہی کا مجموعہ نہیں ہے مسلمانوں کے ہزار سالہ تمدن کا آئینہ بھی ہے ۔ اور عربوں کے معیار معاشرت کا ایک مرقع بھی ، جس کے اردو ترجمہ اور تلخیص میں الیاس عشقی کے قلم نے اپنی گلکاریاں دکھائی ہیں اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اعلیٰ طباعت ۔ پنج رنگ ٹائیٹل ۔ قیمت صرف سات روپے

لکھنو کا دبستان شاعری

دہلی کی بساط سخن کے الٹنے کے بعد لکھنو نے اردو شاعری کے چراغ روشن کئے لکھنو کی فضا دہلی سے مختلف تھی تہذیب و ثقافت کے اس نئے گہوارے میں ، خانقاہوں سے " اللہ ہو " کی ضربوں کے ساتھ طبلہ کی تھاپ اور پائل کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی ۔

اس ماحول نے زندگی کے ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا ۔ اسکا دامن غزل اور قصیدہ سے آگے بڑھنے لگا اور مثنوی اور مرثیہ کو تو یہ فضا ایسی راس آئی کہ یہ دونوں معراج کمال کو پہنچ گئے ، جدت طرازی کی دوسری کروٹ میں ریختی اور منظوم ڈرامہ کی داغ بیل پڑ گئی اور امانت نے اندر سبھا لکھ ڈالی ۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے پندی تحقیق اور کد و کاوش سے ان مناظر کا نقشہ کھینچا ہے اور ادب کے ساتھ ادیبوں کی بھی تاریخ مرتب کر دی ہے ۔

ترمیم اور اضافہ شدہ ایڈیشن ۔ قیمت ۱۳/۵۰ روپیہ

دہلی کا دبستان شاعری

" اردو " نے دکن میں جنم لیا ہو یا ہندوستان کے کسی اور حصہ میں ۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دہلی اس کا گہوارۂ تربیت تھا جس میں نہ صرف زبان کے خد و خال درست ہوئے بلکہ وہ اس طرح نکھاری گئی کہ دلہن بن گئی ، میر نے اس کی مانگ میں سیندور بھرا ۔ غالب نے ماتھے پر ٹیکا لگایا ۔ ذوق اور مومن نے رخساروں پر غازہ مل کر نوک پلک سے درست کر دیا ، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ڈی لٹ نے ان تفاصیل کو تاریخ کی روشنی میں قلمبند کیا ہے اور تحقیق و تنقید کا حق ادا کر کے کتاب کو نظم کی ایک تاریخی دستاویز بنا دیا ہے ۔

لائبریری ایڈیشن ۔ ٹائپ کی طباعت ۔ قیمت ۱۰/۵۰ روپیہ

داستان تاریخ اردو

اردو کے نثری ادب کی بہترین انسائیکلو پیڈیا ، مولانا حامد حسن قادری کا زندہ جاوید کارنامہ ۔

جس طرح مولانا کی ذات گرامی نے نسلوں کو پروان چڑھایا اسی طرح ان کی یہ تخلیق ادبی تاریخ کا ایسا روشن مینارہ ہے جس سے یکے بعد دیگرے ہفت رنگ شعاعیں پھوٹتی ہیں اور ان سے ماضی کے تاریخی افق پر ان ادیبوں کے چہرے منعکس نظر آتے ہیں جنہوں نے اردو کی قربان گاہ پر اپنی زندگیاں بھینٹ دے دیں اور جن کے قلم کی موشگافی آج ہمارے ادب کا سرمایہ ہے ۔ حامد حسن قادری کی یہ گراں قدر تالیف ایک متوازن ادبی دستاویز ہے جو فن کے ساتھ فنکاروں کی حیات دائمی کی ضمانت کرتی ہے مختصر ہونے کے باوجود ضخیم سے ضخیم جلدوں پر بھاری ہے ۔

یہ تاریخ عرصے سے ناپید تھی ۔ ناشرین نے وقت کی پکار پر آخری اضافہ و ترمیم کے ساتھ شایان شان طریقہ پر شائع کیا ہے ۔

مجلد مع گرد پوش بیس روپیہ   لائبریری ایڈیشن ، پچیس روپیہ

اردو اکیڈمی سندھ ۔ ۱۶ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ کراچی

کوثر چاند پوری
شاعر بمبئی

حصار

وہ فروری کی ایک خنک اور حسین صبح تھی۔

حسین علی بی اے موضع عالم نگر کے قریب پلیا پر بیٹھا شہر جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا اس کے سامنے دور تک گیہوں کے کھیت تھے، ان میں پودے لہلہا رہے تھے، جیسے شراب کے نشہ میں سرشار جھوم رہے ہوں۔ ابھی قدرت نے سروں پر بالیوں کے تاج نہ رکھے تھے پھر بھی پودوں میں غرور کا سا ایک جذبہ جھلک رہا تھا وہ اپنے ان داتا ہونے کا غالباً احساس رکھتے تھے۔ بیچ بیچ میں کہیں کہیں چنے اور مسور کے کھیت تھے جن کے ننھے ننھے اودے پھول مسکرا رہے تھے۔ کہیں کہیں گیہوں کے پودوں پر اوس کی شفاف بوندیں لرز رہی تھیں، جیسے کنواری اور معصوم لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوں، حسین علی شبنم کے ان قطروں میں وہ جذبات ڈھونڈ رہا تھا جو آنسوؤں میں بھرے ہوتے ہیں۔ ایک بار ایسی ہی بوندیں اس نے چندر کی پلکوں پر کانپتے دیکھی تھیں، شاید وہ اس کی بیکاری پر رو رہی ہو، اسے خیال آیا ہو کہ میری مانگ میں سیندور اسی وقت بھر جائے گا جب حسین علی کو نوکری مل جائے گی، وہ صرف اپنے گاؤں پر کھیرے ہی کا نہیں، پوری تحصیل کا پہلا نوجوان تھا جس نے اتنی بڑی ڈگری لیکر علاقہ بھر کا نام روشن کر دیا تھا۔ خود اس کے لئے یہ روشنی عذاب بن گئی تھی۔ وہ ہل چلانے اور بھینسوں کی دیکھ بھال کرنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ اس کی زندگی بیانا ندی کی دھارا کے مانند بہتی، دیہاتی ند [illegible] اس کو پھلانگتی بہت دور چلی گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بیانا پر کھیرے کے آس پاس ناچتی بل کھاتی ایک اور بڑی ندی بیتوا میں مل گئی تھی، پھر جمنا میں۔ اس کے بعد جمنا اور پھر گنگا سے ہم آغوش ہو کر ایک بڑا اور پوتر دریا بن گئی تھی، آخر میں سمندر کی شکل اختیار کر کے لاکھوں میل کی لمبائی اور چوڑائی میں پھیل گئی تھی۔ لیکن حسین علی کی روشنی پر کھیرے ہی کی تاریکی نہ مٹا سکی تھی، نہ شہروں کی ٹیوب لائٹ میں شامل ہو کر اپنی منگیتر چندر کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر سکی تھی۔ گاؤں میں بیکار پڑے رہنے سے وہ سب ہی کے لئے بوجھ بن گیا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ اپنے ماموں کے پاس تھا جہاں اس نے تعلیم پائی تھی تو خود اپنے احساس کی خلش بن کر رہ گیا، اتنا پڑھ لکھ کر بھی وہ ایک مہمان ہی کی حیثیت سے رہتا تھا۔

حسین علی کچھ نہ سمجھ سکا وہ طلائی کلس تھا جس کے نیچے ہزاروں پجاری اور عقیدت مند جھک کے گر جاتے ہیں۔ اور وہ سورج اور چاند کی روشنیوں میں چمک کر دلوں میں عقیدت کے جذبات جگاتا رہتا ہے، ورنہ تو ہار بن کر کسی دوشیزہ کی گردن میں حائل ہو سکتا ہے [illegible] کی طرح کسی خالی پیٹ کی آگ بجھا سکتا ہے لیکن ابھی تک [illegible] آئی تھی، حسین علی کا ٹرنک پلیا کی چھوٹی سی دیوار پر رکھا ہوا تھا، اس کے اوپر [illegible] تھا اور [illegible] بندھی ہوئی تھی [illegible] جس طرح حسین علی نے تعلیم حاصل کر کے [illegible] اسی طرح چندر نے کشیدہ کاری [illegible] شہرت اور عزت [illegible]

ریشمی پھولوں میں مہک کبھی پیدا نہ ہوئی تھی، کپڑے کے یہ پھول سکرائے بھی نہ تھے، بلکہ جندو کی آنکھوں میں اکثر آنسو دیکھے گئے تھے اور اس وقت جندو کی ان بھیگی آنکھوں کا خیال آتے ہی حسین علی کے سامنے پھیلے ہوئے کھیتوں کی فضا ایک دم جنّت کی بہاروں میں تبدیل ہوگئی، دنیا کی جنت حسین علی کے لئے اور یہی ہرے بھرے کھیت ہیں، سونے کے محلوں میں جنت کی چیزیں ہیں، وہاں تک عام انسانوں کے تصور کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

حسین علی پانچ میل لمبا کچا راستہ طے کر کے شہر جانے کے لئے یہاں آیا تھا، اور اب موٹر کے ہارن کی آواز پر کان لگائے کھڑا تھا اور ہارن کی آواز کو دور ہٹا کر بار بار جندو اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی اور کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔

مجھے بھول نہ جانا!۔

وہاں سینما کی تصویروں میں میری تصویر نہ ہوگی، چادر کے کونوں پر وہ پھول ضرور ہوں گے جو میں نے کاڑھے ہیں، ان میں خوشبو نہیں، رنگ بھی شاید دھلنے سے اتر جائے، بس محبت کی ایک بھینی سی مہک اور ہلکی سی رنگت ہوگی جسے تم محسوس کر سکو گے۔

حسین علی کا اپنا گاؤں بر کھیرے میں جا پہونچا، وہ بینا ندی کے اونچے کناروں پر آباد تھا۔ ندی کے دونوں جانب کوہے کے درخت تھے، جو گرمیوں میں بھی شاداب رہتے تھے، شام کو ان کی پھلنگوں پر بگلوں اور چیل کوؤں کی لمبی گردنیں ابھرنے لگتی تھیں اور صبح کو پہاڑی پر کھڑے ساگون کے پیڑوں کی اوٹ سے سورج چمکا کرتا تھا۔ جندو کے صاف ستھرے چہرے کی طرح، جندو کا گھر گاؤں کے وسط میں ایک ٹیلہ پر تھا، اس کی آدھی چھت ہاتھ سے بنائی ہوئی کھپریل کی تھی، آدھی سوکھی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی، دروازے کے قریب بھینس بندھی رہتی تھی، اس کا ایک سینگ غائب تھا۔

حسین علی کی بڑی بہن نے اسے بتایا کہ جہیز میں اور کچھ آئے یا نہ آئے ایک سینگ کی یہ بھینس ضرور آئے گی اور پھر اس نے جندو سے زیادہ اس بھینس کی تعریف کی تھی۔

ایک وقت میں چار سیر دودھ دیتی ہے۔

بوڑھی نہیں ہے، سینگ میں تو کیڑا لگ گیا تھا اور بھینس نے پیڑوں اور اپنے کھروں سے کھجا کھجا کر اسے توڑ ڈالا، اچھی بھینسوں کے سینگ میں کیڑا ضرور لگ جاتا ہے۔

اس کے ماتھے پر سفید چاند ہے۔

چاروں تھنوں کے درمیان ایک داغ ہے بالکل روپئے کے برابر، گوڑھ کا نہیں ہے، ایسی بھینس بڑی بھاگوان ہوتی ہے میرے بیرا۔

دفعتاً ہارن کی آواز آئی، حسین علی نے دیکھا دور سڑک پر دھول اڑ رہی ہے۔

حسینا موٹر آگئی!۔ تمسا اللہ دیے نے بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ میں سے اٹھ کر پکارا، موٹر کی بھنبھناہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

حسین علی نے ایک ہاتھ میں ٹرنک اور دوسرے میں ہولڈال سنبھال لیا اور موٹر رکتے ہی جلدی سے ایک خالی سیٹ پر جا بیٹھا۔ چھ گھنٹے کے بعد بس شہر کے قریب پہونچ گئی۔ سات آٹھ میل ادھر ہی سے ہیوی الیکٹریکلس کے نئے نئے کوارٹرز اور بنگلوں کی بہار آفریں دنیا شروع ہوگئی جو اس کے لئے بالکل نئی تھی، وہ کئی سال کے بعد اپنے صوبے کے مرکز میں آیا تھا، یہاں اس کا کوئی عزیز نہ تھا، چند دوست ضرور تھے لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی مکان نہ تھا سب اپنے رشتہ داروں کے یہاں رہتے تھے، اس نے بس اسٹینڈ سے سیدھا سرائے کا رخ کیا، یوں تو ہوٹل بھی بہت تھے مگر ان کا کرایہ زیادہ تھا وہ ٹرنک اور ہولڈال لئے پیدل فٹ پاتھ پر چلتا رہا، سائیکلوں، اسکوٹروں اور کاروں کی آمد و رفت اتنی زیادہ تھی کہ دو تین جگہ بڑی احتیاط سے اس نے سڑک کراس کی۔ سرائے کے منشی کی عنایت سے ایک چھوٹا سا گرد سے اٹا کمرہ اسے مل گیا، اس کی دیواروں پر پنسل سے جگہ جگہ ٹھہرنے والے مسافروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ دو تین فحش قسم کی تصویریں بھی بنی تھیں اور دو چار عاشقانہ اشعار لکھے ہوئے تھے، رات ہو چکی تھی۔ حسین علی کا جسم تھکان سے چور تھا، سر بھی گھوم رہا تھا، وہ باسی ناشتہ کر کے پلنگ پر لیٹ رہا اور دیر تک جندو کے متعلق سوچتا رہا۔

جذبے کی رگوں میں اصل خون ہے۔

جیسی اسے آرٹ سے لگاؤ ہے۔

کپڑے پر پھول کاڑھنا کوئی معمولی بات نہیں وہ بہت حسین ہے۔

اس کا چہرہ جوہی کے پھول اور چنبیلی کی کلی کے مانند حسین اور معصوم ہے۔

شہر میں اتنی دور چلنے کے بعد اس نے جتنے چہرے دیکھے تھے ان میں سے ایک بھی جیدو سے زیادہ دل کش نہ تھا، نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، حسین علی نے کواڑ کھول کر باہر جھانکا، ایک بوڑھا آدمی کمبل اوڑھے موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ وہ فوراً بولا۔

نماز تیار ہے، اب تک سو رہے ہو، کیسے مسلمان ہو نہانے کی ضرورت ہو تو حمام میں جاؤ۔ وہاں گرم پانی ملے گا۔

حسین علی نے ہنس کر کہا۔

میرا نام حسین علی، نامۂ اعمال بالکل سادہ، گناہوں کی فہرست میں صرف نمبر شمار ہی درج ہیں نیکیوں کا ورق بالکل کورا ہے۔

نہانے کیلئے گرم پانی رکھ دیا۔۔۔ کھانے کے لئے؟۔

دروازے پر ہوٹل موجود ہے، خوب کھاؤ پیو۔ دیکھو اب سونا نہیں، سرائے بے نمازیوں کے لئے نہیں ہے۔

ایک بات بتلایئے مہربانی کر کے نماز پڑھنے سے نوکری بھی مل جائے گی؟۔

توبہ کرو جی، نماز کے بدلے جنت ملتی ہے، نوکری نہیں۔ ان بزرگ کا نام غلام محمد تھا، عمر ساٹھ سال سے اوپر ہی ہوگی۔ سرائے کے نگران نے بتایا کہ وہ سرائے والی مسجد میں امام ہیں، کوئی اور روزگار ملتا نہیں تھا اس لئے نماز پڑھانے پر تو کر ہو گئے۔ ان کی کارگذاری یہی ہے کہ پانچوں وقت کی جماعت میں تین چار صفیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ اوقاف کمیٹی کی نظر میں ان کا وجود بیکار ثابت نہ ہو۔ حسین علی نے نیچے تک دروازے والے ہوٹل میں آ کر ایک کپ چائے بھی نہ پی تو نگران کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ حسین علی کے نام سستے کرائے کی کوٹھری الاٹ کر کے دل ہی دل میں شرمندہ ہوا، ہوٹل کا منیجر نگران کو ایک ماہانہ الاؤنس اسی لئے دیا کرتا تھا کہ سرائے میں ٹھہرنے والے وہاں چائے بھی پئیں اور کھانا بھی کھائیں، اسی لئے نگران صاحب جو بیک وقت نیتا، غنڈے، جواری اور شراب نوش، غرض سب ہی کچھ تھے، ہر مسافر کو تالا کنجی حوالے کرتے وقت کہہ دیا کرتے تھے،

خراب کھانا کھا کر بیمار نہیں پڑنا چاہتے تو دروازے والے ہوٹل ہی میں کھانا دونوں وقت ۔ ۔ ۔ ۔ !

خالص گھی میں پکاتا ہے سب چیزیں!۔

اور چائے بھی فسٹ کلاس بناتا ہے۔

دس بجے وہ سوٹ پہن کر سب سے پہلے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر میں آ گیا اور وہاں رجسٹریشن کرانے کے بعد یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومنے لگا۔ ہر آنے جانے والے کو وہ غور سے دیکھتا، دکانوں اور ہوٹلوں کا بھی جائزہ لیتا، ایک سندھی کو دیکھا وہ اپنے ہوٹل میں بیٹھا پیاز کے چھلکے کاٹ رہا تھا۔ قریب ہی پودینہ کی ایک ہری گڈی اور گہرے سرخ رنگ کے ٹماٹروں کی چھوٹی سی ڈھیار رکھی تھی، ٹماٹروں کی سرخی سے سوشلسٹ سماج کا تصور جھلک رہا تھا اور پودینہ کی سبزی زیتون کے پتوں کی یاد دلا رہی تھی، سندھی تیز چھری سے بڑے آرٹسٹک انداز میں بڑی تیزی سے پیاز کے چھلکے تراش رہا تھا جیسے کوئی اسٹینوگرافر انٹرویو کے سوالات ٹائپ کر رہا ہو۔

فائیو ایئر پلان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟۔

آخری پلان کے دوران کتنے بندھ بنائے گئے؟۔

نقش کرتا۔

برسات میں کتنی نئی بنی ہوئی عمارتوں کی چھتیں ٹپکیں اور کتنی عمارتیں مع چھت کے گر گئیں؟۔
باہر سے کتنا اناج منگایا گیا؟۔
تمام ممالک سے لئے ہوئے قرضوں کی کل رقم کتنی ہے اور اس پر سود کیا دینا ہوتا ہے سالانہ؟
بے روزگاری پر منصوبہ بندی کا کیا اثر ہوا؟ اُدھر بیانوں کے لچھے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ ادھر حسین علی کے دماغ میں سوالات کی لسٹ تیار ہوتی جا رہی تھی۔

حسین علی مختلف دفتروں میں بھی گیا اور شام کو تھک تھکا کر اپنی کوٹھری میں آ کر لیٹ گیا، رات کا کھانا بھی اس نے سرائے کے ہوٹل میں نہیں کھایا اور نگران نے جلکر اس کا نام اپنے یہاں کی بلیک لسٹ میں لکھ لیا، اس نے حسین علی کو کسی سماج دشمن پارٹی کا ممبر سمجھ کر خاموشی سے اس کی نگرانی شروع کر دی۔

چھ مہینے یوں ہی گذر گئے، کئی انٹرویو ہوئے لیکن ملازمت نہ ملی، روزانہ کھانے اور کرائے کے مصارف بہت زیادہ تھے خاص طور پر ایک بے روزگار کے لئے، پھر ایک مشکل یہ ہوئی کہ حسین علی کی ماں کا انتقال ہو گیا اور باپ نے تنگ آ کر امداد دینے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کی مالی حالت واقعی بہت خراب ہو گئی تھی۔ حسین علی نے بڑی سرگرمی سے روزگار کی تلاش شروع کی، ٹیوشن ڈھونڈے، پرائیویٹ نوکریوں کے لئے شہر کے بڑے بڑے کارخانے اور تاجروں سے ملا، کئی کاروباری لوگوں نے جو ڈبل حساب کتاب رکھا کرتے تھے، ایک اپنے لئے دوسرا انکم ٹیکس کے افسروں کو دکھانے کی غرض سے، انہوں نے اسے نوکری دینے کا وعدہ بھی کیا مگر رازداری پر اطمینان نہ ہوا اور حسین علی کوئی ضمانت نہ دے سکا۔ بڑی کوشش سے سینما ہاؤس میں گیٹ کیپری ملی، تنخواہ پچاس روپے تھی، کام کی مدت چھ گھنٹے کے قریب تھی۔ بظاہر ڈیوٹی کچھ مشکل نہ تھی مگر جلد ہی پتہ چلا کہ یہ ملازمت زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے گی، روزانہ ان بدمعاشوں اور غنڈوں سے لڑائی ہوتی جو بغیر ٹکٹ اندر جانے کی کوشش کرتے، اور لڑ بھڑ کر اندر داخل ہو جاتے تو چیکنگ کے بعد حسین علی سے جواب لیا جاتا اور اس کی تنخواہ کاٹ لی جاتی، ایک روز ایک بڑے شریف صورت بدمعاش سے پالا پڑ گیا، وہ اندر جانے لگا تو حسین علی نے روکا، اس نے فوراً دو تین چپت رسید کر دیئے اور کود کود کر گانا شروع کیا۔

دھینگا مشتی
لپا ڈگی، چھینا جھپٹی، کھینچا تانی
یہ سب کیا ہے
پاگل خانہ، تیرا گھر ہے،

گیٹ پر کافی ہجوم ہو گیا، سیٹھ بھی آ گیا، بدمعاش نے اتنی دیر میں بڑی صفائی سے اپنے کسی دوست سے ٹکٹ لیکر سیٹھ کو دکھاتے ہوئے کہا۔
ہمارے پاس ٹکٹ موجود ہے۔ پھر یہ کیوں روکتا ہے؟۔
بات معقول تھی، حسین علی کو فوراً الگ کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن کھانا بھی نہ کھا سکا، اُدھر سرائے کے نگران نے نوٹس دیا کہ پچھلا کرایہ ادا کرو ورنہ اسی ہفتہ میں کمرہ خالی کر دو، وہ بہت پریشان ہوا، اسی روز ایک واقف کار نے اسے شاہد علی ڈپٹی سیکریٹری رشتہ دار بتایا تھا کہ وہ بہت ہمدرد اور رحمدل آدمی ہیں، ان کے یہاں اکثر جگہیں نکلتی رہتی ہیں، بہت ممکن ہے وہ ترس کھا کر ملازمت دیدیں، اس دن حسین علی بیحد پریشان تھا، مرحلہ وہ آ گیا تھا کہ بار بار خودکشی کو جی چاہتا تھا، لیکن چند دنوں سے انگلی کا اشارہ کر کے کہہ رہی۔
حسین علی زندگی بہت قیمتی ہے۔
مشکلات کا مقابلہ کرو۔

عاجزسے بھاگو نہیں

جیون کو حسین بناؤ شادی کرو، میری ملک میں سیندور بھر دو، پھر دیکھو دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ زندگی کتنی سُندر ہے!

وہ فوراً اپنے اُوپر ملامت کرنے لگا۔

دیکھ شام کو وہ شاہد علی سکریٹری سے ملنے چلا۔ راستے میں اس نے انگریزی اور اردو کے چند درد انگیز جملے اپنے ذہن پر ثبت کئے۔

میں ایک اچھے خاندان یعنی نوبل فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔

گریجویٹ ہوں!۔

ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی جانتا ہوں۔

اور اس کے بعد مطلب کی بات کہنے کے لئے اس نے بہت سے جملے بنالئے، ایسے جملے جن کو سنتے ہی شاہد علی موم ہو جائیں گے ان کا دل برف کی سل کی مانند پگھل کر پانی ہو جائے۔

مالی حالت بہت کمزور ہے

آج کھانا نہیں کھاسکا ہوں

سرائے سے بھی عنقریب نکال دیا جائے گا

آپ ہی میرا آخری سہارا ہیں

اگر آپ کوئی عمدہ سی جاب، یعنی اسٹینوگرافر یا کم سے کم یو ڈی سی کی جگہ دیدیں تو ۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔۔ اور یہاں ضبط کرنے کے باوجود آنسو نکل پڑیں گے، شاہد علی ضرور اسے ملازم رکھ لیں گے، سکریٹری چاہے تو کیا نہیں کرسکتا۔ وہ مستقل نہیں تو عارضی جگہ ضرور دیدیں گے،

وہ بنگلہ میں داخل ہوا تو اندر سے ایک عمدہ قسم کی کار بالکل اس طرح پھسلتی آرہی تھی جیسے مہاشیر مچھلی ندی کی دھار میں الٹی سمت کو تیر کی مانند تیر رہی ہو، کسی منسٹر کی گاڑی تھی، حسین علی جانتا تھا کہ منسٹر زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوتا تو خود ہی سکریٹری کے یہاں چلا جاتا ہے۔ ورانڈے میں دو تین امیدوار بیٹھے تھے وہ انہیں چپراسی نہیں سمجھتا تھا کیونکہ چپراسی اور امیدوار میں بڑا فرق ہے، امیدوار کے کپڑے میلے، گال پچکے ہوئے، اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہوتی ہیں اور ان میں امید و بیم کے متضاد جذبات ہوتے ہیں، چپراسی بہت مطمئن ہوتا ہے اسے تنخواہ کے علاوہ امیدواروں سے ٹپ بھی ملتی ہے۔

ایک چپراسی نے اشارہ سے حسین علی کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔

کیسے گھوم رہے ہو؟

صاحب سے ملنا چاہتا ہوں!

کیوں؟ ۔ سسپینڈ ہوئے ہو یا بالکل ڈسمس کر دیا گیا ہے؟

نوکری چاہتا ہوں!

نوکری چاہتا ہوں نوکری چاہتا ہوں اس نے جیسے منہ چڑایا، نوکری نہ ہوئی پرشاد ہو گیا جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلا آرہا ہے۔ اور نوکری کے لئے ڈنڈا تو اٹھایا نہیں جاسکتا۔

آہستہ بولو، تم کوئی خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہو میں پولیس گارڈ کے سامنے تمہاری تلاشی لوں گا۔

معاف کیجئے میں تو بہت غریب اور بالکل بے ضرر آدمی ہوں۔

ایسے آدمی ٹپ دیا کرتے ہیں، یعنی بخشش

میں نوکری ملتے ہی آپ کو ٹپ دوں گا۔

نوکری ملتے ہی تو کیا، بس ہینڈ ہو کر شاید دے دو۔ خیر تم کہاں جا بیٹھو نیچے پر،

جو لوگ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے وہ باری باری اندر گئے اور دو دو منٹ ہی میں لوٹ آئے، چوتھے نمبر پر حسین علی کو بلایا گیا وہ جھک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا اور جتنے جملے اس نے بنائے تھے، عاجزانہ لب و لہجہ میں ادا کرنے شروع کر دیئے۔

کس ڈویژن میں پاس ہوئے ہو؟

فرسٹ ڈویژن میں۔

لیکن سبجیکٹ کوئی اچھا منتخب نہیں کیا۔

کھانا نہیں کھایا؟ ــــ اور سرائے سے بھی نکال دیئے جاؤ گے؟ شاہد علی نے اپنی چکنی چندیا کو کھجایا اور حیرت سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

جی ہاں۔

شاہد علی بہت متاثر ہوئے، مگر سوچ میں پڑ گئے انہوں نے جماہی لی اور کچھ گنگنانے کے بعد پوچھا۔

شادی ہو گئی۔

حسین علی چونک گیا، اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے ایک ہی لمحہ میں مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔

ہو جاتی، میں نے کی نہیں۔

کیا ضرورت نہیں، بیمار ہو؟۔

جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں نے سوچا بیکاری میں شادی بھی ایک بوجھ بن جائے گی۔

شادی بیکاری ہی میں کرنی چاہیئے تاکہ بیوی کی قسمت سے عمدہ سی نوکری مل جائے،

اور پھر چند ضابطہ کے سوالات کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔

اپنا سامان بنگلے پر لے آؤ۔

کھانا یہیں کھاؤ، ملازمت بھی مل جائے گی،

حسین علی کا دل دھڑکا اور جدو کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو یاد آئے، پھر چادر کے کونوں پر کڑھے ہوئے پھول یاد آئے جو دھلتے دھلتے بے رنگ ہو گئے تھے، اور بنگلہ میں قدم قدم پر جو پھول کھلے ہوئے تھے، حسین علی کو ان کا بھی خیال آیا، اس کا جی چاہا کہ وہ بھی چند باتیں پوچھ لے،

کتنی لڑکیاں ہیں آپ کے،

اور ان کے یعنی ان کے شوہروں کے لئے گریڈ کیا مقرر ہیں۔

یعنی بڑے داماد کو کتنے کی نوکری ملے گی،

اس سے چھوٹے، پھر اس سے چھوٹے کو کتنے کی؟

جہیز طلب کرنا تو خلاف قانون ہے لیکن ایک بے روزگار داماد نوکری تو ضرور طلب کرے گا، نوکری کے گریڈ مختلف ہو سکتے ہیں، عمر کے

لحاظ سے، تعلیم اور شکل و صورت کے اعتبار سے، وہ ان میں سے کوئی سوال بھی نہ کر سکا اور جلدی سے بولا۔

بہت مناسب ہے میں یہیں آجاؤں گا!۔

سکریٹری صاحب نے گھنٹی بجاکر اردلی کو بلایا اور اسے حکم دیا۔

یہ سامان لیکر آئیں تو موٹر گیراج کے قریب والا کمرہ ان کے لئے کھول دیا جائے اور تمام ضروری چیزیں مہیا کر دی جائیں،

اس نے باہر جاکر حسین علی سے کہا۔

بڑے نصیبہ ور ہو، اتنی جلدی نوکری مل گئی، شادی بھی ہو جائے گی، صاحب کے چار لڑکیاں ہیں۔ وہ پنشن سے پہلے ہی سب کو ٹھکانے لگا دینا چاہتے ہیں، تمہارے لئے منجھلی اچھی رہے گی۔ چند امیدواروں نے تو بڑا فراڈ کیا نوکری ملنے کے بعد جو غائب ہوئے تو آج تک منہ بھی نہ دکھایا۔

بنگلہ پر حسین علی کو بہت عمدہ جگہ ملی، وہ دن بھر کمرے میں پڑا رہتا۔ ایک ایک نوکرانی نے مختلف بہانوں سے وہاں آکر غور سے اس کو دیکھا۔ جب حسین علی اپنے آپ کو ایک کھرا سکہ سمجھ رہا تھا جو بجانے پر عمدہ کھنک دار آواز دیتا ہے اور بازار میں پوری قیمت پاتا ہے۔ انٹرویو کے لئے اسے جلد جلد بلایا جانے لگا۔ اسے اپنا مستقبل سنورتا نظر آیا۔ مگر اس نے سوچا وہ مستقبل ہی کیا جس میں جدّت نہ ہو، صبح اور شام کو لڑکیوں کا ایک غول کا غول باغ میں نظر آتا ان میں کچھ دوسرے رشتہ داروں کی لڑکیاں بھی تھیں، وہ تتلیوں کی طرح باغ کے پھولوں پر منڈلاتیں، حسین علی پر فقرے کستیں اور چلی جاتیں،

صورت تو غنیمت ہے۔

مگر نام چپراسیوں کا سا ہے۔

قد سے تو بالکل گنوار معلوم ہوتا ہے

آدمی رومینٹک قسم کا نہیں معلوم ہوتا۔

نیاز مند ضرور ہے۔

انمیں کئی لڑکیاں لمبی اور پتلی دبلی تھیں دو ایک دوہرے بدن کی تھیں، ایک کے پاؤں بہت چھوٹے تھے اور چہرا بہت چوڑا تھا روٹی پکانے کے توے کی مانند گول اور سانولا، اسے دیکھ کر حسین علی نے دعا کی کہ خدا کرے منجھلی یہ نہ ہو اسے سید حسن کا ایک مقولہ یاد آگیا تھا جو مشہور صحافی اور مفکر تھے۔

"عورت کی نفسیات کی بنیاد ہمیشہ جسمانی ساخت پر ہوتی ہے"

اور اس کی جسمانی ساخت بہت خراب ہے نفسیات بھی اچھی نہ ہوگی، نوکری ملے یا نہ ملے اس سے میں شادی نہیں کروں گا۔ یہ تو وہی خودکشی ہوگی جسے زندگی کی خوبصورتی کے لئے میں نے اختیار نہیں کیا،

۹ بجے کالج بس آتی اور لڑکیاں اس طرح اس میں بیٹھ جاتیں جیسے پر دار کبوتر اڑ کر کابک میں جا بیٹھتے ہیں۔ شام کو پھر تتلیوں کی طرح باغ میں بکھر جاتیں، نقرئی قہقہے گونجنے لگتے،

ایک دن ایک بوڑھا آدمی بالکل سرائے والی مسجد کے امام کی طرح حسین علی کے کمرے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس نے حسین علی کو بلاکر پوچھا۔

کوئی تکلیف تو نہیں؟

کھانا وقت پر مل جاتا ہے؟

چائے پیتے ہو؟

اوڑھنے بچھانے کا سامان ساتھ ہے؟۔ نہ ہو تو اندر سے بھجوا دوں۔

کیا عمر ہوگی آپ کی؟

بائیس سال؟۔ شادی کرلیتے تو دو بچوں کے باپ ہوتے، مگر ہاں سوال نوکری کا ہے، بیکار آدمی کو لوگ نگاہ ہی میں نہیں لاتے،

حسین علی کو ہر مرتبہ ایسا لگا جیسے اب وہ امام صاحب والے لہجہ میں کہنے ہی والا ہے۔

شادی نہ کروگے تو یہاں رہ نہیں سکوگے، چلتے چلتے اس نے کہا۔

نوکری چٹکی بجاتے مل جاتی ہے مگر تم مجھے بدھو قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہو،۔ پوچھو کیوں؟۔ ارے دو دن وقت باغ میں تتلیاں اڑتی ہیں اور تم انہیں غور سے دیکھ کر دل میں کچھ سوچتے بھی نہیں، کیسے نوجوان ہو، اس عمر میں شادی سے پہلے رومان ہوتا ہے، جیسے نوکری سے پہلے انٹرویو، اگر تمہارے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ ان میں سے کسی کو پسند کرسکو تو مجھ سے کہو، ان میں چار لڑکیاں سکریٹری صاحب کی ہیں۔ پیغام روز آتے ہیں مگر وہ ہندوستانی لڑکا چاہتے ہیں۔ کہو تحریک کروں؟

حسین علی نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ یہ بہت گھاگ قسم کا آدمی ہے، سب اسے ماموں کہتے تھے، وہ ماموں کے سوال پر سٹ پٹا کر بولا۔

میں نوکری کرنا چاہتا ہوں!۔

اور شادی نہیں۔ نوکری بغیر سفارش کے نہیں ملا کرتی یار عزیز، سکریٹری صاحب کا داماد بن جانا بہت بڑی سفارش ہے، آج شادی کل نوکری،

حسین علی کے تصور میں جدّہ کاغذی پیرہن میں اکڑی ہوگی، اور چادر کے پھول نقشِ فریادی بنکر چیخنے لگے۔

ہمیں تازگی دو ــــ رنگ دو ــ مہک دو ــ بہار کی رنگینیاں دو!۔

اور جدّہ کہہ رہی تھی۔

تم نوکری کرنے آئے ہو شادی نہیں!۔

تمہاری منتظر میں ہوں

تمہاری شادی مجھ سے ہوگی۔

جہیز میں ایک بھینس بھی ہوگی، تم تو دیکھ چکے ہو، چار سیر دودھ دیتی ہے ایک وقت میں۔

لیکن شادی کے لئے نوکری ضروری تھی۔

اور تھوڑے ہی دنوں میں حسین علی، سکریٹری صاحب کا داماد بن گیا، منجھلی لڑکی اس سے منسوب ہوگئی اس نے خوشہ میں سے اپنی پسند کا پکا ہوا پھل اپنے ہاتھ سے توڑ لیا۔ اسی ہفتہ میں وہ یوڈی سی ہوگیا۔ تقرر چھ ماہ کے لئے امتحاناً ہوا تھا اور امتحانی مدّت گذر جانے سے قبل ہی شاہد صاحب کو ریٹائر منٹ لیو Retirement Leave دیدی گئی۔ اسی دن رات کو حسین علی نے اپنی بیوی پروین جہاں سے کہا۔

شادی تو کنفرم Confirm ہوگئی لیکن نوکری کا کنفرمیشن ہونے سے پہلے ہی ڈیڈی کی پنشن ہوگئی،

اسی رات کو آخری بار جدّہ کا چہرہ حسین علی کو دکھائی دیا، جدّہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، وہ اپنی چادر واپس مانگ رہی تھی، وہ کہہ رہی تھی' تم نے چادر کی توہین کی ہے' یہ شادی کرکے اتنا پیسہ تم میرے باپ کیساتھ کھیتی کرکے بھی کما سکتے تھے۔ فریب نہ دو حسین علی زیادہ فریب نہ دو، میں کسی سے شادی نہ کرونگی اور یقین رکھوں گی۔ تم کبھی میرے پاس نہ آسکوگے۔ سکریٹری صاحب نے تمہارے گرد ہزار فٹ اونچا اور اتنا ہی گہرا حصار کھینچ دیا ہے۔ ان کی پنشن ہوگئی تو کیا ہوا، وہ حصار تو نہیں ٹوٹا۔

نیا دور، کراچی

مہندر ناتھ

اوگاڈ

باندرہ کے علاقے میں لوسی کا شمار حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا اور قدرت نے حسن فیاضی سے بخشا تھا اور یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقے میں صرف لوسی ہی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اور بھی حسین لڑکیاں تھیں، جنھیں اگر لوسی کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جاتا تو شاید ان کے آگے لوسی کی سندرتا ماند پڑ جاتی۔ لوسی حسین ہونے کے علاوہ بے حد آزاد۔ بے باک۔ شوخ چنچل اور نٹ کھٹ تھی، اس کے ساتھ ہمیشہ لڑکیوں کا غول کا غول رہتا اور جب کبھی لڑکے اس غول کے قریب سے گذرتے تو لوسی فقرہ کسنے سے باز نہ آتی۔

لوسی کا باپ الفریڈ، ایک پرائیویٹ فرم میں نوکر تھا اور گھر میں صرف دو بچے ایک لوسی اور دوسرا آمپسن لوسی کا چھوٹا بھائی۔ الفریڈ لوسی کو بہت چاہتا تھا۔ اس نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھی لوسی کو۔ لوسی نے جو فرمائش کی باپ نے اُسے پورا کرنے کی کوشش کی۔ بمبئی میں رہتے ہوئے کپڑے سلوانے کا انداز کچھ بین الاقوامی سا ہو گیا ہے۔ نت نئے فیشن، مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج کبھی اسکرٹ اور کبھی چست پاجامہ۔ اور اوپر جسم پر ایک پھنسی ہوئی قمیص۔ جو چھاتیوں، کمر اور ٹانگوں کے مختلف زاویوں کو یوں اُبھار دے کہ دیکھنے والے کو بغیر پئے ہی نشہ آ جائے۔ لوسی بالوں کو نئے طریقے سے تراشنے میں سب سے آگے تھی۔ بالوں، کپڑوں اور چہرے کے میک اپ میں جو تبدیلیاں کی جاتیں اس میں لوسی کی جمالیاتی حِس کار فرما تھی۔

اپنی ماں فینی سے اس کی ہمیشہ لڑائی رہتی۔ بچاری فینی کو عیسائیت پر پورا اعتقاد تھا۔ مسیح ہی اس کا سہارا تھا۔ وہ سنڈے کے سنڈے گرجا گھر ضرور جاتی۔ یوں ماں اور بیٹی کی صورتیں آپس میں کافی ملتی تھیں فینی بھی اپنے زمانے میں واقعی قتنہ ہو گی۔ آثار قدیمہ سے بڑی آسانی سے پتہ چلتا تھا کہ یہ عمارت ایک دن عظیم الشان تھی۔ فینی کے ظاہری خد و خال میں آج بھی جاذبیت تھی۔ اس کے چہرے پر ایک زردی سی نمایاں تھی۔ اور آنکھیں بے حد اُداس، اور ہونٹ بے رس اور پھیکے پھیکے سے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہار ابھی روٹھ کر گئی ہے۔

فینی کیوں ایک پھول کی طرح نہ کھل سکی۔ اور شادی کے بعد ایک اَدھ کھلی کلی کی طرح مُرجھا کر رہ گئی اور شاید اس کے خاوند الفریڈ کی بدصورتی نے اس کے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ خوشی اُس کے دل کو چھو نہ سکی۔ اور چہرے کی شگفتگی اور جسم کی رعنائی پورے شباب پر نہ آ سکی۔ گو فینی نے اپنے آپ کو الفریڈ کے حوالے کر دیا لیکن دل کے اندر ایک طوفان بند تھا جس کے نکاس کی راہ کوئی نہ تھی۔ وہ مسیح کے آگے دو زانو ہو کر اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگ لیتی اور پھر اخلاقی قدروں کے خول میں اپنے آپ کو قید کر لیتی۔

شاید لوسی کی ماں کی یہی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی بھی اس کے نقش قدم پر چلے وہ ہر روز اپنی جوان بیٹی سے کہتی "بیٹی جب کبھی تیرے دل میں گناہ کا احساس پیدا ہو تو مسیح کے آگے جھک جانا۔ یہ عظیم طاقت تیرے ہر گناہ کو معاف کر دے گی۔"

لوسی سُن کر مسکرا دیتی اور مسکراتی ہوئی باہر نکل جاتی۔ یوں لوسی نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ کسی دفتر میں نوکر نہ ہوئی تھی یہ دن بڑے خوبصورت اور حسین تھے۔ لانبے لانبے ناریل کے درخت، سمندر کا کنارا، ہریں، تیز اور تند ہوا، اور دُور دُور تک پھیلا ہوا سمندر اور پھر شباب اور حُسن کا ایک خوبصورت امتزاج۔

لوسی کی ہنسی دوست اور دشمن دونوں میں مشہور تھی۔ بس کسی خوبصورت لڑکے کو دیکھتی تو فوراً کہتی "ہائے۔ کتنا پیارا لڑکا ہے" وہ لڑکوں پر پیلی کی طرح کبھی فدا نہ ہوئی۔ بس جو چہرہ اچھا لگا، تعریف کر دی۔ لوسی کے گھر اچھے خاصے منچلے لڑکوں کا جمگھٹا رہتا۔ چند لوسی کے عاشق تھے، چند دوست، اور ایک دو رقیب روسیاہ، یعنی اس علاقے میں لوسی کے عاشقوں کی کمی نہ تھی۔ لوسی جان پہچان والوں کے ساتھ بے دھڑک سینما دیکھنے چلی جاتی۔ جب کبھی کوئی لڑکا لینے آتا تو اس کے ساتھ گھومنے پھرنے بھی جاتی پھر کسی غیر آباد علاقے کی طرف نکل جاتے اور ایک سنسان اُجاڑ جگہ پر بیٹھ کر لوسی اپنا سر اس نوجوان کے کندھوں پر رکھتی اور کہتی "اوگاڈ کتنا پیارا سین ہے" نوجوان اس سین کو نہ دیکھتے ہوئے، ان گھنے، سیاہ بالوں کی طرف دیکھتا جو گھٹا بن کر اسکی سر میں گردن پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ ان رسیلے اور چمکیلے ہونٹوں کی طرف دیکھتا، جو اس بات کی دعوت دے رہے تھے کہ اے پاگل باہر کیا دیکھتا ہے۔ تیرے پاس خوبصورتی اور سُندرتا کا خزانہ ہے۔ اس سے منہ موڑنا شرافت نہیں۔ خباثت ہے۔

اس ساحرانہ خوبصورتی سے مرعوب ہو کر نوجوان اپنے جلتے ہوئے ہونٹ ان سُرخ سُرخ لبوں پر رکھ دیتا اور کافی دیر تک رس بھرے ہونٹوں کی مٹھاس سے اپنی روح کو سیراب کرتا رہتا۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ نوجوان نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن لوسی فوراً اُسے روک دیتی۔

ایک دو بار یوں بھی ہوا کہ وہ ایک بدصورت نوجوان کے ساتھ فلم دیکھنے چلی گئی۔ نوجوان اس کی طرف بار بار دیکھتا اور لوسی کو دیکھ کر وہ اُداس سا ہو جاتا۔ لوسی اسے اداس دیکھ کر خود اُداس ہو جاتی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکرانے لگتی۔ لوسی نے دیکھا کہ لڑکے کے بے رونق چہرے پر شگفتگی اور تازگی سی آگئی تھی۔ اداس اور بے رونق چہرہ پھول کی طرح کھِل اٹھا تھا۔ نہ جانے دوسروں کو خوش کر کے اسے کیوں راحت محسوس ہوتی تھی۔ اس قسم کی غیر شریفانہ حرکت کر کے وہ مسیح کے آگے دوزانو ہو جاتی اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔

انہی حرکتوں کی وجہ سے وہ اس علاقے میں بڑی جلدی بدنام سی ہو گئی۔

عاشقوں نے کہنا شروع کر دیا "لوسی ہرجائی ہے، دل کی دولت ہر ایک پر لٹاتی ہے" یوں تو اس کے چاہنے والوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے عاشق ایک خاص حد سے آگے کبھی نہ بڑھ سکے۔ کئی اس انتظار میں تھے کہ بڑھ کر لوسی کا ہاتھ تھام لیں۔ مگر عین وقت پر لوسی ان کا ہاتھ جھٹک کر مسیح کی گود میں چلی جاتی۔

انہی دنوں اس کی سہیلی روزی نے بتایا کہ باندرہ کے گرجا گھر میں ایک نیا پادری آیا ہے۔ کیا بتاؤں لوسی، بے حد خوبصورت اور معصوم ہے۔ یوں کالی کالی سی داڑھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن روشن سی۔ ہونٹ موٹے اور بھرے بھرے۔ آواز میں ایک کھرج، مگر شفقت اور پیار سے بھری ہوئی۔ اچھا خاصا ڈیل ڈول۔ لانبا قد ہے اس کا۔ بس عمر چالیس برس کی ہوگی۔ گاڈ۔ یہ پادری کیوں بن گیا۔ اس سنڈے چلیں گے۔ باندرہ والے گرجے میں۔

جان بھی عجیب و غریب قسم کا پادری تھا اگر وہ پادری نہ بنتا تو وہ بڑی آسانی سے ہندستانی فلموں میں ہیرو بن سکتا تھا، گو اس کی بات چیت میں کھلنڈرا پن نہ تھا۔ بلکہ ایک سنجیدگی اور گہرائی کی جھلک تھی جو اکثر ایکٹروں کی خاصیت نہیں ہوتی۔ ایسی باوقار شخصیت کہ دیکھنے والے پر رعب پڑ جاتے۔ بے حد صاف ستھرے کپڑے پہنتا، معلوم ہوتا جیسے ابھی کسی لانڈری سے دھل کر آیا ہے۔

جب پہلی بار لوسی نے جان کو دیکھا تو فوراً چلائی۔

"اوگاڈ۔ اس کی شادی کرا دو دو چار بچوں کا باپ بن جائے"

"تو اصلی فادر کہلائے گا ۔ ابھی تک تو بس نقلی فادر ہے"

"ابے چپ ۔ کوئی سن لے گا تو گرجا گھر سے باہر کر دے گا" روزی نے جلا کر کہا ۔

کسی کو کیا معلوم کہ جان کیوں اور کیسے پادری بنا کسی کے دل میں کس نے جھانک کر دیکھا کہ اس کے دل میں کس قسم کا درد تھا جس کی وجہ سے اس نے دنیاوی خوشیوں سے منہ موڑ کر مسیح کی گود میں پناہ لی، وہ کیوں اکیلا تھا کسی کو کیا معلوم تھا کہ جب وہ جوان ہوا تو اس کی ماں نے کسی اور مرد کے عشق میں گرفتار ہو کر جان کے باپ کو چھوڑ دیا کسی کو کیا معلوم تھا کہ باپ نے اپنی پیاری بیوی کو واپس لانے کیلئے کتنے جتن کئے تھے، اپنی عزت اور محبت کا واسطہ دیا لیکن جان کی ماں نہ مانی ۔ اور جان خود اپنی ماں سے ملنے گیا تھا ۔ اس نے رو رو کر اپنی ماں سے کہا تھا "ماں، تو واپس آجا ۔ دیکھ میں تیرا بیٹا ہوں، تو نے مجھے جنم دیا ۔ تو نے مجھے پالا پوسا بڑا کیا ۔ میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں ۔ ماں ۔ اپنا سر تیرے قدموں پر رکھتا ہوں ۔ اپنے بیٹے کی لاج رکھ" لیکن ماں نہ مانی ۔ اس نے محسوس کیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا ماں پر ان باتوں کا رتی بھر اثر نہ پڑے گا ۔ اب وہ ماں اس کی ماں نہ تھی ۔ ایک آوارہ، اوباش، شرابی کی معشوقہ تھی ۔ اس کی ماں نے اس بدمعاش کی بیوی بننا پسند کر لیا ۔ اور ایک شریف، باعمل اور باعزت انسان کے ساتھ زندگی گزارنے سے انکار کر دیا ۔

جان کے باپ کو اتنا صدمہ پہنچا کہ بیچارے نے خودکشی کر لی ۔

اس واقعے نے جان کو پادری بننے پر مجبور کر دیا ۔ وہ خوبصورت جوان جس نے سورج کی کرنوں کو لہروں پر مچلتے دیکھا تھا جس نے پھولوں کو آنکھیں کھولتے دیکھا تھا جس نے کسی لڑکی کے سیاہ بالوں کو کالی گھٹا کی طرح کندھوں پر لہراتے دیکھا تھا جس نے ساحل کے کنارے رنگ برنگ کے کیکڑوں کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا تھا ۔ جس نے اپنے خون میں ایک ایسے انجانے وحشی راگ کو سنا تھا ۔ آج اسے یہ دنیا کتنی چھوٹی، کمینی، رذیل، گھٹیا، ظالم اور جھوٹی بے رحم نظر آتی ۔

اس چھوٹی سی عمر میں اس نے زندگی کے ایک بہت بڑے المیہ کو دیکھ لیا اس سے آگے اور کیا ہو سکتا ہے بس اسی دن جان نے تہیہ کر لیا کہ اپنے جسم سے اس خوبصورت سوٹ کو اتار کر پادری بن جائے گا ۔ اس نے گلے میں صلیب ڈال کر اپنی تمناؤں اور خواہشات کو سولی پر لٹکا دیا ۔ یہ کیسا فیصلہ تھا، جس نے اس کی تمام راحتوں پر کانٹوں کی سیج بچھا دی تھی ۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جان نے اس طرح کیوں سوچا، اور دل کی شاداب وادیوں کو ویران کر کے جان کو کیا ملا ۔

جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا ۔ اس واقعے کو بیس برس ہو گئے ۔ اب جان چالیس برس کا تھا ۔ وہی متبسم ہونٹ، معصوم چہرہ، تنومند جسم، بڑی مترنم اور گمبھیر آواز ۔ جو گرجے میں یوں گونجتی جیسے کوئی آبشار چٹانوں سے ٹکرا رہا ہو ۔ لوسی کو یہ پادری بے حد پسند آیا ۔ حالانکہ پادری اس سے عمر میں کافی بڑا تھا ۔ نہ جانے لوسی نے کیوں سوچا کہ ہر گناہ کا اعتراف اس پادری کے آگے کرنا چاہیئے، مسیح کے آگے جھکنے سے بہتر یہ ہے کہ اس حسین پادری کو اپنے حسین اور لطیف گناہوں کا ہمراز بنایا جائے ۔

ایک دن وہ پادری کے گھر چلی گئی، اور جان کو دیکھتے ہی دوزانو ہو گئی ۔

"کیا بات ہے؟"

"میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں فادر"

"کیا گناہ کیا ہے تم نے لڑکی؟"

"بتاؤں" لوسی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا ۔

جان نے لوسی کی طرف دیکھا کتنا خوبصورت اور بے داغ چہرہ تھا گہری سیاہ پتلیاں حیران حیران سی اور سفید مرمریں گردن پر ہلکے سرخ سے نشان ۔

"گناہ بتانے سے پہلے اپنا نام تو بتاؤ"

"لوسی"

"اس چھوٹی سی عمر میں تم کیا گناہ کر سکتی ہو؟"

" فادر ؛ لوسی نے بڑی سنجیدگی سے کہا " میں اس سے پہلے بہت گناہ کرچکی ہوں، اور آگے کرنے کا ارادہ ہے ۔ میں ایک لڑکے کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ انٹرول سے پہلے اس نے میرا منہ چوم لیا۔ وہ لڑکا مجھے پسند نہیں تھا۔ میں اس لڑکے کو کچھ نہ کہہ سکی لیکن اپنے دل میں بے حد شرمندہ ہوں فادر "

پادری ہنس پڑا " بڑی بھولی ہو تم ۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تمہارے دل میں کچھ نہیں تھا اور اگر اس لڑکے نے تمہیں چوم لیا تو کیا ہوا کسی اچھی چیز کو چومنا بُری بات نہیں۔ تم بغیر سوچے سمجھے لڑکوں کے ساتھ سینما دیکھنے نہ جایا کرو بس ۔ میرا یہی مشورہ ہے "

" نہیں جاؤں گی فادر ۔ خیر یہ بتلائیے ۔ آپ نے دنیا کیوں تیاگ دی ؟"

" صرف اس لئے کہ میں دنیا کا کچھ سنوار نہیں سکتا "

" کیا آپ کو گاڈ پر یقین ہے ؟"

" ہاں لوسی ۔ اگر گاڈ پر یقین نہ ہوتا تو میں پادری کیسے بنتا !"

" کیا میں آپ کے گھر آسکتی ہوں، تاکہ آپ کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف کروں "

" لوسی ۔ تم مسیح کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا کرو ۔ یوں لوسی ۔ لفظ گناہ کو بدنام نہ کرو ۔ تم کوئی گناہ نہیں کرسکتیں ۔ لوسی ۔ تم گناہ کے چکر میں نہ پڑو "

لوسی گناہ اور ثواب کے چکر میں تو نہ پڑی ۔ مگر پادری کے چکر میں ضرور پڑی ۔ عجیب قسم کی سنجیدگی اور گمبھیرتا تھی اس پادری کی باتوں میں ۔ کتنا ضبط اور قابو تھا اسے اپنے آپ پر ۔ یوں تو لوسی نے پادری کے مشورہ پر عمل نہ کیا ۔ اس کی چنچل اور شوخ طبیعت میں خاص فرق نہ آیا ۔ لڑکے اور لڑکیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا ۔ نت نئے فیشنوں کو اپنا کر رنگ جمانا ۔ ٹویسٹ اور راک اینڈ رول جیسے ناچوں میں شامل ہونا ۔ اس کے لئے قابلِ فخر بات تھی ۔ انہی دنوں صرف ایک بات کا اضافہ ہوا کہ وہ اپنے دل کے راز جان سے کہہ دیتی اور بات کرتے ہوئے روزانو ہو جاتی ۔

جان نے ایک دن لوسی کا ہاتھ پکڑ کر کہا " لوسی اس خرابات کی دنیا سے نکل کر شادی کرلو "

یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی " کس کے ساتھ فادر ؟"

جان جواب نہ دے سکا ۔ لوسی کمرے سے باہر نکل گئی ۔

اِدھر جان پر کیا گذری ۔ چہرے کی سنجیدگی تو قائم رہی ۔ مگر دل کے نہاں خانے میں ایک ایسا طوفان اٹھا کہ جان کی ریاضت اور پاکبازی دھری کی دھری رہ گئی ۔ کسی نے ویرانے میں پھول کھلتے دیکھا ہے ۔ کسی نے دبی ، گھٹی گھٹی سی خواہشات کو اُبھرتے دیکھا ہے ۔ کبھی کسی نے یوں بھی سوچا کہ انجانے میں آغازِ سفر انجامِ سفر کیسے بنتا ہے ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ۔ اگر لوسی نہیں آتی تو جان کی بے چینی کیوں بڑھ جاتی ہے ۔ وہ تو گناہ کا اعتراف کرنے آتی ہے ، اور ایک تم ہو کہ دل میں گناہوں کا جم غفیر لئے ہوئے اپنے آپ کو پادری کہتے ہو ، لوسی کیوں آتی ہے ۔ تم اُسے منع کیوں نہیں کرتے ۔ لوسی سے صاف صاف کہہ دو کہ وہ تمہارے گھر میں قدم نہ رکھے ۔ کیا جان کو اپنے آپ پر قابو نہ تھا ۔ جب کبھی وہ اپنی زندگی کا جائزہ لیتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ وہ لفظ چاہت سے دور بھاگتا رہا ہے ۔ اس نے دنیاوی راحتوں سے منہ موڑ لیا تھا اور پادری بن کر دنیا کا چلن بدلنے کا تہیہ کرلیا تھا ۔ آج بیس برس کی کڑی ریاضت کے بعد ، اسے یوں محسوس ہوا کہ جو شخص اپنا چلن بدل نہیں سکتا وہ دوسروں کا چلن کیا بدلے گا ۔ وہ بے کار اپنے من کو مارتا رہا ۔ اپنی جائز تمناؤں اور خواہشات کو دباتا رہا ۔ آج لوسی کی صورت بار بار اس کے سامنے کیوں آرہی تھی ۔ لوسی کی شوخ اور چنچل نگاہیں ، چہرے کا رنگ گورا گورا سا ۔ کندھوں پر سیاہ بال لٹکتے ہوئے ، نیم وا ہونٹ ، اور اس کی گول گول اُبھری ہوئی چھاتیاں ، جو اس کے فراک سے پھٹ کر باہر آنا چاہتی تھیں ۔ کیوں اسکی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھیں ۔ او گاڈ ۔ مجھے تباہی اور بربادی سے بچاؤ ۔ یہ خباثت میرے ذہن میں کیسے آگئی ۔ اس نے آج تک یوں کبھی نہ سوچا تھا ۔ کوئی جسم اس طرح ننگا ہو کر اس کے سامنے اس طرح نہ اُبھرا تھا ۔ یہ تمام گھٹیا اور گندی باتیں اس کے ذہن میں کیسے آئیں ۔ جنسی جذبے کی یلغار

نے اسے بے دست و پا کر دیا۔ اس رات وہ مسیح کے آگے کافی دیر تک دو زانو رہا اور اپنے ناکردہ گناہوں کے لئے معافی مانگتا رہا۔

ایک صبح لوسی پھر آدھمکی۔

جسم پر بے حد چست کپڑے کہ جسم ان کپڑوں کو پھاڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ نگاہوں میں شوخیاں۔ ہر ادا میں ایک بجلی سی کوندتی ہوئی۔ چلتے چلتے مسکرا دیتی اور مسکراتے ہوئے قہقہہ لگانے لگتی۔ بالوں کو عجیب فیشن سے تراشا ہوا تھا۔ ان حالات میں انسان راہ سے بے راہ نہ ہو جائے تو کیا کرے۔

"فادر۔ میں تم سے ایک ضروری بات کہنے آئی ہوں۔"

"کہو!"

"ڈیڈی اور ممی مجھ سے بہت تنگ ہیں۔"

"کیوں؟"

"یہی کہ میں بے دھڑک لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں۔ میں سب کو پسند کرتی ہوں اور اس لئے سب لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔"

"یہ تو کوئی بری بات نہیں لوسی۔"

"زندگی گزارنے کیلئے مجھے ایک ایسا مرد چاہیئے جسے میں سب سے زیادہ چاہ سکوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"میں ایک ایسے مرد سے محبت کر رہی ہوں جو یہ نہیں جانتا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔"

"کون ہے وہ خوش قسمت انسان؟"

"بتانے سے کیا فائدہ۔"

"بتا تو دو۔"

"آپ برا تو نہیں مانیں گے!"

"نہیں!"

"سننے کیلئے تیار ہیں آپ۔"

"سننے کیلئے صرف تیار ہی نہیں، بلکہ بیتاب ہوں۔"

"آپ سے۔ جان۔ آپ سے۔"

"مجھ سے؟" جان ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"جو کہنا تھا۔ وہ کہہ دیا۔"

"لوسی۔ میں پادری ہوں۔ میں نے دنیا تیاگ دی ہے۔ میں رومن کیتھولک پادری ہوں۔ میں۔ میں۔"

"تو کیا میں پادری سے محبت نہیں کر سکتی؟"

وہ خاموش رہا۔ لوسی جانے لگی۔

"کل شام کو آؤں گی۔"

"آخری بار آؤں گی۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

"کتنے بجے آؤ گی؟"

"شام کے سات بجے۔" یہ کہہ کر وہ نکل گئی۔

لوسی نے کہا تھا۔ آخری بار آؤں گی۔ رات بھر جان چارپائی پر کروٹیں لیتا رہا۔ یہ کس قسم کی محبت تھی جس نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اس کے ساتھی کیا کہیں گے کہ خدا کی خدائی کو چھوڑ کر ایک بُت کا شیدائی ہو گیا تھا۔ یہ کس قسم کا جذبہ تھا۔ کیوں اس جذبے نے اس کی ساری زندگی کو تہس نہس کر دیا تھا۔ وہ کیا کرے کس سے کہے۔ اس خلش کو کہاں لے جائے۔ وہ مسیح کے آگے جھک گیا اور معافی مانگنے لگا۔ دل کو سکون نہ ملا۔ کیا وہ لوسی کے بغیر زندہ رہ سکے گا؟ اس نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر پوچھا۔ اور دل نے ڈوبتے ڈوبتے کہا، تم لوسی کے بغیر زندہ نہ رہ سکو گے۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے صبح ہو گئی۔

اس نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا، چہرے پر داڑھی تھی اس نے سیفٹی ریزر سے داڑھی صاف کر دی۔ اس نے برسوں کی رکھی ہوئی داڑھی کو صاف کرتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے وہ آج زندگی کی ہر گندگی کو صاف کر رہا تھا۔

حجامت کرنے کے بعد اس نے اپنا چہرہ دھویا پھر اپنی صورت آئینے میں دیکھی۔ ساری خباثت دور ہو چکی تھی۔

سورج کب نکلا اور کب غروب ہوا اس کے بارے میں وہ بے خبر تھا۔

شام کے سات بجے سے وہ ایک شاندار سوٹ پہن کر لوسی کا انتظار کرنے لگا۔ کیا وہ آئے گی؟ اس نے کہا تھا، وہ آئے گی۔ کیا لوسی نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ ہاں اگر وہ نہ آئی تو کیا ہو گا۔ اسکے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ آج جان نے برسوں کی تپسیا کو لوسی پر قربان کر دیا تھا۔ "او گاڈ۔ مجھے معاف کرنا۔ اتنا بڑا گناہ۔"

سات بج گئے۔ لوسی نہ آئی۔

سات بج کر پانچ منٹ ہو گئے۔ لوسی نہ آئی۔ ایک ایک منٹ ایک صدی بن کر گزر رہا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے پر تھی۔ اور ذرا سی آہٹ پر وہ چونک پڑتا اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔

سات بج کر پندرہ منٹ ہو گئے۔

لوسی نہ آئی۔

شاید وہ نہیں آئے گی۔ لوسی نے جھوٹ بولا تھا۔ اسے دھوکا دیا تھا۔

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ کس پر بھروسہ کرے۔ انسان پر یا خدا پر۔ اس وقت دونوں پر سے بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ آج اس کا کوئی نہ تھا۔ آج وہ اس دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ بالکل اکیلا۔ اپنے باپ کی طرح بے یار و مددگار۔ یہ دنیا کتنی گھٹیا، رذیل اور بے معنی ہے یہاں کوئی کسی کا نہیں ہر شخص خود غرض اور بے وفا ہے اس نے غصہ میں آ کر بلیڈ نکالا اور تیز بلیڈ کو گلے کی پھڑکتی ہوئی رگ پر رکھا اور زور کا جھٹکا دیا۔ شہ رگ سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا۔ گرم گرم خون اس کے کوٹ پر پھیل گیا پھر آہستہ آہستہ کرسی کو تھامتے ہوئے وہ فرش پر لیٹ گیا۔ خون بہہ رہا تھا۔ نیم بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ابھی تک لوسی نہیں آئی تھی۔ ترستی ہوئی نگاہوں نے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ شاید آخری بار دیدار ہو جائے، لوسی کا۔ دروازہ اسی طرح کھلا تھا۔ ابھی تک لوسی نہیں آئی۔ اب لوسی نہیں آئے گی۔ آہستہ آہستہ جان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ الوداع۔ لوسی۔ الوداع۔ خون فرش پر جم گیا تھا اور جان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھیں۔

غلام الثقلین نقوی

اوراق ۔ لاہور

پکنک

دریا کے کنارے ایک ننھا سا کونہ تلاش کر کے پکنک کا سامان رکھ دیا گیا۔ بہار کی وجہ سے زمین صحت مند تھی اور سبزے کی جوانی پر نکھار تھا۔ درختوں کے سایوں میں خنکی تھی۔ حالانکہ دھوپ میں چمک تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آج چھٹی کا دن نہیں تھا اور دریا کے کنارے لوگوں کا ہجوم نہیں تھا۔

وہ ایک مختصر سا کنبہ تھا۔ ڈیڈی، ممی، دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ بیٹی دونوں سے عمر میں بڑی تھی اور بڑی ہی معلوم بھی نہیں ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن کی خواب آلود معصومیت بچپن اور جوانی کی حدوں کو جدا نہیں ہونے دیتی۔ اس کا لباس نہ کسا کسا تھا اور نہ ڈھیلا ڈھالا تاہم اس کے نیم پختہ نیم خام جسم پر یہ لباس خوب سج رہا تھا۔ یہ کنبہ ابھی مشرق و مغرب کے سنگم پر تھا کیوں کہ ممی نے اپنے گھنے سیاہ بلکہ نیلگوں بالوں کو گنبد نما اسٹائل میں ترتیب دے کر جدیدیت کو اپنا لیا تھا اور لڑکی کے بالوں کے درمیان مانگ کی سیدھی لکیر تھی اور ایک چوٹی اس کی بھری بھری پشت پر بل کھا رہی تھی اس کی آنکھوں میں ایک پرسکون آمیز متانت تھی ایک روحانی سا سکون جیسے ابھی گلاب کی کلی کی دھیمی خوشبو بکھرنے نہ پائی ہو۔

سامنے دریا تھا۔ دریا میں پانی بہت کم تھا اور کناروں سے دور ہٹ کر بہہ رہا تھا۔ کناروں اور پانی کی پرسکون سطح کے درمیان ریت چمک رہی تھی ابھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا نہیں آیا تھا اور سطحِ آب پر کوئی لہر نہیں ابھری تھی درختوں کے سائے خاموش تھے۔ سبزہ خاموش تھا کوئی پرندہ بھی تو نہیں چہچہا رہا تھا۔ ذرا دور پل پر سے گذرتی ہوئی کاروں اور بسوں کے ہیولے کچھ یوں لگ رہے تھے جیسے ساکن دھوپ کی اسکرین پر کچھ تصویریں بڑی نرم خرامی سے حرکت کر رہی ہوں۔

ممی کو کسی کا انتظار تھا کیوں کہ وہ بار بار دھوپ کی سکرین پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی تھیں۔

"راحت! تم نے منصور کو فون کر دیا تھا؟" ممی نے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"کیا تمہیں یقین ہے؟" ممی نے پوچھا

"جی!"

"پھر وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ لڑکو! تم ذرا بھاگ کر سڑک تک چلے جاؤ۔ اسے کیا پتہ کہ ہم کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں۔"

ممی اس کنبے کی سردار تھیں کیوں کہ ڈیڈی خاموش طبع انسان معلوم ہوتے تھے وہ ایک درخت کے ساتھ لگ کر دور آفق پر نظریں جمائے کھڑے تھے گویا انھیں اپنے ماحول سے قطعاً کوئی تعلق نہ ہو۔

لڑکے سیٹیاں بجاتے ہوئے سڑک کی طرف لپکے۔

"راحت!" ممی بولیں۔

"جی!"

"منصور نے دیر کیوں کر دی؟"

"مجھے کیا معلوم؟" راحت بولی۔

"تم نے فون پر بھی یوں سرسری طور پر کہا ہوگا۔ وہ بڑا حساس لڑکا ہے۔ شاید تمھارے لہجے کی سردی سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگی ہو۔"

"مجھے کیا معلوم ممی" راحت نے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو وہ بڑا خوددار لڑکا ہے۔" ممی نے کہا۔

"اور اس کے پاس رولز رائس ہے۔" راحت نے دھیمے سے کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک متحرک گئی۔ ممی کچھ حیران ہوئیں پھر مسکرا کر بولیں۔ "ہاں! — اور منصور منزل کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم محلوں کے مقابلے میں جھونپڑیوں میں رہتے ہوں۔"

راحت نے کوئی جواب نہ دیا۔

"راحت! اگر یہ زمانہ پریوں کا ہوتا اور کوئی لال پری رستہ بھول کر منصور منزل کی طرف آنکلتی تو اسے پرستان سمجھ لیتی۔"

"ممی! آپ اس عمر میں بھی بہت رومانٹک ہیں" راحت نے کہا اور اس کی آنکھیں پہلی بار مسکرائیں اور یوں معلوم ہوا جیسے اس کا سراپا ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا ہو۔ جیسے بادل چھائے ہوں، گہرے بادل اور ایک نرم خیز کرن نے ایک کونے سے جھلک کر دم بھر میں سارے منظر کو بدل دیا ہو۔

ممی بڑی خوش ہوئیں انھوں نے سوچا۔ راحت بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کی طبیعت میں اتنی مٹھاس ہے کہ میں نے اس کی پیشانی پر کبھی بل نہیں دیکھا۔ اتنی نرم دھیمی تاہم ضرورت سے زیادہ متین۔ یہ کھل کر ہنستی نہیں لیکن کبھی کبھار مسکراتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یعنی... وہ سے پوم پوم کی آواز آئی اور ان کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ "یہ منصور کی رولز رائیس ہے کتنی میٹھی آواز ہے اس کی۔ جیسے راحت کی مسکراہٹ ممی کی سوچ کا رخ یکایک بدل گیا۔ اس کار میں بیٹھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے زمین پر نہیں آسمان پر اڑی چلی جا رہی ہوں اور وہ ہماری پھٹیچر سی کار۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر نہیں پاتال میں چل رہی ہو۔ اور راحت عجیب لڑکی ہے اس کی جگہ پر اگر میں ہوتی تو۔" ان کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ انھوں نے راحت کے ڈیڈی کی طرف دیکھا جو درخت سے ٹیک لگائے گم سم کھڑے تھے۔ "نجانے میں نے انھیں کیوں منتخب کر لیا پر میں نے انھیں کہاں چنا۔ وہ زمانہ اور تھا۔ میرا پلو ان کے دامن سے بندھ گیا وہی میری دنیا میں سب سے پہلے آئے۔" "منصور بھیا آگئے"

اکرام نے جوشِ جذبات میں چیخ کر کہا۔

ممی بے اختیار ہو کر آگے بڑھ گئیں۔

ڈیڈی اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلے۔

اور راحت اپنی دھیمی مسکراہٹ کی آڑ لے کر دھندلکوں میں کھو گئی۔

پھر کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "راحت!"

وہ چونک گئی۔ اس نے منصور کو دیکھا اور ذرا سا مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو میں نے تمہیں پہچان لیا۔

"تم نے فون کیا اور دیکھو میں پہنچ گیا۔ ڈیڈی بڑے خوفناک قسم کے باس ہیں اور آج چھٹی بھی نہیں تھی کام کا رش بھی تھا۔

"شکریہ۔"

"تم نے بڑی اچھی جگہ کا انتخاب کیا ہے سکون اور تنہائی۔"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کو یہ جگہ پسند آئی۔"

"آؤ ذرا درختوں کے اس جھنڈ کی طرف چلیں۔"

"چلیے!"

"موسم کتنا پیارا ہے۔ یہاں آکر معلوم ہوا ہے کہ بہار آئی ہوئی ہے۔"

"ممی جب کبھی منصور منزل سے آتی ہیں تو کہتی ہیں کہ بہار اگر آئی ہے تو منصور منزل کے چمن پر۔"

"آنٹی ٹھیک کہتی ہیں۔ ہر طرف پھول کھلے ہیں تم کبھی منصور منزل آؤ تو سہی یعنی چاندنی رات میں فوارے کے پاس بیٹھ کر پھولوں کی بہار دیکھنا لیکن آپ ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ یہاں آکر معلوم ہوا کہ بہار آئی ہوئی ہے۔"

منصور نے قہقہہ لگایا۔

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ بہار اگر آئی ہے تو منصور منزل پر لیکن اب یہاں آکر میرا خیال بدل گیا ہے۔"

گفتگو کا ایک موضوع ختم ہوگیا تو راحت اپنے آپ میں ڈوب گئی۔!

منصور بھی سوچ رہا تھا کہ اب کس موضوع پر بات کی جائے۔ وہ ایک معمولی شکل و صورت کا نوجوان تھا جس نے باقاعدہ ٹینس کھیل کر اپنے جسم کو جو فربہی کی طرف مائل تھا قابو میں رکھا ہوا تھا اس کے کپڑے قیمتی تھے لیکن ان کے رنگ اور قطع میں شوخی اور تیزی نہیں تھی اور سوچتے سوچتے اس کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہوگئی تھیں جن کی وجہ سے اس کے چہرے پر یک گونہ وقار پیدا ہوگیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ سبزہ خنک تھا اور سردی کی لہر دھیرے دھیرے ان کے احساس میں رچ رہی تھی۔ یکایک وہ جھنڈ میں داخل ہوگئے۔ یہاں پرندے دھیمی دھیمی آوازیں چہچہا رہے تھے اور سایوں کا طلسم دھوپ کی لرزش میں رچ رہا تھا۔

"راحت! یہاں سبزے پر بیٹھ جائیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم وہ سبزے کے نرم فرش پر بیٹھ چکے تھے۔

"راحت!" منصور نے کہا۔

"کہیے۔"

"کیا کہوں؟ میں کہنے اور نہ کہنے کی منزل پر آکر رک گیا ہوں۔" منصور نے کہا۔

"یہ کونسی منزل ہے؟" راحت نے سوچا۔

"زندگی عجیب گورکھ دھندا ہے میں وہ بات کیوں نہیں کہہ سکتا جو میرے نطق پر دستک دے رہی ہے۔" منصور نے کہا۔

"آپ کے پاس رولز رائیس بھی تو ہے؟" راحت کی آنکھ کے افق پر مسکراہٹ کا ایک ننھا سا تارا اٹھا یا۔

"رولز رائیس ہے تو سہی۔ لیکن" منصور حیران ہوکر اپنی بات ختم نہ کرسکا۔

"پھر آپ کہنے نہ کہنے کی منزل پر کیوں رک گئے"؟ راحت بولی۔

"میں تمہاری بات نہیں کر رہا تھا راحت!

"امی رولز رائیس کی ہر وقت تعریف کرتی رہتی ہیں۔

"ہاں بڑی اچھی کار ہے۔"

"امی کہتی ہیں کہ یہ کار ہوا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔"

منصور کھل کھلا کر ہنسا "میں تو زمین پر رہتا ہوں راحت۔ ہوا میں تیر کر کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔"

"اگر پرستان کوئی خیالی چیز نہ ہوتا تو کوئی لال پری آپ کے محل پر پرستان کا دھوکا کھا جاتی۔"

"بڑا اچھا خیال ہے۔" منصور نے ہنس کر کہا۔

"یہ بھی امی کا خیال ہے۔"

"آنٹی ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" منصور نے پوچھا۔ اس کی پیشانی پر غصّے کا ہلکا سا غبار چھا گیا۔

راحت خاموش رہی۔

"راحت میں صرف منصور ہوں۔ میں رولز رائیس اور پری محل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ آنٹی نے کبھی میری بات بھی کی؟"

"نہیں تو۔"

"پھر تو مجھے اپنی بات آپ کرنی چاہیئے اور میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ میں جو منصور ہوں۔"

راحت پھر بھی خاموش رہی تو منصور نے سوچا۔ "نہیں تو۔۔ میں ابھی اپنی بات اپنی زبان سے کہہ سکنے کے قابل نہیں ہوا۔" اور اپنی خاموشی میں خود گم ہو گیا۔ راحت کے گوشۂ دل سے مسکراہٹ کی لطیف کرن پھوٹی جو ہونٹوں پر آئی تو اس کا سراپا بدل گیا۔ منصور حیران ہو گیا۔ حیرت کی دھند میں اس کا ہاتھ بڑھا اور اس نے راحت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ راحت نے ہاتھ نہ کھینچا حالانکہ اس پر خود سپردگی کی حالت بھی طاری نہ ہوئی تھی تاہم اس کے ہاتھ میں ہلکا سا ارتعاش تھا جیسے سائے لرز رہے ہوں اور بہار کے سائے میں اَن دیکھے پھولوں کی خوشبو کانپ رہی ہو۔

وہ چند لمحوں بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سب ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈیڈی، ممی، اکرام اور اسلام، ممی پکنک لنچ کی ٹوکریاں سامنے رکھ کر بیٹھی تھیں۔ وہ آئے تو ممی بڑے عجیب انداز میں مسکرائیں۔ وہ دائرے میں اپنی اپنی جگہ پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ تو امی نے ٹوکری سے بھنے ہوئے چوزے نکالے۔ انھیں چھری سے کاٹا اور پلیٹوں میں ڈال کر ایک ایک کی طرف پلیٹ بڑھا دی اس کے ساتھ سینڈوچ تھے اور مچھلی کے کباب جو راحت نے تیار کئے تھے۔ اب وہ زیادہ گرم نہیں رہے تھے تاہم منصور نے اس کی بہت تعریف کی۔ راحت بڑی آہستگی سے کھا رہی تھی یہ اس کی عادت تھی کہ وہ بہت کم کھاتی اور آج تک اس کی آنکھوں میں کسی نے بھوک کی چمک نہ دیکھی تھی۔ ممی سارے کنبے میں جدید طرزِ زندگی کی سب سے بڑی مؤید تھیں لیکن کسٹرڈ کے معاملے میں بڑی اولڈ فیشن واقع ہوئی تھیں۔ کسٹرڈ مٹی کی کوری پیالیوں میں جمایا گیا تھا اور ایک کے اوپر الٹی ہوئی دوسری مٹی کی پلیٹ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ تاہم کسٹرڈ بہت ٹھنڈا اور خوب جما ہوا تھا اور اس میں آگ میں پکی ہوئی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

ممی نے کہا "بچو جاؤ کھیلو کودو۔"

ایک ملاح نے قریب آ کر جھجکتے جھجکتے کہا۔ "صاحب کشتی کی سیر ہو گی۔"

"دو کشتیاں لاؤ۔" منصور بولا۔

ملاح بہت خوش ہوا اس نے کہا آپ کنارے پر آئیے۔ میں کشتیاں لے آتا ہوں۔"

منصور نے کہا۔ "اکرام اور اسلام ایک کشتی میں جائیں گے۔ میں اور راحت دوسری میں۔ کیوں آنٹی؟ اور آپ؟"

" ممی میں اور ڈیڈی یہیں آرام کریں گے۔ تم جاؤ۔"

وہ چاروں دریا کی طرف گئے تو ممی نے کہا۔ "دیکھئے تو! راحت اور منصور اکٹھے چلتے ہوئے کتنے بھلے لگ رہے ہیں۔"

" ہاں!" انھوں نے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر سوئے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

" میرا خیال ہے منصور راحت کو پسند کرتا ہے۔"

" اگر ایسا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے منصور پسند ہے۔"

" آپ نے کبھی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان دو چار گھنٹوں میں آپ نے منصور سے ایک بات بھی تو نہیں کی۔"

" میں نے دل ہی دل میں اس کو خوش آمدید تو کہا تھا۔"

" لیکن منہ سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت تھی۔"

" کوئی موقع ہی نہیں آیا۔"

آپ نہیں جانتے منصور کے پیچھے کتنے لوگ پڑے ہیں۔ وہ ہاشمی اور پراچے۔ وہ تو اس کے آگے پیچھے بچھے چلے جاتے ہیں۔ اس دن منصور منزل کی پارٹی میں غزالہ ہاشمی نے منصور کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا وہ اس کے چنگل سے نکلا تو نرگس پراچہ نے اس پر قبضہ جما لیا اور راحت ایک کونے میں کھڑی نجانے کیا سوچتی رہی اس کے ہونٹوں پر میں نے وہ مسکراہٹ بھی دیکھی جو خود بخود منصور کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے یہ سب لاتعلقی اس نے آپ سے ورثے میں پائی ہے۔"

ممی کے لہجے میں خشونت آ گئی تھی۔

اور ڈیڈی نے ایک آہ بھری اور کہا، کیا زمانہ آ گیا ہے۔ وہ پرانے دن ہوتے تو منصور کے ڈیڈی میرے پاس آتے اور کہتے دیکھو مرزا! راحت کو میری بیٹی بنا دو۔

" اچھا ہوا وہ دن گذر گئے۔ اتنا بُرا زمانہ تھا کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا تھا۔ نہ پسند کا سوال نہ محبت کا خیال۔"

" اور اب بھی رولز رائیس کاریں اور منصور منزل کے پری محل سارے سودے طے کرتے ہیں بیگم!"

" نہیں ۔" بیگم بولیں، "تم بہت پرانے خیال کے آدمی ہو۔ اس لئے سوسائٹی میں تم اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔"

مرزا جواب میں مسکرائے۔ ایسی مسکراہٹ جس میں طنز تھی نہ نفرت۔ بے تعلق سی مسکراہٹ۔ بیگم مرزا کے چہرے پر غصے کی شکنیں ابھریں اور آہستہ آہستہ اس دھیمی مسکراہٹ کی ہلکی ہلکی لہروں میں جذب ہو گئیں۔ یہ مسکراہٹ ان کے روئیں روئیں میں رچ کر انھیں عجیب سے کیف میں ڈبو گئی اور انھیں نیند آ گئی۔ "تمہاری مسکراہٹ نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا ورنہ میرے ذہن میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے منصوبے تھے۔ تم یہ افیون جیسی مسکراہٹ کا حربہ لے کر پیدا نہ ہوتے تو میں سوسائٹی کے زینے پر تمہیں بہت اونچا اٹھا لے جاتی۔ رولز رائیس کاریں۔ پری محل۔"

دریا کے پانی پر دھوپ کی ساکن چادر بچھی ہوئی تھی اور اس میں ڈھلے ڈھلے آسمان کی بے داغ نیلاہٹیں جھلک رہی تھیں اور پانی کی سطح سے منعکس ہوتی ہوئی تیز شعاعوں میں حدت نہیں تھی بہار کی چمک دمک تھی راحت نے گاگلز پہن لئے تھے اور منظر پر نیلاہٹ چھا گئی تھی اور چمک میں ایک عجیب سی نرمی آ گئی تھی۔

منصور خود کشتی چلا رہا تھا۔ اس نے قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں چپوؤں کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں چند لمحوں بعد وہ ایک ٹاپو پر پہنچ گئے تھے یہ ایک ننھا سا عارضی جزیرہ تھا جو برسات میں یقیناً پانی کی لہروں میں ڈوب کر مٹ جانے والا تھا لیکن اب یہ ایک حقیقت تھا۔ خواب کی طرح اٹل حقیقت۔

منصور نے کنارے کے ساتھ کشتی لگا دی تھی اس نے کہا تھا راحت اترو! راحت نے کنارے پر قدم رکھا تو کائنات کا اسرار بدل گیا تھا۔ ٹاپو میں کائی کے پودے تھے اور بہت گھنے بھی تھے البتہ ان میں تازہ تازہ شباب کی لپک تھی لیکن یہ پودے قد آور بھی نہیں تھے ان کے نیچے بھربھری مٹی تھی جس میں ریت ملی تھی اور ریت میں نمی تھی کچھ بیلیں تھیں جو کائی کے پودوں سے لپٹی ہوئی تھیں اور ان پر ننھے ننھے پھول لگے ہوئے تھے اور پھولوں کی کثرت بھی نہیں تھی اکا دکا پھول جو اپنے ماحول سے الگ الگ تھے ٹاپو پر قدم رکھتے ہی راحت کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی دنیا سے کٹ گئی ہو اور نئی دنیا میں وہ اکیلی بھی نہ ہو۔ یہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ کوئی چڑیا بھی تو چوں چوں نہیں کر رہی تھی اور دور کے لوگ ہیولے بن گئے تھے۔ خوابوں کے ہیولے۔ راحت نے سینڈل اتار دیئے۔ گیلی ریت نے اس کے تلوؤں میں گدگدی کی اور اس کی آنکھیں مسکرا اٹھیں اور مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی خواب آلود چمک میں کھو گئی تھی۔ اس نے گاگلز اتار دیئے تو بہار کی چمک لہروں کا عکس لے کر لپکتی ہوئی آئی اور ٹاپو پر دھلے دھلے آسمان کی نیلاہٹ اتر آئی اور کائی کی سبزیوں میں گھل مل کر ایک نئے رنگ کی تخلیق کر گئی یہ نیا رنگ جس نے اس کے احساس سے جنم لیا اور تصور کے کینوس پر غیر مرئی تصویروں کے سانچے میں ڈھل گیا۔

پھر پھول پر سے ایک تتلی اڑی۔

وہ تتلی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگی۔ تتلی اڑی اور ٹاپو کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی اور پانی کی چمکتی ہوئی لکیر حائل ہوئی تو وہ لوٹ آئی اور اس کے پاس سے گزر کر ایک پھول پر بیٹھ کر پر جھٹکنے لگی۔ رنگ کے دھبے دھوپ میں اڑنے لگے راحت بڑی آہستگی سے وہاں پہنچی تو تتلی لپک کر اونچا اٹھ گئی۔ وہ پھر اس کے پیچھے بھاگی اور جب اس کے قریب پہنچی تو پانی کی ساکن دھوپ نے ان دونوں کا راستہ روک لیا۔ آنکھ مچولی کا یہ کھیل بہت مزیدار تھا۔ ان کی دنیا کتنی چھوٹی سی تھی، ہر طرف پانی کی چادر حائل تھی اور اس دنیا کے باسی صرف دو تھے، وہ، اور رنگ کا ایک چھینٹا جو دفور زندگی سے متحرک رہا تھا ایک بار اس کا ہاتھ رنگ کے چھینٹے تک پہنچ چکا تھا کہ پھر پانی کی لہر حائل ہو گئی اور تتلی یکدم مڑی۔ اس نے اس کے گرد ایک دو چکر کاٹے۔ راحت نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور تتلی اس کے ہاتھ کے گلاب پر آ بیٹھی اور پر جھٹکنے لگی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ منصور جو ٹاپو کے وسط میں کھڑا اس تماشے کو دیکھ رہا تھا اس قہقہے پر دم بخود رہ گیا۔ اس قہقہے میں ایک نرالا نغمہ تھا۔ یہ نغمہ اس نے پہلے نہیں سنا تھا جیسے ساز کے تار پہلی بار جھنجھنائے ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ راحت کے قریب پہنچا اس نے چاہا کہ راحت کے کان میں وہ بات کہہ دے جو اس کے ساز دل میں مقید ہو کر تھرتھرا رہی تھی لیکن راحت اپنے قہقہے کی بازگشت میں گم تھی اور قہقہے کا نغمہ ہر طرف بکھرا ہوا تھا اور دیر کا ایک منصور کو یوں محسوس ہوا کہ وہ اس ماحول میں اجنبی ہے، تیسرا آدمی اور اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس ننھی سی دنیا کا نغمہ منتشر کر دے اور یہ خواب چکنا چور ہو جائے۔

وہ چپکے سے پیچھے ہٹ آیا اور کشتی کے پاس راحت کا انتظار کرنے لگا اکرام اور اسلام کشتی میں بیٹھے ہوئے جزیرے تک آ پہنچے۔

اکرام نے آواز دی "راحت باجی! آؤ چلیں۔"

راحت چونکی اور لرزی۔ تتلی پھر سے اڑ گئی۔

اور وہ کشتی کی طرف لوٹ آئی۔

اس کے ہونٹوں پر بے تعلق سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔

لیکن اس کا چہرہ تمتا رہا تھا۔

ممی اور ڈیڈی ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔

ممی کے ہاتھوں میں پھلوں کی ڈکری تھی۔

وہ کشتیوں سے اتر کر سیدھے ان کے پاس پہنچے۔ راحت کے چہرے پر جھلتی ہوئی ... دیکھ کر ممی بہت خوش ہوئیں ممی نے سب کو پھل پیش کئے۔

ڈرائیور سامان لپیٹ چکا تھا۔

پس خوردے کے پاس ایک کتا بیٹھا ہڈیاں چچوڑ رہا تھا اور ایک طرف ایک ٹھگنا سا لڑکا تھا اس کے سامنے مٹی کی پرچوں کا ڈھیر لگا تھا اور مرغ کے سینے اور ٹانگوں کی ہڈیاں تھیں جن پر ابھی تک گوشت کے ریزے چپکے ہوئے تھے اس کے ہاتھ میں مٹی کی پرچ تھی اور اس میں سے وہ کرید کرید کر کسٹرڈ نکال رہا تھا اور وہ بڑا خوش تھا کیوں کہ وہ اتنے شاہانہ دسترخوان پر اکیلا بیٹھا تھا اس کا رنگ کوئلے کی طرح سیاہ تھا اس کی لال لال آنکھوں میں بھوک کی حرص آلود چمک بھی نہیں تھی ایک عجیب سی سیرچشمی۔ کیوں کہ وہ اس سب مال پر بلا شرکتِ غیرے قابض تھا۔

اور کتا اپنے حصے پر مطمئن تھا۔

دونوں میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

راحت نے یہ منظر دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور زردی جھلک اٹھی۔

ڈیڈی یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے لیکن راحت نے فوراً ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

ممی نے چہکتے ہوئے کہا، "بچو میرا خیال ہے کہ تم نے پکنک سے خوب لطف اٹھایا ہوگا۔

"ممی شکریہ ..." اکرام اور اسلام پھل کھاتے ہوئے بولے۔

"منصور بیٹا تم؟" ممی نے پوچھا۔

"میں خوش ہوں آنٹی!"

"وہ راحت! راحت تم؟ .." ممی نے پوچھا۔

"ممی! وہ ٹاپو بہت خوبصورت تھا۔ راحت نے پرسکون لہجے میں کہا، منصور نے اس کی آواز میں کچھ تبدیلی سی محسوس کی جیسے کسی جھرنے کا رستا ہوا پانی ایک لمحے کے لئے رک گیا ہو۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔ منصور کی رولز رائیس میں راحت اور ڈیڈی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے ممی نے اصرار کر کے انھیں رولز رائیس میں بیٹھنے پر مجبور کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی زمین پر چلتی ہوئی رولز رائیس میں بیٹھ کر آسمان پر تیرنے کا لطف اٹھالیں۔

"راحت بیٹی!" ڈیڈی نے حسب معمول اسے محبت آمیز لہجے میں پکارا۔

"ڈیڈی!"

"کشتی کی سیر خوب رہی؟"

"وہ ٹاپو ایک ننھی سی دنیا تھا، میں بڑی خوش تھی اور میرے ہاتھ پر وہ تتلی آکر بیٹھ گئی تھی۔ ڈیڈی جیسے رنگ کا جھنیا لرزتا کانپتا ہوا۔"

"اور تم وہاں اکیلی تھیں؟"

"نہیں ڈیڈی!"

"نہیں ..." ڈیڈی یہ کہہ کر سوچ میں گم ہو گئے۔

"وہ تتلی بھی تو میرے ساتھ تھی ..."

"اور منصور؟" ڈیڈی نے بے خیالی میں پوچھا اور پھر انھیں اپنی بھول پر افسوس ہوا۔

"منصور! — ہاں — نہیں تو۔"

اور ڈیڈی نے دیکھا کہ راحت کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے ہیں اور اس کی آواز میں آنسو کی ایک بوند کپکپا رہی ہے۔

"راحت!" ڈیڈی دھیمے سے بولے "تم اپنی ممی کی باتوں کا کوئی خیال نہ کرو۔ اپنی خوشیوں کو سامنے رکھو۔ ہماری طرف سے کوئی مجبوری نہیں۔"

"نہیں ڈیڈی۔ یہ بات نہیں تھی" راحت نے کہا۔

آنسو اس کی پلکوں کو بھگو چکے تھے۔

"پھر کیا بات تھی؟" ڈیڈی نے درد آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ڈیڈی! شاید میں کسی بڑی خوشی کو برداشت کرنے کی اہل نہیں۔"

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتی ہو راحت!"

انھوں نے کہا اور ان کی نگاہوں کے سامنے سارا منظر پھر گیا جب انھوں نے راحت کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھا تھا وہ کالا بھجنگ لڑکا۔ وہ چچوڑی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر اور انھوں نے سوچا۔

"یہ دنیا کتنی بدصورت ہے اور کتنی ظالم کہ کسی کی مسرت کی تکمیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

عفت موہانی — الشجاع۔ کراچی

انتظار

کھپریل سے ڈھکے ہوئے چھوٹے سے گھر میں اگر شفیع نہ ہوتا تو گھر قبرستان ہوتا۔ دادی بی کے بوڑھے دماغ میں اس کے قہقہے ہتھوڑے بن کر بجتے۔ دعائیں کرتے کرتے تھک گئیں کہ کسی کی ڈھائی گھڑی کی آئی ہو تو اسے آجائے۔ وہ گھڑونچی کے پاس ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر حصیر بچھائے آنچل کا تکیہ بنا کر لیٹ جاتیں اور اس وقت تک بڑبڑاتی رہتیں جب تک کہ نیند کی جھپکی انھیں مدہوش نہ کر دیتی۔

اور جب سے بھابی کی بچی اسے کھیلنے کو ملی تھی وہ اور بھی دیوانہ ہو رہا تھا دونوں کی عمروں میں ۲۰ سال کا طویل فاصلہ تھا۔ روحی پانچ برس کی اور شفیع پچیسویں برس کو پھلانگ رہا تھا۔ لیکن بڑے بھیا کی اندھی محبت اور بھابی کی بے جا ممتا نے اسے بچہ بنا رکھا تھا۔ چچا جب تک زندہ رہے کہہ کہہ کر ہار گئے کہ کچھ تو پڑھ لکھ لے۔ زمینداری کب کی ختم ہو چکی تھی وہ نوابیت جبکہ مسند پر بیٹھ کر گاؤ تکیہ لگا کر اپنے ہاتھ سے نوالہ توڑنا بھی عار تھا خواب و خیال ہو چکی تھی اب تو اپنے ہاتھوں روز کنواں کھودنا اور حلق تر کرنا تھا مگر شفیع کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ببول کے جھاڑ جھنکاڑ درخت کی طرح بے تحاشہ بڑھتا گیا جس کی چھایا نہ ٹھنڈک۔ صرف کانٹے ہی کانٹے، بھائی کے بل پر کھاتا اور سانڈ کی طرح اینڈتا پھرتا۔ ایک عجیب سی خود فراموش زندگی گزرتی چلی گئی۔ بس حال میں مگن۔ نہ ماضی کی خلش، نہ مستقبل کا اندیشہ! محدود سی دنیا تھی۔ بھابی کی روحی تھی اور ہمسائے کی زاہدہ! وہ بھابی کی محبت میں کھنچی چلی آتی تھی۔ دبلی پتلی اٹھارہ انیس سال کی خاموش سی لڑکی جس کے ماں باپ کبھی کے ختم ہو چکے تھے۔ بھابی اس سے بہت پیار کرتیں تھیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں جہاں کا آنگن کچا تھا۔ ایک طرف منڈھے پر چنبیلی کی گھنی بیل چھائی ہوئی تھی جس کے خنک سائے میں کورے گھڑے رکھے تھے سامنے کنواں تھا جس کے رہٹ کی گھوں گھوں دنیا بھر کے سازوں سے بڑھ کر موسیقی آفریں لگتی تھی۔ یہاں اسے نہ صرف ماں کا پیار ملا۔ بلکہ اس کی کنواری دنیا اور اچھوتے خوابوں نئے نئے قوس و قزح میں گھل مل گئے۔ اس کی مسکراہٹ میں مفہوم پوشیدہ ہونے لگے! شفیع اسے بھی ستانے چڑانے سے باز نہ آیا۔ دادی تو یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر لرزا کرتیں۔ مگر بھیا نے کبھی ان کی واہی تباہی پر کان نہ دھرا جب وہ زچ ہو جاتیں تو خود ہی پتلی سی قمچی لے کر اٹھتیں اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتیں! روز سب کے سامنے پٹنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ جس دن نہ پٹتا۔ سوچتا ضرور دادی خفا ہو گئیں ہیں۔ جان بوجھ کر ان کی بوئی ہوئی کیاری کے قریب بیٹھ کر ننھے منے ہرے ہرے مرچ اور دھنیے کی پتی چننے لگتا۔ دادی بی جو ہری چٹنی اور گھی پڑی گرم گرم کھچڑی کے خیال سے منہ ہی منہ میں رال گھونٹا کرتیں۔ پھر جوتی اتار کر پل پڑتی تھیں اچھی طرح پٹ چکنے کے بعد وہ دادی کے ہاتھ سہلا کر پوچھتا۔

"دادی۔ آپ کی چٹنی پیس دوں؟"

"میری چٹنی کیا پیسے گا نامراد۔ میں تیرا بھرتہ بنا کر رکھ دوں گی!"

"ارے، اپنے ایمان سے۔ دادی ماں۔ اتنے دنوں سے سمجھ نہیں کھایا بھتی آج تو فرور دیجئے!"

"چل۔ بیٹھ ادھر۔"

مگر اپنے تمام تیکھے پن سمیت وہ بڑے بھیا کے دوست ٹھیکیدار صاحب کو پسند آگئی تو وہ بکا رگ سکتے میں رہ گئے۔ ان کے والد اچھا خاصا قرض بھیا پر چھوڑ گئے تھے جو اب سود در سود سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ اصل مع سود میں ٹھیکیدار صاحب نے شفیع کو دھر لیا۔

ان کی بیوہ بہن مدت سے ان کی چھاتی پر مونگ دل رہی تھی روز نند بھاوج میں مہابھارت ٹھن جاتی۔ اگر بیوی سے کچھ کہتے تو میکے جانے کی دھمکی دیتی، بہن کو برا بھلا کہتے تو لوگوں میں ناک نہ رہتی۔ سبھی کہتے۔ بیوہ بہن کو خادمہ سے بدتر رکھ چھوڑا ہے۔ چپکے چپکے ایک معقول آدمی کو وہ دیکھ رہے تھے۔ اچھے برے ٹھیکے لیتے لیتے وہ کھرے کھوٹے کی خاصی پہچان رکھتے تھے پہلی نظر میں بھانپ گئے کہ رفیع صاحب کے چھوٹے بھائی شفیع میاں کے سوا کوئی دوسرا قربانی کی اس صلیب پر نہیں چڑھ سکتا۔ وہ ان پڑھ ہے۔ جاہل ہے۔ کانوں کا کچا، دل کا معصوم! ان کی زبان دراز اور تیز مزاج بہن کو اس سے اچھا شوہر نہیں مل سکتا۔ اور پھر ایک دن انھوں نے رفیع صاحب سے اپنا عندیہ ظاہر کر دیا، ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جوڑے گھوڑے کی رقم کے عیوض وہ قرضے کی دس ہزار کی رقم معاف کر دیں گے چاہیں تو پکا کاغذ لکھوا لیں ان کے لئے دس ہزار کے بدلے ایک جھگڑالو بہن سے نجات حاصل کر کے گھر کے سکون کی جنت خریدنا کچھ ایسا مشکل کام نہ تھا۔ مگر بڑے بھیا کے لئے اتنی بڑی رقم میں اپنے بھولے بھالے معصوم بھائی کو بیچنا پسند نہ تھا ان کی آنکھوں میں شفیع کی ہنستی ہوئی شکل پھر گئی۔ کیا ان کے باپ کا کیا ہوا ناکردہ کار بیٹے کے آگے آئے گا؟ دس ہزار۔ جو ایک نادان اور بے خبر زندگی کی قیمت بن گئے تھے۔

بھابی تو دل تھام کر رہ گئیں۔ لرزتی آواز میں مشورہ دیا۔

"آپ میرے زیور بیچ دیجئے۔"

"وہ تو صرف سود میں پٹ جائیں گے۔ باجرہ۔ کچھ اور سوچو!"

"کیا سوچیں؟" بھابی کے سینے پر بوجھ سا آگرا۔ انھوں نے شفیع کو دیور سمجھ کر نہیں اپنا بچہ سمجھ کر پالا تھا جب وہ سسرال آئی تھیں شفیع بمشکل آٹھ برس کا رہا ہوگا۔ اور اب بھی ان کی نظروں میں وہ اتنا ہی بچہ تھا جو اپنی ذرا ذرا سی بات چلنے سکھ کی۔ بھابی سے کہتا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس کے لئے کیا کریں؟ جو ان تمام باتوں سے بے خبر ننھی روحی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"چاچا۔ آپ کی شادی ہو رہی ہے!" روحی بولی۔ وہ کچھ اپنے ماں باپ سے سن گن لے بھاگی تھی۔

"کل ہی تو ہوئی تھی۔ تمہاری گڑیا کے ساتھ۔" شفیع نے کہا۔

"نہیں چاچا۔ سچ مچ کی شادی" روحی ہنس پڑی۔ "ابا کہہ رہے تھے۔"

"اچھا۔؟" اس نے بھی ہنس کر ٹال دیا۔

دادی اماں سامنے ہی بیٹھی بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ آج ان کے چہرے پر جھلاہٹ نہیں تھی جھریوں سے ڈھکی جھکی آنکھیں رنج کے ننھے منے سانس لے رہی تھیں اور یہ تو بے حد عجیب بات تھی گھنٹہ بھر سے لکڑیوں کے تختے ٹھونک پیٹ کر روحی کی بلی کے بچوں کا گھر بنا رہا تھا دادی اماں نے ایک لفظ نہ کہا تھا پھر وہ جان بوجھ کر مار کھانے کے لئے زور زور سے گانے لگا۔

دو ہنس پیار کی آگ میں جل گئے اک چنبیلی کے منڈوے تلے

اس نے قصداً زاہدہ کی طرف دیکھا جو منڈوے تلے بیٹھی روحی کا فراک سی رہی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو دادی بی اس کچھ لفظ پہلے ماربار وہ موا کر دیتیں۔ مگر اب تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں خاموش بیٹھی پنکھا ہلاتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرتی رہیں۔

"دادی اتنی خفا ہیں کہ مارنے کی بھی روادار نہیں کیا کیا ہے میں نے؟" وہ ہاتھ روک کر سوچ میں پڑ گیا۔

دس ہزار ۔ ایک جان کی قیمت ؟ ۔ اور بھابی کے دل میں زہر غم چپکے چپکے سرایت کرتا رہا ۔ وہ لپٹے پہلے یاد آئے جن کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ سلوک کیا تھا ۔ مگر اب کوئی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا کس کا بوجھ کون ڈھوتا ہے ۔

شام کو تھکے ہارے بھیا کارخانے سے لوٹے اور اپنے کمرے میں جاکر پڑ گئے ۔

بھابی لپکیں ۔ شاید کچھ آس بندھی ہو ۔ مگر انھوں نے رندھے ہوئے گلے سے صرف اتنا کہا ۔

" کچھ نہیں ہو سکتا ۔ باجرہ اور یکمشت دس ہزار کون دے گا ۔ ؟ "

" یہ بیٹھے بٹھائے ٹھیکیدار صاحب کو کیا سوجھی ؟ " بھابی بولیں " کیا وہ روپے کے بدلے میں آدمی خریدیں گے ۔ ؟ "

" احسان کریں گے ۔ " بڑے بھیا کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ جل اٹھی ۔ " ورنہ وہ دعویٰ کردیں تو جیل بھی ہو سکتی ہے " اب تک صبر کیا بہت کیا

" یہ کہیے کہ بیوہ بہن کو ہمارے یہاں جھونکنا چاہتے ہیں ۔ ! " بھابی بولیں ۔

دونوں دیر تک دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے ۔ مگر کچھ بن نہ آئی ۔ کرنا وہی تھا جو ٹھیکیدار صاحب کی مرضی تھی ادائیگی یا پھر شادی ۔ !

کب تک بات چھپتی ۔ شفیع کے کانوں میں بھی پڑ ہی گئی ۔

" کیا بات ہے ؟ کچھ مجھ سے بھی کہیے نا ۔ " وہ ایک ایک کی صورت تک رہا تھا ۔ رات کے کھانے پر سب اکٹھا تھے پوچھنے کا اچھا موقع تھا ۔ بڑے بھیا میں کھسک ہمت نہیں تھی جلدی سے کھانا ختم کیا اور اٹھ کر چلے گئے ۔

" بولیے نا دادی اماں " وہ بچوں کی طرح ٹھنکا ۔

" کیا بولوں بیٹا ۔ بولنے کی بات ہی کون سی ہے ؟ " دادی نے آہ بھر کر ایسے لہجے میں کہا کہ شفیع آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھنے لگا ۔ یہ کیا یہ دادی کے منہ سے نکلا تھا جنھوں نے آج تک سوائے نامراد اور ناشاد کی بات نہ کی تھی کوئی بہت سنجیدہ مسئلہ تھا پھر بھیا کے باہر جاتے ہی وہ بھابی کے پیچھے پڑ گیا ۔ کوئی چھپانے کی بات تو تھی نہیں ۔ انھیں رکے دبے لہجے میں سب کچھ کہنا ہی پڑا ۔ بھابی دیکھ رہی تھیں شعلے کی طرح فروزاں چہرہ آن کی آن میں راکھ ہو گیا ۔ ہونٹوں پر خشکی چھا گئی اور آنکھوں کے حلقوں میں پسینہ پھوٹ پڑا ۔

" تم کیا سوچنے لگے شفو ! "

" کچھ نہیں ۔ بھابی " اس نے بے خیالی میں رومی کو گود سے اتار دیا اور اٹھ کر چلا گیا وہ اس کے پیچھے ہی چل گئیں ۔ پانچویں چھٹی شب کی چاندنی ہلکے ہلکے بادلوں سے چھن رہی تھی ملگجی سی روشنی میں وہ امرود کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا ۔

" شفو ! " بھابی نے آواز دی ۔

" جی ۔ ؟ " ان کے دل پر گھونسہ پڑا ۔ وہ آواز جیسے آنسوؤں میں ڈوب کر نکلی ہو ۔

" کیا سوچ رہے تھے ؟ " انھوں نے اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا اور یک بیک ان کا ہاتھ اس کے بھیگے ہوئے گال سے ٹکرایا ۔ انھیں اپنے ہاتھ کا آشنا پایا اس کے تو دریا ہی بہہ گئے بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا ۔ بھابی سناٹے میں رہ گئیں یہ پتہ نہ تھا کہ اللہ کا شریر لڑکا اس قدر متاثر ہو جائے گا ۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھیں ۔

" بھابی ۔ " روتی ہوئی آواز ۔ روتا ہوا لہجہ " وہ درخت جو کسی چمن میں نہیں اگتا جس پر بارش نہیں برستی جس میں پھل نہیں لگتے وہ تو ایندھن بنتا ہے نا ؟ ! "

" کیسی بہکی بہکی باتیں سوچ رہے ہو ؟ "

" میں سوچتا تھا یونہی دادی اماں سے لاتے ۔ لڑتے کھیلتے ۔ زندگی گزر جائے گی پتہ نہ تھا میری زندگی میں ایک اہم موڑ بھی

شادی کی بات تو میں نے سوچی بھی نہیں تھی۔ بھابی مجھے زاہدہ یاد آتی ہے وہ کیا کہے گی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا! وہ مجھے جھوٹا بنائے گی! ؟"۔

زاہدہ۔ بھابی کو معصوم سی خاموش لڑکی یاد آئی جس کی آنکھوں میں بہت سے مطالبے جاگ اٹھے تھے۔ جو آنکھوں کی زبان میں بہت کچھ کہتی تھی وہ زاہدہ۔

" بھابی میں بھاگ جاؤں گا۔ میرا مقصد ہی کیا ہے؟ نہ پڑھا لکھا نہ نوکر چاکر ہاں آپ سب کو بھی مصیبت میں ڈالتا ہوں۔ میں مر کیوں نہیں جاتا"

اپنے بھائی کو مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے؟"

نہیں بھابی۔ اس نے گہری سانس لے کر سر درخت سے ٹیک دیا۔ بھائی جان کی آن میری جان سے کہیں بڑھ کر ہے اپنی مرحوم ماں کی قسم۔ میں ان کی مرضی سے انکار نہیں کروں گا۔ پھر یہ قرض کیسے ادا ہوگا۔؟!۔"

یک بیک روحی آکر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے اسے گود میں اٹھا لیا اور پل بھر کے لئے اپنی پریشانیاں بھول گیا۔

بڑے بھیا سے اس کا اضطراب پوشیدہ نہ تھا مگر وہ کچھ کہنے کی اپنے میں ہمت نہیں پا رہے تھے وہ چاہتے تھے کہ خودکشی کر لیں سب سے آسان اور سہل ترکیب۔ ان کے بعد بھلا بیوہ عورت اور بے روزگار لڑکے سے کون اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ مگر خیال جتنا آسان تھا عمل اتنا ہی مشکل۔ پھر ہاجرہ کیا کرے گی! ننھی روحی کا کیا ہوگا؟۔ وہ ان کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا واحد مرکز تھی۔ ان کی آنکھوں کی روشنی اور گھر بھر کی لاڈلی۔

" کیا کروں، میرے اللہ۔۔ انھیں ساری ساری رات نیند نہ آتی پہروں کروٹ بدلتے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے۔ شفیع بھی کسی نامعلوم آگ میں جل رہا ہے۔ وہ بھی بے تاب ہے۔ بے خواب ہے!؟

لیکن کسی کی سوچ کا کوئی حل نہ نکلا۔ انھیں دل پر پتھر رکھ کر وہ اٹل فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ جو شفیع کا مقدر بن چکا تھا۔ اس کے قہقہے کھو گئے اس کی اصل روح مر چکی تھی جو اس کو بچپن کی اچپلاہٹ پر اکسا سکتی۔ سارے گھر پر اداسی کا خول منڈھ گیا۔ بھابی دھندلی آنکھوں سے دلہن کے کپڑے سیتی رہتیں۔ دادی کی بے نور آنکھوں کا رہا سہا نور بھی چھن گیا بڑے بھیا دل کے درد کو چھپائے ہوئے تھے۔!

اور شفیع مضمحل اور اداس بیٹھا سوچا کرتا۔ غم کے اندھیروں میں رہ رہ کر زاہدہ کی معصوم اور بھولی بھالی شکل ابھرتی۔ اس کے ہونٹوں پر پیڑیاں بندھی ہوں گی۔ گہری گہری کالی کالی آنکھوں میں یوں آنسو چمک رہے ہوں گے جیسے ڈر ہو کہ آنکھوں سے نکل کر وہ اپنی آب سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے!۔

زاہدہ۔ زاہدہ۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آتے گئے وہ بے چین ہوتا گیا اس کے احساس پر آموں کے گھنے باغ کی مدھر خوشبو چھا گئی وہ دن یاد آئے۔ وہ راتیں یاد آئیں۔ وہ بے سروپا باتیں۔ جو گھنٹوں دونوں نے باغ کے گھنے کنج میں چھپ چھپ کر کی تھیں جو بے تکی تھیں لیکن اب جن کی یاد کچوکے لگا رہی تھی!۔

" تم بڑے نٹ کھٹ ہو۔ بھول جاؤ گے یہ سب کچھ!"

اور اب جو تم نشوے بہا رہی ہو۔ کل کلاں جب ہاتھوں میں مہندی رچے گی۔ دروازے پر شہنائی گونج اٹھے گی۔ لال لال اوڑھنی میں گورا گورا چہرہ چھپائے دولہا کے ساتھ چل دوگی۔ تب بے چارہ شفو بھول کر بھی یاد نہ آئے گا۔" وہ ہنس ہنس کر اس کا جی جلاتا۔

" تم تو یہی سمجھتے ہو؟"

" ہاں۔! میں تو یہی سمجھتا ہوں۔! آج کل کی چھوکریاں پیار نہیں کرتیں پیار کا مذاق اڑاتی ہیں تم بھی ویسی ہی ہوگی۔!"

" امتحان لوگے میرا۔" زاہدہ کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی چمک تھی۔!

"کیسا امتحان؟"

"محبت کا۔!"

"نہیں۔ زاہدہ۔ میں مذاق کر رہا تھا مجھے یقین ہے۔ تم مجھ سے ۔۔۔ رے دل میں جھانکو تو وہاں سوائے تمہارے پیار کے اور کچھ نہ ملے گا۔!"

"کبھی اپنی محبت کو بھلا تو نہ دوگے!"

"کبھی نہیں!"

اسے یقین تھا کہ ایک دن بھابی اور دادی زاہدہ کو اس کے گھر لے آئیں گی۔ وہ کسک جو اس کے پیار کی تھی آگ بن کر رگ رگ میں بھر گئی تھی دل ایک رستا ہوا ناسور بن کر رہ گیا تھا! زاہدہ اب بھی آموں کے باغ میں آتی ہوگی گھنے کنج کی چھاؤں میں کھڑی روتی روتی سی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی راہ تکتی ہوگی۔

زاہدہ زاہدہ۔ مجھے بھول جاؤ۔ دنیا بھر کی بازیوں کے ساتھ ساتھ میں نے تمہاری محبت کی بازی بھی ہار دی اور پھر کبھی زاہدہ اس کے گھر نہیں آئی۔

جس دن وہ دولھا بنا اور بڑے بھیا کے آنسوؤں کا سہرا باندھے گھوڑے پر سوار ہوا اس کا دل چلا چلا کر رو رہا تھا آنکھیں خشک اور ویران تھیں۔ جیسے کسی جنگل میں آگ لگ جائے۔ اس کی زندگی میں بھی کسی نے آگ لگا دی تھی۔

میرے بچے ... میرے لال۔ سہرا باندھے۔ مجبور و بے بس سا جب وہ دادی اماں کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگانے جھکا تو وہ اسے سوکھے مارے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگیں۔ اگر شفیع انھیں سنبھال نہ لیتا تو وہ کھڑے قد سے گر پڑتیں!۔

رات گئے اس کی دلھن اس کے گھر آگئی! شفیع سہرا اتار کر بھابی کے کمرے میں آبیٹھا وہ حیران تھا۔ یہ بھی روحی کا ایک کھیل تھا یا وہ سچ مچ اپنی دلھن بیاہ کر لایا تھا۔

بڑے بھیا تن تنہا ٹہل رہے تھے دل کا درد قابو سے باہر ہو رہا تھا اگر یہ قدم نہ اٹھاتے تو پھر کیا کرتے! انھوں نے دھکتی ہوئی کنپٹیاں جکڑ لیں اور سر دیوار سے لگا دیا آہستہ آہستہ ان پر غشی سی طاری ہوتی گئی اور وہ وہیں دیوار کی جڑ ہی میں بیٹھ گئے۔

جب بہت دیر ہوگئی تو بھابی نے آہستہ سے کہا۔

جاؤ شفو۔ تمہاری دلھن منتظر ہوں گی۔

دلھن؟ اسے عجیب سا لگا اور وہ سکتہ زدہ سا خلا میں گھورتا رہ گیا۔

بھابی یہ بتایئے۔ میں جا کر ان سے کہوں گا کیا؟ ان کے لئے میں پہلا مرد تو نہیں؟!

بھابی کے جسم میں سردی سی دوڑ گئی۔! انھیں خاموش دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑا اور روحی کے گال پر تھپکی دے کر کمرے سے نکلا چلا گیا۔

رفتہ رفتہ گھر کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ چھوٹی بہو کو اپنے چہرے کا غرور تھا یہ احساس بھی تھا کہ وہ اس خاندان پر ایک احسان بن کر نازل ہوئی تھی! جب جوہر کھلے تو زبان بھی کھل گئی!۔ پہلے پہل اپنی چکنی چپڑی باتوں سے شفیع کو شیشے میں اتارا۔ پھر سارے گھر کو چھاپ بیٹھی۔ روحی کو دودھ کی مکھی کی طرح چچا کے دل سے نکال پھینکا! بڑے بھیا کا ادب احترام رخصت ہوا۔ بھابی کا اقتدار گیا۔ دادی کس گنتی شمار میں تھیں۔ بھابی نے تو سوچا تھا کہ آہو جیسے رم خوردہ ہے پیروں میں زنجیروں کی گرانباری محسوس کرے گی تو جھیکے گی۔ مگر وہ تو ڈکٹیٹر بن گئی تھی۔!

شفیع کو اب اپنی ذمہ داری کا احساس ہو رہا تھا نجانے کہاں لیبر شپ اختیار کر رکھی تھی دن کا نکلا شام ڈھلے گھر پہونچا۔ اور اس کی غیر موجودگی

"میں کیا کیا ہوتا تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ وہ تو جانے بھیا کو کیوں اس وقت بچپن والی کر کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا۔ اس دل کے دورے نے مستقل عارضہ کی صورت اختیار کر لی اور وہ بالکل ہی بیٹھ گئے!۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی!۔ لیکن دل کو آرام نہیں تو جسم کو آرام کہاں؟ تشفیع کا مرجھایا چہرہ۔ ماجرہ کی گھٹن۔ اور بھولی بہو کی تیز مزاجی پر کھلتے رہے۔

تشفیع پلنگ کی پٹی پر آ بیٹھا۔

بھیا۔ ایسی کون سی بات ہے جو آپ یوں پریشان ہو رہے ہیں۔

" شفو۔ تم۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

" بھیا۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ کو کچھ بھی نہ سوچنا چاہیئے۔ کیا فائدہ اپنی جان کھونے سے میں نوکری کر رہا ہوں اب آپ کو کارخانے نہ جانے دوں گا۔"

" اچھا۔!" انھوں نے بظاہر اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔

" جاؤ۔ جا کر بھیا کے پاس بیٹھو۔!" اس نے اپنے کمرے میں آکر صفیہ سے کہا۔

" کیوں؟" اس نے تیوری چڑھائی۔

ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

میں کون سی مسیحا ہوں جو میرے جاتے ہی وہ اچھے ہو جائیں گے ویسے ہی مجھے دل کے بیماروں سے وحشت ہوتی ہے!"

" صفیہ!" وہ غرّایا۔

" نہیں جاؤں گی۔ جو بنے کر لو۔" صفیہ نے کہا اور پیٹھ موڑ کر کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی!۔

" چاچا" روحی آکر دروازے پر کھڑی ہو گئی!" امی بلا رہی ہیں کہتی ہیں بابا کے لئے پھل لے آیئے!"

" اچھا۔ بیٹی۔ میں ابھی آیا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

" بس ایک چاچا رہ گئے ہیں۔" صفیہ تڑپ کر مڑی۔ جا کر کہہ دو اپنی امی سے ایک نوکر رکھیں!"

" ہوش میں رہو ہوش میں۔!" تشفیع کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے روحی کو گود میں اٹھایا اور باہر نکلا۔ بھابی اس کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ انھوں نے سب کچھ سنا ہو گا۔ وہ ساری جان سے لرز گیا!!

بھابی۔!" اس کے لب کانپے۔

" ننھے کی ماں پھل لینے گئی۔" وہ بولیں۔ میں نے اسی کو بھیج دیا۔ شاید تمھیں کچھ کام ہو۔!"

روحی مچل کر گود سے اتر گئی۔ بھابی اس کی انگلی تھامے نکل چلی گئیں۔

دادی کو صفیہ کی شکل سے بیر تھا! پہلے شوہر کو بھگت چکی ہے جانے کیا گھر کا گھر وایا کرے ہر گھڑی کھری سنانے سے باز نہ آتیں۔ مگر یہ صفیہ کا اپنا گھر تھا۔ وہ کیوں چپ رہتی۔ ترکی بہ ترکی چوٹ چلتی تھی!۔ کسی بات پر چل ہی گئی تھی دادی نے اس کی جہالت پر طعنہ دیا۔ صفیہ حقارت سے ہنس پڑی۔

تمہارے بیٹوں نے پڑھ لکھ کر کون سے چھپّر ٹکے کئے۔

" صفیہ!" ایک طرف سے تشفیع دھاڑا۔

" دادی ماں" دوسری طرف سے بھابی کی آواز آئی۔

" بھیا اگر قرضہ معاف نہ کرتے تو تمہارے صاحبزادے جیل کی ہوا کھاتے۔" تیسری طرف سے صفیہ کی تیز آواز آئی۔

بے رخی برتنے لگا۔ پچیس روپے صفیہ کے سینے پر دھرے تھے۔ بھابی نے پورے پیسے اسی کے ہاتھ پر لا رکھے۔

"بہن۔ مجھ سے اب گرہستی کا بوجھ نہیں سنبھلتا۔ یہ بھی تم ہی رکھو۔ مجھے اور روحی کو صبح شام ایک ایک روٹی دے دیا کرنا۔!"

ہاں ہاں۔ تاکہ تم محلے بھر میں ڈھنڈورا پیٹ دو کہ بیوہ کے پیسے بھی ہضم کر لئے۔

"کیوں، شفو۔ کیا یہ روپے تمہارے نہیں ہیں؟" وہ بھابی اس کی طرف مڑیں۔

"بھابی . . ." وہ ہچکچا کر بولا۔ "میں کیا بتاؤں۔ اگر آپ انہی کی بات مان لیں تو کیا حرج ہے؟ آپ اپنا انتظام الگ ہی کر لیجئے۔"

نوٹ ان کے ہاتھ سے گر گئے آنچل میں چہرہ چھپا کر وہ رو پڑیں۔ جب ننھے کی ماں نے انھیں وہاں سے اٹھایا تو جانے شفیع اور صفیہ کب کے جا چکے تھے

"امی۔ کیا چاچا خفا ہو گئے؟" روحی کے سوال پر پھر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

اسے بہلاتی رہیں۔ ویسے خود کے بہلنے کا کوئی سامان نہ تھا۔!

اور اب صفیہ نے دادی کی جگہ بھابی کو رکھ لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ دیتی۔ آگ لگاتی اور چنگھاڑتی۔ روز روز کی دانتا کل کل سے شفیع تنگ آ گیا۔ نہ بیوی پر جبر کر سکتا تھا نہ بھابی کو تھام سکتا۔! ایک حل یہی نکالا کہ آبائی گھر چھوڑ کر اپنی بیوی سمیت ٹھیکیدار صاحب کے یہاں منتقل ہو گیا بڑی سرسری اور رواداری میں بھابی سے رخصت ہوا تھا۔ روحی سو گئی۔ بھابی نے سلا دیا تھا وہ کیوں ان کی جدائی کا دلخراش منظر دیکھتی! لیکن اسے اپنے چاچا کے بغیر چین کہاں تھا! صبح اٹھتے اور شام ڈھلتے کھڑکی میں آ جاتی۔ ایک دن ننھے کی ماں کے ساتھ صفیہ کے گھر پہنچی! شفیع نے اسے دیکھا مگر مڑ کر چلا گیا۔ روحی کے قدم رک گئے وہ بہت مشکل سے خود کو سمجھا سکی کہ جو بے رخی سے چلا گیا وہ اس کا چاچا نہ تھا کوئی اور تھا۔

شفیع کو گم صم دیکھ کر صفیہ نے پھر کان کھڑے کئے اور بے وجہ بھابی کی برائیاں شروع کر دیں۔ وہ احمق تھا۔ جاہل تھا اسے نیکی بدی کا بھی احساس نہ تھا اس نے صفیہ کی باتوں میں آ کر سب کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر وہ روحی کا مایوس ہو کر لوٹ جانا نہیں بھول سکا۔ اس کے ننھے ننھے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ کتنی حسرت اور بے کسی تھی ان نگاہوں میں۔ وہ مڑ مڑ کر دیکھتی گئی تھی۔!

"یا خدا۔ میں کیا کروں؟" اس نے جھنجھلا کر کنپٹیاں جکڑ لیں۔

انہی دنوں راستے میں ننھا ملا تھا۔ کہا تھا کہ روحی بیمار ہے وہ بے چین ہو گیا۔ پل بھر کے لئے اسے اپنا مرحوم بھائی یاد آیا مظلوم بھابی اور معصوم روحی یاد آئیں۔ جسے وہ اپنی بیٹی کہتا تھا!۔

"کیا سوچ رہے ہو۔" صفیہ نے پوچھا۔

"روحی بیمار ہے!" بے اختیار وہ بول پڑا۔

"مکاری ہوگی۔ تمہیں بلانے کے لئے ہاجرہ نے یہ چال چلی ہے!"

روحی نے بہت چاہا۔ وہ بھول جائے۔ مگر بھول نہ سکی ننھے سے دل کا زخم ناسور بن گیا تھا۔ دل میں باپ کی یاد۔ لب پر چچا کا نام۔ بھابی اس کی دلجوئی کرتیں۔ نت نئے کھیل کھیلتیں۔ ننھے کی ماں بھی شریک ہو جاتی۔ مگر جو داغ وہ صفیہ کے گھر سے لائی تھی وہ نہ مٹ سکا۔ کھیلتے کھیلتے اچانک رونے لگتی!۔

"امی۔ بابا کب آئیں گے۔ میرے لئے کیا لائیں گے!۔"

"ہائے بیٹی تیرے بابا۔" بھابی کا جی چاہتا وہ چیخ چیخ کر روئیں۔ مگر وہ بچی کو بہلاتیں۔ یہی رنگ رہا تو اس کا کیا حال ہوگا روحی کو خاموشی نے سمیٹ لیا۔ نہ روتی نہ کھیلتی۔ اسے تپ چڑھ گئی۔! اور بھابی لٹے ہوئے جواری کی طرح جمع پونجی ہار کر بچا کھچا سنبھال کر بیٹھ گئیں۔

بچی گود میں لیٹی تھی اور آنسو اس کے سینے پر گر رہے تھے آسمان کی طرف آنچل پھیلا رکھا تھا۔

میرے اللہ۔ میرے اجڑے گھر کی بہار۔ میری بے نور آنکھوں کی روشنی۔ میرے آنگن کا پھول۔ یہ نہ مرجھا جائے اس کے دل کا ۔۔۔۔ مدد کر اللہ اللہ۔!

بہت دنوں بعد پھر زاہدہ نے بھرے گھر کی چوکھٹ پہ قدم رکھا تھا۔ بھابی کے پاس بیٹھی تسلی دے رہی تھی۔

" چاچا۔ چاچا۔!" روحی کے لبوں پر یہی نام تھا۔ ننھے کی ماں سے نہ رہا گیا۔ وہ شفیع کو بلانے پہنچی۔ صفیہ اسے کسی تقریب میں لے گئی تھی۔ ننھے کی ماں بے نیل و مرام لوٹی۔!

اور جب رات گئے شفیع دعوت سے آیا تو بہت خاموش تھا۔ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ بجانے کب آنکھ لگی تھی کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

" کیا ہے۔" صفیہ ڈر گئی۔

" روحی۔ یہاں روحی آئی تھی۔" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا!۔

" اب؟ دو بجے رات کو۔" صفیہ ہنس پڑی۔

" نہیں صفیہ نہیں۔ روحی آئی تھی۔ میں نے اسے گود میں لینے کو ہاتھ پھیلائے۔ مگر وہ آسمانوں کی طرف اڑ گئی!۔"

ہر وقت روحی۔ روحی۔ کبھی تمہارا دماغ اس سے خالی بھی رہتا ہے!۔

" تم ڈائن ہو۔ تم نے میری ماں کو میری بیٹی کو مجھ سے چھڑایا ہے۔" وہ تو پاگل ہو رہا تھا صفیہ کو بستر پر ڈھکیل کر اندھا دھند باہر نکل گیا۔

آسمان پر گھرے بادل منجمد تھے ہوائیں ساکن تھیں موسم کے سناٹے نے ماحول کو ہولناک بنا رکھا تھا۔ بھابی کی آنکھیں جل رہی تھیں رہ رہ کر بیمار بچی کی پیشانی چھوتیں۔ ہونٹ چومتیں اور پھر اپنا آنچل پھیلا دیتیں۔! روحی رہ رہ کر سسک اٹھتی۔

امی۔ بابا نہیں آئے۔

امی۔ چاچا کہاں گئے۔

روحی۔ تمہارے چاچا آگئے۔" زاہدہ نے یونہی تسلی دی تھی۔ مگر سچ مچ دروازہ کھلا اور مدتوں بعد اندھیرے اجالوں میں مدغم شفیع کی قد آدم شبیہ دروازہ میں دکھائی دی۔ وہ تیر کی طرح جھپٹا اور بچی پر گر پڑا۔

بیٹی میں آگیا۔ روحی۔ آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو۔ روحی۔ روحی۔

چاچا۔ روحی کی آنکھیں کھلیں اور بند ہوگئیں۔ وہ کراہنے لگی۔ چاچا۔ آپ نے مجھے مڑکر نہیں دیکھا۔ میں آپ سے ملنے گئی تھی۔ وہ آپ نہیں تھے۔

" ہاں بیٹی میں تھا۔ تیرا گناہگار۔ تیرا مجرم۔ سنگدل چچا۔ مجھے معاف کر دے۔ میری بچی۔۔"

لیکن اس کا جرم قابل معافی کب تھا۔! اسے اس کی سزا مل گئی۔

" شفو۔" بھابی نے بڑے صبر سے کہا۔" اپنے بھائی کی امانت سنبھالو۔"

اور بچی کی لاش شفیع کی گود میں رکھ دی۔ پھر وہ ضبط نہ کر سکیں۔

آج میرا سب کچھ چھن گیا۔ میرے آنگن کی بہار۔ میرے دل کا قرار۔ میری بچی لوٹ آ۔ لوٹ آ۔ دیکھ تیرے لئے تیری ماں دامن پھیلا رہی ہے روحی۔ روحی۔ کیا تو بھی چلی گئی میری بیٹی۔!

صبح کو سب نے دیکھا۔ بچی کا ننھا سا جنازہ شفیع نے اپنے ہاتھوں پہ اٹھا رکھا ہے اور اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے ہیں جب معصوم جھومٹی کی چادر میں چھپ گیا۔ وہ بیٹھا اس ہولناک ڈھیر کو دیکھتا رہا پھر یکبارگی فرط غم سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

نہیں نہیں! یہ آنکھ مچولی نہیں ہے۔

وہ تو چھپ گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

پھر وہ بھی لوٹ کر نہیں آیا۔

اور بھابی۔ وہ دروازہ کھولے چوکھٹ پر بیٹھی رہتی ہیں دھوپ میں۔ بارش میں۔ خزاں میں بہار میں ٹک ٹک سڑک کو دیکھا کرتی ہیں انھیں اب بھی انتظار ہے ایک دن بھیا، شفیع اور روحی اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔!

لیکن ان راستوں پر کوئی نہیں آیا۔

مدتیں گزر چکیں !!!۔

وجاہت علی سندیلوی
کتاب لکھنؤ

دُھوپ کی عینک

محلے کی مسجد میں فجر کی اذان بھی نہ ہونے پاتی کہ شیخ صدرالدین کے گھر میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو جاتے۔ پہلے شیخ جی کھانسنا شروع کرتے اور اسی کھانسی کے دوران انہیں حقّے کی طلب بڑی شدّت سے ستاتی اور وہ کئی بانگیں "حمیدہ! حمیدہ!" کی لگاتے لیکن کوئی جواب نہ ملتا۔ پھر شیخ صاحب کی چھوٹی لڑکی منی کُنمناتی اور باقاعدہ رونا شروع کر دیتی۔ اسی کی آواز سے شیخ صاحب کی بیوی نادرہ بیگم بھی نیند سے جاگ پڑتیں۔ ایک آدھ دفعہ چمکارنے کے بعد وہ روتی ہوئی لڑکی کی پیٹھ پر ایک زور کا ہاتھ لگاتیں اور اس کے رونے کی آواز چوگنی ہو جاتی۔ شیخ صاحب اس عرصہ میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد برابر کھانس رہے ہوتے۔ اب نادرہ بیگم اٹھ کر بیٹھ جاتیں اور ان کی زبان پر بھی پہلا نام "حمیدہ" کا آتا۔ دو تین دفعہ اس کو پکارنے کے بعد وہ چیختیں "اٹھ مردار! یہ حمیدہ کی بچی سوتی ہے یا مر جاتی ہے۔ نہ باپ کے حقّے کا خیال نہ بہن کے دودھ کی فکر۔ چیختے چیختے گلا بیٹھ جائے لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بنی پڑی ہے مسٹنڈی۔ اٹھتی ہے یا لگاؤں دو جوتیاں؟"

اور پھر حمیدہ خود جاگتی یا ماں کے گھونسے پر اٹھتی اور آنکھیں ملتی منہ ہی منہ میں کچھ بُدبُداتی باورچی خانے میں پہونچ کر آگ جلاتی اور آگ کے جلتے ہی سارے گھر میں نئے دن کی مشین بڑے زوروں سے چلنا شروع ہو جاتی۔ تھوڑی ہی دیر میں باپ حقہ گڑگڑانے لگتے، بہن خشی سے دودھ پینے لگتی، ماں چائے اور ناشتے کا تقاضہ کرنے لگتی اور چھوٹے بھائی اور بہن اپنے جوتے کپڑے کتابیں اور کاپیاں تلاش کرنے کیلئے "آپی، آپی" کی دہائی دینے لگتے۔ ناشتہ ختم ہو جاتا تو کھانے کا ہنگامہ شروع ہو جاتا اور ایک بوڑھی نوکرانی کے ساتھ برتن مانجھنے، گھر کی صفائی کرنے، کپڑے دھونے اور گھر کے بیسیوں کام کرنے میں حمیدہ کا پورا دن اور ایک تہائی رات گذر جاتی۔ اور جب وہ سارے گھر کو سلا کر اپنے بستر پہ بے سدھ گرتی تو اسے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔

سارے گھر کا پورا انتظام پندرہ سولہ سال کی بچی حمیدہ کے سر تھا۔ وہ بے چاری ہر وقت کولھو کے بیل کی طرح جُٹی رہتی۔ کسی روز اتفاق سے دوپہر میں جب باپ دفتر اور بھائی بہن اسکول جا چکے ہوتے وہ ذرا دیر کی چھٹی پا کر کسی کونے میں دبک جاتی تو ماں کو فوراً اس کی شدید ضرورت لاحق ہو جاتی۔ "وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ لے ذرا شمو کی پتلون کا یہ کھونپ رفو کر دے" یا "ادھر آ حمیدہ! دیکھ منی کتنی دیر سے رو رہی ہے اسے تھپکا کر سلا دے تو ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے میں بھی لیٹ جاؤں"۔ گھر میں کوئی نقصان ہو جاتا تو حمیدہ پر ہی ڈانٹ پڑتی۔ کوئی چیز کھو جاتی تو اس سے باز پرس ہوتی کیونکہ کرنے دھرنے والی تو صرف وہ تھی، گھر کے دوسرے لوگ تو گھر کے اندر اپنے ہاتھوں کا استعمال جانتے ہی نہ تھے۔

• خود نہیں لا سکتی تھی بیٹے، شمو کو پکڑا دی اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ کب سمجھ آئے گی تجھ نا شدنی کو؟"

"کہاں رکھا ہے وہ کپڑا جو اس روز میرے جہیز سے بچا تھا۔ تجھی نے کہیں رکھا ہوگا۔ جا ڈھونڈ! اب منہ کیا تک رہا ہے میرا؟"

"یہ گرم کپڑے کس بدتمیزی سے رکھے تو نے! نہانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے گھڑے سے نکل رہے ہیں۔ اب آئی ہی گران پر استری ہو!"

حمیدہ اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد تھی۔ پھول سی بچی پاکر شیخ جی اور نادرہ بیگم بہت خوش تھے اور ہر وقت اس پر جان چھڑکتے۔ لیکن وہ ابھی آٹھ برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے بڑے دانوں کی چیچک نکلی اور اس سے نہ صرف چہرہ کملا کر رہ گیا بلکہ بائیں آنکھ پھوٹ کر باہر کی طرف کچھ نکل سی گئی۔ اس عرصہ میں ایک لڑکا شمیم اور لڑکی رشیدہ پیدا ہو چکے تھے، جو ویسے ہی خوبصورت تھے جیسی کہ حمیدہ کبھی تھی۔ ماں باپ کی ساری توجہ ان دونوں کی طرف مبذول ہو گئی بلکہ غیر ارادی طور سے حمیدہ کے لئے ماں تا اور محبت کے سوتے خشک ہو کر رہ گئے۔

شیخ جی ظاہر میں تو سب بچوں سے یکساں برتاؤ کرتے بلکہ حمیدہ کے لئے وہ مقابلتاً رحم اور ہمدردی کا کچھ زیادہ ہی اظہار کرتے لیکن اس کی جانب سے ان میں ایک سرد مہری سی آگئی تھی۔ ترس کھانے اور محبت کرنے میں جو فرق ہوتا ہے اس کو حمیدہ نے غیر شعوری طور سے بہت بچپن ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ اس کے اور باپ کے درمیان وہ بے تکلفی اور لگاؤ باقی نہیں رہا تھا جو عام طور سے پیار اور دلار کی فضا میں باپ اور بیٹی میں پایا جاتا ہے۔

نادرہ بیگم اپنی جہالت کے باعث حمیدہ کی آنکھ پھوٹ جانے کا ذمہ دار خود اسی کو سمجھتیں۔ ان کو اس سے ایک طرح کی جلن سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ حمیدہ کی بجائے خود اپنے آپ کو قابلِ ہمدردی سمجھتیں۔ وہ سوچتیں کہ اب اس کانی لڑکی سے کوئی شادی نہیں کرے گا اور یہ ان کے لئے نہ صرف زندگی بھر کا بوجھ بن گئی ہے۔ بلکہ اپنے ہم چشموں کے سامنے ان کی مستقل شرمندگی کا باعث ہے۔ انہوں نے اس کو آنکھ سے معذوری کے بعد پڑھنے نہیں دیا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ بچپن میں جب وہ بھی اسکول جانے کے لئے تیار ہوئی تھی تو انہوں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ "تو کہاں جائے گی پڑھنے اور اپنا مذاق اڑوانے! جا اپنے ابا کی چلم پر آگ تو رکھ لا۔" حمیدہ کو گھر کے کاموں میں لگا کر ان کا خیال تھا کہ وہ اس کی بے مصرف زندگی کا کوئی مصرف پیدا کر رہی ہیں۔ دوسرے بھائی بہنوں کی خدمت وہ اس کے لئے یوں ضروری سمجھتیں کیونکہ ان کے خیال میں والدین کے نہ رہنے پر اس کا بوجھ انہیں کو اٹھانا پڑے گا۔ ان کی ماں تا کی جوت اگر کبھی جاگتی بھی تو وہ کچھ اس انداز سے جو حمیدہ کو اور بھی انگاروں پر لٹا دیتی: "ہائے میری بچی کی یہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے پار لگے گی؟" یا "اس قہر خداوندی کا نشانہ بننے کے لئے میری حمیدہ ہی رہ گئی تھی!" یا "ہائے میں اس بیچاری کو دنیا کی نظروں سے کیسے چھپاؤں۔ اس کی وجہ سے رشیدہ اور منی کی شادی میں بھی لوہے لگ جائیں گے۔" اگر کبھی کبھار وہ اس کی کنگھی چوٹی کرنے بیٹھ جاتیں تو کسی محلے والی کو یا اپنے ہی بچے کو آتا دیکھ کر وہ اسے ایک طرف ڈھکیل کر دوسری طرف مخاطب ہو جاتیں جیسے وہ کوئی قابلِ اعتراض کام کر رہی ہوں اور اسے دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہوں۔ گھر میں مہمان آتے تو وہ حمیدہ کو خاص طور سے ہدایت کر دیتیں کہ وہ جہاں تک ہوسکے انکے سامنے نہ آئے۔

حمیدہ سے چھوٹا ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ شمیم اور رشیدہ سے اس سے عمر میں دو سال اور چار سال ہی کا فرق تھا البتہ منی چودہ پندرہ سال چھوٹی تھی۔ شمیم اور رشیدہ سے اس کی کبھی نہیں بنی ان دونوں نے ہوش سنبھالتے ہی اس کو صرف کام کرنے کی ایک مشین پایا تھا۔ وہ اس سے کام لینا اپنا حق سمجھتے اور ماں باپ کا رویہ محسوس کر کے اس سے تحقیر کے ساتھ پیش آتے۔ حمیدہ کی طبیعت میں بھی ان کے لئے ایک طرح کی رکھائی اور تلخی پیدا ہو گئی تھی جس سے نفرت اور حسد کا صاف اظہار ہوتا۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتی اور ہر کام کچھ اس انداز سے کرتی جیسے مجبوراً زبردستی کر رہی ہو، دوسرے بھائی بہنوں اور اس کے درمیان رفاقت یا محبت کا کبھی کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکا۔ کبھی کبھار بھائی کے لئے اس کی بہن والی محبت جاگتی بھی تو بھائی اسے غیر ضروری خوشامد سمجھ کر قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھتا اور حمیدہ تلملا کر رہ جاتی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک دن دوپہر میں حمیدہ کسی کام سے شمیم کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ موجود نہیں تھا۔ میز پر آئینے کے سامنے اس کی دھوپ کی عینک رکھی ہوئی تھی۔ حمیدہ آئینہ کم دیکھتی لیکن اس وقت نہیں معلوم اس کے دل میں کیا آیا کہ وہ عینک لگا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایک بڑا خوشگوار تعجب سا ہوا۔ اس کے سامنے ایک اچھی خاصی بھولی ... لڑکی کا چہرہ جھانک رہا تھا۔ دھوپ کی عینک نے اس کی پھوٹی بلکہ ایک طرح سے اُبلی ہوئی آنکھ بالکل غائب کر دی تھی اور اس کے چہرے پر ایک جاذب توجہ تیکھا پن پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے کئی دفعہ عینک اتار اتار کر پھر لگائی اور اپنے چہرے کے مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگی اس کے ہونٹوں پر ایک بڑا دل آویز تبسم کھیلنے لگا اور وہ کئی منٹ تک مبہوت اپنے چہرے کو تکتی رہی۔ اس تبسم نے اس کے چہرے کو اور بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا اور وہ بے اختیار اپنے سر کے بال ٹھیک کرنے لگی۔ نہیں معلوم وہ کتنی دیر اس محویت میں کھڑی رہتی اگر اسے اپنی ماں کی غصہ بھری آواز نہ سنائی پڑتی "اری کہاں مر گئی کم بخت! چیختے چیختے گلا بیٹھا جا رہا ہے"

اسی روز رات میں جب کھانا ختم ہو گیا تو برتن مانجھنے سے پہلے وہ دوسروں کی نظریں بچا کر شمیم کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اور اسے کچھ اس انداز سے دیکھنے لگی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن جانتی نہ ہو کہ کیسے کہے۔ شمیم نے جو کرسی پر بیٹھا تھا اس کی طرف نظریں اٹھا کر کچھ تعجب سے پوچھا۔ "کیا ہے آپی؟" حمیدہ چونک کر واپسی کے لئے مڑ گئی لیکن پھر چہرہ دوسری ہی طرف کئے ہوئے شرما کر بولی۔ "یہ دھوپ کی عینک کتنے کی ملتی ہے؟"

"دھوپ کی عینک؟"

"ہاں جیسی تمہاری ہے!"

"تم کیا کرو گی دھوپ کی عینک؟"

"میں دام پوچھتی ہوں"

شمیم ہنسنے لگا اور حمیدہ تیزی سے اس کے کمرے سے نکل گئی۔ دوسرے دن جب شمیم نے یہ واقعہ اپنی ماں اور چھوٹی بہن رشیدہ کو سنایا تو وہ بھی ہنسنے لگیں تھوڑی دیر بعد رشیدہ نے اس سے باورچی خانہ میں کہا "آپی تمہیں دھوپ کی عینک لگانے کا شوق ہو تو ابا کی وہ پرانی عینک کیوں نہیں لگا لیتیں جس کا ایک شیشہ گر کر ٹوٹ چکا ہے۔ بیکار ہی تو پڑی ہے وہ عینک!" اور حمیدہ جو آٹا گوندھ رہی تھی بڑی بے بسی سے سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ وہ کیا کہہ سکتی اور کس سے؟ اس کی دنیا سے سب لوگ کتنے دور تھے؟۔

کئی روز تک حمیدہ بجھی بجھی سی رہی لیکن اس کے بعد اکثر شمیم جب اسکول جانے کے لئے تیار ہوتا تو اس کو اس کی دھوپ کی عینک ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ حمیدہ سے پوچھا جاتا تو وہ جھلا کر کہتی "میں کیا جانوں؟ میں تو جاتی بھی نہیں ہوں اُدھر!" اور پھر وہ دوپہر کا کام ختم کرنے کے بعد وہ ماں کی آنکھ بچا کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کرتی اور شمیم کے کمرے میں چلی جاتی۔ دوسرے دن شمیم کو اپنی کھوئی ہوئی عینک کسی کوٹ کی جیب سے یا کتاب کے نیچے سے مل جایا کرتی۔

ایک دفعہ شیخ جی کسی رشتہ دار کے یہاں شادی میں کلکتہ جا رہے تھے انہوں نے جاتے وقت بیوی بچوں سے فرداً فرداً پوچھا وہ ان کے لئے کیا لائیں۔ سب نے کچھ نہ کچھ کہا لیکن حمیدہ کچھ نہ بولی۔ شیخ جی برو کٹے کی طرف بڑھے تو حمیدہ جو ان کا ناشتے دان لئے جا رہی تھی، قدم بڑھا کر ان کے پاس پہنچی اور اس طرح چپکے سے کہ کوئی دوسرا سن نہ لے۔ "دھوپ کی عینک" شیخ جی نے چونک کر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اچھا" کہتے ہوئے ناشتے دان اس کے ہاتھ سے لیکر باہر چلے گئے۔ دو ہفتوں کے بعد وہ لوٹ کر آئے تو حمیدہ نے بڑے اشتیاق سے ان کا اسباب کھولا۔ وہ سب کے لئے کچھ نہ کچھ لائے تھے۔ اس کے لئے بھی ایک خوبصورت چپل لائے تھے لیکن وہ تو دو ہفتوں سے دھوپ

کی عینک کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہی تھی! عینک کے متعلق وہ کچھ بولی۔ شیخ صاحب نے کچھ کہا۔ چپل پاتے ہی وہ اپنے آنسو چھپانے کیلئے بے تحاشا باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ اس کے تعاقب میں ماں کی آواز آئی "شاباش بتاتو لا جلدی سے چائے!"

شیخ جی کے مکان کے سامنے ہی لالہ ہردیال کا مکان تھا۔ ان کا بڑا لڑکا رامو ایک پیر سے پیدائشی لنجا تھا اور بیسا کی لگا کر چلا کرتا۔ زیادہ تر وہ اپنے گھر کے دروازے پر برآمدے کے نیچے بیٹھا رہتا۔ حمیدہ کی جب تک آنکھ نہیں پھوٹی تھی وہ باہر نکلتی اور اکثر محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ وہ رامو کے ساتھ بھی کھیلا کرتی لیکن آنکھ کے حادثے کے بعد اس کا باہر کے لوگوں سے سخت قسم کا پردہ ہوگیا تھا۔ رامو نے تفریحاً اپنی چڑ کریلا بنا رکھا تھا۔ محلے کے لڑکے اسے اکثر چھیڑتے "رامو دادا کریلا کھاؤ گے؟" اور وہ بگڑ کر ان کو مارنے کے لئے اپنی بیسا کی اٹھاتا اور ان کے طرح طرح نام دھرتا۔ حمیدہ پردہ ہو جانے کے بعد بھی کبھی کبھار جب رامو کو گلی میں اکیلا دیکھ پاتی تو کھڑکی کی آڑ سے کہتی "رامو دادا آج بڑے مزے کے کریلے پکے ہیں!" رامو چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھتا اور منہ بنا کر کہتا۔ "بلی کی نانی! چھچھوندر کی خالہ، چھپکلی کی دم کھاؤ گی؟" اور حمیدہ ہنستی ہوئی کھڑکی کے پاس سے ہٹ جاتی کہ کہیں ان کا مذاق کوئی دوسرا سن نہ لے۔

شیخ جی کے کلکتے سے پلٹ آنے کے کچھ روز بعد ایک دوپہر میں جب گھر خالی تھا اور ماں سو رہی تھی حمیدہ نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ گلی سنسان ہے اور رامو اکیلا بیٹھا ایک کتے سے کھیل رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "رامو دادا" رامو پہلے کچھ نہ بولا۔ شاید انتظار کر رہا تھا کہ حسب معمول کریلے کا ذکر کیا جائے تو ایک دم سے کچھ جواب دے۔

حمیدہ نے پھر پکارا۔ "رامو دادا"

"کیا ہے؟ چوہے کھنی!"

"تم بازار جاتے ہو؟"

"کوئی مجھے جانے ہی نہیں دیتا لیکن کبھی آنکھ بچا کر نکل بھی جایا کرتا ہوں۔"

"مجھے ایک دھوپ کی عینک لا دو!"

"لا دوں گا"

"کتنے کی ملتی ہوگی یہ عینک؟"

"میرا بھائی آٹھ روپے کی لایا تھا کچھ دن ہوئے"

"آٹھ روپے میں؟ بہت داموں کی ہوتی ہے یہ عینک!"

"میرے پاس چھ روپے اور کچھ پیسے ہیں باقی دام میں تمہیں دیدوں گی"

اور یہ کہتے ہوئے حمیدہ دوڑ کر اپنے بکس سے چھ روپے ساٹھ پیسے نکال لائی اور ہاتھ بڑھا کر انہیں دروازے کی دہلیز پر رکھتے ہوئے بولی "تم عینک لا کر اپنے ہی پاس رکھ لینا کسی کو بتانا مت! میں خود ہی لے لوں گی"

رامو نے اپنے چبوترے سے اتر کر بیسا کی کی مدد سے چلتے ہوئے دہلیز سے پیسے اٹھا لئے۔

آٹھویں دن حمیدہ کو اس کی عینک مل گئی! اس کی آواز پر رامو نے دہلیز پر عینک اور ساٹھ پیسے رکھتے ہوئے کہا! چھ روپے کی ملی ہے۔ آٹھ روپے مانگتا تھا دکاندار لیکن میں نے دو روپے چھڑا لئے "حمیدہ کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ وہ عینک لیکر بھاگی اپنی کوٹھری کی طرف اس عینک کا فریم اتنا خوبصورت تو نہیں تھا جتنا کہ اس کے بھائی کی عینک کا لیکن اس احساس سے کہ یہ اس کی اپنی ہے اس نے اسے لگانے سے پیشتر کئی بار چوم چوم لیا تھا۔

اب حمیدہ کی زندگی کا ایک مقصد پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتی کہ کب اسے موقع ملے اور کب وہ اپنی کوٹھری کی تنہائی میں اپنی عینک لگا کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو۔ عینک لگانے کے بعد اس میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق باقی رہ جاتا؟ کچھ بھی تو نہیں بلکہ اس خیال سے کہ یہ راز اس کا اور صرف اس کا ہے وہ گھر کے دوسرے لوگوں کو ایک مخصوص احساس برتری سے دیکھتی۔

لیکن یہ راز بھی افشا ہو کر رہا۔ حمیدہ باورچی خانہ میں تھی کہ ایک دم سے رشیدہ اس کی دھوپ کی عینک لئے ہنستی ہوئی اس کی کوٹھری سے نکلی: "آپی یہ عینک کس کی ہے؟" حمیدہ بوکھلا گئی اور اس کے ہاتھ سے شیخ جی کی چلم چھوٹ پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تلملا کر بولی: "یہ عینک میری ہے تمہیں اس سے کیا؟ رکھو جا کر جہاں سے اٹھائی ہے۔" لیکن رشیدہ بھلا کب ماننے والی تھی وہ عینک لیکر سیدھی ماں کے پاس پہنچی۔ نادرہ بیگم نے رشیدہ سے عینک لیکر رکھ لی اور تھوڑی دیر بعد جب حمیدہ ان کے سامنے پہونچی تو انہوں نے پوچھا: "کہاں ملی تجھے یہ عینک؟"

حمیدہ کچھ نہیں بولی تو نادرہ بیگم اور تیز ہو گئیں: "میں آج تجھ سے پوچھ کر رہوں گی کہ تو نے یہ عینک کہاں سے پائی؟"

"امی مجھے میری عینک دیدو!" حمیدہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پہلے یہ بتا یہ آئی کہاں سے؟" نادرہ بیگم ایک جھنکار کے ساتھ پاندان بند کر کے کھڑی ہو گئیں جیسے وہ حمیدہ کو مارنے بڑھ رہی ہوں۔

"خالو ابا بریلی سے آئے تھے تو وہ بھول گئے تھے۔"

"تو نے آج تک بتایا کیوں نہیں" نادرہ بیگم کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور انہوں نے اسی وقت اپنا کیش بکس کھولکر عینک اسمیں رکھ لی۔

نادرہ بیگم کو نمونیا ہوا تو ان کی تیمار داری میں حمیدہ نے دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت سنبھلنا شروع ہوئی تو اکثر یہ دیکھ کر کہ رات میں جب گھر کے دوسرے لوگ سو رہے ہوتے ہیں حمیدہ کس طرح ان کی خدمت کرتی ہے کبھی انہیں لحاف اڑھاتی، کبھی انہیں دوا پلاتی اور کبھی ان کا سر دباتی، انکی آنکھوں میں اظہار تشکر کے طور پر آنسو آجاتے اور وہ دیر تک سوچا کرتیں کہ وہ اپنی اس لڑکی کیلئے کیا کر سکتی ہیں ایک رات انہوں نے اسکے سر کو اپنے سینے پر جھکالیا۔ اور بڑی محبت سے پوچھا "حمیدہ تجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟"

حمیدہ نے سسکیاں بھرتے ہوتے کہا "امی مجھے میری عینک دیدو۔ وہ خالو ابا نہیں بھولے تھے میں نے اپنے پیسوں سے راموسے منگائی تھی۔"

نادرہ بیگم نے اسے اس تعجب سے دیکھا جیسے انہیں اس کا دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ "وہ عینک تو میں پرسوں ہی تمہارے خالو ابا کو جو نوکر آیا تھا اس کے ہاتھ بریلی بھیج چکی ہوں! آخر کیا کرے گی تو عینک؟ اور تو نے راموسے اسے کیوں اور کیسے منگایا تھا؟"

حمیدہ کچھ نہیں بولی۔ وہ پلنگ کے نیچے فرش پر لڑھک گئی۔ نادرہ بیگم بڑے تعجب اور تاسف سے بہت دیر تک اس کی سسکیاں سنتی رہیں۔

ڈاکٹر نے انجکشن دیا تو حمیدہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے کئی روز سے نمونیا تھا اور بخار کی شدت سے وہ جھلس کر رہ گئی تھی۔ پاس ہی پلنگ پر نادرہ بیگم تکیہ کے سہارے دم بخود بیٹھی ہوئی تھیں اور شیخ صدر الدین آنکھوں سے آنسو پونچھتے سرہانے کھڑے تھے۔

ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور مایوسی سے سر ہلایا۔

شیخ جی گلوگیر آواز میں کچھ پوچھنے ہی والے تھے کہ حمیدہ نے منہ کھول دیا۔ پیالی سے تھوڑا پانی اس کے حلق میں ڈالا گیا تو اس نے بولنے کے لئے کئی دفعہ منہ چلایا اور کچھ دیر بعد اس کی بہت ہی نحیف آواز تھرتھراتی ہوئی سنائی دی: "دھوپ کی عینک" اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ تڑپ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

مانک ٹالہ　　　　شاعر بمبئی

خون اور پانی

ڈی لکس ٹرین نئی دہلی ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ گاڑی کے اندر اور پلیٹ فارم پر ایک اضطرابی کیفیت سی طاری ہو گئی تھی۔ کچھ ایسی ہی حالت چرن داس اور اس کی بیوی سرلا کی ہو رہی تھی۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے اور چہروں سے بے تابی دبے قراری کے آثار ہویدا تھے۔ چار سال پہلے انھوں نے اسی اسٹیشن سے اپنے تین ساڑھے تین سال کے جگر گوشے کو خاموش الوداع کہی تھی۔ وہ راجو جو اُن کا اپنا تھا۔ ان ہی کے جسم و جان کا ایک حصّہ تھا۔ اسے انھوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے سرلا کی بہن رادھا کی گود میں ڈال دیا تھا۔

سرلا کی بہن رادھا بے اولاد تھی۔ بہترین علاج معالجوں اور ٹونے ٹوٹکوں کے باوجود جب رادھا کی گود ہری نہ ہوئی تو اس نے اپنی بہن کا نوزائیدہ بیٹا راجو گود لے لیا۔

اور آج وہ لوگ لگ بھگ چار برس کے بعد پھر دہلی آ رہے تھے۔ اگرچہ اس دوران میں سرلا اور چرن داس کو راجو کی کئی تصویریں، اس کے جنم دن اور دیگر تقریبات پر لی گئی، اور مختلف زاویوں سے کھینچی ہوئی، اکثر ملتی رہتی تھیں اور وہ راجو کے چہرے کے نقوش اور قد و قامت سے بہت حد تک مانوس تھے۔ لیکن پھر بھی اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے کی تمنا مچل رہی تھی۔

اور جب کہ گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی اور وہ لوگ چند ہی لمحوں میں گاڑی سے باہر آنے والے تھے یہ بے تابی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ چار سال کے طویل عرصے میں راجو کی جدائی اس قدر شاق نہیں گذری تھی جتنی اس وقت گذر رہی تھی۔ راجو کو رادھا کی گود میں ڈالتے وقت انھوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اب راجو پر ان کا کوئی ادھیکار نہیں رہا۔ بدائی کے وقت جوان بیٹی کو ڈولی میں بٹھاتے وقت ماں باپ موہ ممتا کا حسین و لطیف تاگا اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کی دھار سے جس طرح کاٹ ڈالتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا احساس انھیں اپنا راجو رادھا کی گود میں سونپتے ہوئے ہوا تھا اور پھر فاصلے کی دوری اور وقت کے فاصلے کے گردابوں میں ان کی ممتا اور پریم کے احساس پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی۔ لیکن آج جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی تو ان کی ممتا اس طرح اپنی باہیں وا کئے بیتاب کھڑی تھی۔ جیسے پیاس سے بیاکل سیپ اپنی آغوش پھیلائے سواتی کی بوند کی منتظر ہوتی ہے۔

چرن داس اور سرلا دہلی کی ایک شرنارتھی نو آبادی میں رہتے تھے۔ چرن داس نوکری پیشہ شخص تھا۔ لگی بندھی آمدن تھی۔ پانچ چھ بچے تھے۔ بڑھتی ہوئی ضروریاتِ زندگی اور ضروریاتِ زندگی کے ہر روز بڑھتے ہوئے دام۔ گذارہ بہت مشکل سے چل پاتا تھا۔ سرلا کے بہنوئی گلاب چند بمبئی میں کاروبار کرتے تھے۔ اگرچہ لاکھوں کا ہیر پھیر تو نہیں تھا لیکن بہرحال گذارہ اچھا چل رہا تھا۔ سات آٹھ برس

شادی کو ہو چکے تھے لیکن اولاد نہیں تھی۔ جب سب طرف سے نراش ہو گئے تو رادھا اور گلاب چند نے دہلی آکر سرلا کا نوزائیدہ بچہ راجو گود لے لیا تھا۔ اور چند روز وہاں ٹھہر کر واپس بمبئی چلے گئے تھے۔ پھر کاروبار کی مصروفیت کے باعث انھیں دہلی آنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ اب وہ چار سال کے بعد بڑی کوشش کے بعد دہلی آرہے تھے۔

گاڑی پلیٹ فارم پر رکی گلاب چند سامان سمیٹنے میں لگ گیا۔ اور رادھا راجو کو انگلی سے لگائے باہر دروازے پر آئی۔ سرلا انھیں دیکھ کر لپکی۔

"وہ دیکھو آنٹی۔ نمستے کرو آنٹی کو بیٹے" رادھا نے سرلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن راجو اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھلونے ہی میں مست رہا۔ اگرچہ آنٹی کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ لیکن پھر اپنے کھلونے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سرلا کی آنکھوں کے سامنے تین ماہ کے راجو کی چھب گھوم گئی۔ جب کہ وہ ان سے جدا ہوا تھا۔ چار سال کے عرصہ میں تو وہ (چشم بددور) بہت بڑا ہو گیا تھا۔ کیا سرخ سفید رنگ نکھر آیا تھا۔ قیمتی دیگران کی بش شرٹ اور سلیک پہنے ہوئے کیا بانکا لگ رہا۔ سرلا کی ممتا بے تاب ہو اٹھی۔ وہ راجو کو گود میں اٹھانے کو لپکی۔ لیکن راجو نے مزاحمت کی۔

رادھا نے پچکارا "جاؤ بیٹے آنٹی کے پاس۔ بہت اچھا ہے میرا راجہ بیٹا"

"نہیں جاؤں گا" راجو نے منہ پھلا کر جواب دیا۔ لاڈ پیار نے اُسے خود سر اور بے باک بنا دیا تھا۔

"کیوں نہیں آئے گا؟" سرلا کی آنکھوں میں کھسیانی مسکراہٹ اور آواز میں خوشامد کا عنصر تھا۔

"تم بدھی ہو" راجہ نے اسی طرح منہ پھلا کر جواب دیا۔ سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ سرلا بھی کھسیانی ہنسی ہنس دی۔ درحقیقت وہ وقت سے پہلے ادھیڑ نظر آنے لگی تھی۔ جب بیاہی گئی تو بالکل چینی کی گڑیا نظر آتی تھی۔ لیکن کثرتِ اولاد اور تنگدستی کے باعث صحت اور حسن دونوں رخصت ہو چکے تھے۔

"تم آنٹی کے پاس نہیں جاؤ گے تو ہم تمہاری ممی نہیں بنیں گے" رادھا نے راجہ کو ڈانٹا۔ اس پہ حربہ کارگر ہوا اور راجو سرلا کی گود میں چلا گیا۔

سرلا نے اُسے چھاتی سے لگایا۔ پیار کیا۔ اور منہ چومنے والی ہی تھی کہ راجو پھر بگڑ کھڑا ہوا "نہیں نہیں ہمارا منہ گندا ہو جائے گا" اور وہ سرلا کی گود سے پھسل کر اتر گیا اور پھر رادھا کی انگلی سے جا لگا۔

سرلا نے تو سوچا تھا کہ وہ راجو کو گود میں اٹھا کر بھینچ بھینچ کر پیار کرے گی۔ اس کا منہ بوسوں سے بھر دے گی۔ لیکن سرلا کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

گھر پہنچے تو سرلا کے سب بچے راجو کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہی سب سے پہلے راجو کو گود میں اٹھا کر پیار کرے۔ چنانچہ راجو کو حاصل کرنے کیلئے ان میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ لیکن راجو سب کو دھکے دے کر پھر رادھا سے آچپٹا۔ اور سب بچے بے چارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

رادھا من ہی من میں بہت دکھی ہوئی۔ وہ گھر کے کسی فرد سے گھل مل نہیں رہا۔ اور غالباً شدید احساسِ برتری میں مبتلا تھا۔ پھر بھی رادھا نے اسے پچکارتے ہوئے کہا "جاؤ راجو بیٹا ان سے کھیلو۔ یہ سب تمہارے بہن بھائی ہیں"

"نہیں ممی! ہم نہیں کھیلے گا ان سے" راجو نے لاڈ پیار سے بگڑے بچوں کی طرح منہ پھلا کر بات کی۔

"کیوں نہیں کھیلے گا؟" رادھا نے پیار سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"یہ سب گندے بچے ہیں" راجہ نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔

رادھا کو معلوم نہ تھا کہ اس کی نفاست پسندی یہ گل کھلائے گی۔ جب کبھی راجو گلی محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا تو رادھا زبردستی پکڑ لاتی۔ اور کہتی "راجو بیٹا! گندے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتے۔ وہ سب گندے بچے ہیں۔ تو تو کتنا اچھا اور صاف ستھرا بچہ ہے۔ یہ دیکھو یہ کتنے کھلونے ہیں۔ ان سے کھیلنا

اور وہ بڑے بڑے قیمتی کھلونے راجو کے سامنے ڈال دیتی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجو جلد ہی خود پسند ہو گیا ۔ اس کے علاوہ اس میں خواہ مخواہ احساس برتری پیدا ہو گیا اور اب وہ انہی بچوں سے پرے بھاگ رہا تھا جن کی رگوں میں بھی اسی کا خون گردش کر رہا تھا ۔

پھر بھی رادھا نے اسے پچکارا ۔ "نہیں بیٹے ایسی بات نہیں کہتے ۔ یہ تو سب اچھے بچے ہیں ۔ ان کے ساتھ کھیلو ۔"

"نہیں ممی یہ سب گندے ہیں ۔ دیکھو تو کتنے گندے کپڑے پہنے ہوئے ہیں یہ ۔" راجو اپنے معصوم انجانے پن میں بار بار سرلا اور چرن داس کو ان کی کم مائیگی کا احساس دلا رہا تھا ۔ چنانچہ رادھا نے اس معاملہ کو درگذر کر دینا ہی مناسب سمجھا ۔ چنانچہ وہ سرلا کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئی ۔

اتنے میں راجو پھر پکارا "ممی ! ممی ۔ اپنے گھر چلو ۔"

رادھا نے پیار بھرے لہجے میں کہا "راجو بیٹے اپنا گھر تو بہت دور بامبے میں ہے ۔ اب تو یہاں ہی رہیں گے ۔ یہ تمہاری آنٹی کا گھر ہے ۔"

"نہیں ہم نہیں رہیں گے یہاں ۔" راجو نے پھر مچلتے ہوئے کہا ۔

"کیوں نہیں رہو گے یہاں ؟" رادھا کو پھر غصہ آ گیا ۔

"آنٹی کا گھر گندا ہے ۔ اپنے گھر چلو ۔" راجو نے اسی طرح مچلتے ہوئے جواب دیا ۔ رادھا نے غصہ میں اسے جھڑک دیا ۔ سرلا نے سب کی نظریں بچا کر آنکھ کے کونے پر امنڈتا ہوا آنسو چٹکی سے جھٹک دیا ۔

بات آئی گئی ہو گئی ۔ سرلا رسوئی میں مصروف ہو گئی ۔ رادھا بھی بہن کے قریب جا بیٹھی ۔ رسوئی کے کام کاج کے ساتھ گفتگو کا دور شروع ہوا ۔ چار سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی ۔ نئی پرانی کئی باتوں کا دفتر کھل گیا ۔ ادھر چرن داس اور گلاب چند بھی ادھر ادھر کی گپیں ہانکنے میں مصروف ہو گئے ۔

سرلا کے بچے باہر صحن میں کھیل کود میں مصروف ہو گئے ۔ راجو اکیلا رہ گیا تھا ۔ وہ پہلے تو ان کے قریب جا کھڑا ہوا اور انھیں کچھ دیر تک کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ پھر خود بھی ان کے کھیل میں شریک ہو گیا ۔

کھانا تیار ہونے پر تھالیاں لگ گئیں تو رادھا کو راجو دھیان آیا ۔ اس نے راجو کو آوازیں دیں مگر جواب ندارد ۔ رادھا بہت فکر مند ہوئی کہ کہیں ضد میں آکر باہر ہی نہ نکل گیا ہو ۔ چنانچہ وہ ڈھونڈنے کے لئے باہر نکلی تو یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئی کہ راجو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہے ہاتھ پاؤں کپڑے سبھی مٹی میں اٹے پڑے تھے ۔ اور وہ ان سب کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھا ۔

حسب عادت رادھا اسے اس حالت میں دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی ۔ اور قریب تھا کہ راجو کو پکڑ کر اس کی مرمت کر ڈالتی کہ کسی انجانی طاقت نے اس کو روک دیا اور وہ چپ چاپ راجو کو اپنی بہن کے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی ۔ رادھا کے پیچھے سرلا بھی کھڑی ہو کر یہ تماشہ دیکھتی رہی ۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہی ۔

جلد ہی راجو سب بچوں کے ساتھ گھل مل گیا ۔ ان ہی کی طرح ہاتھ پاؤں کپڑے سب مٹی میں اٹے رہتے ۔ دن بھر ان کے ساتھ کھیل کود میں مصروف رہتا حتیٰ کہ اپنے کھلونے جنھیں وہ کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتا تھا ، سب نکال نکال کر ان کو دینے لگا اور ان کے ساتھ یوں گھی شکر ہو گیا جیسے برسوں کی پہچان ہو ۔ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی الگ بچہ ہے ۔ اونچ نیچ ، برتر و کمتر کا سب امتیاز ختم ہو چکا تھا ۔

اگلے روز رادھا اور گلاب چند دونوں اسے وہیں کھیلتا ہوا چھوڑ گئے ۔ دو ایک کام تھے اور پھر کناٹ پیلس میں انھوں نے ایک پکچر کا میٹنی شو بھی دیکھا ۔ واپسی پر ٹیکسی لے کر لپک جھپک واپس پہنچے کہ کہیں راجو اداس ہو کر رو نہ رہا ہو ۔ لیکن جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ کمرے میں سب بچوں کے درمیان راجو میر محفل بنا بیٹھا ہے ۔ اپنی چھوٹی چھوٹی اور پیاری پیاری باتوں سے سب کا دل بہلا رہا ہے ۔ دوسرے بچے کوئی بات پوچھتے تو انھیں اس طرح چہکتے جواب دیتا کہ سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ۔ رادھا نے اندر جا کر بڑے پیار سے راجو کو پکارا "راجہ بیٹا ہم آ گئے ۔"

راجو ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر پھر اپنے ساتھیوں کی باتوں اور ان کے قہقہوں میں گم ہو گیا ۔ گویا اس کے ممی ڈیڈی ہی نہیں بلکہ کوئی غیر آئے

ہم مذہبی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

اور یہی راجو جب بمبئی میں تھا تو ایک پل کی جدائی گوارہ نہیں کرسکتا تھا۔ راجو کے لئے انھوں نے الگ نوکر رکھا ہوا تھا اور وہ شام کو بہت مشکل سے ایک دو گھنٹہ کھیلنے نوکر کے ساتھ باغیچہ میں چلا جاتا تھا وہ بھی اس لئے کہ وہاں کئی دوسرے بچے بھی اپنے اپنے نوکروں اور آیاؤں کے ساتھ آئے ہوتے تھے۔ اور وہاں اپنے ہمجولیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر اپنی دن بھر کی تشنگی بجھاتا۔ کیونکہ اس کی ممی اسے گلی محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

سرلا اور چرنداس سے وہ اس قدر غیر مانوس وغیر متعلق تو نہیں رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ان سے ذرا کھنچا کھنچا سا رہتا تھا۔ جی میں آتا تو کبھی سرلا سے میٹھی میٹھی باتیں کرلیتا۔ لیکن جب سرلا اسے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگتی تو وہ بدک جاتا۔

لیکن ایک روز تو سچ مچ معجزہ ہوگیا۔ سرلا رسوئی میں ناشتہ کے لئے ملائی کے ٹوسٹ بنا رہی تھی۔ راجو کو ملائی کے ٹوسٹ بہت بھاتے تھے۔ ٹوسٹ بنتے دیکھ کر اس کا جی للچا اٹھا۔ آہستہ آہستہ سرلا کے قریب گیا۔

"مجھے ایک ٹوسٹ دو" اس کے لہجہ میں خوشامد کا عنصر بھی تھا۔

"ٹوسٹ لوگے راجو بیٹا؟" سرلا نے ممتا سے بھرپور لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں" راجو نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیوں میں کیا لگتی ہوں تیری جو تجھے ٹوسٹ دوں"

"تم میری اچھی آنٹی ہو" راجو نے بھولے پن سے جواب دیا۔

"تو پھر تم مجھے پیار کیوں نہیں کرنے دیتے" سرلا نے پوچھا۔

"پیار کرنے دوں گا تو پھر ٹوسٹ دوگی نا؟"

"ہاں پھر تو میں تمہیں دو ٹوسٹ دوں گی"

"اچھا تو پھر ایک ہی کِس لینا" راجو نے سرلا کے قریب سرکتے ہوئے کہا۔

سرلا نے اسے گود میں اٹھا کر پہلے محبت سے گلے سے لگا کر بھینچا۔ پھر ایک بوسہ اس کے گال پر جڑ دیا۔ اور پھر جھٹ سے اپنے ہونٹ الگ کردیئے کہ کہیں راجو بدک نہ جائے۔

اور پھر اچانک غیر متوقع طور پر راجو نے بھی اپنے ننھے ننھے ہونٹ سرلا کے گال پر رگڑ دیئے۔ حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات میں سرلا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس نے ممتا سے بے قرار ہو کر پھر اپنے ہونٹ راجو کے گال پر رکھ دیئے۔ راجو نے بھی اسی طرح سرلا کا گال چوم لیا۔ اور پھر سرلا نے راجو کے اور راجو نے سرلا کے ہونٹ، آنکھوں اور گالوں کے لاتعداد بوسے لے لئے۔ اور ساری اجنبیت بوسوں کی گرمی سے پگھل گئی۔ اور دونوں کی خوب گاڑھی چھننے لگی۔ راجو سرلا کا اس قدر گرویدہ ہوگیا کہ ایک حد تک اپنی ممی سے بھی لاپرواہ ہوگیا۔

آخر روانگی کا دن آپہنچا۔ ڈی لکس ٹرین چار بجے کے قریب سہ پہر روانہ ہوتی تھی۔ رادھا راجو کو تیار کرکے خود اپنی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ تیار ہو کر باہر آئی تو دیکھا کہ راجو باقی بچوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہے۔ اور نئے کپڑے مٹی میں لت پت ہوچکے ہیں۔

رادھا نے غصے میں راجو کو پکارا۔" راجو کے بچے سب کپڑے گندے کردیئے۔ چلو پھر کپڑے بدلو"

"ممی ابھی ہم کھیل رہے ہیں" راجو نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"ہم باہے چل رہے ہیں، جلدی کرو گاڑی چلی جائے گی"

"ہم باہے نہیں جائیں گے۔ ہم تو یہاں ہی رہیں گے" راجو نے دو ٹوک فیصلہ کردیا۔

"اچھا تو ہم جا رہے ہیں تم یہیں رہو" رادھا نے دھمکی دی۔

"اچھا تم جاؤ ممی" راجو نے بھولا پردا ہی سے جواب دیا۔ "تا۔ تا"

رادھا راجو کو پکڑنے کے لئے گئی تو راجو دوڑ کر قریب کھڑی سرلا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"تم بہت نانی بچے ہو۔ جاؤ ہم تمہاری ممی نہیں بنیں گے" سرلا نے پھر دھمکیوں سے کام نکالنے کی کوشش کی۔

"ہم آنٹی کو ممی بنالیں گے"

"آنٹی تو تمہاری بڑھی ہے" رادھا نے راجو کا حربہ اسی پر استعمال کیا۔

"نا۔ نا۔ بہت اچھی ہے۔ ہمیں بہت پیار کرتی ہے" راجو نے سرلا کی ٹانگوں کے گرد اپنے ننھے ننھے بازوؤں کا حلقہ اور تنگ کر لیا۔

رادھا روہانسی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو چھلکنے لگے۔

شیکھر پنڈت
سریتا۔ دہلی

منزل اور راستے

ڈاکٹر مس رنیتا اروڑہ ایم اے، پی ایچ ڈی کی مانگ میں جب ایک دن سیندور کی لکیر کھنچ گئی تو بہت سی بھنویں استعجاب سے تن گئیں اور جب دوسرے پروفیسر صاحبان اور طلبا کو اس بات کا علم ہوا کہ آئندہ ان سے طرزِ تخاطب مس اروڑہ کی بجائے مسز شرما ہوا کرے گا، تو سب کی انگلیاں دانتوں تلے دب گئیں!۔

پروفیسر دنیش شرما میں کوئی کمی نہیں تھی۔ بہت سے گریجویٹ لڑکیوں کے باپ، درمیانے طبقے کے کچے دھاگے سے بندھی ہوئی آہنی زنجیروں کی روایات کے اسیر پروفیسر شرما میں ایک مثالی داماد کا عکس دیکھ رہے تھے، پرکھ رہے تھے اور پرتول رہے تھے۔ لیکن پروفیسر شرما کی ڈاکٹر اروڑہ سے شادی کو وہ معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔ یہ اتفاق نہ تھا ایک حادثہ تھا۔

پروفیسر شرما اپنی نوبیاہی دلہن سے ہر لحاظ سے چھوٹے تھے۔ عمر، تعلیم، خاندانی امارت، کوٹھی، کار، بنگلہ، سماجی اقتدار، سرکاری خطابات، روپے پیسے کی ریل پیل، رکھ رکھاؤ میں، سج سجاؤ میں۔ غرضکہ ہر بات میں وہ اپنی بیوی سے کم تر تھے۔ اور تو اور دونوں کے مضامین میں قطبین کا فرق تھا۔ دنیش فلسفی تھا مگر رنیتا کا مضمون سیاسیات تھا۔

یونیورسٹی میں تو ایسے واقعات حیرت کا کہرا چیر کر مسکراہٹ کی کرن پیدا کر دیتے ہیں اور اس کے بعد قہقہے۔ نہ اس میں ماں باپ کے منی آرڈروں پر زندہ رہنے والے ٹوسٹ اور جاز کے ہم جولیوں کا چھورا رومان تھا جو سکینڈل پیدا کر سکے۔ وہ دونوں تو فرائڈ کو دس پندرہ سال پہلے پڑھ چکے تھے۔ بلوغیت تو الگ بات، وہ سنجیدگی کی ان حدود میں پہنچ چکے تھے جہاں ماتھے کی تیوری کنپٹیوں کے ایک آدھ سفید بال سے جا ٹکراتی ہے۔ لہٰذا بات بنی، بن کے پھیل اور پھیل کر کامپس کی رومان پرور فضا میں تحلیل ہو گئی۔

بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھی لیکن رائے بہادر چرن داس کے گھر میں تو کہرام مچ گیا۔ احباب و اقارب، اپنے بیگانے، ناطے اور رشتے دار کوٹھی پر یوں ٹوٹے جیسے تعزیت پر آئے ہوں۔

رائے بہادر صاحب اب تک اپنے بوسیدہ خطاب کو سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے۔ اس خطاب کے علاوہ وہ کسی سوسائٹی کے پردھان، کسی کے چیرمین، کسی کے پریذیڈنٹ اور پتہ نہیں کیا کیا تھے۔ ان کے غریب خانے پر قیصرِ ہند سے لیکر چکر دھاریوں تک ہر قسم کے مسٹر اور شرنی قدم رنجہ فرما چکے تھے۔ ان حالات میں چار سو ٹکے پانے والا ایک دماغی قلی اور ان کا داماد، انہونی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔

رائے بہادر صاحب ایک ہفتہ تک کوٹھی سے باہر نہیں نکلے۔ کاک ٹیل، برج پارٹی، ایٹ ہوم، کلب، "ٹی ڈنر"، ڈریٹی کے دفتر اور

[illegible] سے منہ موڑ لیا اور تو اور، دو دھوا آشرم سالانہ جلسے کی صدارت اور غیر ملکی سفیروں کے اعزاز میں منعقد ہونے والا کلچرل پروگرام بھی رائے بہادر صاحب کی حجرہ نشینی میں گڑبڑا کے رہ گیا۔

اور شریمتی اروشہ نے بھی تو ان دنوں بہت سینہ کوبی کی۔ اکلوتی بیٹی کی شادی اگر ان کے ہاتھ سے پروان چڑھتی تو شاید کار میں وداع ہونے والی دلہن کو لٹتے آنسو نذرانے میں بھینٹ نہ ہوتے۔ سو چا کیا ہوا کیا۔

اور بیٹی بھی ایسی ڈھیٹ نکلی کہ عدالت میں سول میرج کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر کے سیدھی کالج پہونچی وہاں حسب معمول طلباء سے مغز پچی کی۔ شام کو اسٹاف روم سے اپنے نوگرفتار شدہ شوہر کو کار کی اگلی سیٹ پر بٹھایا، بازار جا کے چند ایک ضروری چیزیں خرید کر پروفیسر شرما کے ننھے منے فلیٹ میں پہونچ گئی اور اس کے بعد ذہنیت کی وجہ ہیں، کے باوجود کتابوں کو قرینے سے لگایا، میلے کپڑوں کا انبار اکٹھا کیا، جوتوں کو شلف میں لگایا، جالے اور گرد صاف کئے قمیصوں میں بٹن ٹانکے اور چولہا چڑھا دیا گویا رومانیت پر مادیت کا ایک اور دبیز نقاب چڑھ گیا۔

اُدھر کوٹھی میں رائے بہادر صاحب منتظر تھے کہ کب نو بیاہتا جوڑا ان سے آشیرباد لینے آئے اور وہ نوکروں سے کہہ کے انہیں باہر نکلوا دیں اور ببانگ دہل اعلان کریں کہ اس خود سر بے حیا لڑکی کے وہ باپ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اور ان کی کروڑوں کی جائداد سے اسے ایک دھیلہ بھی نہ مل سکے گا۔

اور نہ شریمتی اروڑہ کو کہنے کا موقع ملا کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کے سامنے اسے بے حیا، کلنکنی، پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی، ندیدی کہہ سکیں۔ ان دونوں کی حسرت کہ وہ خاندان عالیہ کی روایات سنہری کو ہر خاص و عام کے سامنے بیان کر سکیں، دل میں ہی رہ گئی۔

لوگ باگ چہرے پر اسباب آثار مردنی طاری کر کے آتے، پوچھتے اور کوٹھی سے باہر نکلتے ہی کھل اٹھتے۔ گویا برسوں کی مرادیں آج پوری ہوئیں۔ عورتیں آتیں دن میں کئی کئی بار ایک دوسرے کے ساتھ، نئے نئے بہانے تراش کر۔ اور شریمتی اروڑہ کے ہاں۔ گہنوں اور کپڑوں کے بھرے ہوئے صندوقوں کو بار بار کھول کر دیکھتیں جو بیٹی کے جہیز کے لئے انہوں نے پچھلے بتیس برس میں تیار کئے تھے۔ صندوقوں کی تہہ میں پرانے زمانے کی وہ پھلکاری بھی تھی جو شریمتی اروڑہ اپنے جہیز میں لائی تھیں۔ اور ہزار پندرہ سو کی ساڑھیاں بھی۔ موتی بد نما تھے تھی اور ہلکے پھلکے جواہروں سے مرصع زیورات بھی۔ اور ادھر رائے بہادر صاحب آہنی تجوری سے چک بک نکالتے اور رکھ دیتے۔ لیکن ونیتا نے آنا تھا نہ آئی۔

قصور سراسر ونیتا کا تھا جو ان کے لئے اب بھی ننھی منی سی وتی ہی تھی رائے بہادر صاحب کو تو بچی کی پیدائش پر ہی اس کے گھر ور کی فکر لگ گئی تھی اور تب سے اب تک وہ اس کے لئے مناسب لڑکا اور اچھا گھر دیتے رہے تھے۔ آخر گڈے گڑیا کی شادی تو ہے نہیں کہ جھم سے رچا دی ہر چیز دیکھنی پڑتی ہے۔

لیکن لڑکی نے ایسی خود مختاری دکھائی کہ سارے خاندان کی ناک کٹوا دی۔ پھر بھی کوئی لاج رہ جاتی اگر ماں باپ سے آ کے معافی مانگ لیتی۔ آخر خون اپنا تھا۔ ماں باپ کیسے بھی ہوں، ناخون اور گوشت کا رشتہ تو کبھی نہیں ٹوٹتا۔

لیکن وہ عجیب مٹی کی بنی ہوئی لڑکی نکلی۔ معافی مانگنی تو علیحدہ، کوٹھی کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ گھر میں پل پل کی خبریں آتی تھیں آج خانساماں نے بٹیا کو خود سبزی خریدتے دیکھا۔ بیرے نے اسے لانڈری پر کپڑے دیتے، شوفر نے اسے موٹر صاف کرتے، مالی نے اسے گملوں میں پانی ڈالتے پرائیویٹ سکریٹری نے اسے ڈاکخانے میں چٹھیاں ڈالتے اور خود ونیتا کی اپنی پرانی گورنس نے اسے ایک دکان پر پرام کا سودا کرتے دیکھا تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ خود ایک دن رائے بہادر اور شریمتی اروشہ نے پروفیسر شرما اور ونیتا کو سینما سے باہر ہاتھ میں ہاتھ دیے مسکراتے دیکھ لیا۔

۔۔۔۔۔ بعد اس روز پہلی مرتبہ شریمتی اروڑہ رائے بہادر صاحب سے الجھ پڑیں۔ ورنہ پچھلے چار مہینوں میں جب کبھی رائے بہادر نے ونیتا کے بارے میں کچھ کہا تو اس نے دو سنا دیں۔ لیکن آج شریمتی اروڑہ تنک کر بولیں "یہ سارا قصور آپ کا ہے"

"میرا" رائے بہادر صاحب نے عینک اتار کے میز پر رکھی اور ماتھے پر ناجانا غور و فکر کے آثار پیدا کر کے کہا۔ "کیا کہا میرا"

"آپ کا نہیں تو اور کس کا" شریمتی اروڑہ واقعی غصے میں تھیں۔ "آج سے پندرہ سال پہلے میں آپ سے کہتی تھی کہ لڑکی پرایا دھن ہے لڑکا دیکھو۔ لیکن آپ کے کان پر جوں نہ رینگی"

رائے بہادر صاحب نے عینک اٹھا کر پھر ناک پر جمائی اور غور سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے"

شریمتی جی تنک کر بولیں، "میرا تو ٹھیک ہے، آپ کو علاج کی ضرورت ہے" اور غصے میں آکر خود ہی ریفریجریٹر کھول کے پانی کی بوتل اٹھا لائیں۔

"یہ بوتل میں تمہارے سر پر پھوڑ دوں گا" رائے بہادر صاحب نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا، "آخر کیا وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ مجھے اس کا خیال نہ تھا، مجھے علم نہ تھا کہ لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے۔ کیا میں نے اسے اعلیٰ تعلیم نہیں دلوائی۔ انگلستان اور امریکہ میں نہیں بھیجا۔ اس کے لئے پچاسوں لڑکے نہیں دیکھے"

شریمتی اروڑہ نے غصے سے بات کاٹ کر کہا، "پچاس کی بجائے آپ ایک پر دل ٹکا لیتے تو یہ نوبت نہ آتی" اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور سچ پوچھئے تو رائے بہادر صاحب کا اس میں قصور بھی نہ تھا۔ آج سے تیس سال پہلے جب ونیتا نے ان کے گھر میں اجالا کیا تو وہ اس دن سے ہی اس کے لئے گھر بر کی تلاش میں جٹ گئے تھے۔ اور ان سالوں میں انہوں نے پچاسوں کیا سینکڑوں لڑکوں کو دیکھا۔ لیکن دیکھے بوجھے مکھی کون نگلتا ہے۔ لڑکی کی زندگی کا سوال تھا اور وہ لڑکی کو وہاں بیاہنا چاہتے تھے جہاں ان کی لاڈلی سکھی رہے۔

جب وہ پیدا ہوئی تو وہ ونیتا اروڑہ نہ تھی۔ فقط ونتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں وہ خود صرف چرنا تھے اور ان کی بیوی بھاگ بھری۔ محض بھاگو۔ اور ونتی کی پیدائش پر انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی شادی اپنے مالک کے لڑکے رامو سے کریں گے جس کی عمر پانچ سال تھی اور اس کے باپ کے بھٹے پر وہ خود منشی تھے۔ اور ایک دن دبی زبان سے انہوں نے لالہ جی سے ذکر بھی کیا۔ لیکن اس نے ہی ہی کرتے ہوئے کہا، "منشی جی جتنی چادر ہے اتنے ہی پاؤں پسارو"

اتفاق کی بات چادر بڑھتی گئی اور پاؤں چھوڑ ہاتھ پاؤں سبھی باون گز کے ہوتے گئے۔

سات سال کے بعد جب انہوں نے لالہ کے مقابلے میں بھٹہ قائم کیا بلکہ ایک آدھ سال میں لالہ والا بھٹہ بھی خرید لیا تو دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور ونتی اب خیر سے تیسری جماعت میں تھی اب منشی چرن داس کی نظر میں ٹھیکیدار شیو پرشاد کا لڑکا نرنجن تھا جو دسویں میں پڑھتا تھا۔ گھر میں کسی بات کی کمی نہ تھی۔ برادری بھی تھی اور بھاگ بھری کو بھی لڑکا پسند تھا۔ دبلا پتلا خاموش سا۔ کئی دفعہ جب ٹھیکیدار صاحب بھٹے پر آتے اور کچی پیلی اینٹوں کی اونچ نیچ کی بات کر کے چلے گئے تو بھاگ بھری نے چرن داس کو کہا بھی کہ ٹھیکیدار صاحب سے کہیں کہ نرنجن کو کھلایا پلایا کریں، کچھ جان آئے۔ اپنی ونتی کو دیکھو تو۔

لیکن جب لالہ چرن داس نے خود ٹھیکیداری شروع کی تو انجینئر صاحب کا لڑکا کانت ہر لحاظ سے موزوں تھا، صحت سے بھی اچھا تھا رنگ کو بہت صاف نہ تھا، لیکن بی ایس سی میں پڑھتا تھا اور انجینئر صاحب کا خیال اسے بھی انجینئر بنانے کا تھا اور جب ایک دن لالہ جی نے انجینئر صاحب کی دعوت کی تو بھاگ بھری نے انجینئر صاحب، ان کی بیوی اور سب بچوں کو اکیس سے لیکر پانچ پانچ روپے تک دیئے۔ ان دنوں ہونے والے رائے بہادر چرنداس

یہیں منڈھے چڑھ بھی جاتی لیکن ملک تقسیم ہو گیا۔ کوئی کہیں گیا، کوئی کہیں گیا نہ انجینئر صاحب کا پتہ تھا اور نہ انہوں نے رائے بہادر صاحب کی ٹوہ لینے کی کوشش کی۔

جب ادھر آ کے رائے بہادر صاحب نے ایک آدھ کارخانہ اور چند ایک مکانات الاٹ کروا لئے تو پانچ سات سال تو بزنس کو استوار کرنے میں لگ گئے۔ ونتی ان دنوں بی اے کر چکی تھی اور رائے بہادر صاحب کی نظر محکمہ سپلائی کے ڈپٹی سکریٹری کے صاحب زادے اوناش پر پڑی جو امریکہ میں بزنس ایڈمنسٹریشن کے تین سالہ کورس پر جانے والا تھا۔

دونوں خاندانوں میں بات تقریباً طے ہو چکی تھی بلکہ ونتی نے، جو اب ونیتا ہو چکی تھی، اوناش کے نام پر شرمانا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس ساری بات میں دقت صرف یہ تھی کہ لڑکا بضد تھا کہ وہ شادی امریکہ سے واپس آ کر کرے گا اور کورس شروع ہونے سے پہلے ہی رائے بہادر صاحب نے اسے ایک ہزار روپے ماہوار پر اپنی فرم میں بزنس ایڈوائزر مقرر کر لیا تھا اور لڑکے کے باپ کو یہ رقم ماہوار بطور تنخواہ صاحبزادہ پہنچنے لگی تھی۔ اور لڑکی کے لئے ماسوائے آگے پڑھنے کے چارہ نہ تھا۔

لیکن تین سال کا عرصہ بھی بہت ہوتا ہے۔ رائے بہادر صاحب اس اثنا میں کہیں کے کہیں پہنچ چکے تھے اور ونتی بھی اِن دنوں ایم اے ایل ٹی کر بیٹھی تھی اب ان کی نظر اپنے کلب کے ایک دوست جو کسی ٹریبونل کے چیئرمین تھے ان کے لڑکے پہ تھی۔ لڑکا آئی اے ایس تھا اور ان کے دوست کے خیال میں دگمبر سے بہتر دماغ شاید ہندوستان میں نہ ہو۔ اور شاید یہ دماغ اگر کسی مغربی ملک میں پیدا ہوتا تو آج تک قیامت آ گئی ہوتی۔

لیکن جب ایک دن ان کے دوست کی چیئرمین شپ کا عرصہ ختم ہو گیا اور لڑکا کہیں دور افتادہ مقام پر تعینات کر دیا گیا تو رائے بہادر صاحب کو اپنی اکلوتی لڑکی کو اتنی دور بھیجنا گوارہ نہ ہوا۔ آخر پانچ سات سو یا ہزار روپیہ ماہوار پانے والا لڑکا تو وہ کہیں بھی ڈھونڈ سکتے تھے اور ونیتا ان کی اکلوتی بچی تھی۔

جب ونیتا نے یہ سنا تو اس نے جھنجلا کے اس فیصلہ کو سراہا اور کہا کہ اب وہ مزید تعلیم کے لئے امریکہ جانا چاہتی ہے رائے بہادر صاحب کو کیا اعتراض تھا جب ان کے تمام دوست اپنے بچوں کی غیر ملکی تعلیم پر مفرور تھے بھلا وہ کیوں پیچھے رہتے۔

ونیتا جب امریکہ سے پی ایچ ڈی کر کے لوٹی تو وہ آدھی دنیا بھی ساتھ ہی ساتھ دیکھ آئی تھی۔ لندن، پیرس، الجیریا، جینوا، روم قاہرہ، ٹوکیو اور ہر جگہ کا ذکر اس پیرایے میں کرتی گویا وہیں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے ـــــ اب رائے بہادر صاحب کی گفتگو کا موضوع بیٹیا کی جہاں گردی کا ذکر تھا۔ انہوں نے ونیتا کے لئے ایک وزیر صاحب کے ہوشیار صاحبزادے کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی ایک مخالف پارٹی کے سربراہ تھے لیکن ان سے کیا ہوتا ہے۔ رائے بہادر صاحب تو خاندان کی شان بان پہ جان دیتے تھے۔ لیکن برا ہو سیاست کا اگلے الیکشن میں منسٹر صاحب چاروں شانے چت ہو گئے اور تب رائے بہادر صاحب کو یاد آیا کہ ان صاحب میں کتنی خامیاں تھیں ـــــ ونیتا انہیں دنوں وقت گزارنے کی خاطر یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئی تھی جہاں اسکی ملاقات پروفیسر ونیش شرما سے ہوئی۔ ایک ریٹائرڈ ڈاکٹر کا لڑکا جس کا باپ دور افتادہ قصبے میں پریکٹس کرتا تھا ایک دن دھان پان قسم کا اوسط جسم اور شکل و صورت کا مالک جو چہرے مہرے سے فلسفی لگتا تھا سگریٹ اور کتاب کے علاوہ اس کی زندگی کا اور کوئی ساتھی نہیں تھا ـــ شادی اپنا رنگ دکھا کے رہتی ہے چاہے منظوری کے ساتھ ہو یا بلا منظوری۔ اور جب رائے بہادر صاحب کو اطلاع ہوئی کہ ونیتا کے گھر لڑکا ہوا ہے تو صبر کے تمام بندھ ٹوٹ گئے۔ ایک روز شام کو جب کار کو اتم قلم سے بھیجے انہوں نے شوفر سے کہا کہ فلاں طرف چلو تو وہ حیرت سے انکا منہ دیکھنے لگا اس کے خیال میں وہ علاقہ رائے بہادر صاحب کیلئے آؤٹ آف باؤنڈ تھا لیکن جب اس نے دوبارہ ڈانٹ سنی تو سماعت پر یقین آیا ـــــ شریمتی اروڑہ نے جب ننھی سی جان کو دیکھا چھاتی سے لگایا تو ونیتا اندر آئی پروفیسر شرما ابھی کالج میں ہی تھے۔ رائے بہادر صاحب نے رسمی تعلقات بالائے طاق رکھ کے ننھے کے گالوں کو اپنی موٹی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا ـــــ "میرا بچہ!"

قیصر تمکین

الشجاع کراچی

پرانا مکان

پھوپی اماں نے رو رو کر پورا قصہ سنایا۔

مگر مجھ کو ہنسی آرہی تھی اور زبردستی سنجیدہ بنا ہوا بیٹھا تھا۔ ان کے جذبات مجھ کو بہت ہی مضحکہ خیز معلوم ہو رہے تھے مگر کھلم کھلا ان کا اظہار ناممکن تھا۔

ہوا یہ کہ ممو جان پر جب بہت قرضہ چڑھ گیا تو انھوں نے گڑھی والا آبائی مکان بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اس تقریباً نیم آباد قصبے میں جب اس محل نما مکان کا کوئی گاہک نہ ملا تو انھوں نے دوسری ترکیب سوچی یعنی یہ کہ مکان کھدوا کر اینٹیں، دھنیاں اور پھاٹک وغیرہ نخاس بازار میں بیچ دیں اور خالی زمین پر قلمی آم کا باغ لگا دیں۔

ویسے میرے خیال میں اس میں کوئی قباحت نہیں تھی مگر پھوپی اماں کی نسل کے لوگوں نے اس کو بہت اہمیت دی اور ہمارے پورے قصبے میں ہر ایک کا موضوع گفتگو ممو جان کی نئی اسکیم بن گئی۔

ممو جان بڑے شاندار انسان تھے۔ نواب بے ملک کے قصے سنے تھے یا پھر ممو جان کی شکل میں دیکھے۔ دوسری جنگ کے زمانے میں جب چیزیں [illegible] ہوگئی تھیں ممو جان نے لاکھوں کمائے مگر اسی طرح اڑائے بھی ان کی شاہ خرچیاں اور فیاضیاں جلد ہی ضرب المثل بن گئیں۔ ان پر ہر طرح کے الزام لگائے جا سکتے ہیں ہر برائی اور جھوٹ سچ ان کی ذات سے منسوب کی جا سکتی ہے مگر ایک عیب یعنی بخل۔ ایسا ہے جو ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان سے منسوب کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ یہ تو ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ جہاں کسی نے ممو جان سے ان کی کسی چیز کی تعریف کر دی تو بس پچھتانا تھا کہ ممو جان ضبط کر کے رہ جائیں۔ فوراً وہی چیز تعریف کرنے والے کی نذر کر دیتے۔ تعریف کرنے والا خواہ کتنا ہی کیوں نہ انکار کرے۔ مگر ممو جان مصر ہو جاتے اور اس کو یہ چیز بطور تحفہ قبول کرنے پر مجبور کر دیتے۔ ان کی اس عادت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے بھی کم نہ تھے یہی وجہ تھی کہ ممو جان کے گھر میں کوئی چیز کبھی زیادہ دنوں تک نہیں دیکھی جا سکی۔

لڑائی ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ممو جان کی آمدنی بھی گھٹ گئی اور گھٹتے گھٹتے یہ نوبت آپہنچی کہ ان کی کل تنخواہ ہی [illegible] تین یا سوا تین سو ہی تھی جس میں ان کا گزارہ ظاہر ہے کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا مگر ممو جان نے اپنی عادت ترک نہیں کی اب بھی جب کوئی کسی غرض سے ممو جان کے پاس جاتا۔ وہ بہر صورت اس کی حاجت روائی کرتے۔ اب خواہ چاہے ننھے گھر میں بچوں کو بغیر ناشتے کے اسکول جانا پڑے ان کو [illegible] پروا نہیں ہوتی۔

آنٹی ان کی عادت سے بہت پریشان تھیں۔ مگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر وہ خود بھی کچھ کم فیاض نہیں تھیں میں نے ایک دفعہ دیکھا عموجان نے کچھ رقم آنٹی کے پاس کسی کام سے رکھا دی مگر ہوا یہ کہ آنٹی کی کوئی جاننے والی آگئیں اور بولیں " دلہن برا نہ ماننا تمہارے پاس ایک ضرورت سے آنا پڑ گیا۔

" نہیں نہیں آپا جی کہیئے، آپ بھی کیا غیروں کی سی باتیں کرتی ہیں۔" آنٹی نے فوراً کہا۔

بھئی ہوا یہ کہ میں نے کچھ کپڑا خریدا ہے اور نپوا کر قطع بھی کرا لیا۔ مگر جب پرس میں دیکھا تو پورا سو روپے کا نوٹ گم۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ تمہارے بھائی صاحب کل ہی دورے پہ جا رہے ہیں ان سے اس بارے میں اس وقت تک کہہ بھی نہیں سکتی ہوں تم اگر یہ رقم دے دو تو میں تم کو وہ ایک ہفتے بعد ادا کر دوں گی۔"

"ارے تو اس میں پریشانی کی کیا بات۔ خدا کا شکر ہے اس وقت میرے پاس روپے موجود ہیں آپ بے شک لے جائیے واپسی کا کیا سوال آپ بھی کیا غیریت برتتی ہیں۔"

آنٹی نے فوراً روپے ان خاتون کو دے دیئے اور بھول بھی گئیں۔ مگر دوسرے ہی دن اتفاق سے عموجان نے اس کے بارے میں پوچھا آنٹی بہت سٹپٹائیں۔ مگر انھوں نے یہ بتانا پسند نہیں کیا کہ کن خاتون کو کس ضرورت سے دے دیئے انھوں نے ساری رقم عموجان کو دیتے ہوئے کہا باقی سو روپے انھوں نے خرچ کر دیئے ہیں۔

یہ تو ایک واقعہ ہے جس کا علم اتفاق سے مجھ کو ذاتی طور پر ہے مگر بہت سے ایسے ہی واقعات ہم لوگوں نے دیکھے اور سنے جن سے یہی ثابت ہوتا کہ دونوں میاں بیوی بالکل ایک ہی جیسے تھے۔

خیر تو ہوا یہ کہ آمدنی گھٹ جانے کی وجہ سے اور اخراجات کم نہ ہونے کی وجہ سے عموجان کو قرض لینا پڑا۔ اور لاکھ ہاتھ روکنے کے باوجود وہ کئی ہزار کے قرضدار ہو گئے۔ تنخواہ سے تو ادائیگی ناممکن تھی اس لئے انھوں نے پہلے تو انھوں نے وہ ایک باغ بیچے اور آخر میں گڑھی والا مکان جو برسوں سے خالی پڑا تھا۔ بیچ ڈالنے کا ذکر کیا۔ مگر اس مکان میں پھوپی اماں کا بھی حصہ تھا۔ پھوپی اماں کو اس حصے سے زیادہ مکان کا خیال تھا اس لئے وہ روتی دھوتی ہمارے یہاں پہنچیں اور ہمارے ابو سے رو رو کر تمام قصے سنانے لگیں۔ جس تشویش اور سنجیدگی سے پھوپی اماں کے معاصرین نے اس مسئلے پر غور کیا اس سے میں بھی ذرا سوچ میں پڑ گیا۔

میرے لئے مسئلہ صرف یہ تھا کہ گڑھی والا پرانا مکان جو برسوں سے اجاڑ پڑا تھا اور جس میں سوائے بھوت پریت کے کوئی نہ رہتا تھا کھنڈر والا تھا اس کی جگہ پر ایک قلمی آم کا باغ لگے گا جس سے کئی ہزار کی آمدنی ہوا کرے گی۔ اس مکان سے لوگوں کی محبت میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ ہم لوگ ہمیشہ شہروں میں کرائے کے مکانوں میں رہے اور کبھی بھی کسی مکان میں دو تین سال سے زائد نہیں رہے۔

مگر پھوپی اماں کے لئے اور عموجان کے دوسرے رشتے کے بھائی، بہنوں کے لئے اس معاملے کی نوعیت کچھ دوسری ہی تھی ان میں سے بہت سے لوگ گڑھی والے مکان میں پیدا ہوئے اور کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ ان کے بزرگوں کی یادیں اس مکان کے ایک ایک چپے سے وابستہ تھیں اور مکان کھودنا کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی زبردستی ان کی سوانح عمریوں کے اولین ابواب پھاڑ کر نذر آتش کئے دے رہا ہے۔

عموجان پر کسی کے صلاح و مشورے اور احتجاج کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کو اس مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کے والد نے کئی شادیاں کی تھیں اور کسی اولاد کو بھی ڈھنگ سے نہیں پالا تھا۔ بچپن میں عموجان ایک ایک چیز کے لئے ترستے تھے ان کا کہنا تھا کہ بائیس برس کی عمر تک ان کے ہاتھوں میں کبھی پورا روپیہ نہ آیا تھا۔ اس لئے جب انھوں نے کمانا شروع کیا تو جی بھر کے کمایا۔ جائز ناجائز طریقے سے اور خوب جی بھر کر اڑایا اپنی ایک ایک حسرت اور آرزو کو جو انھوں نے سینے سے لگا رکھی تھی اپنی جوانی میں جی بھر کر پورا کیا اور اب وہ قرضدار تھے اور قرض ادا کرنے کے لئے گڑھی کا مکان

بہت مدد دے سکتا ہے۔

"مجھ کو نہ اپنے باپ کی یاد سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اپنے منحوس بچپنے کی یاد سے، مجھ کو ماضی سے نفرت ہے اور ان تمام باقیات سے نفرت ہے جو مجھ کو یاد دلاتی ہیں کہ باوجود باپ کے ہونے کے میں یتیمی کی زندگی گزارتا رہا۔ میں تو اس مکان کو خاص طور پر کھدوا کر پھینک دوں گا۔ عمو جان نے ایک دن مجھ سے جوش میں کہا۔

دنیا کچھ کہے مگر میں عمو جان سے متفق ہوں۔ ان کی باتوں سے متاثر تھا اور ان کے اس اقدام کا حامی تھا۔

ایک اتوار کا ذکر ہے۔ کسی عزیز کے یہاں کوئی تقریب تھی سب لوگ وہیں گئے ہوئے تھے۔ میں گھر میں اکیلا بیٹھا نئے نئے ریکارڈ بجانے چلا جا رہا تھا کہ پھوپی اماں ہانپتی کانپتی پہنچیں۔ "چلو بیٹا میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔ خیریت تو ہے؟"

"بس چلو۔ گیارہ بجے کی بس سے مجھے پہونچنا ہے۔"

پھوپی اماں کی بات ممکن ہے میں ٹال دیتا مگر مجھے ابو کا خیال آگیا کہ وہ خفا ہوں گے اس لئے میں ان کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا راستے بھر پھوپی اماں سسکیاں بھرتی رہیں اور بڑبڑاتی رہیں بس میں دوسرے مسافر بھی تھے مگر خیریت گزری کہ ان میں سے کوئی مجھ کو نہیں جانتا تھا ورنہ بڑی شرمندگی ہوتی۔

قصبے میں پہنچتے ہی انھوں نے فوراً ڈولی منگائی اور کہاروں سے گڑھی چلنے کو کہا۔ میں بھی حیران حیران سا ڈولی کے پیچھے ہی چل پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا گڑھی کے مکان پر بہت سے مزدور لگے ہوئے تھے اور اس وقت ان کے بڑے بڑے ہتھوڑے دیوان خانے پر برس رہے تھے انھوں نے دیوان خانے کے دو دروازے الگ کر دیئے تھے اور ہاں عجیب منڈا منڈا سا معلوم ہو رہا تھا۔

پھوپی اماں دوڑی دوڑی گئیں ان کو پردے کا بھی خیال نہ رہا۔ بس مجنونوں کی طرح چلانا شروع کر دیا۔ "نکل جاؤ، دور ہو جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ مکان نہیں کھدے گا، نہیں کھدے گا۔

سب حیرت سے دیکھنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ حافظ نبی احمد گھبرائے ہوئے آئے انھوں نے پھوپی اماں کو بے پردہ دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ تمام مزدور حیران کھڑے تھے اور پھوپی اماں برابر چلائے جا رہی تھیں۔ "مکان نہیں کھدے گا۔"

میں ان کو زبردستی پکڑ کر اندر لے گیا وہ بیچ والے دالان میں گر کر زور زور سے رونے لگیں اور صدمے سے بے ہوش ہو گئیں۔

حافظ نبی احمد نے ڈولی منگوا کر ان کو قصبے کے ایک اور مکان میں بھجوا دیا۔

عمو جان کو شاید اس واقعے کی خبر نہ تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ ہتھوڑے چلتے رہے اور دھیرے دھیرے کر کے شام تک پورا دیوان خانہ ایک بھیانک کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔

پھر مجھے خبر نہیں کیا ہوا اگر معاملہ روایت کے باوجود میں پھوپی اماں کے طرز عمل کو جائز نہیں سمجھ سکا۔ پورا مکان کھد کر ناپید ہو گیا اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر لوگوں نے عمو جان کو خوب برا بھلا کہا مگر دیوان خانے کے دروازے اور مکان کے بڑے بڑے پھاٹک نخاس بازار میں بک رہے تھے۔

پھر اس واقعہ کو کئی سال گزر گئے۔

میں یونیورسٹی میں اپنے چار سال گزارنے کے بعد رخصت ہو رہا تھا ہوسٹل کا بائیں بازو کا کمرہ جس میں چار سال سے مقیم تھا مجھ سے چھوٹ رہا تھا اور یہ سوچ کر کہ اب زندگی میں شاید ہی کبھی یہاں آنا ہو بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔

سامان بندھتے ہی ہوسٹل کا ملازم میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"بھیا سب لڑکے لوگ یہی کہہ جاتے ہیں پھر کوئی کو یاد نہیں رہتا ہے۔" اس کے معصوم لہجے نے مجھ کو اور بھی افسردہ کر دیا۔

اپنے پیشرووں کی تقلید میں میں نے بھی ہوسٹل کے ٹینس کورٹ کے حاشیہ پر ایک درخت کی قلم لگائی اور ہری سے اس کی خصوصی نگہداشت کی اپیل کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوا۔

ہری نے بڑی محبت سے میرے ماتھے پر تلک لگایا اور رخصت ہوتے وقت رو پڑا۔

سال ڈیڑھ سال تک میں نے یونیورسٹی کی خبریں بڑی دلچسپی سے پڑھیں پھر میں بھول بھی گیا کبھی میرا کوئی تعلق بھی اس یونیورسٹی یا شہر سے رہا تھا دن گزرتے دیر نہیں لگتی ہے مجھ کو وہ شہر اور یونیورسٹی چھوڑے ہوئے ۹ برس ہوچکے ہیں مگر یہاں آج ۱۹۶۷ء کی ایک اکیلی اکیلی اور بے انتہا سرد اور خاموش رات کو میں پھر اداس ہوں۔ میرے دوست نے ادھر ادھر کی باتیں لکھتے ہوئے خط کے آخر میں یہ بھی اطلاع دی ہے کہ ہماری یونیورسٹی والا محبوب ہوسٹل منہدم کرا دیا گیا ہے جس جگہ ہم لوگوں نے درخت لگائے تھے وہ پوری کھدوا دی گئی ہے اور وہاں ایک بہت بڑا پوسٹ گریجویٹ ہوسٹل بن رہا ہے۔

مجھ کو اپنا کمرہ یاد آیا اور پھر تمام باتیں تمام شوخیاں اور شرارتیں جو ان دنوں سے وابستہ تھیں یاد آئیں اور میں نے حسرت سے سوچا کہ اب وہاں کچھ نہ ہوگا۔

مجھے کچھ رونا سا آگیا۔ مگر میرا فرانسیسی دوست ویدے میری حماقت پر ہنس پڑا۔ اس کمرے اور ہوسٹل سے میری وابستگی اس کی سمجھ میں آہی نہیں سکی۔

ایس۔ایم۔حیات

شاعر۔بمبئی

چوری

اسکول کے روزآنہ کام سے فارغ ہوکر پدما گھر لوٹی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ اسے گرم گرم کافی کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ اسکول سے لوٹ کر کافی پینا اس کا معمول تھا لیکن آج اسے مایوسی ہوئی گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا خادمہ گھر کے باہر دہلیز سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے ناراضگی کی کیفیت عیاں تھی۔ آج اس نے پدما کا خیر مقدم بھی نہیں کیا۔ باورچی برآمدے میں کھڑا تھا۔ مکان کے اندر سے تیز تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کچھ پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس ہنگامہ کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ کمرہ میں داخل ہوتے وقت اسے بینا ملی لیکن وہ پدما سے اس طرح کترا کر نکل گئی جیسے اس نے پدما کو دیکھا ہی نہ ہو۔ گیتو کھیلنے کے لئے باہر نکلا ہی چاہتا تھا۔ پدما کو دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل کر دیئے اور کہا "ماں بہت غصہ میں ہے۔" ماں کی آواز اسکے کمرے صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ پدما اور اس کے اسکول کے کام پر رائے زنی کر رہی تھی۔

پدما خاموش و ساکت کھڑی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار کسی دست نگر شخص کی تذلیل کا شدت سے احساس ہوا۔ اپنے قلبی تاثرات اور جذبات کے اظہار کی ہمت اس میں ختم ہو چکی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے کمرہ کی تلاشی لی گئی ہے۔ اس کی میز کی دراز باہر کی طرف کھینچی ہوئی تھی اور اسے بند کیا گیا تھا۔ چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے کے بعد تیزی کے ساتھ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کتابیں، اون کے گولے، کاغذات اور دوسری چیزیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سوچنے جیسے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس نے شانوں کو جھٹکا دیا۔ مایوسی کے عالم نے اسے سرد بنا دیا۔ کئی سوال اس کے ذہن میں بُری طرح چمٹ چکے تھے۔ اس کے صندوق میں انھیں کس چیز کی تلاش تھی؟ اس کا صندوق کھلا کیوں چھوڑ دیا گیا؟ انھوں نے صندوق کا تالا توڑ دیا تھا۔ ساڑھیاں جنھیں وہ بڑی احتیاط سے رکھا کرتی تھی بے ترتیب پڑی تھیں۔ کپڑوں کی تہوں تک کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پیسوں کا صندوقچہ بھی اپنی جگہ سے دور ایک کونے میں پڑا تھا۔ چند بٹے اور جڑاؤ پن فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ صندوق، میز اور بستر ان سب پر تلاشی کے نقوش ثبت تھے۔ لیکن اس تلاشی کا مقصد کیا تھا؟ آخر یہ تلاشی کیوں؟ اس کے کمرہ کی تلاشی کس لئے لی گئی۔

سوچ میں ڈوبی ہوئی وہ بے ترتیب چیزوں کو پھر قرینے سے رکھنے لگی۔ اس کی غیر حاضری میں اس کے صندوق کی تلاشی لینا کتنی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ اس کے صندوق میں کئی چیزیں ایسی بھی تھیں جنھیں وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسرے دیکھیں اور ان کے متعلق جانیں۔ ڈائری، ماں کے پاس سے آئے ہوئے خطوط، ٹکٹ کا البم، سب کچھ تھے۔ اسے یاد آیا، اس نے بستر کے نیچے اپنے پسندیدہ فلمی گانوں کی چند کتابیں چھپا رکھی تھیں۔ اس تصور کے ساتھ کہ اس کا بھید ساس ماں پر کھل چکا ہے۔ پدما شدید غصہ اور شرم کی ملی جلی کیفیتوں میں ڈوب گئی۔ ناراضگی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ اس کی کنپٹیوں، اس کے دل میں اور اس کے دل کی گہرائیوں میں جذبات کی لہروں کا ارتعاش محسوس ہونے لگا۔

کپڑے بدل کر پدما کمرہ سے باہر آئی۔ اسے کافی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ باورچن کے پاس گئی جو برآمدے میں بیٹھی تھی۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" پدما نے سوال کیا۔

"میں نے اپنی ملازمت چھوڑ دینے کی ٹھان لی ہے۔ پھر کبھی اس ڈیوڑھی پر قدم نہ رکھوں گی!"

"آخر کیوں؟ کیا ہوا ہے؟"

"تمہاری مامی کا کچھ پیسہ کھو گیا ہے۔ ہر ایک سے پوچھتی رہیں اور سب کی تلاشی لیتی رہیں۔ انھوں نے میری بھی ایک ایک چیز کی تلاشی لی لیکن بھگوان گواہ ہے میں نردوشن ہوں۔"

گھر میں پھیلی ہوئی ابتری کا راز پدما پر اب عیاں ہوا۔ اس کے کمرہ کی بھی پوری تلاشی لی گئی تھی۔ کیا اس پر بھی شک کیا گیا تھا۔ اسکے چہرے پر موت کی زردی پھیل گئی اور فرطِ الم سے اس کا انگ انگ کانپ اٹھا۔

"تمہارے کمرے کی بھی تلاشی لی گئی مگر وہاں کچھ نہیں ملا...."

میرے کمرے کی تلاشی؟

"ہاں، تمہارے ماما جی نے اعتراض بھی کیا تھا۔ لیکن مامی نے اسے اَن سنی کر دیا اور انھوں نے تمہارے صندوق کا تالا توڑ کر ہی دم لیا۔"

"یہ کتنی ذلیل حرکت ہے، توہین آمیز!" پدما غصے میں بڑبڑانے لگی۔ "کیا حق ہے انھیں مجھ پر شک کرنے کا! میری غیر حاضری میں میرے صندوق کی تلاشی لینے کا؟"

وہ کر بھی کیا۔ مانا کہ تم ان کی رشتہ دار ہو، کام سے لگی ہوئی ہو۔ پھر بھی تم ان کے سہارے ہو، کیونکہ تم کنواری ہو۔ تم اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتیں تو بات ہی اور ہوتی۔"

پدما کے سینے میں جیسے کسی نے زہر میں ڈوبا ہوا خنجر گھونپ دیا ہو، وہ تلملا اٹھی۔ جذبات پر قابو پانا اس کے لئے محال تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ اس سے بڑھ کر بے عزتی اور کیا ہو سکتی ہے؟ وہ بستر پر گر پڑی اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ وہ گھر میں غیر نہیں تھی رشتہ دار تھی۔ چوری کے سلسلہ میں اس پر شک و شبہ! کیا فرق رہ گیا اس میں اور اس گھر کی باورچن میں۔؟؟

تاریکی کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ گھر کے سارے چراغ جل اٹھے۔ کرتوکمیل سے فارغ ہو کر گھر واپس آچکا تھا۔ ماما جی کے سوا گھر کے سب لوگ گھر میں موجود تھے لیکن سب کے لبوں پر مہر خاموشی ثبت تھی۔ گھر کی فضا سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ چہار دیواری میں ایک طوفان گھر کے رہ گیا ہے۔ تنہائی کا احساس اسے کھائے جا رہا تھا۔ اس کی طرفداری کون کرے گا؟ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار وہ کس سے کرے؟ وہ کیسے اپنا دل دکھائے؟ اس کی ماں بھی تو اس سے بہت دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے۔ وہ چھوٹی سی تھی تبھی اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے ماما کے یہاں شہر آگئی تھی۔ انھوں نے اس کی پرورش اور تعلیم کا ذمہ اپنے سر لے لیا تھا۔ ماں ہر مہینہ اس کے خرچ کے لئے اپنی چھوٹی سی پونجی میں سے جو اپنی زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کے منافع کی صورت میں پاتی تھی کچھ رقم ماما جی کے نام بھیجا کرتی تھی۔ پدما جانتی ہے کہ ماما جی اس رقم کو کبھی قبول نہ کرتے لیکن اس کی مامی؟؟

تعلیم کا سلسلہ ایک خاص موڑ پر پہنچ کر رک گیا۔ پدما نے ٹیچرس ٹریننگ حاصل کی اور اسی اسکول میں استانی کی جگہ مل گئی۔ ماں کا سینہ اپنی بیٹی کی اس ترقی پر فخر سے پھول گیا۔ بے چاری یہ سمجھ نہ سکی کہ پدما کی چھوٹی سی تنخواہ ستر روپے، اس کے لئے مشکل ہی سے کافی ہوں گے۔ پدما اپنی تنخواہ میں سے ہر مہینہ ماں کے نام بیس روپے بھیجا کرتی تھی اور اپنے ماما جی کو تیس روپے دیتی۔ باقی بیس روپے اس کے ذاتی اخراجات کے لئے کم ہی ہوتے تھے یہاں تک کہ اسکول جانے کے لئے سلک کی ایک اچھی ساڑھی بھی نہ خرید سکتی تھی۔ لیکن کیا وہ اتنی سی بات کے لئے چوری کا تصور تک کرے گی۔ اف!

کتنی نیچ اور ذلیل حرکت !!

"کھانا تیار ہے، ماں نے تمہیں بلایا ہے" اس کی ممیری بہن جیا آئی اور ساڑھی کا پلو کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔

وہ حیران تھی۔ اس کی مامی اسے کھانے کے لئے بلا رہی ہے؟ وہ جانتی تھی کہ مامی رسوئی گھر میں تنہا ہوگی۔ کیا اسے بلانے کا مطلب اس سے اس چوری کے بارے میں پوچھنا ہے؟ سر نیچا کئے چپ چاپ وہ دسترخوان پر بیٹھ گئی۔ بھوک کے باوجود وہ کچھ نہ کھا سکی۔

"آج تمہیں یہ چپ کیوں لگی ہے؟" مامی نے سکوت توڑا۔

"جی نہیں! کوئی بات نہیں، مامی!"

"تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نظر نہیں آ رہی ہے؟"

مامی کی آواز میں غیر معمولی شفقت اور رحمدلی کی گھلاوٹ تھی۔ اس نمایاں تبدیلی میں کس ارادے کو دخل تھا؟ پدما کے چہرے پر مامی کی معاملہ فہم نگاہیں جمی رہیں۔

"طبیعت تو تمہاری ٹھیک نظر نہیں آ رہی ہے مامی" پدما نے جواب دیا۔

"دل جلی کو اور کیوں چھیڑتی ہو۔ میں پہلے ہی سے پریشان ہوں۔ صحت کی قیمت دو سو روپے سے کئی گنا بڑھ کر ہے"

"دو سو روپے! کیا کھو دیئے تم نے مامی؟"

"پتہ نہیں تمہیں؟ سچ؟؟"

"مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ کچھ کھو گیا ہے لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ کیا کھو گیا ہے"

"تمہارے ماما جی بنک سے نکال لائے۔ سو سو روپے کے دس نوٹ۔ بالکل نئے! مینا کے لئے زیور بنانا چاہتی تھی۔ صندوقچی میں رکھ کر تالا لگانا بھول گئی تھی۔ آج دوپہر جب سنار گھر آیا تو میں نے روپیوں کے لئے صندوقچی کھولی اس میں صرف آٹھ نوٹ تھے اور پورے دو سو روپے غائب!"

"تعجب کی بات ہے!"

"تعجب تمہیں ہوگا، مجھے نہیں۔ کوئی غیر تھوڑے ہی گھر میں آکر پیسے اڑا لے جائے گا۔ اور اگر وہ غیر ہوتا تو کیا باقی آٹھ سو روپے صندوقچی میں چھوڑ جاتا؟"

پدما کو ایسا معلوم ہو رہا تھا مامی کی نظریں اس کے چہرے میں چبھتی چلی جا رہی ہیں۔ اس نے اپنا سر اسی طرح جھکائے رکھا۔ اس کا حلق سوکھ گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ چیخیں مار کر رو پڑے۔ اس نے اپنے کانپتے ہونٹوں پر دانت پیوست کر دیئے۔

"مجھے کسی بات کا ملال نہیں ہے، لیکن میری رقم پر ڈاکہ ڈالنا یہ سراسر احسان فراموشی اور ناشکر گزاری ہے۔ میرے احسان مند، میرے رحم و کرم اور میرے احسانات کا معاوضہ اسی طرح چکاتے ہیں!" مامی نے کہا۔

پدما کے ضبط کا بندھ ٹوٹنا چاہتا تھا۔ وہ کھانے کی تھال پر سے اٹھ کھڑی ہوئی ہاتھ صاف کئے اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ اسے اگلے دن پڑھانے کے اسباق پر نوٹس تیار کرنے تھے ——— لیکن اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ چراغ بجھا کر پلنگ پر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ اپنی ماں کی گود میں اپنا منہ چھپا کر اپنا سارا دکھڑا سنا دیتی۔ لیکن اس کی ماں کے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس چلی آتی۔ پدما یہاں کسی ویران بیابان میں اپنے بیگانوں سے بچھڑے ہوئے راہی کی طرح اپنے دن گزار رہی تھی۔

وہ ساری رات سو نہ سکی۔ ساری رات سوچ میں ڈوبی رہی۔ وہ سوچنے لگی جتنی جلدی ہو سکے اسے اس گھر کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اسے اس گھر میں اب ایک دن بھی نہ رہنا چاہیئے۔ وہ جانتی تھی کہ ہوسٹل میں وارڈن کی جگہ پر ابھی کسی کا تقرر نہیں ہوا ہے۔ وہ اس جگہ کو پا سکتی ہے۔ اسے رہائش کے علاوہ ایک

گو بھی مل جاتے اور اسے کچھ تنخواہ بھی ملتی رہے گی ۔ کمانے کے اخراجات بھلے بڑھیں گے اسے اس کی پروا نہیں ۔ وہ اپنی آمدنی ہی میں سب کچھ سنبھال لے گی لیکن وہ آزاد تو رہے گی ۔ اسے گھر چھوڑتے دیکھ کر مامی کی خوشی اور دوگنی ہو جائے گی ۔ مینا بھی اس کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کرے گی ۔ وہ ابھی بچی جو ہے ۔ اگر کسی کو اس کے نہ رہنے کا احساس ہوگا تو صرف اس کے ماما کو ۔ وہ اسے بہت چاہتے ہیں بہت پیار کرتے ہیں ۔ وہ بھی ان کا ہر کام نہایت عقیدت اور تندہی کیساتھ انجام دیتی رہی تھی ۔ ان کے نہانے کا گرم پانی وہ خود تیار کرتی ۔ ان کی چیزوں کو قرینہ سے رکھتی ۔ اور رات کو سونے سے پہلے ان کیلئے دودھ لے جاتی تھی ۔

اپنے ماما کی ذات میں پدما کو کھوٹ اور خود غرضی سے پاک پُرخلوص اُلفت نظر آئی ۔ وہی ایک تھے جو پدما کو اس گھر میں حد درجہ پیار کرتے تھے ۔ پدما سوچنے لگی اس کے دل میں بھی ماما سے جُدائی کا احساس کانٹے کی نوک کی طرح کھٹکے گا اور نہ جانے کتنے دنوں تک کھٹکتا رہے گا ۔

دوسری صبح پدما ایک مستحکم ارادے کے ساتھ بیدار ہوئی اور اپنا سامان باندھنے لگی ۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ اپنی روانگی کو ملتوی کر دے تو شاید اس کے ارادے پر کمزوری غالب آ جائے ۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں ؟" اس کے ماما نے کہا ۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں پدما کے کمرے تک چلے آئے تھے ۔ اور ایک دبی ہوئی نرم آواز میں داخلے کی اجازت طلب کر رہے تھے ۔ "کیا میں اندر . . . ؟"

"آجایئے ماما جی !"

وہ اندر چلے آئے اور چند لمحوں کے لئے گم سُم کھڑے رہے ۔

"یہ سب کیا ہے ؟" صندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے پدما سے پوچھا ۔

پدما ایک لمحے کے لئے جھجکی پھر اپنی تمام تر ہمت کو مجتمع کر کے اس نے جواب دیا "میں اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں "

"کہاں ؟"

"ہوسٹل "

"آخر ہوا کیا ہے یہاں ؟"

پدما اس سوال پر چونک پڑی ۔ اس کے ماما جی اس طرح پوچھ رہے تھے جیسے گھر میں برپا قیامت سے بالکل ناواقف ہوں ۔

"کچھ نہیں ۔ ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتی "

"اب سمجھا " تمہاری مامی کے سلوک کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں ۔ بیٹی میں مانتا ہوں اس نے سمجھداری سے کام نہیں لیا "

"میں بنتی کرتی ہوں ماما جی ! مجھ سے یہ سب کچھ نہ کہیئے "

"تو کیا تم نے مجھ بدنصیب کو اکیلا چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے ؟ کیا میں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں ؟ میں جانتا ہوں تمہاری آن کو ، تمہارے دل کو گہری چوٹ پہنچی ہے "

"ماما ۔ یہ میری آن کا سوال نہیں ہے ۔ سوال ہے میری خودداری کا ۔ مجھ پر شک کیا گیا ہے چوری کا ۔ میرے صندوق کا تالا توڑ کر اس کی تلاشی لی گئی اور آپ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی چپ رہے !"

"یہ سراسر میری غلطی ہے پدما ! خطاوار دراصل میں ہوں ۔ مجھے اقبالِ جرم کر لینا چاہیئے تھا "

"اقبالِ جرم ؟ ۔ کیسا جرم ؟ ۔ کیسا اقبال ؟"

"وہ روپے میں نے چرائے ہیں "

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟؟"

پدما پانچ سو روپے میں نے اٹھائے تھے۔ بازار میں اچانک تمہارے گاؤں کے منصف سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ چند دن پہلے تمہارے گھر کی پچھلی دیوار شدید برسات کی وجہ سے گر گئی ہے۔ تمہاری ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس حادثہ کی خبر مجھے ہو۔ وہ تمہیں بھی پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی اسے ہماری مالی حالت کا بخوبی اندازہ ہے۔ میں نے سوچا دیوار کی مرمت کے بغیر وہ اس مکان میں کیسے رہ سکتی ہے۔ سر چھپانے کیلئے دوسرا کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں میں نے سوچا بہت سوچا۔ لیکن تمہاری ماجی کی صندوقچی سے دو سو روپے اڑانے کے سوا دوسرا کوئی اور چارہ نہ تھا۔"

سامان باندھنا چھوڑ کر پدما پتھر کی مورتی کی طرح ساکت و صامت کھڑی ہو گئی۔ اس کے ماجی کے الفاظ رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اسکے دل میں اپنے ماجی کے لئے پھر وہی بے انتہا عقیدت پیدا ہو گئی۔ اس کے ماجی سارے کنبے کے سرپرست۔ چوری کریں اور وہ بھی اپنے لئے نہیں اس کی ماں کیلئے ماں کے لئے کیوں خود اس کے لئے۔ اپنی ساری ضروریات کو پس پشت ڈال کر اس کے ماما نے اس کی اور اس کی ماں کی مدد کی۔ اس عظیم قربانی کے آگے اسکے وقار کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔

پدما اپنے ماماجی کے قدموں میں گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھے شما کر دو ماماجی! میں سچ مچ باوری ہوں۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔ کہیں نہ جاؤں گی ماماجی۔ کہیں نہیں!"

ماما نے شفقت سے پدما کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "پگلی تجھے جانے کون دیتا!"

پدما نے معصوم بچی کی طرح اپنی لمبی لانبی پلکیں اٹھا کر ماماجی کو دیکھا اور ان کے سینے پر سر ٹیک دیا۔

(ترجمہ۔ لکشمی سبرہم کی تامل کہانی سے)

چندر کرن سون رکسا

آجکل۔ دہلی

شکستِ خواب

شام ہو چلی تھی۔ روپ بازار کے سب آباد کوٹھے بجلی کے لال پیلے ہرے نیلے قمقموں سے جگمگا اٹھے۔ دن بھر بے رونق رہنے والے کمرے اس وقت سفید چاندنی، گاؤ تکیے، پاندان، خاصدان وغیرہ سے آراستہ ہو کر گجرے اور پھولوں سے مہک اٹھے۔ کہیں سے گھنگھروؤں کی آواز آ رہی تھی کہیں طبلے کے ساتھ سارنگی کے سُر ملائے جا رہے تھے مگر زہرہ کا کوٹھا اس وقت بھی تاریک تھا۔ وہ کئی ماہ سے بیمار تھی، لہٰذا وہ پروانے جو اس کی شمعِ حسن پر منڈلایا کرتے تھے، ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ ایسا نہ تھا کہ اُسے کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ بازار کی تمام ناچنے والیاں دن بھر اس کے پاس جمع رہتی تھیں، خدمت، تیمار داری اور علاج میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ بوڑھے استاد جی بھی دن کا کافی وقت زہرہ کے پاس گزارتے تھے۔ تقریباً تین ماہ سے تنخواہ کے نام پر ایک پیسہ بھی نہ ملنے پر استاد جی زہرہ کی گیارہ سالہ لڑکی کو ناچ گانا سکھانے میں کبھی ناغہ نہ کرتے۔ لیکن شام سے آدھی رات تک روزگار کا وقت رہتا ہے اس لئے اس وقت زہرہ اکیلی ہی رہتی۔ بوڑھی خادمہ نے زیرو پاور کا بلب جلا کر پوچھا۔ ”بیگم دودھ لے آؤں۔؟“

دودھ، بیماری اور دودھ۔ زہرہ کو دودھ کے نام سے چڑ ہو گئی تھی مگر دودھ نہ پیئے تو کمزوری کیوں کر دور ہو۔ طاقت کا دوسرا نام حسن و جوانی ہے۔ دودھ تو پینا ہی پڑے گا۔ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لے آیئے۔“

گندے بستر پر لیٹی ہوئی زہرہ سوچ رہی تھی۔ کیا زندگی ہے میری...... کیڑے مکوڑے سے بھی بدتر۔ لاکھ مخمل پہنیں، میوے مٹھائیاں کھائیں لیکن ایک غریب مزدورنی بھی ہمیں اپنے سے گئی گزری سمجھتی ہے اور کیوں نہ سمجھے۔ وہ مزدوری کرتی ہے، اپنی محنت بیچتی ہے۔ محنت ہاتھ پیر کا میل ہے اور ہم لوگ فروخت کرتے ہیں جسم، عزت، پاکیزگی، اس کی کوئی برابری نہیں ہے۔ مگر زندگی کی دھندلی شام جب ہمارے تھکے ماندے جسموں پر جھریاں بن کر ابھرنے لگتی ہے۔ تب ان خریداروں میں سے کوئی جھانکنے بھی نہیں آتا....... دروازے پر آہٹ سن کر اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ امی امی پکارتی ہوئی جوہی آ کر ماں سے لپٹ گئی اور اس کے پیچھے بوڑھے استاد جی بھی داخل ہوئے۔

”بڑا اچھا تماشہ تھا امی۔“ جوش میں جوہی بولتی گئی۔ ”ایک میری برابر کی لڑکی نے کتھک ناچ دکھایا۔ اسے تین تمغے چاندی کے ملے اور ایک بڑی لڑکی نے بھرت ناٹیم دکھایا، ایک نے ستار پر شیام کلیان بجایا....... امی میں بھی کتھک سیکھوں گی اور تم مجھے اسکول پڑھنے کیوں نہیں بھیجتی ہو...... ؟“ بیٹی کے سلسلۂ کلام کو روکتے ہوئے زہرہ نے کہا۔ ”اچھا اچھا جا کر کپڑے بدل اور کھانا کھا۔“

”نہیں پہلے وعدہ کرو کہ مجھے اسکول بھیجو گی۔“

”بھیج دوں گی بابا۔“ زہرہ نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ جوہی اپنا ریشمی غرارہ سرسراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"اب جلدی سے تندرست ہو جاؤ زہرہ بائی۔" استاد جی نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "سنگترے کا عرق پیا یا نہیں اور دودھ صرف ایک پیالہ لیا۔ واہ۔ اس طرح کہیں طاقت آسکتی ہے۔ ابھی چار پانچ سال تک تو تمہیں اپنا خیال رکھنا ہی پڑے گا پھر جوہی بیٹی تیار ہو جائے گی۔ تو انشاء اللہ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ واہ کیا خوب گلا پایا ہے۔ اور پاؤں تو طبلے کی تھاپ کے ساتھ یوں تھرکتے ہیں جیسے پانی میں کہتا ہوں دیکھنا تو سہی جس دن اپنی جوہی نے محفل میں قدم رکھا، سارے بازار کی رونق سمٹ کر تمہارے کوٹھے پر چلی آئے گی۔"

"مگر استاد جی! میرا ارادہ جوہی کو محفل کی شمع بنانے کا نہیں ہے۔"

"تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔۔" استاد جی چونکے، ہکلاتے ہوئے بولے "کیا شادی کر دینے کا ارادہ ہے۔ بائی جی اس خیالِ خام کو دماغ سے نکال ہی دیجئے تو بہتر ہے۔ کوئی شریف آدمی رنڈی کی لڑکی کو اپنی دلہن بنانے کو تیار نہ ہوگا۔"

"ہوں۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میری دلی خواہش ہے کہ وہ اگر کسی اچھے خاندان کی دلہن نہ بھی بنے تو کم از کم اس پیشے سے آزاد رہے۔"

"ایں" استاد جی نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "بڑھاپے میں تم کیا کرو گی بیگم؟ دو مہینوں میں دیکھو کیا حال ہو گیا، مکان کا کرایہ، بنیا۔ دھوبی، دودھ والا، سب کی مقروض ہو گئی ہو۔ تم پہ خدا کا کرم ہے اس نے چاند سی بیٹی عطا فرمائی ہے ورنہ دوسری ہم پیشہ عورتوں کی طرح ادھر ادھر لڑکی تلاش کرتی پھرتیں۔ خانم نے تمہیں بھی تو چار سو میں خریدا تھا تعلیم دے کر تیار کیا پھر بڑھاپے تک آرام سے پان چباتی رہیں۔"

"کاش مجھے تعلیم کے بجائے زہر دے دیا ہوتا۔" زہرہ نے آہ بھری۔ "نہیں استاد جی میں تو نہیں چاہتی کہ ہماری جوہی برتن صاف کر کے دن گزارے مگر اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ پاپی پیٹ کے لئے اپنی جوانی کی دکان نہ سجانی پڑے۔ مگر اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ ناچنا گانا بڑے بڑے شریف گھروں کی بہو بیٹیاں سیکھنے لگی ہیں۔ نوکری کرتی ہیں، وکالت کرتی ہیں تو کیا میری جوہی کوئی ایسا ہی سکھانے پڑھانے کا کام کر کے گذر بسر نہیں کر سکتی؟ محبت کر کے کسی پر نثار ہو جائے یہ بات الگ ہے مگر اسے پڑھنے لکھنے کا کتنا شوق ہے۔ میں اسے پڑھاؤں گی اور اونچے درجے کی موسیقی سکھاؤں گی تاکہ وہ اپنے ہنر سے روٹی کما سکے۔ اسے وہ فخر حاصل ہو جو ایک مزدوری کرنے والی پاک دامن عورت کو ہوتا ہے مگر ہماری ایسی عورتوں کو حاصل نہیں ہوتا، خواہ ہم بہت امیر ہی کیوں نہ ہوں۔"

استاد جی نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن سوچ سمجھ لو۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ نو بجے گلاب بائی کی محفل میں طبلے پر سنگت کرنی ہے۔"

"سلام۔"

استاد جی دعائیں دیتے ہوئے باہر چلے گئے۔

شریف بننے اور سمجھے جانے کی تمنا اور کسی شخص کی ہمیشہ ہو کر زندگی بسر کرنے کی آرزو زہرہ کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی اب اپنی جوہی کے لئے وہ اسی خواب کو حقیقت میں بدل دینا چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا شہر میں کئی اسکول کھل گئے ہیں جہاں بڑے گھروں کے بچے ناچ گانا سیکھتے ہیں۔ کتھک ناچ کے مشہور استاد سے اس نے التجا کی کہ اس کی لڑکی کو اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ وہ اس کو محفل کے رقص نہیں سکھانا چاہتی۔ استاد جی بھی جوہی کو ٹھمری، دادرا اور قوالی کے بجائے دوسرے تمام راگ راگنیوں کی تعلیم دینے لگے۔ ماسٹر سے گھر ہی پر کورس ختم کرا کے اسے ساتویں جماعت میں شہر کے ایک ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ جوہی اس کو روزانہ آکر سناتی "امی میری بہت سی سہیلیاں بن گئی ہیں۔ ... صاحب کی بیٹی اوشا تو مجھے آج اپنی موٹر میں لے جا رہی تھی۔ امی ڈاکٹر بھاٹیہ کی اندرا کو جو ماسٹر ستار سکھاتے ہیں وہ چالیس روپے ماہوار لیتے ہیں۔ امی ہماری شمیم بہن جی بہت اچھی ہیں۔ میں بھی پڑھ لکھ کر استانی بنوں گی۔ امی گانا سکھانے والی بہن جی کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے ہیں

میں بڑی ہو کر اپنے اسکول میں گانا سکھلاؤں گی ـــ امی جب میں گانے لگوں گی تب تم یہ گانا بجانا بند کر دینا۔ مجھے یہ گانا سننے والے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے، کیسی واہیات باتیں بکتے ہیں . . . ." بیٹی کی باتیں سن کر زہرہ کا دل باغ باغ ہو جاتا۔

دن گزرتے گئے۔ تین سال میں جو کمال کتھک ناچ میں جوہی نے حاصل کیا اس پر بندہ نواز حیرت زدہ تھے۔ کلاسیکی موسیقی میں کرشن بھکتی کے گانے جوہی اس خوبی سے گاتی کہ استاد جی نے اس کا نام میرا رکھ دیا تھا۔ ستار کے جھالے سن کر راستہ چلتے شوقین طبیعت لوگ رک رک کر کوٹھے کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ زہرہ بیٹی کی اس ترقی کو دیکھ کر بہت خوش تھی اور اس دن کے خواب دیکھ رہی تھی جب اس کی جوہی موسیقی کا اپنا اسکول چلائے گی، شہر کے معزز لوگوں کے بچے اس کی آپا اور بہن جی کہہ کر عزت کریں گے۔ شہر کے بڑے بڑے موسیقی کے جلسوں میں عزت کے ساتھ بلائی جائے گی محفل کی رقاصہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اعلیٰ فن کار کی حیثیت سے . . . . . . اور . . . . اور . . . . پھر شاید اس کی قسمت جاگے تو کوئی شریف، دل والا کلاکار اسے اپنی رفیقہ حیات بنانے پر آمادہ ہو جائے . . . .

ایک دن جوہی اسکول سے واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑے پیار سے بولی ـــ "امی تمہیں اجازت دینی ہی پڑے گی۔"

"کس بات کی؟"

"سول لائن جانے کی۔ تم مجھے میری سہیلیوں کے پاس نہیں جانے دیتی ہو نہ انہیں بلاتی ہو۔ مگر میں آج وعدہ کر آئی ہوں۔ وہاں کے لڑکے اور لڑکیاں مل کر دیوالی پر جو ورائٹی شو کر رہے ہیں اس میں میں کتھک ناچ ناچوں گی اور ستار پر بھی میرا کے دو بھجن گاؤں گی۔ مگر انہیں طبلے والا نہیں مل رہا ہے۔ میں اس دن استاد جی کو لے جاؤں گی ـــ دیکھو امی اب منع مت کر دینا۔ وہاں ڈاکٹروں، پروفیسروں اور وکیلوں کی لڑکیاں میری کتنی خوشامد کر رہی تھیں۔"

اچھا۔ زہرہ نے کہا بے شک وہ بڑے گھروں کی عورتوں میں بیٹھنے کا حق کھو چکی ہے مگر اس کی بیٹی جوہی تو ان کے بچوں کے ساتھ اٹھ بیٹھ سکتی ہے۔ وہ کیچڑ کا کنول ہے اور اگر وہاں کے معزز لوگوں پر اس نے اپنی دھاک جمالی تو اسے اسکول کھولنے میں سہولت ہوگی۔ شاید اسی دن سے کچھ صاحبان اپنی بچیوں کو کتھک ناچ کے ٹیوشن کے لئے منظور کر لیں۔ زہرہ کا دل اس خیال سے کھل اٹھا۔

خوب تیاریاں کی گئی تھیں۔ انجنیئر صاحب کے بڑے لان میں سینکڑوں کرسیاں پڑی تھیں، دریاں بچھی تھیں۔ مہمانوں کو پانی پیش کیا جا رہا تھا۔ دالان بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا اور ریشمی پردوں سے ڈھکا ہوا اسٹیج بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ سات بجے سے ورائٹی شو کا پروگرام تھا اور لان ابھی سے شہر کے تعلیم یافتہ، مہذب، معزز اور دولت مند لوگوں سے بھر گیا تھا۔ یہ لوگ نہیں کے بچے بچیوں کا کلچرل پروگرام تھا دیکھنے کیوں نہ آتے۔ ڈاکٹر بھاٹیہ کے صاحب زادے پرمود بابو جو کہ ڈائرکٹر بھی تھے، عمر بھی صرف سترہ سال کی تھی، نہایت پریشان تھے۔ گرین روم میں کوئی ان سے مونچھیں ٹھیک کراتا تو کوئی صافہ بندھوانے کی جلدی کرتا۔ لڑکیاں کریم پاؤڈر، بندی اور روج کے ساتھ بھولی کھیل رہی تھیں۔ مگر طبلے والا ابھی تک نمودار نہ تھا۔ پہلی بار وہ اپنی ذمہ داری پر ایسا شو کر رہے تھے۔ یوں تو اسکول اور کالجوں میں پروفیسروں کی ہدایت کاری میں ان میں سے بہت سے بچے بچیاں اداکاری کر چکے تھے۔ یہ ذمہ داری ان پر پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑی تھی، سات بج گئے۔ پرمود چیخ اٹھا۔ "ارے شیلا تم ابھی تک سرسوتی بن کر تیار نہیں ہوئیں۔ اوشا، سدھا، کملا چلو اسٹیج پر لائن بنا کر کھڑی ہو۔ رمیش تم پردے کے پیچھے سے جن من گن گاؤ۔ یہ لڑکیاں بیچ میں بھول گئیں تو سب گڑبڑ ہو جائے گا۔

طبلے والا نہیں آیا۔ راجندر نے گھبرا کر اپنی بہن سے پوچھا۔ "او سو ریکھا تیری سکھی جوہی کہاں ہے جس نے کتھک ناچ کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اب ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ اس کا گھر بتاؤ کسی کو بلانے بھیجوں۔"

"گھر کا مجھے پتہ نہیں"

"کس کی لڑکی ہے؟ یہ بھی پتہ نہیں۔ طبلچی کے بغیر پروگرام خراب ہو جائے گا۔ ... تین سال سے ستار سنگت میں جاتی ہے مگر اسٹیج پر آنے کے نام سے نانی مرتی ہے۔"

باہر پردہ کھلوانے کے لئے ... کسی طرح پردہ اٹھا بغیر طبلے کے سب گانے والے لگ رہے تھے پھر بھی تالیاں بجیں، داد ملی کیوں کہ بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی ضروری تھی۔

ایک دو آئٹم ہوئے تھے کہ ... پرمود گرین روم میں جا کر کہانی سوریکھا کو ... اسٹیج پر جا کر گانا یا پڑھنا یا سب بھول گئی — ؟ تمہاری سکھی جوہی کہاں غائب ہو گئی — ؟؟ طبلے والا کہاں مر گیا — ؟؟؟"

سوریکھا پچھواڑے سے بھاگتی ہوئی باہر آئی شاید جوہی آئی ہو، وہ کئی بار پہلے بھی دیکھ گئی تھی۔ ایک رکشا آکر رکا۔ اس میں جوہی تھی، ساتھ میں بوڑھے استاد جی طبلے سنبھالتے ہوئے اترے۔ سوریکھا جوہی کو ... کھینچتی ہوئی اندر پہنچی۔ "لو آگئی۔ جان کھا ڈالی اتنی دیر میں — جوہی تم نے بہت دیر لگائی۔"

جوہی آج ساٹن کا جوڑی دار پائجامہ اور ویسی ہی گوٹہ دار اچکن پہنے ہوئے تھی۔ سب کو تکتے ہوئے بولی۔ "درزی نے یہ کپڑے دینے میں دیر کی —"

"جلدی کرو" پرمود بولا "ان کا میک اپ کر دو۔ اگلی باری انہی کی ہے اسٹیج پر جائیں گی۔"

"میں یونہی جاؤں گی" چاندی سی کھلی ہوئی جوہی نے کہا "مجھے لپ اسٹک بہت بری لگتی ہے۔ بولو تو ذرا سا پاؤڈر لگا لوں۔"

پرمود نے مائک پر اعلان کیا ... کماری جوہی کتھک ناچ پیش کریں گی۔

پردہ اٹھا۔ طبلے پر چوٹ پڑی اور جوہی ناچ کی مدرا میں سر جھکائے ... تھئی تت کی سریلی آواز پورے لان پر چھا گئی۔

"یہ نئی لڑکی کون ہے؟ سوال ... لوگوں نے انجینئر صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھنا شروع کیا۔ فنکشن انہی کے یہاں ہو رہا ہے انہیں ضرور معلوم ہوگا۔ جوہی کی خوب صورت انگلیوں ... بدن اور گونجی آواز نے سب پر جادو سا کر دیا۔

پخت سیام سنگیت مدھر دھن ... ن ن تن۔ ن ن تا تھئی تا تھئی ترام تھئی، تتا ترام تھئی۔ میٹھے بول پہ بول پھوٹنے لگے مدرائیں بنتی گئیں وقت گزرتا گیا اور جوہی تیز اور تیز ناچتی گئی۔ ... جیسے کسی نے چلتے ہوئے لٹو پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہاتھ جڑے، نظریں جھکیں اور اشارہ پاتے ہی پرمود نے پردہ گرا دیا۔

"ونس مور .... شاباش ..." ... لوگوں نے انجینئر کے کان کھا ڈالے۔ یہ کماری جوہی کون ہیں؟ ... اس کے باپ کیا کرتے ہیں۔ پرمود سے کہیں ان کا ایک شو اور ہو ... ہمارے کالونی کے فنکشن میں بھی آئیں گی یا نہیں — مگر انجینئر صاحب نے جواب میں اتنا کہا کہ میں خود نہیں جانتا یہ کس کی صاحبزادی ہیں۔ شاید پرمود کے کسی دوست کی بہن ہیں۔ اس سے پوچھتا ہوں" مسٹر ورما کئی آدمیوں کے ساتھ اندر پہنچ گئے۔ "کیوں پرمود یہ کماری جوہی کس کی لڑکی ہیں؟ کیوں بیٹا تمہارے والد کا کیا نام ہے؟" جوہی خاموش سی آنکھیں جھکائے کھڑی رہی۔ پرمود نے کھسیا کر سوریکھا کی طرف دیکھا۔ سوریکھا نے استاد جی کی طرف — استاد جی نے آداب بجا بہت شائستگی سے جواب دیا "سرکار یہ ہماری بیٹی ہے۔ اسکول میں نویں جماعت کی طالب علم ہے۔" مہندی لگی داڑھی، چکن کا کرتہ، وضع داری آداب۔ ورما جی سناٹے میں آگئے۔ پروفیسر صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ استاد جی واضح طور پر کسی کوٹھے والی کے طبلچی معلوم ہوتے تھے۔

فوراً رنگ ڈھنگ بدل گئے...... تو........ تو...... یہ کسی بائی جی کی لڑکی ہیں ؟ بائی یعنی طوائف۔ اسے بھلے گھر میں طوائف گھس آئی ۔" ورما جی نے آنکھیں نکال کر پرمود سے پوچھا۔" تم نے کس سے پوچھ کر انہیں بلایا۔ جانتے ہو یہ طوائف ! طوائف ! جو ہی پیلی پڑ گئی۔ بچے چونک پڑے مگر پرمود ہکلایا۔" ڈیڈی یہ تو اتنی چھوٹی ہیں...... سوربھا کی سکھی ہیں ۔"

" یہ نہ سہی۔ اس کی ماں تو طوائف ہے۔ ہم سے پوچھے بغیر اس لڑکی کو کیوں بلایا۔ اور استاد جی آپ کی بھی عقل ماری گئی۔ یہ شریف لڑکے لڑکیوں کا پروگرام ہے۔ کسی شریف اور عزت دار کے گھر پر آپ انہیں لے کیسے آئے ؟"

وہ خاموش رہے۔ کیسے کہتے کہ وہ بچی کی حوصلہ افزائی کے لئے لائے تھے۔ ورما بولتے ہی گئے۔" چلئے جلدی اپنا طبلہ سنبھالئے۔ کلچرل پروگرام میں ایسی لڑکیوں کی کیا ضرورت ؟"

عارف عبدالمتین

اوراق - لاہور

سمندر

میں سمندر کی غمناک گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا ہوں
ہر گھڑی تھاہ کی آرزو میں سمندر کی سطحِ حسیں سے میں کچھ اور بھی دُور ہوتا چلا جا رہا ہوں
تھاہ کی آرزو ناتمامی کی جس آگ میں رات دن جل رہی ہے
اِس سمندر کا پانی عجب ہے کہ اِس آگ کو تیز کرتا ہے، لیکن بجھاتا نہیں ہے!

کتنے طوفان مرے سر کو ہر رواں بن کے ہر دم گزرتے ہیں،
کتنی موجیں سیہ ناگنوں کی طرح مجھ کو ہر آن ڈستی رہی ہیں،
کتنے گرداب سات آسمانوں کی گردش کا ہیجان لے کر،
میرے اِس ناتواں جسم پر خون آشام یلغار کرتے رہے ہیں،
کتنے وحشی نہنگوں کی سفاک پیکار سے تھک تھکا کر،
میں نہیں کے دہن کی اندھیری لحد میں اترتا رہا ہوں!

مَیں تہِ آب اپنا سفر جاری رکھنے پہ اب بھی مصر ہوں کہ مجھ کو یقین ہے،
حادثے خود، مسافر کے ذوقِ سفر کا اچھوتا صلہ ہیں!

تحریک۔ دہلی

عبدالعزیز خالدؔ

لحنِ صریر

شاید کہ ہے جذبۂ محبت ابھی خام .
ناداں ہے یہ لکنت ہی دلیلِ عرفاں
پھرتا ہے زباں پہ لب پہ آتا نہیں نام
جب عقل تمام ہو تو گھٹ جائے کلام

انساں کے حقوق کا محافظ ہے خدا
محسن کا لہو بڑھائے تحسین و سپاس
احساں کی جزا، جرم کی دیتا ہے سزا
مقتول کے ساتھ نکلے دم قاتل کا

صورت کے طلسم میں رہے سرگرداں
انساں کی سرشت میں ہے اُلفت بُت کی
ہے محرمِ معنیِ مکنونہ کہاں ؟
اوجھل ہے نگاہوں سے مقامِ یزداں

ہے کارِ جہاں پہ کیوں تجھے حیرانی ؟
اربابِ ہوس کے لئے ملکِ محمودؔ
کر دفترِ ماضی کی ورق گردانی
اخلاص کی مِلک، خرقۂ خرقانی

دُنیا سے رہے دست و گریباں، فنکار.
ہو گوشۂ انزوا میں آخر کو مقیم
اغیار سے ناراحت و خود سے بیزار
ہے دل کی حضوری ہی دوامِ احضار

گر عارض و گیسو کے جھمیلے میں پھنسے
ہو صاحبِ فن فطرتاً آشفتہ مزاج
گر انفس و آفاق کی گرہیں کھولے
منزل سے رہے دُور، رہوں میں بھٹکے

ہے شانِ ہنر رحمی و رزّاقی
با وصفِ محبت، وطن ہوتا ہے
پیاسوں کو پلائے سوختہ لب ساقی
فن کار کا نقطۂ نظر آفاقی!

رابرٹ روژدیسٹوینسکی
انور احسن صدیقی

طلوع کراچی

نوحہ

طویل نظم سے اقتباس

سوویت فوج کے ان بہادروں کی یاد میں جو دوسری عالمی جنگ کے دوران مارے گئے

مہ و سال کی گردشوں کا تسلسل
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا
مگر ان کی اُلفت کا ہے قرض ہم پر
جو راہِ عمل میں فنا ہو چکے ہیں
سراپا جو نذرِ وفا ہو چکے ہیں

یہ وہ قرض ہے جو ہمیشہ رہے گا
کوئی اشکِ خونیں، کوئی نوحۂ غم
کبھی بھی نہ اس کو ادا کر سکے گا
ہیں اپنے دیروز و فردا میں پیہم
شہیدوں پہ ایقان رکھنا پڑے گا

یہ نغمے ہمارے، یہ راتیں ہماری
خوشی اور محبت کی باتیں ہماری
حیاتِ فروزاں ہے جن سے عبارت
جدال و قتال و دغا و بلا میں
ادا کی ہے ہم نے بڑی ان کی قیمت

سنو! میرا ایقان و اصرار یہ ہے
تقاضہ مرا تم سے ہر بار یہ ہے
کہ ہر سانس کے ساتھ تم یاد رکھنا
انہیں، جو ہمیں زندگی دے گئے ہیں

اور اس وقت بھی، جبکہ نغمے ہمارے
ستاروں بھرے آسمانوں میں گونجیں
انہیں یاد رکھنا نہ تم بھول جانا
کہ نغمات جن کے فنا ہو چکے ہیں

نئی نسل کو اس سے واقف کرانا
کہ امن و اماں کیسے حاصل ہوا تھا
بھلائے نہ اس کو کہیں نسلِ آدم
چلے گا یہ پیغام سینہ بہ سینہ

نئے عہد کی آمدِ گل بداماں
درِ زندگانی پہ دیتی ہے دستک
اٹھو خیر مقدم کو اہلِ گلستاں
اٹھو اہلِ دل، جنگ کے اژدہے کو
کچل دو، یہ عفریت ہے دشمنِ جاں

عناصر کو مغلوب و مفتوح کر کے
خلاؤں میں جب محوِ پرواز ہوں ہم
تو ان کشتگانِ جفا و ستم کو
خراجِ عقیدت کریں پیش پیہم
کہ مغلوب جن کو کوئی کر نہ پایا
کہیں بھی جنھوں نے نہ سر کو جھکایا

نقش کراچی

اوراق۔ لاہور

وزیر آغا

ماں

(پہلا روپ)

وہ برگد کا اک پیڑ تھی
جس کی مانوس گہری خنک چھاؤں میں
ہم نے عمریں بتائیں
وہ اک سربرآور وہ چھتنار تھی
جس کے پتوں میں چھپ کر
مہکتی ہوئی دودھیا شاخ کو تھام کر
ہم نے میٹھی سی راحت کا انعام پایا
وہ پتوں کے پنکھے سے
شاخوں کی لوری سے ہم کو سلاتی رہی
مسکراتی رہی!

اور پھر ایک دن
اک بگولا اٹھا۔
پیڑ جڑ سے اکھڑ کر پرے جا پڑا
اور چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے سارے پنچھی
بھیانک سی چیخوں کے کہرام میں آ پڑے ـــــ آسماں کی طرف
پھر بکھرتے گئے ـــــ چار سُو!!

(دوسرا روپ)

خموشی کے اس زرد لمحے سے پہلے
یہ محسوس ہوتا تھا جیسے
کوئی غم زدہ، بے نشاں چاپ
میرے تعاقب میں
اک نرم جھونکے کی صورت چلی آ رہی ہے!
کوئی ہے ـــــ جو میرے عقب میں
محبت کی نمناک خوشبو بکھیرے
اُمڈتے ہوئے تیز شعلوں سے مجھ کو بچاتا
مرے ہر قدم کی "سلامت روی" کے لئے
التجاؤں، دعاؤں کی برکھا میں خود کو بھگوتے
مرے سر پر آنچل کا سایہ کئے
آ رہا ہے!

اور اب ـــــ دفعتاً
غم زدہ بے نشاں چاپ رُک سی گئی ہے۔
لاکھوں بپھرتے قدم، ان گنت تند دھارے
دُبکے پڑے تھے
عقب سے اُبھر کر
مری سمت تیزی سے بڑھنے لگے ہیں
جھپٹتے، لپکتے ـــــ چلے آ رہے ہیں!!

پہلا دن

نگارِ سحر بن سنور کر، نکھر کر
دھندلکوں سے باہر اُجالوں میں آئی
کہ مشتاقِ دیدار بے تاب ہوں گے

وہ میدان سے گذری، درختوں پہ پھیلی
وہ شاخوں میں سجی، وہ پھولوں میں مہکی،
سیہ چمنیوں، زرد کھیتوں پہ چمکی
وہ شہروں کی آباد سڑکوں پہ ٹھہری
جہاں فکر آلود چہروں پہ اُتری؛
جھجکی، ہراساں نگاہوں سے اُلجھی
وہ اونچے گھروں، سونے کمروں میں بکھری
بھرے آنگنوں، ٹھنڈے چولہوں پہ ٹھٹکی،

مگر.... آج سب اس سے یوں بے خبر تھے،
کہ جیسے وہ ان کے لئے اجنبی ہو

اک نظم

اب کڑی دھوپ کا شکوہ کیسا
اب گلہ کیا ہے مقدر میں اگر
سایۂ گیسوئے دلدار تو کیا
کسی دیوار کا سایہ بھی نہیں
دلِ ناکام میسّر تجھ کو
صرف دیوار کا سایہ ہی نہیں
سایۂ گیسوئے دلدار بھی تھا
تو نے اک منزلِ موہوم کی دُھن میں ناداں
وہ سکوں زارِ وفا چھوڑ دیا
جو مقدر نہ تھی اس عشرتِ کامل کے لئے
جو میسّر تھا وہ خوشیوں کا چمن چھوڑ دیا
تیری آوارگیٔ شوق تجھے
ایک ویرانۂ تجرید میں لے آئی ہے
جس جگہ ریگِ عقائد کے سوا کچھ بھی نہیں
آہ یہ سعیٔ سفر کا انجام

سحر قضائی

درد کی پرچھائیں

ناوکِ غم کی خبر درد کی پرچھائیں سے پھر
زخم کی طرح ملی، شمع کی مانند جلی
آئینہ خانۂ احساس میں محسوس ہوئی
ایک پرچھائیں سے پرچھائیں کی سرگوشی سی

بات صدیوں کی کہی جائے کہ لمحات کی بات
بات در اصل ہے، احساس کی جذبات کی بات
وقت پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے
آج بھی گردش و رفتار کا عالم ہے وہی
مہر و مہ مشرق و مغرب کے سفیر آج بھی ہیں
روز و شب اپنے ہی لمحوں میں اسیر آج بھی ہیں

ناوکِ غم کی خبر کوئی نئی بات نہیں
ضررِ خونِ جگر کوئی نئی بات نہیں
زندگی زخم نما آنکھ لئے صدیوں سے
سازشِ کشمکشِ مہر و ستم دیکھتی ہے
اک ہجومِ خلش و کرب و الم دیکھتی ہے

اس ہجومِ خلش و کرب و الم میں مجھ سے
آج پھر درد کی پرچھائیں یہی کہتی ہے
ناوکِ غم سے چلا سلسلۂ دانش و رنگ
حرف و آہنگ کے نا سنگ و دف و بربط و چنگ
زندگی تازگیِ موجِ نفس چاہتی ہے
ہر سفر کے لئے افسونِ جرس چاہتی ہے

براج کومل — کتاب۔ لکھنؤ

اِمکان

شہر جلتا ہے، اس کو جلنے دو
چیختی ہے ہوا درختوں میں
دل میں سو وسوسے جگاتی ہے
لوگ سوچیں گے زندگی کے لئے
لوگ بھاگیں گے زندگی کے لئے
بستیاں جب نئی بسائیں گے
ان میں کچھ احتیاط سے شاید
کام لیں گے کہ جانے کل کیا ہو!

گاؤں جلتا ہے، اس کو جلنے دو
کھیت بنجر ہیں، پیٹ بھوکے ہیں
آسماں سے لہو ٹپکتا ہے
لوگ اٹھیں گے زندگی کے لئے
لوگ ابھریں گے زندگی کے لئے
بستیاں جب نئی بسائیں گے
ان میں کچھ احتیاط سے شاید
کام لیں گے کہ جانے کل کیا ہو!
زندگی اس سے بڑھ کے مشکل ہو!

زبیر رضوی — شب خون۔ الہ آباد

موسم کا المیہ

پرندے
فضاؤں کی لہروں پہ
ننھے سفینوں کی مانند بہتے ہوئے
وسعتیں ناپتے ہیں
سہانی رتیں
دیر سے وقت لئے
اپنے ہاتھوں میں، اس بات کی منتظر ہیں
ہوائیں پرانی کتھاؤں کو
پاؤں پڑے گھنگروؤں کی زباں میں سنائیں
گھٹائیں
مناظر کی آنکھوں میں
کاجل کی ہلکی لکیریں سجانے اٹھی ہیں
زمیں کے بدن پر
پڑے آبلوں کی جلن مٹ گئی ہے
زمیں کا بدن
تازہ پھولوں کی مانند پھر جل اٹھا ہے۔

کہیں دور
شاخوں میں الجھا ہوا ایک زخمی پرندہ۔
فضاؤں کی لہروں پہ بہتے ہوئے
وسعتیں ناپنے کے جتن کر رہا ہے!!

شبی فارُوقی — فنون۔ لاہور

رشتہ

ہمارے آبا
زمیں کے پیوند ہو چکے ہیں
ہمیں بھی ہونا ہے دفن اک دن
زمیں کے نیچے
یہ ذہن میں ہے۔
جبکہ آنے والی ہماری نسلوں کی
آخری خوابگاہ ٹھہری
تو پھر وہ ہم سے
جو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہنوں کے مُردہ جسموں کو
آگ، پانی، ہوا میں تحلیل کر رہے ہیں
جو ایک دن،
خود بھی آگ، پانی، ہوا میں تحلیل ہو رہیں گے
یہ کس عداوت میں کہہ رہے ہیں
"تمہارا رشتہ زمیں سے کیا ہے؟"

ناصر زیدی — ادبِ لطیف۔ لاہور

پاگل لڑکی

ایک ہے پاگل لڑکی لوگو!
ایک ہے پاگل لڑکی

چہرے پر اُس کے سنولاہٹ
بائیں گال پہ کالا تل ہے

آنکھیں جیسے بادہ خانے
ہونٹوں کی لالی کیا کہنے

صورت کی مَن موہنی سی ہے
ہر دم میرے دل میں بسی ہے

میں کہتا ہوں اس کو اپنا
لیکن وہ مجھ سے بدظن ہے

روش صدیقی — **شانِ ہند دہلی**
ظہیر کاشمیری — **نقوش لاہور**

غم باندازۂ راحت ہی سہی
نہ سہی شکر، شکایت ہی سہی

اک قیامت ہے سنبھل کر چلنا
جادۂ ترکِ محبت ہی سہی

ہوش مندوں سے نہیں دل ملتا
اب یہ وحشت ہے تو وحشت ہی سہی

جی بہلنے کے کچھ آثار تو ہیں
شورِ طوفانِ ملامت ہی سہی

عہدِ حاضر کا غزل خواں ہے روشؔ
دوش پر بارِ قدامت ہی سہی

پروانہ جل کے صاحبِ کردار بن گیا
لیکن جمالِ شمع گنہ گار بن گیا

ہم دل زدے جو سیرِ چمن کو نکل پڑے
ہر پھول دستِ شاخ میں تلوار بن گیا

امشب طلوعِ یار کا منظر عجیب تھا
بامِ بلند، مطلعِ انوار بن گیا

اے دوستانِ شہر مری بندگی کرو
میں خود سنور کے عکسِ رخِ یار بن گیا

وہ پاس تھے، نظر پہ حجابِ غرور تھا
وہ چل دیئے، میں دیدۂ بیدار بن گیا

جب خامشی ہی بزم کا دستور ہو گئی
میں آدمی سے نقش بہ دیوار بن گیا

محسوس کر رہا ہوں کہ تنہا ہوں ان دنوں
ہر شہر گرچہ مصر کا بازار بن گیا

جس ہم نفس کو مجھ سے متاعِ وفا ملی
وہ ہم نفس مرا ہی خریدار بن گیا

اے دل ستم ظریفیٔ حالات دیکھنا
جو حرفِ مدعا تھا، وہی دار بن گیا

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خودنما ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا روحِ کائنات!
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

جب نیند آگئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے میں اپنا ہم نوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بے وفا ہوں میں

میرے لئے بھی دار و رسن کا یہ اہتمام
میں نے یہ کب کہا تھا کہ کوئی خدا ہوں میں

حسابِ عمر کرو یا حسابِ جام کرو
بہ قدرِ ظرف شبِ غم کا اہتمام کرو

اگر ذرا بھی روایت کی پاس داری ہے
خرد کے دور میں رسمِ جنوں کو عام کرو

خدا گواہ فقیروں کا تجربہ یہ ہے
جہاں ہو صبح تمہاری وہاں نہ شام کرو

نہ رند و شیخ نہ ملا نہ محتسب نہ فقیہہ
یہ مے کدہ ہے یہاں سب کو شاد کام کرو

وہی ہے تیشہ، بیاباں وہی ہے، دار وہی
جو ہو سکے تو زمانے میں تم بھی نام کرو

خرامِ یار کی آہٹ سی دل سے آتی ہے
سرشکِ خوں سے چراغاں کا اہتمام کرو

اسیرِ زلف ہیں اک ہمیں نہیں میر بھی تھے
مگر اب اٹھ کے دو عالم کو زیرِ دام کرو

اریب دیکھو نہ اتراؤ چند شعروں پر!
غزل وہ فن ہے کہ غالب کو تم سلام کرو

محسن احسان

فنون۔لاہور

سمجھ میں آتا نہیں، انتظار کیسا ہے
وہ پاس بھی ہے، یہ دل بیقرار کیسا ہے
امیرِ قافلۂ شہر! کچھ بتا تو سہی
جبینِ راہرواں پر غبار کیسا ہے
نہ برق ہی کہیں تڑپی، نہ آگ ہی بھڑکی
مگر دھواں سا سرِ شاخسار کیسا ہے
نہ کارواں کوئی بھٹکا، نہ کوئی دل دھڑکا
مگر یہ شورِ سرِ رہگزار کیسا ہے
ہر ایک بات میں پنہاں ہے طنز کی تلوار
مجھے خبر ہے مرا غمگسار کیسا ہے
پرو دیے مری پلکوں پہ جس نے پیار کے پھول
خدا ہی جانے وہ جانِ بہار کیسا ہے
ہوائے دشتِ محبت! بتاؤ محسن کی
وہ بے مراد، غریب الدیار کیسا ہے

سیف زلفی

فنون۔لاہور

کب تک یہ التفات، یہ پتھراؤ دوستو
پھر تم نہ گن سکو گے میرے گھاؤ دوستو
پہلے تم اپنے اپنے گریباں میں جھانک لو
پھر داغ ماہتاب کے گنواؤ دوستو
اپنی ستائشوں کے کنویں میں مگن رہو
خود اپنی عظمتوں کے بھجن گاؤ دوستو
تم چپ رہو تو اس میں تمہارا بھرم بھی ہے
یوں سب کے سامنے تو نہ ہکلاؤ دوستو
خنجر بدست آج تو پکڑے گئے ہو تم
اپنے کیے پہ آج تو شرماؤ دوستو
کہتے ہیں جس کو شعلۂ احساس آگہی
اس کو لہو کی آنچ سے بھڑکاؤ دوستو
وہ عطر جس کا نام خلوصِ حیات ہے
اس عطر سے مزاج کو مہکاؤ دوستو
وہ سوچ جس سے ذہن کے گوشے دمک اٹھیں
اس سوچ کی کرن سے لپٹ جاؤ دوستو
زلفی کے دل میں گردِ کدورت ذرا نہیں
تم بھی اسی اصول کو اپناؤ دوستو

نقش کراچی

جونؔ ایلیا — نئی قدریں۔ حیدرآباد (پاک)

رحمٰنؔ کیانی — سیپ۔ کراچی

نیا اک ربط پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم
خموشی سے ادا ہو رسمِ دُوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم
یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم
وفا، اخلاص، قربانی، محبت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم
ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم؟
تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم؟
زلیخائے عزیزاں! بات یہ ہے
بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم
اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم
جو اک نسل فرومایہ کو پہونچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
کسی کو ہم نہ دے سکتے ہوں جب زہر
تو پھر اس کا مداوا کیوں کریں ہم
پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم

چشمِ جنوں میں وسعتِ صحرا خالِ رُخِ لیلےٰ سے کم
ناقہ و محمل ڈھونڈنے والے وقفِ غبارِ نقشِ قدم
مکتبِ کودکِ ناداں کاغذ کی زنجیر لئے
زیستِ غزالِ وحشت خوردہ صحرا صحرا فرصتِ رَم
اہلِ خرد کی سعیِ مسلسل وضع کریں سامانِ حیات
کیوں نہ انھیں دیوانہ کہئے خود جو کریں زنجیر بہم
حاصلِ دریا قطرۂ شبنم وسعتِ ذرہ گوئے زمیں
اہلِ نظر کے جزو و کل بھی اہلِ خرد کے بیش و کم
انجم تاباں مہر درخشاں عکسِ جمالِ جانِ جہاں
اپنی اپنی بزمِ طرب تک دود چراغِ دیر و حرم
عقل حدِ ادراک پہ جس کو شہرِ حقیقت کہتی ہے
اُٹھ نہ سکے تو سنگِ گراں کو لوگ بنا لیتے ہیں صنم

اختر انصاری اکبرآبادی
نقوش - لاہور

ہم اہلِ شوق تماشائے رنگ و بو کرتے
گزر رہے ہیں شگوفوں سے گفتگو کرتے

جہانِ جہد و عمل میں نہ آ گئے ہوتے
تو قصدِ شہر نگارانِ خوبرو کرتے

ادا شناسِ جنوں مل گئے ہمیں ورنہ
زباں سے اپنی ہم اظہارِ آرزو کرتے

اگر زمین کے ذرّے پکارتے نہیں
تو آسماں کے ستاروں سے گفتگو کرتے

کبھی جو عقل کے بندوں کو ہوش آ جاتا
خیالِ بندگیٔ ساغر و سبو کرتے!

بقدرِ ظرف خرابات میں جو مل جاتی
گلوں کی طرح نہ شبنم سے ہم وضو کرتے

جھلک خلوص کی ملتی جو تیری نظروں میں
تو ہم بھی شوق میں کچھ شرحِ آرزو کرتے

گلوں کے ناز اُٹھانے پڑیں گے اے اختر
ہم آ گئے ہیں تمنائے رنگ و بو کرتے

محبوب خزاں
سیپ۔ کراچی

ہر بات یہاں بات بڑھانے کے لئے ہے
یہ عمر جو دھوکا ہے تو کھانے کے لئے ہے

یہ دامنِ حسرت ہے وہی خوابِ گریزاں
جو اپنے لئے ہے نہ زمانے کے لئے ہے

اُترے ہوئے چہرے میں شکایت ہے کسی کی
رُوٹھی ہوئی رنگت ہے منانے کے لئے ہے

غافل تری آنکھوں کا مقدر ہے اندھیرا
یہ فرش تو راہوں میں بچھانے کے لئے ہے

گھبرا نہ ستم سے، نہ کرم سے، نہ ادا سے
ہر موڑ یہاں راہ دکھانے کے لئے ہے

جون ایلیا — نئی قدریں، حیدرآباد (پاک)

نیا اک ربط پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم
خموشی سے ادا ہو رسمِ دُوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم
یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفاداری کا دعویٰ کیوں کریں ہم
وفا، اخلاص، قربانی، محبت
اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم
ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم؟
تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم؟
زلیخائے عزیزاں! بات یہ ہے
بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم
اُٹھا کر کیوں نہ پھینکیں ساری چیزیں
فقط کمروں میں ٹہلا کیوں کریں ہم
جو اک نسل فرومایہ کو پہونچے
وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
کسی کو ہم نہ دے سکتے ہوں جب زہر
تو پھر اس کا مداوا کیوں کریں ہم
پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم

رحمٰن کیانی — سیپ، کراچی

چشمِ جنوں میں وسعتِ صحرا خالِ رُخِ لیلےٰ سے کم
ناقہ و محمل ڈھونڈنے والے وقفِ غبارِ نقشِ قدم
مکتب مکتب کودکِ ناداں کاغذ کی زنجیر لئے
رلیست غزالِ وحشت خوردہ صحرا صحرا فرصتِ رَم
اہلِ خرد کی سعیِ مسلسل وضع کریں سامانِ حیات
کیوں نہ انھیں دیوانہ کہئے خود جو کریں زنجیر بہم
حاصلِ دریا قطرۂ شبنم وسعتِ ذرہ گوئے زمیں
اہلِ نظر کے جزو و کل بھی اہلِ خرد کے بیش و کم
انجم تاباں مہر درخشاں عکسِ جمالِ جانِ جہاں
اپنی اپنی بزم طرب تک دود چراغِ دیر و حرم
عقل حدِ ادراک پہ جس کو شہرِ حقیقت کہتی ہے
اُٹھ نہ سکے تو سنگِ گراں کو لوگ بنا لیتے ہیں صنم

اختر انصاری اکبر آبادی | نقوش - لاہور | محبوب خزاں | سیپ - کراچی

ہم اہلِ شوق تماشائے رنگ و بو کرتے
گزر رہے ہیں شگوفوں سے گفتگو کرتے
جہانِ جہد و عمل میں نہ آ گئے ہوتے
تو قصدِ شہرِ نگاراں خو برد کرتے
ادا شناسِ جنوں مل گئے ہمیں ورنہ
زباں سے اپنی ہم اظہارِ آرزو کرتے
اگر زمین کے ذرے پکارتے نہیں
تو آسماں کے ستاروں سے گفتگو کرتے
کبھی جو عقل کے بندوں کو ہوش آ جاتا
خیالِ بندگیٔ ساغر و سبو کرتے!
بقدرِ ظرف خرابات میں جو مل جاتی
گلوں کی طرح نہ شبنم سے ہم وضو کرتے
جھلک خلوص کی ملتی جو تیری نظروں میں
تو ہم بھی شوق میں کچھ شرحِ آرزو کرتے
گلوں کے ناز اٹھانے پڑیں گے اے اختر
ہم آ گئے ہیں تمنائے رنگ و بو کرتے

ہر بات یہاں بات بڑھانے کے لئے ہے
یہ عمر جو دھوکا ہے تو کھانے کے لئے ہے
یہ دامنِ حسرت ہے وہی خوابِ گریزاں
جو اپنے لئے ہے نہ زمانے کے لئے ہے
اترے ہوئے چہرے میں شکایت ہے کسی کی
روٹھی ہوئی رنگت ہے منانے کے لئے ہے
غافل تری آنکھوں کا مقدر ہے اندھیرا
یہ فرش تو راہوں میں بچھانے کے لئے ہے
گھبرا نہ ستم سے، نہ کرم سے، نہ ادا سے
ہر موڑ یہاں راہ دکھانے کے لئے ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی
شب خون الٰہ آباد

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خود نما ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا روحِ کائنات!
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

جب نیند آگئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے میں اپنا ہم نوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بے وفا ہوں میں

میرے لئے بھی دار و رسن کا یہ اہتمام
میں نے یہ کب کہا تھا کہ کوئی خدا ہوں میں

سلیمان اریب
شب خون الٰہ آباد

حسابِ عمر کرو یا حسابِ جام کرو
بہ قدرِ ظرف شبِ غم کا اہتمام کرو

اگر ذرا بھی روایت کی پاسداری ہے
خرد کے دور میں رسمِ جنوں کو عام کرو

خدا گواہ فقیروں کا تجربہ یہ ہے
جہاں ہو صبح تمہاری وہاں نہ شام کرو

نہ رند و شیخ نہ ملا نہ محتسب نہ فقیہہ
یہ مے کدہ ہے یہاں سب کو شاد کام کرو

وہی ہے تیشہ، بیاباں وہی ہے، دار وہی
جو ہو سکے تو زمانے میں تم بھی نام کرو

خرامِ یار کی آہٹ سی دل سے آتی ہے
سرشکِ خوں سے چراغاں کا اہتمام کرو

اسیرِ زلف ہمیں اک نہیں ہیں میر بھی تھے
مگر اب اٹھ کے دو عالم کو زیرِ دام کرو

ادیب دیکھو نہ اتراؤ چند شعروں پر!
غزل وہ فن ہے کہ غالب کو تم سلام کرو

محسن احسان
فنون۔لاہور

سمجھ میں آتا نہیں، انتظار کیسا ہے
وہ پاس بھی ہے، یہ دل بیقرار کیسا ہے

امیرِ قافلۂ شہر! کچھ بتا تو سہی
جبینِ راہرواں پر غبار کیسا ہے

نہ برق ہی کہیں تڑپی، نہ آگ ہی بھڑکی
مگر دھواں سا سرِ شاخسار کیسا ہے

نہ کارواں کوئی بھٹکا، نہ کوئی دل دھڑکا
مگر یہ شورِ سرِ رہگزار کیسا ہے

ہر ایک بات میں پنہاں ہے طنز کی تلوار
مجھے خبر ہے مرا غمگسار کیسا ہے

پرو دئے مری پلکوں پہ جس نے پیار کے پھول
خدا ہی جانے وہ جانِ بہار کیسا ہے

ہوائے وشتِ محبت! بتاؤ محسن کی
وہ بے مراد، غریب الدیار کیسا ہے

سیف زلفی
فنون۔لاہور

کب تک یہ التفات، یہ پیار، او دوستو
پھر تم نہ گن سکو گے میرے گھاؤ دوستو

پہلے تم اپنے اپنے گریباں میں جھانک لو
پھر داغ ماہتاب کے گنواؤ دوستو

اپنی ستائشوں کے کنویں میں مگن رہو
خود اپنی عظمتوں کے بھجن گاؤ دوستو

تم چپ رہو تو اس میں تمہارا بھرم بھی ہے
یوں سب کے سامنے تو نہ ہکلاؤ دوستو

خنجر بدست آج تو پکڑے گئے ہو تم
اپنے کئے پہ آج تو شرماؤ دوستو

کہتے ہیں جس کو شعلۂ احساسِ آگہی
اس کو لہو کی آنچ سے بھڑکاؤ دوستو

وہ عطر جس کا نام خلوصِ حیات ہے
اس عطر سے مزاج کو مہکاؤ دوستو

وہ سوچ جس نے ذہن کے گوشے مہکا اٹھیں
اس سوچ کی کرن سے لپٹ جاؤ دوستو

زلفی کے دِل میں گردِ کدورت ذرا نہیں
تم بھی اسی اصول کو اپناؤ دوستو

اشتیاق طالب
منشور۔ کراچی

ظلم کے شعلے گلستاں میں بھڑکتے ہی رہے
ہم کہ پھولوں کی طرح پھر بھی مہکتے ہی رہے

ظلمتوں کے رقصِ یخ بستہ فضا کے باوجود
دامنِ شب پر ستارے کچھ چمکتے ہی رہے

جیسے صحرا میں بگولے، جیسے گلشن میں صبا
جستجو میں آپ ہم اپنی بھٹکتے ہی رہے

نفرتوں کی گرد کے اُٹھتے رہے طوفاں تو کیا
دامنِ دل ہم مگر اپنا جھٹکتے ہی رہے

ہر نفس مہکا ہوا تھا بوئے جسمِ یار سے
خار بن کر وسوسے دل میں کھٹکتے ہی رہے

کوئی یہ دیکھے کہ ہم ترکِ وفا کے باوجود
صورتِ دل اُس کے پہلو میں دھڑکتے ہی رہے

انور انجم
نقوش۔ لاہور

میری بستی میں جو سورج کبھی اترا ہوتا
میں بدن ہوتا ترا، تو مرا سایا ہوتا

کس کی بے مہر ادا سے ہمیں شکوا ہوتا
ہم کسی کے نہ ہوئے کون ہمارا ہوتا

جان پر کھیل کے میں راہِ وفا طے کرتا
اُس کی جانب سے مگر کچھ تو اشارا ہوتا

دل کا احسان ہے جو بچھڑ گیا خود ہی، ورنہ
جانے میں کس کو کہاں ڈھونڈنے نکلا ہوتا

اُس کو پانے کی تو حسرت ہے اُسے پا کر بھی
کس کو معلوم ہے دل یونہی اکیلا ہوتا

دُور سے کھینچتا رہتا ہے جو تصویر مری
کاش اُس نے کبھی نزدیک سے دیکھا ہوتا

سُن کے یاروں کے الم سوچتا رہتا ہوں کہ میں
کیسے جیتا جو ترا پیار بھی جھوٹا ہوتا

میرے عیبوں میں ہے شامل مری مجبوری بھی
میں بھی انسان نہ ہوتا تو فرشتہ ہوتا

تم نہ آئے کبھی نزدیک تو اچھا ہی کیا
لوگ ناداں ہیں، یونہی شہر میں چرچا ہوتا

شاعری کی تاویل کرنا ایک ایسی غلطی ہے جو ایک طرف اس کی شاعری سے لطف اندوزی کو مجروح کرتی ہے اور دوسری طرف اس کی تنقید کو ایک مقریہ لیکن غلط رُخ دے دیتی ہے۔ اسی لئے جب میں ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں تو اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ میں اس کے تنقیدی کارناموں کو اپنی زبان کے لئے اس کی شاعری سے زیادہ مفید سمجھتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اس کی تنقید اس کی شاعری کا ایک ذیلی حصّہ نہیں ہے بلکہ شاعری سے الگ ایک زندہ سرگرمی ہے۔ شخصیت کے اسی دوسخے پن کی وجہ سے اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی صلاحیت کو غصب نہیں کرتا مثلاً ایلیٹ کا تنقیدی شعور بہت لطیف ہے وہ کلاسیکیت کا حامی ہے۔ اس کا مطالعہ اور اس کی دلچسپیاں ایسی نظموں اور ایسے شاعروں سے زیادہ ہیں جو خود اس کے اپنی شاعری سے بالکل متضاد و مختلف ہیں۔ دلچسپیوں کے اس تضاد کی وجہ سے اس کی تخلیقی صلاحیت اس کے تنقیدی فیصلوں کو اور اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی قوت کو غصب نہیں کرتے بلکہ دونوں کو الگ الگ محفوظ کرتے اور پرورش پانے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی لئے ایلیٹ بیک وقت شاعر بھی بڑا ہے اور نقاد بھی۔ ذہن اور شخصیت کے اس توازن کا اندازہ وہ لوگ آسانی سے کر سکتے جنھوں نے ایسے ہی پل صراط پر چلنے کی کوشش کی ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ایلیٹ کی شخصیت میں تنقید اور تخلیق کا عمل ایک دوسرے کے ساتھ اس طور پر گڈمڈ نہیں ہوجاتا کہ دونوں کی الگ شان باقی رہے۔ مثال کے طور پر اس کے مذہبی عقائد، جنہیں میری طرح اور لوگ بھی رجعت پسندانہ سمجھتے ہیں، اسے اچھی شاعری سے لطف اندوز ہونے سے معذور نہیں کردیتے۔ اپنے مذہبی عقائد کے باوجود وہ 'جمالیاتی اثر' کو مذہبی اثر سے، اخلاقی، سیاسی اور سماجی اثر سے آزاد اور الگ سمجھتا ہے۔ وہ شاعری کی بابت ایک طرف یہ کہتا ہے کہ اس کا مقصد خود اس کے اندر موجود ہے اور ساتھ ساتھ وہ نہ صرف لادینی شاعروں سے بلکہ غیر مذہبی شاعروں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ بودلیئر والے مضمون سے میں ایلیٹ کے نقطۂ نظر اور اس کے اندازِ فکر کو تو سمجھ سکتا ہوں لیکن اس کی شاعری کو نہیں۔ اسی لئے دانتے والے مضمون کو پڑھ کر میں اس کی فکر، اس کے تنقیدی شعور کی داد تو دے سکتا ہوں لیکن دی ویسٹ لینڈ، دی ہولو مین، برنٹ نورٹن، ایسٹ کوکر، نو سونگ اوف جے الفریڈ پروفروک وغیرہ کے سمجھنے میں مجھے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ یہاں تک ملٹن کی عیسائیت کے باوجود وہ اس کی شاعری کی عظمت کا منکر ہے اور اس وقت تک منکر رہتا ہے جب تک مذہبی عقائد اور مذہبی مسائل ضعفِ جسم اور موت کے احساس کے ساتھ، اس کے فکر و احساس میں اس درجہ غلو نہیں کرلیتے کہ وہ تصوف کے گنبد بے در میں چکر لگاتے ہوئے اپنے پہلے مضمون (۱۹۳۶ء) پر اظہارِ افسوس کرتا ہے اور اسی قسم کے دلائل دیتے ہوئے ملٹن کی دوبارہ توصیف کرتا ہے کہ "ملٹن صرف اس وجہ سے عظیم شاعر تھا کہ اس کے بعد کوئی بھی ملٹن کی طرح کی شاعری نہ کر سکا"۔ یہ بات ہر ٹھ پونجیے شاعر کے بارے میں اسی وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ اس پورے مضمون میں وہ ملٹن یا جنتِ گم گشتہ کے بارے میں کسی بڑے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ اس ذہنیت کے ساتھ ممکن ہے کہ ایلیٹ پیرو مرشد تو بن گیا ہو لیکن اس کا تنقیدی شعور کمزور پڑکر کند ہونے لگتا ہے۔ بہرحال ملٹن (۱۹۳۶ء)، دانتے (۱۹۲۹ء)، بودلیئر (۱۹۳۰ء) وہ مضامین ہیں جو بنیادی طور پر اس کی شاعری کی نفی کرتے ہیں اور اگر ان مضامین کی مدد سے اس کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے میر کے کلام سے ایک مربوط نظامِ حیات تلاش کیا جائے یا داغ کی شاعری کو صوفیانہ شاعری ثابت کیا جائے۔ بہرحال آخری عمر کی تحریروں کو چھوڑ کر ایلیٹ کی شخصیت اور اس کے فن میں ایسے دوروپ ملتے ہیں جو ایک ہوکر بھی الگ الگ ہیں اور جہاں تنقیدی شعور تخلیقی قوت کو اور تخلیقی قوت تنقیدی شعور کو غصب نہیں کرتے۔ اب اگر میں ایلیٹ کی نثر کو شاعری پر ترجیح دیتا ہوں یا اسے ایک الگ سرگرمی کے طور پر دیکھتا ہوں تو شاید یہ بات اب اتنی بے معنی نظر نہ آئے جتنی شروع میں نظر آتی تھی۔

یہ دیکھنے کیلئے کہ تنقید کے سلسلے میں ایلیٹ کا بنیادی نظریہ کیا ہے اس کے بہت سے مضامین کے علاوہ میری نظر اس کے ایک مضمون "تنقید کا منصب" پر جاتی ہے۔ جہاں وہ تخلیق اور تنقید پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے "کہ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ فن اپنے علاوہ بھی کچھ اور مقاصد

جمیل جالبی   نیا دور۔ کراچی

مفکّر نقّاد

ہر اس شخص کے لئے جس کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے، ایلیٹ کی نثر اس کی شاعری سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور میں نثر میں اس کے ڈراموں کو اس لئے شامل سمجھتا ہوں کہ یہاں ایلیٹ نے نظم اور نثر کی حدود ملا کر عام بول چال کی زبان سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ من و تو کے بیشتر رشتے ختم ہو کر ایک ہو گئے ہیں۔ یہی وہ "وحدت" ہے جو ایلیٹ کے فن اور ایلیٹ کی شخصیت کی ممتاز خصوصیت ہے۔ اس وحدت کے معنی وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو "لطیف اور جامع میڈیم" کے معنی سمجھتے ہیں اور جو اس بات کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اس کا تجربہ بھی رکھتے ہیں کہ "فن شخصیت کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ شخصیت سے فرار کا نام ہے"۔

جب میں ایلیٹ کی نثر کو ایک غیر اہل زبان کی حیثیت سے اس کی شاعری پر ترجیح دیتا ہوں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی زبان کی شاعری سے نہ صرف وہی لوگ پورے طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے لہجہ اور تیور کو نہ صرف اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہوں بلکہ جن کے مزاج میں اس زبان کے کلچر کی روح چلک کر بول رہی ہو اور جو ان جذبوں اور ان محسوسات سے بخوبی واقف ہوں جو "آفاقی ہوتے ہوئے بھی 'قومی' ہوتے ہیں"۔ کسی زبان میں "سوچنا" بمقابلہ اس زبان میں محسوس کرنے کے نسبتاً آسان ہے۔ اسی لئے کوئی فن بمقابلہ شاعری کے اتنی شدت کے ساتھ قومی خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا۔ جب میں ایک غیر اہل زبان کی حیثیت سے ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری پر ترجیح دیتا ہوں تو اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں اس کی شاعری کی اہمیت کو جھٹلا رہا ہوں یا میں اس کی شاعری سے ایک حد تک لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس بات کا اعتراف مقصود ہے کہ میں انگریزی میں سوچ تو سکتا ہوں محسوس نہیں کر سکتا۔ شاعری میں محسوس کرنے کا عمل بمقابلہ نثر کے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ایلیٹ کی نثر نے، اس کی شاعری سے ایک حد تک لطف اندوز ہونے کے باوجود، مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے اور میں نے خیال سے لے کر جملوں کی ساخت، لہجے کی ادا، بات کے ڈھنگ تک سے وابستگی محسوس کی ہے پھر ایک بات یہ کہ اس کی نثر اور خصوصاً ادبی تنقید اس کی شاعری کے مقصد کو آگے بڑھانے کے باوجود ایسی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے جو خود اس کی شاعری کی نفی کرتی ہیں، نہ صرف نفی کرتی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الگ الگ دو آدمی ہیں جو ایک حد تک ہم خیال ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جن میں سے ایک نثر لکھتا ہے اور دوسرا شاعری کرتا ہے۔ یہ عمل ادب کی تاریخ میں کبھی کبھار ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں لے دے کے مولانا حالی کی مثال ملتی ہے۔ ایک جگہ ایلیٹ خود اس بات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "اپنی تنقید میں اگرچہ میں انتہائی سچی رائے پیش کرتا ہوں لیکن میں اپنی شاعری میں خود ان کی خلاف ورزی کرتا ہوں اور اگر آپ اسے منافقانہ بات نہ بھی سمجھیں تو بھی میں ایک طرح سے دو رنگا ہو کر ظاہر ہوتا ہوں"۔ ایلیٹ کے یہ "دو روپ" ایک حد تک مربوط ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی نفی بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے اس کی تنقید

نسیم انصاری   سیپ-کراچی   باسط عظیم   ساغر-کراچی

ستم کے تیر، ملامت کے سنگ برساؤ
ہوں انتظار میں، اے دشمنِ وفا آؤ
ابھی نہ جاؤ مرے ساتھیو! کہ تنہا ہوں
بساطِ دل پہ ابھی اور رقص فرماؤ
غمِ حیات کی راہیں بھی جگمگا اٹھیں
مرے ندیم تبسم کی وہ کرن لاؤ
سکوتِ دیدہ و دل تو کسی طرح ٹوٹے
مرے وجود میں تم روح بن کے در آؤ
اٹھاؤ جام کہ کچھ دور ہوں غمِ حالات
کبھی تو ختم ہوں یہ رات دن کے الجھاؤ
وفا کے گیت ہوں یا ہوں خلوص کے نغمے
نسیم شہرِ خرابی میں سوچ کر گاؤ

ہر شخص لیے کاسۂ امید کھڑا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی قحط پڑا ہے
یہ وصل کے لمحے ہیں بہرحال غنیمت
عصیاں کی تلافی کو بہت وقت پڑا ہے
اس شخص کو کس نام سے موسوم کروں میں
سائے کی طرح جو مرے نزدیک کھڑا ہے
کس نے سموئی مری گفتار میں شوخی
یہ کون پسِ پردۂ الفاظ کھڑا ہے
الفاظ کا مرہم نہیں اس زخم کا درماں
جو زخم ترے طرزِ تکلم سے پڑا ہے

جمیل جالبی
نیا دور۔ کراچی

مفکّر نقّاد

ہر اس شخص کے لئے جس کی مادری زبان انگریزی نہیں ہے، ایلیٹ کی نثر اس کی شاعری سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور میں نثر میں اس کے ڈراموں کو اس لئے شامل سمجھتا ہوں کہ یہاں ایلیٹ نے نظم اور نثر کی حدود ملا کر عام بول چال کی زبان سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ ان دو کے بیشتر رشتے ختم ہو کر ایک ہو گئے ہیں۔ یہی وہ "وحدت" ہے جو ایلیٹ کے فن اور ایلیٹ کی شخصیت کی ممتاز خصوصیت ہے۔ اس وحدت کے معنی وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو "لطیف اور جامع میڈیم" کے معنی سمجھتے ہیں اور جو اس بات کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اس کا تجربہ بھی رکھتے ہیں کہ "فن شخصیت کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ شخصیت سے فرار کا نام ہے"۔

جب میں ایلیٹ کی نثر کو ایک غیر اہلِ زبان کی حیثیت سے اس کی شاعری پر ترجیح دیتا ہوں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی زبان کی شاعری سے نہ صرف وہی لوگ پورے طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے لہجہ اور تیور کو نہ صرف اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہوں بلکہ جن کے مزاج میں اس زبان کے کلچر کی روح چہک چہک کر بول رہی ہو اور جو اُن جذبوں اور ان محسوسات سے بخوبی واقف ہوں جو 'آفاقی' ہوتے ہوئے بھی 'قومی' ہوتے ہیں۔ کسی زبان میں 'سوچنا' بمقابلہ اس زبان میں محسوس کرنے کے نسبتاً آسان ہے۔ اسی لئے کوئی فن بمقابلہ شاعری کے اتنی شدت کے ساتھ قومی خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا۔ جب میں ایک غیر اہلِ زبان کی حیثیت سے ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری پر ترجیح دیتا ہوں تو اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں اس کی شاعری کی اہمیت کو جھٹلا رہا ہوں یا میں اس کی شاعری سے ایک حد تک لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس بات کا اعتراف مقصود ہے کہ میں انگریزی میں سوچ تو سکتا ہوں محسوس نہیں کر سکتا۔ شاعری میں محسوس کرنے کا عمل بمقابلہ نثر کے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ایلیٹ کی نثر نے، اس کی شاعری سے ایک حد تک لطف اندوز ہونے کے باوجود، مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے اور میں نے خیال سے لے کر جملوں کی ساخت، لہجے کی ادا، بات کے ڈھنگ تک سے وابستگی محسوس کی ہے پھر ایک بات یہ کہ اس کی نثر اور خصوصاً ادبی تنقید اس کی شاعری کے مقصد کو آگے بڑھانے کے باوجود ایسی خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہے جو خود اس کی شاعری کی نفی کرتی ہیں، نہ صرف نفی کرتی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الگ الگ دو آدمی ہیں جو ایک حد تک ہم خیال ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور جن میں سے ایک نثر لکھتا ہے اور دوسرا شاعری کرتا ہے۔ یہ عمل ادب کی تاریخ میں کبھی کبھار ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں لے دے کے مولانا حالی کی مثال ملتی ہے۔ ایک جگہ ایلیٹ خود اس بات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "اپنی تنقید میں اگرچہ میں انتہائی صحیح رائے پیش کرتا ہوں لیکن میں اپنی شاعری میں خود ان کی خلاف ورزی کرتا ہوں اور اگر آپ اسے منافقانہ بات نہ بھی سمجھیں تو بھی یہ ایک طرح سے دو روپ [illegible]

نسیم انصاری — سیپ۔ کراچی

ستم کے تیر، ملامت کے سنگ برساؤ
ہوں انتظار میں، اے دشمنِ وفا آؤ

ابھی نہ جاؤ مرے ساتھیو! کہ تنہا ہوں
بساطِ دل پہ ابھی اور رقص فرماؤ

غمِ حیات کی راہیں بھی جگمگا اُٹھیں
مرے ندیم تبسم کی وہ کرن لاؤ

سکوتِ دیدہ و دل تو کسی طرح ٹوٹے
مرے وجود میں تم روح بن کے در آؤ

اُٹھاؤ جام کہ کچھ دور ہوں غمِ حالات
کبھی تو ختم ہوں یہ رات دن کے اُلجھاؤ

وفا کے گیت ہوں یا ہوں خلوص کے نغمے
نسیم شہرِ خرابی میں سوچ کر گاؤ

باسط عظیم — ساغر۔ کراچی

ہر شخص لئے کاسۂ اُمید کھڑا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی قحط پڑا ہے

یہ وصل کے لمحے ہیں بہر حال غنیمت
عصیاں کی تلافی کو بہت وقت پڑا ہے

اس شخص کو کس نام سے موسوم کروں میں
سائے کی طرح جو مرے نزدیک کھڑا ہے

کس نے سموئی مری گفتار میں شوخی
یہ کون پسِ پردۂ الفاظ کھڑا ہے

الفاظ کا مرہم نہیں اُس زخم کا درماں
جو زخم ترے طرزِ تکلم سے پڑا ہے

اشتیاق طالب

منشور۔ کراچی

ظلم کے شعلے گلستاں میں بھڑکتے ہی رہے
ہم کہ پھولوں کی طرح پھر بھی مہکتے ہی رہے
ظلمتوں کے رقص یخ بستہ فضا کے باوجود
دامنِ شب پر ستارے کچھ چمکتے ہی رہے
جیسے صحرا میں بگولے، جیسے گلشن میں صبا
جستجو میں آپ ہم اپنی بھٹکتے ہی رہے
نفرتوں کی گرد کے اٹھتے رہے طوفاں تو کیا
دامنِ دل ہم مگر اپنا جھٹکتے ہی رہے
ہر نفس مہکا ہوا تھا بوئے جسم یار سے
خار بن کر وسوسے دل میں کھٹکتے ہی رہے
کوئی یہ دیکھے کہ ہم ترکِ وفا کے باوجود
صورتِ دل اس کے پہلو میں دھڑکتے ہی رہے

انور انجم

نقوش۔ لاہور

میری بستی میں جو سورج کبھی اترا ہوتا
میں بدن ہوتا ترا، تو مرا سایا ہوتا
کس کی بے مہر ادا سے ہمیں شکوا ہوتا
ہم کسی کے نہ ہوئے کون ہمارا ہوتا
جان پر کھیل کے میں راہِ وفا طے کرتا
اُس کی جانب سے مگر کچھ تو اشارا ہوتا
دل کا احسان ہے جو بجھ گیا خود ہی، ورنہ
جانے میں کس کو کہاں ڈھونڈنے نکلا ہوتا
اُس کو پانے کی تو حسرت ہے اُسے پا کر بھی
کس کو معلوم ہے دل یونہی اکیلا ہوتا
دُور سے کھینچتا رہتا ہے جو تصویر مری
کاش اُس نے کبھی نزدیک سے دیکھا ہوتا
سُن کے یاروں کے الم سوچتا رہتا ہوں کہ میں
کیسے جیتا جو ترا پیار بھی جھوٹا ہوتا
میرے عیبوں میں ہے شامل مری مجبوری بھی
میں بھی انسان نہ ہوتا تو فرشتہ ہوتا
تم نہ آئے کبھی نزدیک تو اچھا ہی کیا
لوگ ناداں ہیں، یونہی شہر میں چرچا ہوتا

شاعری کی تاویل کرنا ایک ایسی غلطی ہے جو ایک طرف اس کی شاعری سے لطف اندوزی کو مجروح کرتی ہے اور دوسری طرف اس کی تنقید کو ایک مقرر لیکن غلط رُخ دے دیتی ہے۔ اسی لئے جب میں ایلیٹ کی نثر کو اس کی شاعری سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں تو اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ میں اس کے تنقیدی کارناموں کو اپنی زبان کے لئے اس کی شاعری سے زیادہ مفید سمجھتا ہوں اور دوسرے یہ کہ اس کی تنقید اس کی شاعری کا ایک ذیلی حصّہ نہیں ہے بلکہ شاعری سے الگ ایک زندہ سرگرمی ہے۔ شخصیت کے اسی دورُخے پن کی وجہ سے اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی صلاحیت کو غصب نہیں کرتا مثلاً ایلیٹ کا تنقیدی شعور بہت لطیف ہے وہ کلاسیکیت کا حامی ہے۔ اس کا مطالعہ اور اس کی دلچسپیاں ایسی نظموں اور ایسے شاعروں سے زیادہ ہیں جو خود اس کے اپنی شاعری سے بالکل متضاد و مختلف ہیں۔ دلچسپیوں کے اس تضاد کی وجہ سے اس کی تخلیقی صلاحیت اس کے تنقیدی فیصلوں کو اور اس کا تنقیدی شعور اس کی تخلیقی قوت کو غصب نہیں کرتے بلکہ دونوں کو الگ الگ محفوظ کرتے اور پرورش پانے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی لئے ایلیٹ بیک وقت شاعر بھی بڑا ہے اور نقاد بھی۔ ذہن اور شخصیت کے اس توازن کا اندازہ وہ لوگ آسانی سے کر سکتے جنھوں نے ایسے ہی پل صراط پر چلنے کی کوشش کی ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ ایلیٹ کی شخصیت میں تنقید اور تخلیق کا عمل ایک دوسرے کے ساتھ اس طور پر گڈمڈ نہیں ہو جاتا کہ دونوں کی الگ شان باقی رہے۔ مثال کے طور پر اس کے مذہبی عقائد جنھیں میری طرح اور لوگ بھی رجعت پسندانہ سمجھتے ہیں' اسے اچھی شاعری سے لطف اندوز ہونے سے معذور نہیں کر دیتے۔ اپنے مذہبی عقائد کے باوجود وہ 'جمالیاتی اثر' کو مذہبی اثر سے، اخلاقی، سیاسی اور سماجی اثر سے آزاد اور الگ سمجھتا ہے۔ وہ شاعری کی بابت ایک طرف یہ کہتا ہے کہ اس کا مقصد خود اس کے اندر موجود ہے اور ساتھ ساتھ وہ نہ صرف لادینی شاعروں سے بلکہ غیر مذہبی شاعروں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ بودلیئر والے مضمون سے میں ایلیٹ کے نقطۂ نظر اور اس کے اندازِ فکر کو تو سمجھ سکتا ہوں لیکن اس کی شاعری کو نہیں۔ اسی لئے دانتے والے مضمون کو پڑھ کر میں اس کی فکر، اس کے تنقیدی شعور کی داد تو دے سکتا ہوں لیکن دی ویسٹ لینڈ، دی ہولو مین، برنٹ نورٹن، ایسٹ کوکر، لوسونگ اور جے الفریڈ پروفروک وغیرہ کے سمجھنے میں مجھے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ یہاں تک ملٹن کی عیسائیت کے باوجود وہ اس کی شاعری کی عظمت کا منکر ہے اور اس وقت تک منکر رہتا ہے جب تک مذہبی عقائد اور مذہبی مسائل ضعفِ جسم اور موت کے احساس کے ساتھ، اس کے فکر و احساس میں اس درجہ غلو نہیں کر لیتے کہ وہ تصوف کے گنبد بے در میں چکر لگاتے ہوئے اپنے پہلے مضمون (۱۹۳۶ء) پر اظہارِ افسوس کرتا ہے اور اس قسم کے دلائل دیتے ہوئے ملٹن کی دوبارہ توصیف کرتا ہے کہ "ملٹن صرف اس وجہ سے عظیم شاعر تھا کہ اس کے بعد کوئی بھی ملٹن کی طرح کی شاعری نہ کر سکا"۔ یہ بات ہر ٹٹ پونجئے شاعر کے بارے میں اسی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ اس پورے مضمون میں وہ ملٹن یا جنتِ گم گشتہ کے بارے میں کسی بڑے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ اس ذہنیت کے ساتھ ممکن ہے کہ ایلیٹ پیر و مرشد تو بن گیا ہو لیکن اس کا تنقیدی شعور کمزور پڑ کر کند ہونے لگتا ہے۔ بہرحال ملٹن (۱۹۳۶ء)، دانتے (۱۹۲۹ء)، بودلیئر (۱۹۳۰ء) وہ مضامین ہیں جو بنیادی طور پر اس کی شاعری کی نفی کرتے ہیں اور اگر ان مضامین کی مدد سے اس کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے میر کے کلام سے ایک مربوط نظامِ حیات تلاش کیا جائے یا داغ کی شاعری کو صوفیانہ شاعری ثابت کیا جائے۔ بہرحال آخری عمر کی تحریروں کو چھوڑ کر ایلیٹ کی شخصیت اور اس کے فن میں ایسے دو روپ ملتے ہیں جو ایک ہو کر بھی الگ الگ ہیں اور جہاں تنقیدی شعور تخلیقی قوت کو اور تخلیقی قوت تنقیدی شعور کو غصب نہیں کرتے۔ اب اگر میں ایلیٹ کی نثر کو شاعری پر ترجیح دیتا ہوں یا اسے ایک الگ سرگرمی کے طور پر دیکھتا ہوں تو شاید یہ بات اب اتنی بے معنی نظر نہ آئے جتنی شروع میں نظر آتی تھی۔

یہ دیکھنے کیلئے کہ تنقید کے سلسلے میں ایلیٹ کا بنیادی نظریہ کیا ہے اس کے بہت سے مضامین کے علاوہ میری نظر اس کے ایک مضمون "تنقید کا منصب" پر جاتی ہے۔ جہاں وہ تخلیق اور تنقید پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے "کہ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ فن اپنے علاوہ بھی کچھ اور مقاصد

کا ادا کر سکتا ہے۔ لیکن خود فن کے لئے ان مقاصد سے باخبر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور فن درحقیقت اپنا منصب، وہ جو کچھ بھی ہو، اظہار کے مختلف طریقوں کے مطابق زیادہ بہتر طریقہ پر اس سے بے خبر رہ کر ہی انجام دے سکتا ہے۔ برخلاف اس کے تنقید کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ کسی مقصد کا اظہار کرے ایلیٹ اپنے مخصوص معنی میں تخلیق کے لئے بے خبری کو شرط قرار دیتا ہے اور تنقید کے لئے باخبری کو۔ یہاں تنقید میں شعور کی سطح واضح ہے۔ فکر اور اس کے وہ بنیادی مسائل اہمیت رکھتے ہیں جن پر ادب کی بنیاد قائم ہے اور جن سے معاشرہ کی تہذیبی روح قوت حاصل کرتی ہے فکری تنقید کے بغیر آج کا ادب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ جب تنقید کے ساتھ میں فکر کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں جب سائنس نے فلسفے کو غیر اہم بنا دیا ہے اور فلسفہ رفتہ رفتہ سائنس کی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر خود بے معنی ہو رہا ہے میں ادبی تنقید کے ذریعہ وہ کام انجام دینا چاہتا ہوں جو ایک زمانہ میں ادب اور فلسفہ الگ الگ انجام دیتے تھے۔ اسی لئے میں اس تنقید کو جو فکر سے عاری ہے ادب کے دائرے سے بھی خارج سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس تنقید کے علمبردار وہ لوگ ہیں جو ایلیٹ کے الفاظ میں "وہ استاد ہیں جو نقاد بن گئے ہیں اور جن کی تنقیدی سرگرمیاں پہلے پہل کلاس روم میں رونما پذیر ہوئیں"۔ تنقید کی یہی وہ قسم ہے جسے میں "نصابی تنقید" کا نام دیتا ہوں۔ اس تنقید نے ایک طرف خود تنقید کی تخلیقی سطح کو بے معنی بنا دیا ہے اور دوسری طرف اصلاح مذاق، خیال کی پیدائش، ارتقاء اور ذہن کی تربیت کے عمل کو بند کر دیا ہے۔ مثلاً اس تنقید کا ایک زہریلا اثر تو یہ ہوا ہے کہ آج کا طالب علم کسی اور مکمل تصنیف کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ نہیں رکھتا۔ اسے ادب پاروں سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ نصابی نقادوں کی رائیں ادب پاروں کا بدل بن گئی ہیں۔ اس زہریلے اثر نے سوچنے کی صلاحیت کو مردہ کر دیا ہے اور ادب پاروں کے ساتھ ذہنی سفر کو ایک بے معنی چیز بنا دیا ہے۔ نصابی نقادوں کی آراء کی بیساکھیاں نوجوان طالب علموں کے پاس ہیں اور ادبی فیصلوں کے کیپسول ان کے ذہن کے خانوں میں رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی ساری ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ جعلی دستاویزیں، نقلی مہروں کے ساتھ، اصل کی جگہ چل رہی ہیں۔ اور یہ صورتحال ایسی ہے کہ اس پر جس قدر تشویش کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

اسی صورت حال کی وجہ سے تنقید ایک دوسرے درجہ کی سرگرمی بن گئی ہے جو تخلیق کی ضد ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو حقیقی تنقید حقیقی تخلیق کی ضد ہرگز نہیں ہے۔ ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جب تک ادب ادب رہے گا اس وقت تک تنقید کے لئے جگہ باقی رہے گی کیونکہ تنقید کی بنیاد بھی اصل میں وہی ہے جو خود ادب کی ہے"۔ تنقید اور تخلیق کے بنیادی رشتہ کو سمجھنے کے لئے بجلی کی اس لہر کی مثال دی جا سکتی ہے جو ایک طرف کمروں کو روشن رکھتی ہے، پنکھے چلاتی ہے اور پانی ٹھنڈا کرتی ہے اور دوسری طرف کپڑا بنتی ہے، تصویریں دکھاتی ہے اور دنیا بھر کی خبریں آناً فاناً ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے۔ یہ سب کام نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان سب میں بجلی کی ایک ہی لہر کام کر رہی ہے۔ اور بنیادی طور پر وہ وہی رہتی ہے۔ اسی طرح تنقید کی بنیاد بھی اصل میں وہی ہے جو خود ادب کی ہے۔ تنقید کو غیر تخلیقی سرگرمی سمجھنا اس بات کی علامت ہے کہ ہم ادب کے معنی و مفہوم، مزاج و نوعیت، حدود و ماہیت سے واقف نہیں ہیں۔ تخلیق میں تنقید کا عنصر اور تنقید میں تخلیق کا عنصر اپنے طور موجود رہتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو نہ تخلیق تخلیق رہتی ہے اور نہ تنقید تنقید۔

اس تنقید کی اہمیت، جس کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں اور جس کا ایک ذمہ دار نمائندہ ایلیٹ ہے، یہ ہے کہ ہر نسل کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تنقید خود پیدا کرے اور اپنی فکر کے پیمانوں اور معیاروں کا از سر نو جائزہ لے۔ اگر کوئی نسل اپنی تنقید پیدا کرنے سے قاصر رہی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ ادب میں اور نہ صرف ادب میں بلکہ پورے نظام خیال میں جس کا اظہار اس معاشرے کے کلچر میں ہو رہا ہے، سخت گڑبڑ، سخت انتشار اور بحران موجود ہے اس بحران کے معنی وہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں جو کلچر اور ادب کے معنی کو جانتے ہیں اور ادب کو کلچر کی تشکیل جدید کا ایک اہم اور بنیادی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے اپنے ادب، اپنے معاشرے اور اپنے کلچر پر نظر ڈالئے تو موجودہ تخلیقی ناکارہ پن اور تہذیبی و معاشرتی بحران کے اسباب سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ کیا ہم اپنے ادب کو دیکھ کر اپنی نسل کے کسی نقطہ نظر کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس تنقید کا پتہ بتا سکتے ہیں جو ہماری نسل نے پیدا کیا ہے؟ کیا ہمارے

پاس اپنے کوئی ایسے پیمانے، کوئی ایسے معیار نہیں جن سے ہم اپنے ماضی کا نہ صرف ماضی کا بلکہ حال کا جائزہ لے سکتے ہیں ۔ اپنے دور میں سرسید کی نسل نے اپنے تنقیدی معیار بنائے تھے ۔ اکبر کی نسل نے بھی اپنے طور پر تنقید کے اپنے پیمانے اور معیار بنائے تھے ۔ اقبال کی نسل نے بھی اپنی تنقید خود پیدا کی تھی یہاں تک کہ ترقی پسندوں نے بھی جنھیں ہم لوگ بے وجہ مطعون کرتے رہتے ہیں، اپنی تنقید خود پیدا کی تھی ۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد سے، چند مبہم اور جذباتی باتوں کو چھوڑ کر ہم کسی ایسے تنقیدی معیار کی طرف اشارہ نہیں کرسکتے جسے ہم اپنی نسل سے منسوب کرسکیں ۔ ہماری تنقید ابھی از کار رفتہ طریقوں اور اندازِ فکر کی تقلید کررہی ہے ۔ انہی مقاصد کو دہرا رہی ہے اور انہی ذہنی کیفیات کا اظہار کررہی ہے جن کو ہماری پچھلی بلکہ پچھلی سے پچھلی نسل نے پیش کیا تھا ۔ ہماری نسل کے پاس اپنی تنقید اور اپنے معیار نہ ہونے کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہم فراق گورکھپوری، حسن عسکری اور کلیم الدین احمد سے آگے نہیں بڑھے ہیں اور ہم جوش، راشد، مجاز اور فیض سے بڑے یا کم از کم ان کے برابر قد کے شاعر بھی پیدا نہیں کرسکے ہیں ۔ اس تخلیقی ناکارہ پن کا سبب یہ ہے کہ ہماری نسل اپنی تنقید پیدا کرنے سے معذور ہوگئی ہے ۔ اور یہ بات اتنی تشویشناک ہے کہ اس سے ساری تہذیبی روح کے مردہ ہوجانے کا امکان پیدا ہوگیا ہے لیکن اس خطرہ کو وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جو تنقید کی تخلیقی قوت کے معنی سمجھتے ہیں! ایلیٹ کے الفاظ کا سہارا لے کر میں اپنی نسل پر یہ بات واضح کرتا چلوں کہ "تنقید اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا خود سانس لینا"!

جیسا کہ میں نے کہا 'ہر زندہ نسل' اپنی تنقید، اپنے معیار اور پیمانے خود بناتی ہے ۔ اسی سے توصیف کے پیمانے بنتے ہیں اور اسی سے گمنام ادیب اور ادبی ادوار دوبارہ اہمیت حاصل کرتے ہیں اور نامور ادیب اور ادوار گوشۂ گمنامی میں جا چھپتے ہیں ۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ہر دور اپنے پچھلے دور سے ذہنی، سماجی، تہذیبی و فکری اعتبار سے مختلف ہوتا ہے ۔ اس کی ضروریات، تقاضے اور عوامل جدا ہوتے ہیں ۔ ہم اپنے والدین سے اس اعتبار سے مختلف ہیں ہمارے بچے ہم سے مختلف ہوں گے ۔ اسی لیے پرانے معیاروں پر ہمیشہ نظرِ ثانی کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ نئے معیار، جو اس نسل کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرسکیں، تلاش کئے جاسکیں ۔ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ وہ ادیب یا ادیبوں کی وہ جماعت ہے جو اسے انجام دیتی ہے ادب و تہذیب میں خود تاریخی اہمیت اختیار کرلیتی ہے ۔ سرسید اور حالی اسی لئے بڑے اور اہم ہیں ۔ کالرج اور میتھو آرنلڈ اسی لئے تاریخ میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں ۔ جدید دور میں ایلیٹ کی بھی یہی اہمیت ہے ۔ آپ اس سے ہزار اختلاف کریں لیکن اسے نظر انداز نہیں کرسکتے ۔ آپ اسے رجعت پسند کہیں لیکن اسکی ملت کا حوالہ دینا ضروری ہوگا ۔ تاکہ آپ ترقی پسندی کو پہچان سکیں ۔ ایلیٹ نے اپنی نسل کے لئے جو معیار اور پیمانے بنائے ان کے ساتھ ہی دورِ الیزبتھ کے ڈرامہ نگار دوبارہ مقبول ہوگئے ۔ اور ان میں اس نسل کو نئے معنی نظر آنے لگے ۔ نہ صرف یہ بلکہ انیسویں صدی کے مقبول شعراء ٹکسال باہر ہوگئے ۔ ملٹن کی شہرت اور شاعرانہ عظمت مشتبہ ہوگئی ۔ ڈرائڈن اور پوپ دوبارہ مقبول ہوگئے ۔ سترھویں صدی کے مابعد الطبیعاتی شعراء جو اب تک ایک عجیب و غریب مخلوق سمجھے جاتے تھے، ایک نئی معنویت کے ساتھ اس نسل کی فکر میں شامل ہوگئے ۔ دانتے اور ڈان دوبارہ زندہ ہوگئے ۔ رومانیت کے پیر لوٹ گئے اور کلاسکیت پر دوبارہ بامعنی بحث ہونے لگی ۔ مذہب میں دوبارہ معنی نظر آنے لگے ۔ ہر نسل کے اپنے تنقیدی معیار زندگی کے ہر شعبہ میں یہی کام انجام دے کر زندگی میں معنی پیدا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح معاشرہ تخلیقی بانجھ پن سے محفوظ رہتا ہے ۔

ایلیٹ کسی فن پارہ کو کوئی ایسی الہامی چیز تسلیم نہیں کرتا جو شدتِ جذبات کے ساتھ ایک خاص شکل اور ایک خاص لے میں خود بخود وجود میں آگیا ہو ۔ وہ فن پارے کو ایک "شے" کی طرح سمجھتا ہے جسے سوچ سمجھ کر، ناپ تول کر سلیقہ اور محنت سے تعمیر کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ یہ اثر فنکار کے سامنے پہلے سے موجود ہوتا ہے ۔ اس بات کی وضاحت وہ معروضی تلازمات (OBJECTIVE CORRELATIVES) کے نظریہ سے کرتا ہے جسے اس نے ہیملٹ والے مضمون میں پیش کیا ہے ۔ فن کی شکل میں جذبات کے اظہار کا واحد طریقہ یہ ہے کہ معروضی تلازمات تلاش کئے

جائیں یعنی اشیاء کو اس طرح ترتیب دیا جائے ۔ موقع عمل اور واقعات کے سلسلوں کو اس طور پر جمایا جائے کہ جب خارجی واقعات حسی تجربوں کے ذریعہ ظاہر ہوں تو وہ مخصوص جذبہ یا جذبات، جو فنکار کے پیش نظر تھا، ابھر آئے ۔ یہ کام بصری امیجز اور موزوں الفاظ کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے ۔ امیجز کے ذریعہ جذبات کا اظہار ہوگا اور زبان کو اس طور پر استعمال کرنے سے سمعی تخیل کا ۔ اس عمل کے ذریعہ، ایلیٹ کا خیال ہے، پہلے سے سوچا سمجھا اثر پیدا کیا جاسکتا ہے اور فن پہلے سے سوچی سمجھی اثر آفرینی کا نام ہے ۔ اس کی ایک دلچسپ مثال خود ایلیٹ کے مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" میں ملتی ہے جہاں وہ شخصیت اور جذبات کے مسئلہ کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پلیٹنیم کے ایک نازک و نفیس ٹکڑے کو ایک ایسے ہینڈ بیگ میں داخل کیا جاتا ہے جو آکسیجن اور سلفر ڈائی آکسائیڈ سے بھری ہو ۔ جب ان دو گیسوں کو پلیٹنیم کے تار کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو نتیجہ کے طور پر سلفیورس ایسڈ پیدا ہوتی ہے ۔ یہ آمیزہ اسی وقت وجود میں آتا ہے جب پلیٹنیم موجود ہو لیکن اس کے باوجود اس نئی گیس میں پلیٹنیم کا کوئی بھی نشان موجود نہیں ہوتا اور پلیٹنیم بھی بظاہر متاثر نہیں ہوتا اور بالکل بے حرکت اور غیر مبدل رہتا ہے ۔ شاعر کا دماغ بھی پلیٹنیم کے ٹکڑے کی طرح ہوتا ہے .... سائنسی تجربے کی رو سے یہ مثال بالکل غلط ہے ۔ سرے سے یہ ہوتا ہی نہیں لیکن اس قیاسی تجربے کو اس طور پر بیان کرنے سے ایلیٹ اپنے خیال کی ایک ایسی تصویر بنا دیتا ہے کہ ذہن کی آنکھ اس سائنسی تجربے کو دیکھ کر اس اثر کو قبول کر لیتی ہے جو فنکار کے پیش نظر ہے ۔ یہی معروضی تلازمات کا نظریہ ہے ۔

ایلیٹ جمالیاتی اقدار کو سب اقدار سے الگ قائم کر کے یہ بتاتا ہے کہ شاعری خالص اور اچھوتی جمالیاتی روح کا نام ہے ۔ وہ ماضی کو ادب اور تہذیب کے لئے بنیادی اہمیت دیتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ اپنے دور کا شعور بغیر ماضی کے شعور کے ادھورا اور ناقص ہے ۔ ماضی کا شعور ان لوگوں کے لئے ناگزیر ہے جو پچیس سال کی عمر کے بعد بھی شاعر رہنا چاہتے ہیں لیکن یہاں ماضی کا شعور صرف گذرے ہوئے زمانے اور بیتے دنوں کی یادوں کا رومانوی تصور نہیں ہے ، جب گاڑیوں میں گھوڑے جتتے تھے اور ان کے ٹاپوؤں کی آواز اندھیری سڑکوں پر دور تک سنائی دیتی تھی بلکہ یہ ماضی حال کا حقیقی حصہ ہے ۔ یہیں سے ایلیٹ کے ہاں روایت کا تصور پیدا ہوتا ہے ۔ روایت تکرار سے بہتر ہے ۔ یہ میراث میں نہیں ملتی اور اگر کوئی اسے حاصل بھی کرنا چاہیے تو اس کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اول تو اس کے لئے تاریخی شعور کی ضرورت پڑتی ہے ۔ تاریخی شعور مجبور کرتا ہے کہ لکھتے وقت جہاں اسے اپنی نسل کا احساس رہے وہاں یہ احساس بھی رہے کہ یورپ کا سارا ادب ہومر سے لے کر اب تک اور اس کے اپنے ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے ۔ یہ تاریخی شعور جس میں زماں اور لازماں کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے وہ چیز ہے جو ادیب کو روایت کا پابند بناتا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو کسی ادیب کو زماں میں اس کے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتا ہے ۔ روایت کے اس تصور نے جدید ادب کو ایک نئے معنی دیئے ہیں ماضی کے اسی شعور کے ذریعہ ہم اپنی بنیادی غلطیوں، غیر ضروری ستائش اور تاریخی و ذاتی مغالطوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں جن میں ہماری تنقید پھنسی ہوئی ہے ۔

ایلیٹ مذہب پر ہر جگہ زور دیتا ہے " اگر تہذیب کے معنی مادی ترقی اور صفائی وغیرہ کے نہیں ہیں بلکہ اس سے اعلیٰ سطح پر معاشی تنظیم ہے تو یہ بات مشکوک ہے کہ آیا تہذیب بغیر مذہب کے زندہ رہ سکتی ہے اور مذہب بغیر چرچ کے " ایک ڈرامہ میں اس کا ایک کردار یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ " ہمارا ادب مذہب کا بدل ہے اور اسی طرح ہمارا مذہب ادب کا " لیکن اس کے باوجود وہ تخلیقی عمل کو مذہبی عقیدے سے الگ رکھتا ہے ۔ دانتے والے مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ " آپ دانتے کے فلسفیانہ اور دینی عقائد کو نظر انداز کرنے کی جراءت نہیں کر سکتے لیکن ان کے ساتھ ان عقائد کو ماننا آپ کے لئے ضروری نہیں ہے کیونکہ فلسفیانہ عقیدہ اور شاعرانہ قبولیت میں فرق ہے ۔ یہاں آپ اس عقیدے کو ماننے پر مجبور نہیں ہیں جس پر دانتے ایمان رکھتا تھا بلکہ آپ اسے زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش ضرور کرنے لگتے ہیں ۔

ایلیٹ سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اس نے تنقید میں فکر کو جذب کر کے ایک نئی قوت دی ہے ۔ اس کی تنقید تاثراتی نہیں ہے ۔ وہ طرز فکر، تجزیہ، تحلیل وہ وسائل ہیں ۔ وہ اپنے خوبصورت اور جچے تلے انداز میں ٹھنڈے ٹھنڈے باوقار طریقے سے بات کرتا ہے

اس کے اسلوب میں شامل بھی رہتی ہے اور علیحدہ بھی۔ اپنے اسلاف شعراء میں ان شعراء سے وہ خاص دلچسپی کا اظہار کرتا ہے جنھوں نے ماضی سے شدت کے ساتھ اپنا رشتہ توڑلیا ہے جیسے لافورگ، ڈان وغیرہ یا پھر جنھوں نے رشتہ توڑے بغیر بول چال کی زبان سے قریب رہنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے وہ جیکوبین ڈرامہ نگاروں کو محبوب رکھتا ہے۔ ایلیٹ رسمی اظہار کے خلاف ہے اور ڈرامائی اور عام بول چال کی زبان کا مداح ہے۔ اس کی تنقیدی زبان اس کے اپنے تجربے اور شخصیت کا پورا اظہار کرتی ہے۔ طویل جملوں اور جملہ ہائے معترضہ کے باوجود اس کا انداز بیان برجستہ اور دلکش ہے اس کی شاعری کی طرح اس کی نثر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ہم اردو والے ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں

مسیح الزماں
شعبۂ خوش خط الہ آباد

بریخت کا ایپک تھیٹر

ادب اور فن کی دنیا میں بت بنتے اور ٹوٹتے رہے ہیں، عقائد، تصورات، خیالات اور نظریات، انسانی ذہن و احساس میں برسات کے گھنیرے بادلوں کی طرح شکلیں بناتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ ان شکلوں کی مدتِ حیات یکساں نہیں ہوتی۔ اپنے تراشنے والوں کے درکِ حیات کے مطابق ان کی پرستش بھی ہوتی ہے اور فرمانروائی بھی۔ فکرِ انسانی کا کاروان شکست و تعمیر، کلیم و سومنات، نیوٹن اور گلیلیو کی روایت پر آگے بڑھتا ہے۔ اس کی راہ میں نہ بے ستون حائل ہوتے ہیں نہ INQUISITION کی آگ ان کے قدم روکتی ہے، عقائد مجروح ہوتے ہیں، بنے بنائے تصورات بکھر جاتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے بڑھتے ہوئے شعور کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ بیسویں صدی نے بہت سے پرانے بت توڑے ہیں ان کی جگہ نئے صنم کدے آباد کئے ہیں۔ ان نئے صنم تراشوں میں جرمن ڈرامہ نگار اور پروڈیوسر برتول بریخت BERTOLT BRECHT (۱۸۹۸ء-۱۹۵۶ء) بھی ممتاز شخصیت رکھتا ہے۔

یوں تو ڈرامہ کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ میں کتنی ہی تحریکیں ابھریں، مروّج ہوئیں اور وقت کے گرد و باد میں دب کر رہ گئیں لیکن ارسطو کے ڈرامائی نظریات کو بریخت کے خیالات نے جو دھچکا پہنچایا اس نے صدیوں کی مسلسل روایات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ڈرامہ اور اسٹیج میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اسی انقلاب کی نوعیت سمجھنے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ کرنے کیلئے ایک پس منظر یا تمہید کی ضرورت ہے۔ لیکن اس تمہید سے پہلے یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ بریخت پر اپنے پہلے کے کئی قسم کی ڈرامائی روایتوں اور طرزِ فکر کا اثر تھا جسے اس نے ہمیشہ تسلیم کیا۔ ڈرامہ اور اسٹیج کی ان روایتوں کو اپنے تجربہ اور فکر کی آنچ میں گلا کر بریخت نے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کی آواز میں ایک مبلغ کے جوش کے ساتھ ساتھ اعتماد اور خلوصِ نیت کی جھنکار ہے جس کی بنا پر لوگ اس کے نظریات کو نیا اور انقلابی سمجھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں واقعیت پسند اسٹیج نے عروج حاصل کیا۔ اس کے پہلے روشنی کے جدید کرشموں اور اسٹیج کی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے ہدایت کار کا یہ مقصد نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسٹیج پر فریبِ حقیقت (ILLSION OF REALITY) پیش کرے یعنی جو مناظر ڈرامہ میں دکھائے جائیں انہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ دھوکہ ہو کہ یہ واقعات سچ مچ پیش آ رہے ہیں۔ واقعیت پسند اسٹیج نے بجلی کے کرشموں اور اسٹیجی مشینوں کی مدد سے ڈراموں میں فریبِ حقیقت کی وہ طرح ڈالی جس میں اداکار ناظرین سے بالکل غافل زندگی کے کچھ پہلو پیش کرتے تھے۔ اور ناظرین گویا کمرے کی چوتھی دیوار ہٹا کر اندر جھانکتے رہتے تھے۔ یہ واقعیت پسند اسٹیج ایسا عالمگیر انداز سے مروّج و مسلم ہو گیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں اسٹانسلاوسکی (STANISLAVSKI) کے ہاتھوں اس نے وہ بلندیاں حاصل کیں کہ یہ سمجھا گیا کہ اس سے پہلے کی صدیوں پرانی روایتیں تھیٹر سے رخصت ہو گئیں۔

بریخت نے جب آنکھیں کھولیں تو اسے جرمنی میں ایسی فضا نظر آئی جو سرمایہ داری اور فسطائیت کے جلوے دکھا رہی تھی۔ تنگ نظر قوم پرستی

کی سب سے بڑی قدر بن گئی ۔ طاقت کا غرور وہ چیز تھی جس کی وجہ سے بالآخر جرمنی کو پہلی جنگ عظیم میں چھلانگ لگا دینا پڑی ۔ جنگ کے بعد اس کے نتائج اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ نے بریخت کو اس نظام سے بدظن کر دیا اور اس نے سامراج شاہی کے خلاف ایک ڈرامہ لکھا جس میں ایک نیک مزاج صلح پسند آدمی، سامراجی فوج میں بھرتی ہو کر جنگجو اور خونخوار ہو جاتا ہے ۔ انقلاب روس نے سرمایہ داری اور فسطائیت کی نئی لہر یورپ میں دوڑا دی ۔ چنانچہ بریخت نے بھی اشتراکی تحریک سے ہم نوا ہو کر سماجی اصلاح کو فن کی بنیاد بنایا اور رفتہ رفتہ اصلاح کا تصور انقلاب سے بدل گیا ۔

واقعیت پسند اسٹیج (محرابی اسٹیج) میں حقیقی زندگی کی مماثلت اور جدید اسٹیجی مشینوں کے استعمال سے ایک ایسی فضا پیدا کر دی جاتی ہے جس پر ناظرین دنگ رہ جاتے ہیں ۔ کردار زندگی کے جن مرحلوں سے دوچار ہوتے ہیں، جن تجربات سے گزرتے ہیں دیکھنے والے بھی ان سے جذباتی ہم آہنگی پیدا کر کے کم و بیش وہی جذبات اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں ۔ ہیروئن کی بے چینی اور تڑپ خود انہیں بھی درد و کرب میں مبتلا کر دیتی ہے ۔ اور ہیروئن کی کامرانی سے ان کے چہرے بھی مسکرانے لگتے ہیں ۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو المیہ میں ہیرو یا ہیروئن کو مرتا دیکھ کر خود بھی آنسو بہانے لگتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا ناظر ہو جو ایک کامیاب المیہ کی پیش کش دیکھ کر غمزدہ اور متاثر نہ نکلے ۔ ڈرامے کے اسی پہلو کو ارسطو نے تزکیۂ نفس یا KATHARSIS قرار دیا تھا ۔ یعنی اسٹیج پر گزرنے والے واقعات کو دیکھ کر ناظر پر جو غم و الم کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اس کے ذاتی جذباتی تناؤ، تلخ زندگی کے مسائل سے ذہن پر چھائی ہوئی الجھنوں کی بھڑاس نکال دیتی ہے اور اس کے تناؤ کے ختم یا کم ہو جانے کے بعد زندگی کے معمولات میں حصہ لینے کے لئے ایک طرح سے تازہ دم اور سماج کے لئے بے ضرر ہو جاتا ہے ۔ قدیم یونان کے کھلے ہوئے نیم دائرے کے تھیٹر سے لے کر اسٹانسلافسکی کے واقعیت پسند چوکھٹے بکس سیٹ تک اسٹیج اور تھیٹر نے بہت سی شکلیں بدلیں اور پیش کش، اداکاری، سجاوٹ کے مختلف نظریے سامنے آئے لیکن ڈرامے کے اس بنیادی مقصد سے کسی نے انکار نہیں کیا بلکہ سب اسی مقصد کو حاصل کرنے، ناظرین کو اسٹیج پر پیش ہونے والے واقعات کی اصلیت کا زیادہ سے زیادہ یقین دلانے اور انہیں ڈرامائی کرداروں کے جذبات سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنے اپنے نظریے پیش کرتے رہے ۔ گویا تزکیۂ نفس کا خیال دو ہزار سال سے زیادہ تھیٹر کی دنیا میں ایک مسلمہ حقیقت کی طرح مانا جاتا رہا ۔ بریخت نے اس مسلمہ اصول پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کی بنیادیں لرز گئیں اور ڈرامے میں فطرت پسندی یا واقعیت کے بجائے اشتراکی حقیقت نگاری کا نقطۂ نظر پیش کیا ۔ ڈرامہ کے کرداروں کے ساتھ ناظرین کی جذباتی ہم آہنگی بریخت کے نزدیک فن کی بلندی نہیں بلکہ پستی ہے ۔ اسٹیج حقیقی زندگی کا فریب دے کر دیکھنے والوں کو ڈرامہ کے عمل میں شریک کر لیتا ہے اور اس طرح ان کی اپنی انفرادیت زائل کر دیتا ہے ۔ ایسا ڈرامہ دیکھ کر تھیٹر ہال سے باہر نکلنے والا رنجیدہ یا مسرور نکل سکتا ہے لیکن ذہنی بالیدگی یا وسعت نظر لے کر نہیں نکل سکتا ۔ ایسا ڈرامہ ایک اچھی دعوت کی طرح ہے جس سے آدمی مسرور و مطمئن واپس آتا ہے ۔ لیکن فن کے مطالبات ایسی تسکین سے بڑھ کر کچھ اور چاہتے ہیں ۔

بریخت کا خیال ہے کہ جب آدمی کے جذبات ابھار دیئے جاتے ہیں تو اس کی غور و فکر کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں ۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور ڈرامہ کی سماجی اہمیت اور ڈراموں پر سنجیدہ تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا ۔ اس لئے ڈرامہ کی افادیت برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ناظرین کے جذبات کو برانگیختہ ہونے سے روکا جائے اور انہیں مسائل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا جائے جو ڈرامہ کا موضوع ہیں ۔ اس کے لئے سب سے پہلے فریب حقیقت پیدا کرنے کے جذبے ہی کو ختم کر دینا ہوگا ۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ناظرین کو برابر اس کا احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اسٹیج پر اسی لمحہ ہونے والی زندگی کے کچھ واقعات نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ وہ ایک تھیٹر میں بیٹھے ہیں اور ایسے واقعات کی نقل دیکھ رہے ہیں جو ماضی میں پیش آ چکے ہیں ۔ ڈرامہ نگار یا پروڈیوسر کو یہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ ناظر ڈرامہ کے کرداروں میں کسی ایک کے ساتھ جذباتی ہم آہنگی پیدا کر کے اپنی تجزیاتی صلاحیت سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے، بلکہ اسے ایسے طریقے اختیار کرنا چاہئیں کہ دیکھنے والا ڈرامہ کے واقعات اور کرداروں سے اپنے کو الگ اور بے تعلق رکھے ۔ بریخت کا یہ نظریہ بے تعلقی (ALIENATION) کا نظریہ کہلاتا ہے اور اس کی بنیاد پر اس نے ڈراموں کی جو طرح ڈالی اسے ایپک تھیٹر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس غیر ارسطوئی تھیٹر کے اصول بریخت نے ۱۹۳۱ء میں اس طرح گنائے تھے جنہیں ہم مسلمہ ڈرامائی اصول کے ساتھ ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ

دونوں کا فرق واضح ہو جائے۔

ارسطوئی تھیٹر کے اصول

۱ : عمل

۲ : ناظر کو اسٹیج کے عمل میں شریک کر لیتا ہے اور

۳ : اس کی قوت عمل اور جذبۂ عمل صرف کر دیتا ہے

۴ : ناظر کے احساسات کو متحرک کرتا ہے اور اسے جذباتی تجربے سے دوچار کرتا ہے۔

۵ : ناظر کرداروں کے ساتھ مسائل میں کھو جاتا ہے۔

۶ : ڈرامہ مسائل کے کسی مخصوص حل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۷ : تشویش قصہ کے انجام تک رہتی ہے اور ایک منظر دوسرے منظر سے مربوط اور اس پر منحصر ہوتا ہے۔ پلاٹ کی ترقی مسلسل واقعات سے ہوتی ہے۔

۸ : خیال سماجی روح کی تشکیل کرتا ہے۔

۹ : جذبہ یا احساس ڈرامہ کی روح رواں ہے۔

۱۰ : تقدیر پرستی یا آدمی حالات کا اسیر۔

ایپک تھیٹر کے اصول

۱ : بیانیہ

۲ : ناظر کو تماشائی کی حیثیت سے رکھتا ہے لیکن

۳ : اس کے جذبۂ عمل کو بیدار کر دیتا ہے

۴ : ناظر کی قوت فیصلہ کو ابھارتا ہے اور اسے دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیتا ہے۔

۵ : ناظر کے سامنے مسائل حیات سوال بن کر آتے ہیں۔

۶ : ڈرامہ مسائل کے حل کی دلیلیں پیش کرتا ہے۔

۷ : تشویش انجام پر نہیں بلکہ سلسلۂ پیشکش میں ہوتی ہے اور ہر منظر اپنی جگہ خود اپنی حیثیت رکھتا ہے پلاٹ کیلئے مونتاج (MONTAGE) کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔

۸ : سماجی روح خیال کی تشکیل کرتی ہے۔

۹ : دلیل یا عقلیت ڈرامے کی روح رواں ہے۔

۱۰ : آدمی قادر و مختار۔

بریخت نے ڈرامے میں جذبات کی جو مخالفت کی اس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ وہ ڈرامہ کو جذبات سے یکسر خالی رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ بعد کو اس نے اس کی وضاحت کی کہ جذبات تو انسانی زندگی کا لازمی جز ہیں اور زندگی کی پیشکش میں ان کا ظاہر ہونا ضروری ہے لیکن وہ ایسے ڈرامے یا ایسی پیشکش کا مخالف ہے جو ناظرین کو جذبات کی رو میں بہا کر ان کی ذہنی انفرادیت، ان کے سوچنے سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم کر دے اور وہ مسائل حیات پر خود رائے قائم کرنے کے بجائے ڈرامہ نگار کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگیں۔

بریخت کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ طریقے بتا دیئے جائیں جن پر عمل کر کے ایپک تھیٹر مذکورہ بالا مقاصد حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ بریخت نے خود بھی لکھا ہے۔ ایپک تھیٹر ارسطوئی تھیٹر کی ضد نہیں بلکہ ان کا اختلاف بڑی حد تک نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ ایک میں ڈرامہ کے جن پہلوؤں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے دوسرے میں ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے دوسرے پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے۔ ناظرین کو ڈرامہ سے بے تعلق کرنے کیلئے بریخت اسٹیج پر بہت تیز روشنیاں رکھتا تھا اور ان کا مخرج ناظرین سے پوشیدہ نہیں رکھتا۔ اندھیرے یا رات کے مناظر پیش کرنے میں بھی روشنیاں تیز رہتی تھیں تاکہ ناظر کم روشنی کی وجہ سے اونگھ کر جذبات کی دنیا میں نہ چلا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک کہ مقابلے میں ناظرین روشنی کے مخرج کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتے تو اسٹیج پر روشنی چھپے ہوئے ذریعوں سے کیوں آئے۔ اسی طرح پس منظر کی موسیقی کے لئے جو گراموفون استعمال کیا جاتا تھا وہ بھی ناظرین سے پوشیدہ نہیں رہتا تھا۔ اداکاروں کے نام اور تصویریں پیچھے کے پردہ پر منعکس کر دی جاتی تھیں تاکہ لوگ اداکاروں کو اصلی شکل میں بھی دیکھ لیں اور ڈرامے کے دوران میں یہ محسوس کر سکیں کہ یہ اداکار اسٹیج پر اپنا پارٹ کر رہا ہے اور اس کی اصل شخصیت اس سے الگ ہے جو اس وقت پیش کی جا رہی ہے۔

ایپک تھیٹر میں کہا ہے کہ ایک کردار جسے منتظم یا پیشکار کہا جا سکتا ہے اسٹیج پر آکر ناظرین سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے اور ڈرامے کے

بارے میں کچھ بتاتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں کورس کے گانے بھی رکھے جاتے ہیں جو اسٹیج کے ایک کنارے گا کر مختلف مناظر کے بارے میں کچھ کہتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بعض کردار بھی اپنے پارٹ سے الگ ہو کر ناظرین سے کچھ کہنے لگتے ہیں۔ بریخت کی رائج کی ہوئی اداکاری کا بھی بنیادی اصول یہ ہے کہ فقیر کا پارٹ کرنے والے کو خود اپنے کو فقیر محسوس نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بات مدنظر رکھنا چاہیئے کہ وہ صرف فقیر کا پارٹ کر رہا ہے یعنی کسی دوسرے شخص کے ان افعال و حرکات کو پیش کر رہا ہے جو پہلے کبھی واقع ہو چکے ہیں۔ اداکار کو ناظرین کی طرح اپنے کردار سے ایک طرح کی دوری اور بے تعلقی قائم رکھنی چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب اداکار سہراب کا پارٹ کر رہا ہو تو اس میں ولولہ نہیں ہونا چاہیئے جو اس کردار کا تقاضہ ہے۔ اداکار کا فرض ہے کہ جس کردار کا پارٹ کرے اسے پوری طرح دکھائے لیکن اس کردار کو پیش کرنے میں اس کو ان محسوسات اور جذباتی تجربات سے نہیں گزرنا چاہیئے جن سے اصل کردار گزرا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی اداکاری ایسی ہونی چاہیئے کہ دیکھنے والے کہیں کہ فلاں نے سہراب یا گرد آفرید یا اوتھیلو کا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا مگر یہ نہ کہیں کہ وہ سچ مچ سہراب یا گرد آفرید یا اوتھیلو معلوم ہوتا تھا یعنی اداکار کا مقصد ایک دوسرے آدمی کے حرکات و جذبات کو پیش کرنا ہے اور اس طرز اداکاری کو پیش کرنے کیلئے بریخت نے بہت سے طریقے استعمال کئے مثلاً ریہرسل کے دوران اداکاروں کو ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مکالمے کو صیغۂ واحد متکلم میں بولنے کے بجائے واحد غائب میں بولیں اور مکالمہ بولنے کے پہلے "اس نے کہا" یا اسی قسم کا کوئی فقرہ لگالیں یا مکالمے کے ساتھ جو ہدایتیں لکھی رہتی ہیں وہ بھی بولتے رہیں۔ اداکاروں کے چہروں پر بچپوں (MASK) کا استعمال بھی اس نے اسی مقصد سے کیا۔

ممکن ہے جو لوگ ایپک تھیٹر کے نئے انداز اور اس کے اثرات سے روشناس نہیں ہیں انہیں یہ جدتیں محض ایجاد بندہ نظر آئیں۔ لیکن اپنے ڈراموں خصوصاً "ماں"، "گلیلیو"، "جس نے ہاں کہا" اور "ست ژواں کی نیک عورت" میں بریخت نے ان طریقوں سے کام لے کر جس ڈرامائی قوت کا مظاہرہ کیا اُسنے ساری دنیا میں تھیٹر سے دلچسپی رکھنے والوں کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کیا۔ بریخت کی ڈرامائی بے تعلقی کا تصور صرف پیش کش اور اداکاری سے متعلق نہیں بلکہ ڈرامہ کی ساخت سے بھی اس کا گہرا رشتہ ہے اور اس کی اصلی بنیاد وہیں پڑتی ہے۔ کبھی ایک ہی منظر دوبارہ ہوتا ہے اور ان میں بہت معمولی فرق ہوتا ہے کبھی ایک کردار ایک گذشتہ واقعہ کا حوالہ دے کر الگ کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ واقعہ اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے ناظرین جذباتی ہم آہنگی سے بچے رہتے ہیں۔

بریخت کے کردار ناظرین کی موجودگی سے بے خبر نہیں ہوتے اس لئے وہ اپنے مکالموں میں خوبصورتی سے ایسے فقرے یا جملے ادا نہیں کرتے جن سے ان کے آپس کے تعلقات ناظرین پر ایسے واضح ہو جائیں جیسے ان کو بتلائے نہیں گئے۔ "ماں"، "تھری پنی اوپرا" اور "ست ژواں کی نیک عورت" میں ڈرامے کے آغاز ہی میں کردار ناظرین سے اپنے مسائل بیان کر کے اپنا تعارف کرا دیتے ہیں۔ "سفید کنڈلی" میں ایک راوی اسٹیج کے کنارے بیٹھا ہوا تمام ضروری واقعات ناظرین کو بتاتا جاتا ہے۔ بیشتر ڈرامے ایسے ہیں جن میں بیچ بیچ میں گانوں کے ذریعے گزرے ہوئے واقعات پر تبصرہ اور آئندہ کے واقعات کا اشارہ کیا جاتا ہے۔ غرض ان تمام طریقوں سے بے تعلقی کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔

بے تعلقی کی حالت پیدا کرنے کیلئے بریخت کے نزدیک کسی مخصوص تکنیک کا استعمال ضروری نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کی ایک عام حالت کا شعور پیدا کرنا ہے۔ یہ شعور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک چیز کو سمجھانے کیلئے اس کی عام، مانوس حالت سے بدل کر ایک غیر معمولی حالت میں پیش کر دیا جائے۔ ایک طرح سے بالکل سامنے کی واضح چیز کو اس لئے مبہم بنا کر دکھایا جائے کہ وہ اور زیادہ واضح ہو جائے۔ روزمرہ زندگی میں اُسے اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اس آدمی کو بات کا احساس کہ اس کی ماں کسی کی بیوی بھی ہے اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کر لیتی ہے۔ یا فیٹ موٹر کار کے نئے ماڈل کا چلانے والا کسی پرانے فورڈ پر جا بیٹھے اور اس کے انجن کی پھٹا پھٹ اور انداز رفتار کو دیکھ کر موٹر کے ایک عجیب اور مختلف مشین ہونے کا احساس کرے۔

ایپک ڈرامے کی ساخت ڈھیلی ڈھالی بیانیہ انداز کی ہوتی ہے جس میں مختلف واقعات ایک سلسلے میں جڑے ضرور ہوتے ہیں لیکن روایتی طرز کے

کے ڈراموں کی طرح ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ نہ مربوط ہوتا ہے نہ اس کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ اس میں نہ تو جذبے کو ابھارنے کا مقصد رہتا ہے اور نہ ڈرامے کے ارتقا کو مختلف واقعات سے اٹھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کا پلاٹ مختلف چھوٹے چھوٹے پلاٹوں میں منقسم رہتا ہے۔ ڈرامے کا اثر آپس میں ایک دوسرے کے مخالف حالات اور واقعات کو سمونے اور ان کے مونتاج (MONTAGE) سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ارسطوئی ڈرامہ مکمل حالت ہی میں سمجھا جاسکتا ہے لیکن بریختی ڈرامہ چھوٹے چھوٹے حصوں (اکائیوں) میں ہونے کی وجہ سے جستہ جستہ بھی سمجھا جاسکتا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اور اثر لیا جاسکتا ہے جیسے ایک ہی ایپک کے مختلف حصوں سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی مثال چین کے کلاسیکی ڈراموں میں بھی ملتی ہے جس کے لیے لمبے ناٹک کئی مختصر ناٹکوں کا مجموعہ ہوتے ہیں لیکن ان کا تین ناٹکی سلسلہ اس سے مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ بریختی انداز کا ڈرامہ اسی لئے اپنے ڈراموں کو ایکٹوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ انہیں الگ الگ حصے قرار دیتا ہے اور عموماً ان کا عنوان بھی الگ رکھتا ہے۔

بریخت نے اپنے نظریات میں اشتراکی حقیقت نگاری کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ اس نے ڈرامہ کو عوام کی بیداری اور اس نئی قوت کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی جو زندگی کو اشتراکی طرز پر ڈھال سکے، جو فن کو نئے ذرائع اظہار دے کر ایک نئے سماج کی تعمیر و تشکیل میں مدد دے سکے اور اس فرض کو پورا کر سکے جو تاریخ نے اس کے سپرد کیا ہے۔

بریخت کے نزدیک فن اور ادب کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ عوام کو ان کی قوت کا احساس دلائے لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جانا چاہیئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز ازلی نہیں، کوئی چیز ایسی نہیں جو پہلے سے واقعات کا سلسلہ معین کر دے بلکہ واقعات اور حالات آدمی کی قوت عمل کا نتیجہ ہیں۔ اس کی اپنی سکت اور انسانی سماج کے حدود سے باہر کوئی ایسی بالائی قوت نہیں جو حالات کو موڑ دے۔ آج کی سرمایہ دارانہ تہذیب میں مقدر پرستی کی وبا عام ہے اس کے اثرات کو دور کرنے کیلئے ایک اشتراکی حقیقت نگار کو ایسے ادبی اور فنی نمونے پیش کرنے چاہئیں جو لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں سماجی ارتقاء کے فطری اصولوں کو سمجھنے میں مدد دیں۔ اس جدلیاتی کیفیت کو سمجھنے کے بعد ہی ان میں یہ یقین پیدا ہوگا کہ ایک نامناسب سماجی نظام، استحصال اور ظلم کی یہ دنیا ہمارا مقدر نہیں۔ یہ نہ بدل سکنے والی چیز نہیں۔ ان کے دلوں کا یہ یقین ہی مقدر پرستی اور اوہام کو ان کے خیال اور ان کے دل سے دور کر سکتا ہے اور اگلے انقلاب کا راستہ کھول سکتا ہے۔

بریخت کا ایپک تھیٹر اسی لئے ایک تماشہ گاہ نہیں جہاں لوگ تفریح کرنے یا اپنی الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے آتے ہیں بلکہ تھیٹر اس کے نزدیک ایک تعلیم گاہ ہے جہاں عوام کو انکی قوت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ارسطوئی تھیٹر میں تماشائی اسٹیج سے الگ پیش کئے جانے والے واقعات سے الگ جذباتی طور پر ڈرامے کے واقعات اور کرداروں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ایپک تھیٹر میں اس کے برخلاف تماشائی ڈرامے کے واقعات اور کرداروں کے جذبات سے بے تعلق ہو کر پورے تماشے میں شریک رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے سامنے کچھ واقعات کی نقلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ نقلیں پیش کرنے والے اصل کردار نہیں۔ وہ رک رک کر ناظرین سے مخاطب بھی ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح جہاں ڈرامے اصلی عمل سے ان کو الگ اور بے تعلق رکھتے ہیں وہاں ان کو پورے تماشے میں برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔ بریخت نے جب اپنے ڈرامے پیش کئے تو ایک چشم دیدبیان کے مطابق جیسے سارا ہال ایک اجتماعی قوت سے جاگ اٹھا اور سسکتی ہوئی عورتوں اور ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے مردوں کے بجائے دو گھنٹے تک سارے تماشائی مسائل حیات کو سمجھنے میں اداکاروں کے شریک رہے اور اجتماعی ڈرامے کی ایک نئی شکل سے متاثر ہو کر یہ سوچتے ہوئے اٹھے کہ تعصب اور طرفداری، بے ایمانی اور رشوت کے اس سماج کو کیسے بدلا جاسکتا ہے۔

اوپر کی سطروں سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ بریخت ایک منفرد فنکار ہونے کے بجائے اشتراکی ڈھنڈورچی ہے۔ بریخت اپنی پوری زندگی میں صرف چند روز کے لئے روس گیا اور جب ۱۹۳۳ء میں اسے جرمنی سے ملک بدر کیا گیا تو پہلے ڈنمارک میں مقیم ہوا، پھر امریکہ چلا گیا جہاں زندگی کے پندرہ سال گزارے اختلاف کے باوجود بریخت شناسی کے جذبے میں آج امریکہ پیش پیش ہے اور یہ اس کے فن کو بہت بڑا خراج ہے۔

فکر تونسوی — بیسویں صدی۔ دہلی

اوٹ پٹانگ

اگر صبح اخبار نہ آئے تو بابو اونکار ناتھ مضطرب ہو جاتا ہے اسے یوں لگتا ہے جیسے اس کی ارتھی اٹھنے والی ہے۔ ہائے! یہ دنیا کتنی خوبصورت تھی (خیال ہے وہ اٹھ جائے گا) کسی ابھرتی دوشیزہ کے رسیلے گرم گرم ہونٹوں کی طرح۔ مگر صرف اخبار نہ آنے سے کتنی بھونڈی ہو گئی۔ ہر روز کنوارے کنوئیں سے اخبار کا رس جب بابو اونکار ناتھ کے جلے سڑے لبوں میں ٹپ ٹپ گرتا ہے تو ارتھی اٹھانے کے لئے آئے ہوئے لوگ بھاگ جاتے ہیں اور جیسے واشنگٹن کے وہائٹ ہال میں بیٹھا ہوا پریذیڈنٹ جانسن، اونکار بابو سے براہِ راست ٹیلیفون پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: "اونکار بابو! آپ نے آج کا اخبار پڑھا، ہماری ویت نام پالیسی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

اونکار بابو اور پریذیڈنٹ جانسن دونوں اخبار کے غلام بن چکے ہیں۔ اگر کسی دن اخبار کا ایڈیٹر انتقال کر جائے تو پریذیڈنٹ جانسن کو یہ افسوس نہیں ہوگا کہ ایک انسان مر گیا، ایک عورت بیوہ ہو گئی۔ بلکہ یہ افسوس ہوگا کہ آج اس کا بیان نہیں چھپا۔ جس دن مسٹر جانسن کو یہ اطلاع مل گئی کہ اخبار ہمیشہ کی اشاعت ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئی ہے اور اب اس کا کوئی بیان شائع نہیں ہو سکے گا۔ تو وہ کہے گا: "اب امریکہ کا پریذیڈنٹ بنے رہنے کا کیا فائدہ؟ اے ارتھی اٹھانے والو! اٹھاؤ ارتھی اور مجھے کسی پرائمری اسکول کے باہر جا کر بٹھا دو۔ وہاں بیٹھ کر میں مکئی کے بھٹے بھون بھون کر بیچا کروں گا۔"

مکئی کے بھٹے بیچنے والا گنجا بوڑھا گنگا رام کبھی اخبار نہیں پڑھتا۔ اس لئے وہ مطمئن رہتا ہے۔ لندن سے ایک انگریز بوڑھا ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ہندوستان آیا میں نے پوچھا: "لندن سے کیوں بھاگ آئے؟"

وہ بولا: "ہر روز اخبار پڑھنے سے میری زندگی میں انتشار اور اضطراب پھیل گیا۔ اس لئے میں یہاں یوگ وِدیا سیکھوں گا۔ سکونِ قلب و دماغ تلاش کروں گا۔"

اونکار بابو اخبار نہ ملنے سے مضطرب ہے، انگریز مسٹر جان اخبار ملنے سے بے چین ہے۔ کاش! اخبار مر جاتے، کاش ہم سب مکئی کے بھٹے بیچا کرتے۔

اور کاش ہم سب لوگ ذرا کم بولا کرتے، مدھم مدھم سرگوشیاں کیا کرتے جیسے کوئی محبوبہ اپنے عاشق کے کان میں نائیلون ایسی نرم، پگھلی ہوئی باتیں کہہ رہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری دنیا کتنی مدھر اور شانت ہو جاتی۔ مگر ہم تو اتنا شور مچاتے ہیں کہ ہم نے دھرتی کا سارا حسن برباد کر دیا ہے۔ خدا نے بھیجا کیا، کتنا خاموش ہے۔ اس کے گھر میں کوئی ریڈیو سیٹ نہیں ہے جس پر پہلے سے والیوم تیز رکھا جاتا ہو۔ کیا کبھی آپ نے اس ٹرک کی گھڑگھڑاہٹ خدا کی ٹرانسپورٹ کمپنی نے مال ڈھونے کے لئے ارسال کیا ہو۔ لاؤڈ اسپیکر لگا کر خدا کی پبلسٹی پبلشر کار کبھی سڑکوں پر یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں گھومتا

بندھا آج اناج منڈی میں شام کے آٹھ بجے خداوند تعالیٰ اپنے بھگتوں کو ایڈریس کرے گا اور گناہ گاروں کو کوڑے لگائے گا۔

آپ ذرا مندرجہ ذیل آوازیں سنیے اور پھر کسی نازنین سے کہیے کہ میرے ساتھ عشق کرو (ناممکن! حسن کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں ہے جو سڑکوں اور بازاروں میں اپنے بال دینے کا اعلان کرتا پھرے)

۱۔ ہیلو ہیلو! پٹنہ ایکسپریس آٹھ دو گھنٹے لیٹ چھوٹے گی (مسافر جہنم میں جائیں)۔

۲۔ پوں پوں پوں، چھک چھک چھک۔ گھوں گھوں گھوں۔ کائیں کائیں کائیں (کوّے اور ہوائی جہاز دونوں بیک وقت شور مچانے لگتے ہیں)۔

۳۔ ابے تیرا ستیاناس ہو، شیشے کا نیا گلاس توڑ دیا خصم پٹنے (بچے کو تھپڑ آہ دبکا کا کورس گیت)۔

۴۔ لاٹھی گولی کی سرکار! نہیں چلے گی، نہیں چلے گی۔ لاہ سرکار نے گولی چلادی)۔

۵۔ زندہ باد، مردہ باد، مردہ باد، زندہ باد، زندہ باد، مردہ باد (ہر چہ باد اباد)

۶۔ جو بولے سو ابھے۔ شری گوگڑنا تھ جی کی جے!

۷۔ بھجن، بھجن، بھجن۔ سیتارام (ڈھول پر تھاپ زور زور سے لگاؤ)۔

بادل گرجتے ہیں، لاؤڈ اسپیکر چلاتے ہیں، لاریاں گھڑگھڑاتی ہیں، عورتیں دہشت ہلاتی ہیں۔ آتش بازیاں چھوٹتی ہیں۔ جلوس گرجتے ہیں، ہاکر چیختے ہیں۔ زندگی آوازوں کا ایک بہت بڑا، پھیلا ہوا گنبد بن چکی ہے۔ آوازیں ہی آوازیں۔ تا منگیشکر کی آواز لاری کی گھڑگھڑاہٹ میں مل گئی، گھڑگھڑاہٹ میں فیکٹری کا بھونپو داخل ہو گیا، بھونپو میں بھجن سیتارام سرایت کرتے ہوئے جب تھوڑی دور چلا تو انقلاب زندہ باد کے ساتھ ٹکرا گیا۔ انقلاب کا سر پھٹ گیا تو پارلیمنٹ کا ایوان کانپ اٹھا۔ بھونچال آ گیا۔ پارلیمنٹ کی میزوں پر تھپ تھپ تھپ، آوازے بولیاں، انگریزی میں، تامل میں، بنگالی میں اور پھر اچانک پارلیمنٹ کے گیٹ کے باہر کسی نے شادی کے بینڈ بجانا شروع کر دیئے۔ ہر آواز ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی، ایک دوسرے کا ملبہ بن گئی اور پھر نہ جانے کس طرح محلے کے کتوں کو علم ہو گیا کہ انسان ان سے زیادہ ایڈوانس ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے رشک کے مارے "بھوں بھوں بھوں" سے سارا محلہ سر پہ اٹھا لیا اور نازک تاروں والی نیلگوں چلمن کے پیچھے بیٹھی ہوئی نازنین محبوبہ نے اپنے عاشق کے کانوں میں رس گھولتے ہوئے مدھم سروں میں کہا "آئی لو یو"

اور عاشق کی طرف سے (شاید) جواب آیا "بھوں بھوں بھوں"

"بھوں بھوں بھوں!" ڈکشنری میں لکھا ہے، یہ کتوں کی آواز ہے۔ لہٰذا کتوں کو ہی حق حاصل ہے کہ وہی یہ آوازیں نکالیں۔ لیکن کل میں نے ایک انسان کو بھی بھوں بھوں کرتے دیکھا تو میں نے بچوں کی طرح منہ کھول دیا اور پوچھا "اے اشرف المخلوق! ڈکشنری میں لکھا ہے کہ یہ آواز کتوں کیلئے مخصوص ہے"

وہ (بچے کو تھپڑ مارتے مارتے بچا) بولا "میں ڈکشنری کو تبدیل کر دوں گا"

کتنا مشکل سوال تھا، جواب کتنا آسان۔ صرف ڈکشنری کا نیا ایڈیشن چھاپنے سے ہی کتے اور انسان کے درمیان فرق مٹ جائے گا۔ کتے کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ڈکشنری کو بدل نہیں سکتا۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ ڈکشنری کے صدیوں کے مفہوم کو بدل سکتا ہے۔ وہ کتوں کو انسان کی طرح اشرف المخلوقات بنا سکتا ہے (ایک کتے کو میں نے مینٹنگ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ایک انسان کو سگریٹ کا ایک جلا ہوا ٹکڑا اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے دیکھا ہے)، میں نے انسانوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ امیر وہ ہے جو پیسہ خرچ نہیں کرتا۔ ایک مفلس انسان کباڑی بازار سے پرانی، استعمال شدہ سستی قمیص پر ایک روپیہ آٹھ آنے خرچ کر دیتا ہے، وہ امیر ہے، کیونکہ وہ خرچ کرتا ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر وہ اس پھٹی پرانی قمیص کی بجائے ایک ہاتھی خریدے تو وہ ہندوستان کا وزیر اعظم بن سکتا ہے۔ لیکن ہاتھی اتنا بدمذاق نہیں ہے کہ چار ضرب چھ گز کے جھونپڑے سے کوارٹر میں رہنا پسند کرے۔ لہٰذا ہاتھی ہمیشہ راجہ کے محل کا رخ کرتا ہے۔ آپ انسان کو بے وقوف بنا سکتے ہیں ہاتھی کو نہیں۔

انسان نے ہاتھی کا مفہوم بدلنے کی لاکھ لاکھ کوشش کی۔ اسے سرکس میں ڈانس کرنا، سونڈ اٹھا کر سلام کرنا، ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر تپسیا کرنا سکھایا تاکہ ہاتھی بھی انسان کی طرح آرٹسٹ بن جائے، غلام بن جائے، تپسوی بن جائے لیکن ہاتھی نے انسان کے دھوکے میں آ کر اپنی حیثیت ترک نہیں کی۔ وہ آج بھی انسان کو اچانک سونڈ سے پکڑ کر اچھال پھینکتا ہے اور انسان کی پوری تہذیب، فلسفی اور حکمت کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایک بار میں نے ایک ہاتھی سے پوچھا "میاں جی! تمہارے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور کیوں ہوتے ہیں؟"
وہ ظالم مسکرا کر بولا "انسان کی صحبت میں رہنے سہنے سے ہو گئے ہیں۔"

کل مجھے ایک سیلز ٹیکس انسپکٹر کے ساتھ صحبت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ہر صبح گیتا کا پاٹھ کرتا ہے۔ دوپہر کو بیوپاریوں سے رشوت لیتا ہے، شام کو وہسکی پیتا ہے اور رات کو سوتے وقت اپنے بچوں کو بیٹھ کر نصیحت کرتا ہے کہ نیک بنو، سچ بولو، ظلم مت کرو۔
اپنے اس روزمرہ کے دلچسپ پروگرام کا انکشاف کر کے وہ زار و قطار رونے لگا۔ روتے ہوئے وہ بالکل اودبلاؤ لگ رہا تھا۔ جو کبھی پانی میں ڈبکی لگا کر چھپ جاتا ہے اور کبھی سر باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ گیتا کا کوئی بھگوان کرشن اسے وہسکی پیتے ہوئے دیکھتا تو نہیں رہا۔ کوئی بے ایمان بیوپاری اسے گیتا کا پاٹھ کرتے دیکھ کر مسکرا تو نہیں رہا اور کوئی بچہ رشوت کی رقم سے خریدے ہوئے سنگترے اور سیب کھاتے کھاتے یہ تو نہیں کہہ رہا "ڈیڈی! نیک بنو، سچ بولو، ورنہ تمہاری روح آنے والی کئی صدیوں تک خلائے بسیط و بالا میں بھٹکتی بھٹکتی اور کودتی پھرے گی اور کوئی تمہیں وہسکی کی بوتل کا ڈھکنا بنانے پر بھی آمادہ نہیں ہوگا۔"
میں نے کہا "اے سیلز انسپکٹر! تو مت رو ڈیئر! تیرے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے خود خدا کی مرضی اس میں شامل تھی کہ تیرے ایک ہاتھ میں گیتا اور دوسرے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل ہو۔"
"سچ؟" حیرت اور ایمان کی ایک چمک اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ "تقدیر، ہاں تقدیر ہم سب کی رہنما ہے، وہی ہم سے کہتی ہے، گیتا پڑھو۔ ہم پڑھنے لگتے ہیں۔ وہی ہمیں حکم دیتی ہے، رشوت لے۔ ہم لینے لگتے ہیں۔ وہی ہم سے..."
اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس کے حلق میں تقدیر کا رس گھول کر اسے تڑپنے پھڑکنے سے بچا لیا۔ کنفرمیشن کے لئے اس نے خدا کو ٹیلیفون کیا۔ خدا کے پرسنل اسسٹنٹ نے بتایا کہ خدا صاحب اس وقت نہیں مل سکتے۔ وہ ایک بچے کا بھیجا ہوا خط پڑھنے میں مصروف ہیں۔
"پرسنل اسسٹنٹ جھوٹ بولتا ہے" میں نے اسے تسلی دی۔ "ہر پرسنل اسسٹنٹ جھوٹ بولنے کا شائق ہوتا ہے۔ تم کل صبح گیتا پڑھتے وقت خدا سے ڈائرکٹ پوچھ لینا۔"
نہ جانے اس نے دوسری صبح خدا سے پوچھا کہ نہیں مگر مجھے ابھی تک شک ہے کہ وہ خط سیلز ٹیکس انسپکٹر کے بچے کا ہی ہوگا جس میں ڈیڈی کی شکایت کی گئی ہوگی۔ بچے خدا سے ڈائرکٹ گفتگو کیا کرتے ہیں۔ بیچ میں کوئی (دغاباز) پرسنل اسسٹنٹ نہیں ہوتا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ہم بچوں سے ڈرتے ہیں۔
سنا ہے بچوں کا دل ایک صاف سلیٹ ہوتا ہے۔ جس پر ہم جو چاہیں لکھ دیں۔ صاف سلیٹ سے ہم ڈرتے ہیں۔ جونہی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے ہم سمجھتے ہیں ہمارا دشمن پیدا ہو گیا۔ اس لئے ہم اس کے جنم دن سے ہی اس کی سلیٹ پر لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلمان اس پر اسلام زندہ باد لکھ دیتے ہیں، بودھ اس پر بدھم شرنم گچھامی تحریر کر دیتے ہیں۔ کیمونسٹ اس پر لکھ دیتے ہیں "دنیا بھر کے مزدورو! ایک ہو جاؤ" ہندو اس سلیٹ کے کافی بڑے حصے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ [illegible] لکھ دیتے ہیں سلیٹ بھر جاتی ہے، کچھ [illegible] ہو جاتی ہے اور اس پر [illegible]
باقی [illegible]

مجتبیٰ حسین
صبا حیدرآباد دکن

تکیہ کلام

"تکیہ کلام" سے ہماری مراد وہ تکیہ کلام نہیں ہے جو بات چیت کے دوران بار بار مداخلت بے جا کرتا ہے۔ بلکہ یہاں "تکیہ کلام" سے مراد وہ کلام ہے جو تکیوں پر زیور طبع سے آراستہ ہوتا ہے اور جس پر آپ اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں اور جو آپ کی نیندیں "حلال" کر دیتا ہے۔ برسوں کی بات ہے کہ ہم نے ایک محفل میں غالب کا وہ شعر پڑھا کہ ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر کو سن کر ایک صاحب بے طرح چونکے، پھر گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور اپنا سر کھجاتے ہوئے بولے "اگر میرا حافظہ خراب نہ ہوا ہو تو یہ شعر میں نے ضرور کہیں پڑھا ہے" ہم نے ان کی یادداشت کا امتحان لینے کی خاطر پوچھا "تب تو سوچ کر بتلائیے آپ نے یہ شعر کہاں پڑھا تھا؟" وہ کچھ دیر سوچ کر بولے "بھئی لو یاد آیا۔ یہ شعر ہم نے رحمٰن خاں ٹھیکیدار کے تکیہ کے غلاف پر پڑھا تھا۔ بھلا تمہیں یہ شعر کس طرح یاد ہو گیا۔ کیا تمہیں بھی اس تکیہ پر سونے کا اتفاق ہوا تھا؟" ہم نے کہا "آپ کیسی باتیں کہتے ہیں۔ یہ شعر تو دیوان غالب میں موجود ہے۔ رحمٰن خاں ٹھیکیدار سے ہمارا کیا تعلق؟" اس پر وہ بولے "بھئی! دیوان غالب سے ہمارا کیا تعلق ہم تو شعر و شاعری صرف تکیوں کے غلافوں پر پڑھ لیتے ہیں۔ جو شاعری آپ کو تکیوں کے غلافوں پر پڑھنے کو مل جاتی ہے اس کے لئے شعرا کے دواوین الٹنے پلٹنے کی ضرورت کیا ہے؟" اور ان صاحب کے جواب کو سن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جس زبان میں شعر و شاعری کی بہتات ہوتی ہے وہاں شعر و شاعری کا یہی حشر ہوتا ہے۔ شاعری کا پیمانہ صبر اتنا لبریز ہو جاتا ہے کہ اشعار چھلک کر تکیوں پر گر جاتے ہیں، چادروں پر بکھر جاتے ہیں۔ لاریوں کی پیشانیوں پر چپک جاتے ہیں۔ رکشاؤں کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ دسترخوانوں تک کی زینت بن جاتے ہیں۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ ہم دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے ہیں کہ اچانک دسترخوان پر چھپے ہوئے کسی شعر نے ہمیں چونکا دیا اور ہم کھانا کھانے کی بجائے سر دھنتے رہ گئے۔ بعض سخن فہم حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دسترخوانوں پر "فارسی میڈیم" میں اشعار لکھواتے ہیں جیسے ؎

شکر بجا آر کہ مہمان تو
روزی خود می خورد از خوان تو

نتیجہ ان فارسی اشعار کی اشاعت کا یہ ہوتا ہے کہ مہمان کھانا کم کھاتے ہیں اور اس شعر کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں اور یوں جب وہ معنی و مفہوم کے چکر سے آزاد ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ میزبان نے سارا کھانا خود ہی کھا لیا ہے۔

دسترخوانوں کے اشعار کی بات چھوڑیئے کیونکہ اب ہم دسترخوانوں پر چنی جانے والی اشیائے خورد و نوش میں مختلف ملاوٹوں کے علاوہ اشعار کی ملاوٹ کے بھی عادی ہو گئے ہیں اور یہاں یہ بات "تکیوں" اور ان کے "کلام" کی چل رہی ہے اور ہم نے ایسے معرکتہ الآرا اشعار تکیوں پر دیکھے ہیں کہ اگر کوئی ان تکیوں پر سو جائے تو پھر زندگی بھر ان تکیوں پر سے اٹھنے کا نام نہ لے۔

ہمیں ایک بار سفر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک شناسا کے ہاں مہمان ٹھہرے حسب روایت بستر ہم چونکہ ساتھ نہیں لے گئے تھے اس لئے میزبان نے ہمارے بستر کا انتظام کیا۔ اب جو ہم بستر پر پہنچتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ تکیہ پر نہایت جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے کہ۔

کسی کے حسن کا جادو بسا ہے تکیہ میں　　　جہانِ عارض و گیسو بسا ہے تکیہ میں

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے حق میں یہ بستر، بستر مرگ ثابت ہوا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ اختر شماری تک کرتے رہے ہر بار یہی سوچتے رہے کہ آخر تکیہ میں کس کے حسن کا جادو بسا ہے۔ آخر وہ کون مہ جبین ہے جس کا "جہانِ عارض و گیسو" اس تکیہ میں پنہاں ہے۔ بار بار تکیہ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس تکیہ نے ہم میں وہ سارے آثار پیدا کر دیئے جو آغازِ عشق کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ ذوقِ عشق نے اتنا سر اٹھایا کہ ہم بار بار تکیئے پر اپنا سر پٹکتے رہے۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوگی تو ہم اس نازنین کو ضرور دیکھیں گے جس کے حسن کا جادو اس تکیہ کے توسط سے ہمارے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ صبح ہوئی تو ہم نے چوری چھپے اس نازنین کو دیکھ ہی لیا۔ اور اس نازنین کے ڈیل ڈول اور وضع قطع کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ محترمہ کو یہ شعر تکیہ پر نہیں بلکہ "گاؤ تکیہ" پر لکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ ان کے حسن کا "سمبل" صرف گاؤ تکیہ ہی ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد سے تکیے کے اشعار پر سے نہ صرف ہمارا ایقان اٹھ گیا بلکہ جب بھی کوئی "منظوم تکیہ" ہمارے سر کے نیچے آیا تو ہم نے چپکے سے اس کا غلاف اتار لیا کہ کون اپنی نیند حرام کرے۔ اگر آپ کو نیند آتی ہو تو آپ نے تکیوں کے وہ اشعار ضرور پڑھے ہوں گے جن پر سو کر آپ نہایت ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ عرض کیا ہے کہ

کونین تک سمیٹ لئے ہیں غلاف میں　　　ٹکڑے جگر کے ٹانک دیئے ہیں غلاف میں

خواب ہائے دل نشیں کا اک جہاں آباد ہو　　　تکیہ جنت سے اٹھا لائیں اگر ارشاد ہو

چمن در چمن ہے غلاف آپ کے تو　　　ذرا اس پہ آرام فرمائیے تو

غنچہ ہائے دل کھلے سر رکھ کے گستاخی معاف　　　گلشنِ امید کے سب پھول چن لایا غلاف

غور فرمایئے کہ ان اشعار پر کیا آپ "تکیہ" کر سکتے ہیں۔ گویا تکیہ نہ ہوا الہ دین کا چراغ ہوا کہ کونین تک اس میں سمٹ کر آ گئے ہیں۔

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو "ادھورے خواب" دیکھنے کی بیماری تھی۔ وہ تھوڑا سا خواب دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن ہم سے بولے "بھئی عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے" جیسے میں خوابوں کے "ٹریلر" دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا ہوں! ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا تکیہ پر ایسا شعر لکھا ہوا ہے جو "بحر سے خارج" ہے۔ اس پر ہم نے کہا "بھئی اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیہ پر سو جاتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہوا ہے۔ اور اس تکیہ کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کو بدل دو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ انہیں عرصے سے "بلڈ پریشر" کی شکایت تھی، جب

سو جاتے تھے تو ان کا۔ بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ جب ایلوپیتھی علاج سے فائدہ نہ ہوا تو حکیم صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں حکیم صاحب نے ان کا بغور معائنہ کیا ساری دکھتی رگیں پکڑ کر دیکھیں زبان اتنی باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے مگر اسی اثنا میں حکیم صاحب کی نظر تکیہ پر پڑی اور وہ تکیہ کی جانب لپکے۔ شعر کو غور سے پڑھا اور تنک کر بولے: اس تکیہ کو ابھی یہاں سے ہٹائیے۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو اس تکیہ سے پھوٹ رہی ہے۔ واہ صاحب واہ! کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا شعر تکیہ پر طبع کروا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوش کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوش کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دوران خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہوگا؟ اس تکیہ کو اسی وقت یہاں سے نکالئے۔ خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوش کے تکیہ پر سر رکھا اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغ کے غلاف پر سویا کیجئے۔ جگر کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھیے۔ ان شعرا کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی۔ بھوک زیادہ لگے گی۔ آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف جوش کا غلاف بدل دیا بلکہ اب وہ جوش کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔

لیکن تکیوں کے کلام کی ایک افادیت بھی ہوتی ہے جس کا راز صرف اہل دل ہی جانتے ہیں۔ راز یہ ہے کہ ایک صاحب کی شادی صرف تکیوں کے ان ہی اشعار کے باعث ہوئی تھی ہوا یوں تھا کہ یہ صاحب کہیں مہمان گئے ہوئے تھے۔ رات کو میزبان کے گھر میں سے ان کے لئے جب بستر آیا تو اس میں ایک تکیہ بھی تھا جس پر یہ شعر لکھا تھا۔

شمیم طرۂ گیسوئے یار لایا ہوں　　　میں اپنے ساتھ چمن کی بہار لایا ہوں

آدمی چونکہ ہوشیار تھے اسی لئے اس غلاف کا مطلب سمجھ گئے۔

دوسرے دن بازار گئے اور ایک ریڈی میڈ غلاف خرید لائے جس پر یہ شعر لکھا تھا۔

اٹھا تو سر پٹک دیا تکیہ پر بار بار　　　شب بھر گواہ یہ بھی مرے درد دل کا تھا

انہوں نے چپکے سے تکیہ کا پرانا غلاف اتارا اور اپنا غلاف اس پر چڑھا دیا۔ اور یہ تکیہ ان کا پیغام لیکر اندر واپس ہوا۔ نہ جانے اس شعر نے اندر کیا کیا قیامت مچائی۔ مگر جب شام میں پھر تکیہ واپس ہوا تو اس پر ایک نیا شعر لکھا تھا۔

مرا جذب دل میرے کام آ رہا ہے　　　اب ان کی طرف سے پیام آ رہا ہے

دوسرے دن ان صاحب نے یہ غلاف بھی اتار لیا اور پھر ایک طبعزاد غلاف چڑھا دیا جس کے بول تھے۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے　　　سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

غرض اس تکیہ بردار عشق نے وہ جوش مارا کہ سلام و پیام کا سلسلہ بڑھتا رہا، اور بالآخر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور اب یہ دونوں ایک ہی شعر پہ تکیہ کر رہے تھے۔ لیکن اب ان کے تکیوں کے اشعار کی ماہیت قلبی، تبدیل ہو گئی ہے چنانچہ ہم نے برسوں ان کی خوابگاہ میں جو تازہ تکیہ دیکھا تھا اس پر یہ شعر درج تھا۔

اس سیاہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں　　　خواب راحت بھی جسے خواب پریشاں ہو جائے

یہ تو خیر عام آدمیوں کے تکیوں کی بات تھی۔ اگر آپ کو دانشمندوں کے تکیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ یقیناً دنگ رہ گئے ہوں گے۔ ان تکیوں پر ایسے صوفیانہ اور فلسفیانہ اشعار لکھے جاتے ہیں کہ اچھا خاصا آدمی فلسفی بننے کی کوشش کر بیٹھے۔ مثلاً ایک انٹلکچول قسم کے صاحب نے اپنے تکیے پر یہ شعر لکھ رکھا تھا۔

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سچ پوچھیے تو اس تکیہ پر کوئی عام آدمی سو ہی نہیں سکتا۔ ایسے فلسفیانہ شعر پر تو صرف ایک دانشمند ہی سو سکتا ہے۔ اور اسے ہی ایسے فلسفیانہ تکیے زیب دیتے ہیں۔

آئیے اب ذرا شعرا کے تکیوں کی بات ہو جائے جن کے لئے شاعری اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے۔ یعنی ان کے تکیوں پر شعر ہوتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ہم نے ایک شاعر صاحب کی "مچھر دانی" پر بھی شعروں کا جنگل اگا ہوا دیکھا ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے گھر میں ایک "منظوم تکیہ" دیکھا جس پر یہ شعر درج تھا۔

یار سوتا ہے بصد ناز بصد رعنائی محوِ نظارہ ہوں بیدار کروں یا نہ کروں

ہم نے اس شعر کو پڑھ کر کہا "بھئی واہ کیا خوب شعر کہا ہے۔ کس کا شعر ہے؟"

ہمارے سوال کو سنکر ان کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بولے "معاف کیجئے۔ میں کسی دوسرے کے کلام پر تکیہ نہیں کرتا۔ یہ شعر میرا ذاتی ہے اور یہ بات میری خود داری کے خلاف ہے کہ میں دوسروں کے اشعار پر سو جاؤں۔ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی شاعر اپنے تکیہ پر میر کے تکیہ کا شعر لکھ مارے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہم نے ان کا غصہ دیکھ کر معافی چاہ لی اور چپ ہو رہے بعد میں ان کے گھر کی اشیاء پر جو نظر ڈالی تو ہر شے شعر میں لت پت نظر آئی۔ پھر بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ ان شاعر صاحب کی جو غزلیں مختلف رسالوں سے "ناقابل اشاعت" قرار پا کر واپس آتی ہیں انہیں وہ اپنے گھر کی چادروں پر چھپوا دیتے ہیں۔ تکیہ کے غلافوں پر چڑھا دیتے ہیں اور انہیں میز پوش پر زیور طبع سے آراستہ کرتے ہیں۔ ہم تکیوں کے ذریعہ ادب کی ترقی کے ضرور قائل ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ "ناقابل اشاعت" اشعار بھی تکیوں پر چھاپے جائیں۔ پھر جب ہماری شاعری میں نئے رجحانات آ رہے ہیں تو تکیوں میں بھی نئے رجحانات کا آنا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی سخن فہم صاحب اپنے تکیہ پر آزاد نظم لکھوا لیں اگر تکیہ اس نظم کو قبول کرنے کے معاملے میں "تنگ دامنی" کا شکوہ کرے تو اس نظم کو تین تکیوں پر شائع کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نظم کا ایک بند تو ایک تکیہ پر ہو اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہو کہ۔

"براہ کرم تکیہ الٹیے" اور تکیہ الٹنے پر بھی کام نہ بنے تو نیچے یہ عبارت لکھی جائے کہ "باقی نظم ملاحظہ ہو گاؤ تکیہ نمبر (۱) پر" اور گاؤ تکیہ بھی اس کی طوالت کو پیش نہ کر سکے تو اس کے نیچے لکھا جائے "باقی نظم ملاحظہ ہو شطرنجی کلاں پر" اور جب یہ نظم ختم ہو جائے تو اس کے نیچے "غیر مطبوعہ" کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ "منظوم تکیوں" کے شائقین اپنے تکیوں کو شاعری کے جدید رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

سب سے آخر میں ہم اس مضمون کے لئے ان خاتون کے تہہ دل سے مشکور ہیں جن سے ہم نے تکیوں کے چند اشعار مانگے تو انہوں نے اپنے نوکر کو ہمارے گھر بھیجا۔ اس نوکر نے آتے ہی ہم سے کہا "صاحب اپنے نوکر کو باہر بھیجئے تا کہ وہ تکیہ کے اشعار رکشا میں سے اتار سکے۔"

ہم نے حیرت سے پوچھا "تمہاری بیگم صاحبہ نے آخر اتنے اشعار کیوں بھیجے کہ انہیں رکشا میں ڈال کر تمہیں ہمارے یہاں لانا پڑا؟"

وہ بولا "صاحب! آپ نے بیگم صاحبہ سے تکیے کے اشعار مانگے تھے اور انہوں نے اپنے گھر کے سارے تکیے آپ کے پاس بھجوا دیئے ہیں۔ آپ ان تکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیجئے۔"

پھر ہم اس دھوبی کے بھی مشکور ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا۔ ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی سے نکالتا ہے

اسے کھولتا ہے پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اسی کپڑے کو پتھر پر زور سے پٹخنے لگتا ہے۔ ہم نے اس کی اس حرکت کا بغور مشاہدہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض کپڑے نہایت آہستگی اور سلیقہ سے دھوتا ہے۔

ہم نے پوچھا۔ بھئی! تم بعض کپڑے زور سے پٹختے ہو، اور بعض نہایت آہستگی سے! آخر یہ راز کیا ہے؟

وہ بولا۔ صاحب! اگر اصل تکیئے کے غلاف ہیں اور میں تکیئے کے ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو زور زور سے پتھر پر پٹختا ہوں یعنی ادبی اصطلاح میں "ہوٹنگ" کرتا ہوں۔ اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقہ سے دھوتا ہوں کہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے۔ ہم اس ادب دوست دھوبی اور اس کے گدھے کے بھی جو ان اشعار کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا ہے مشکور ہیں کہ اس نے بعض اچھے اشعار ہمیں فراہم کئے جو اس مضمون میں شریک نہیں ہیں۔

مجتبیٰ حسین

صبا حیدرآباد (دکن)

میرا سلام کہیو اگر نامہ بَر ملے

کہتے ہیں کہ ایک نوجوان سرکاری ملازم کا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر ہو گیا اور وہ پہلے شہر میں اپنے پیچھے اپنی ایک عدد محبوبہ کو چھوڑ گیا۔ پھر روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ اس نوجوان کو اپنی محبوبہ سے اتنی محبت تھی کہ اسے اتنی محبت اپنی ماں سے بھی نہ تھی۔ سو یہ نوجوان آٹھوں پہر اپنی محبوبہ کے غم میں نڈھال رہتا اور آٹھ پہروں میں سے چار پہر اپنی محبوبہ کو خط لکھنے میں گنوا دیتا۔ عالم اس نوجوان کا یہ تھا کہ ہر دو گھنٹے بعد وہ اپنی محبوبہ کو ایک ایکسپریس ڈیلیوری خط لکھتا اور اسے لیٹر بکس میں ڈال آتا۔ اس کی خطوط نویسی کی شہرت چیار دانگ آفس میں پھیل چکی تھی۔ اس کے دوست احباب اس کی یہ حالت دیکھ کر کفِ افسوس ملتے اور جب انہیں کفِ افسوس ملنے سے فرصت ملتی تو اسے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اے نا عاقبت اندیش اپنے دل پر قابو رکھ اور دل سے زیادہ اپنے قلم پر کہ بسیار نویسی ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔ مگر وہ نہ مانا اور ہر دو گھنٹے بعد اپنی محبوبہ کو خط لکھتا رہا۔ پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن اس نوجوان کا ٹرانسفر پھر کسی دوسرے شہر ہو گیا۔ پھر دن گزرتے گئے۔ منٹ گھنٹوں اور گھنٹے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ موسم بدلتے رہے، حکومتیں بدلتی رہیں۔ اشیا کی قیمتیں چڑھتی رہیں اور انسان مہنگا ہوتا رہا۔ اس نوجوان کے دوست احباب اسے بھول بھال گئے۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک دن اس نوجوان کا ایک پرانا ساتھی سڑک پر مل گیا۔ دونوں بہت خوش ہوئے اور اپنی اپنی داستانِ غم سنانے کے لئے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔

نوجوان کے دوست نے پوچھا۔ کیوں یار تمہارا کیا حال ہے۔

وہ بولا۔ بھئی اچھا ہوں اور زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔

پھر دوست نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ یار تم نے تو اپنی اس محبوبہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا جسے تم ہر روز چار خطوط لکھا کرتے تھے۔

نوجوان پہلے تو زار و قطار رونے لگا پھر قطار اندر قطار روتا ہوا بولا۔ بھئی تم اس بے وفا کا ذکر کیوں چھیڑتے ہو۔ اس نے تو میری زندگی کے ساتھ ایک سنگین مذاق کیا تھا۔

دوست بولا۔ بھئی آخر بات کیا ہوئی؟

وہ بولا۔ بات کیا ہوتی۔ اس بے وفا نے بالآخر اس پوسٹ مین سے شادی کر لی جو اسے ہر روز دن میں چار مرتبہ خطوط پہنچایا کرتا تھا۔ پھر بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی اس ظالم نے میری ایک عرضۂ محبت کے آخری دنوں میں یہاں تک لکھا تھا کہ، میرے دیوتا! تم اگر دو گھنٹوں میں ایک خط لکھنے کے بجائے ایک گھنٹہ میں دو خط لکھ سکو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ کیونکہ میں بہت بے چین رہتی ہوں اور مجھ سے ہجر کے دو گھنٹے

کاٹے نہیں کٹتے۔

میں جنم جنم کا پاگل ٹھہرا۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ ایک گھنٹہ میں چار چار خط لکھنے لگا۔ ادھر میری خطوط نویسی جاری رہی ادھر پوسٹ مین سے اس کا عشق پروان چڑھتا رہا۔"

یہ کہہ کر نوجوان پھر رونے لگا اور بولا۔ اس نے میرے وہ سارے خطوط بذریعہ وی پی واپس کر دیئے ہیں جو میں نے اسے لکھے تھے۔ مجھے حیرت تو اس بات پہ ہے کہ جملہ ۸ ہزار محبت ناموں میں سے صرف ابتدائی چھ محبت نامے کھلے ہوئے پائے گئے اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ میری محبت صرف چھ محبت ناموں تک اس کے دل میں قائم رہی۔ اور بقیہ محبت نامے تو کسی اور کی نذر ہو گئے۔

تو صاحبو! یہ واقعہ اتنا عبرت انگیز ہے اور اثر انگیز اور نہ جانے کیا کیا انگیز ہے کہ کوئی بھی ایسے سنگر پوسٹ مین سے خائف ہو سکتا ہے اور وہ جو غالب نے کہا تھا کہ

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تو غالب نے غالباً ایسے ہی کسی خطوط رساں کے بارے میں کہا تھا جو محبت نامہ لیکر کسی اور کام میں مصروف ہو گیا تھا سچ پوچھئے تو ہمیں نامہ بری کا وہ قدیم طریقہ اب بھی پسند آتا ہے جب لوگ کبوتروں کے ذریعہ محبت نامے روانہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تو راز داں کے اچانک رقیب بننے کا ڈر تھا اور نہ خطوط کی دیر سے تقسیم کا اندیشہ۔ اگر کبھی دیر بھی ہو جاتی تو وہ بھی نذر محبت ہو جاتی۔ فرض کیجئے کہ نامۂ محبت لے جانے والے کبوتر کی راستے میں کسی کبوتری سے ملاقات ہو جاتی تو یہ کوئی ایسی خطرناک بات نہ تھی۔ کبوتر جب اظہار محبت کر لیتا تو پھر نامۂ محبت لیکر اپنے مالک کی محبوبہ کے پاس روانہ ہو جاتا تھا۔ کم از کم وہ اپنے مالک کو دھوکا تو نہ دے سکتا تھا۔ مگر ادھر جب سے محبت، بذریعہ ڈاک ہونے لگی ہے اور مندرجہ بالا قسم کے واقعات پیش آنے لگے ہیں لوگ جائز طور پر پوسٹ مینوں سے خائف رہنے لگے ہیں۔ پھر ہم نے بعض ایسے خوبرو پوسٹ مین بھی دیکھے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح غالب نے مہ رخوں کے لئے مصوری سیکھی تھی اسی طرح ان چھیل چھبیلے پوسٹ مینوں نے صرف مہ رخوں کی خاطر خطوط رسانی کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان حالات میں ہمارے ان دوست صاحب کی دور اندیشی بالکل بجا اور درست ہے۔ جو پہلے تو اپنی محبوبہ کو خط لکھتے ہیں اور پھر خود ہی پوسٹ مین کا لباس پہن کر اس خط کو تقسیم کر آتے ہیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

مگر ہم کہیں گے کہ ہماری زندگی سے پوسٹ مین کا ربط ضبط بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اپنے حلقہ کے سارے افراد کی دکھتی رگیں ہوتی ہیں وہ یہ خوب جانتا ہے کہ زید صاحب مقروض ہیں بکر کے گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ عمر کے اپنی بیوی سے تعلقات کشیدہ ہیں۔ زید نے چھ ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ بکر کی چھ لڑکیاں شادی کے قابل ہیں لیکن کوئی لڑکا اس قابل نہیں ہے کہ وہ جہیز کے بغیر ان کی کسی لڑکی سے شادی کرے۔ عمر کی لڑکی زید کے لڑکے سے محبت کرتی ہے اور خود زید کا لڑکا بکر کی لڑکی سے محبت کرتا ہے غرض پوسٹ مین کو ان ساری غیبی باتوں کا علم رہتا ہے اور دور کیوں جایئے خود ہماری مثال لے لیجئے کہ جب بھی ہمارے حلقے کے پوسٹ مین سے راستے میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہم مارے شرم کے نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں کہ نہ جانے اس پوسٹ مین کو ہمارے کتنے راز معلوم ہیں اسے یہ تک معلوم ہے کہ ہمارے کتنے افسانے ناقابل اشاعت قرار پا کر مختلف رسالوں کے دفتروں سے واپس آ چکے ہیں۔ ایک بار تو خود ہم نے اپنے کانوں سے اس کی بات چیت سنی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست سے کہہ رہا تھا۔ ارے۔ وہ کیا خاک لکھے گا۔ مجھ سے پوچھو۔ اب تک اس کے پورے چوبیس افسانے ناقابل اشاعت قرار پا کر رسالوں کے دفتروں سے واپس آ چکے ہیں اور اب تو میں نے رسالوں کو اس کے افسانوں سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کر لیا ہے یعنی جب بھی یہ کسی رسالے کو افسانہ روانہ کرتا ہے تو میں ڈاکخانے سے ان افسانوں کو حاصل کر لیتا ہوں اور چند دنوں بعد یہ افسانے اسے دے آتا ہوں کہ قبلہ! یہ افسانے بھی ناقابل اشاعت ہیں۔ مشق جاری رکھئے۔ جب آپ کا رنگ پختہ ہو جائیگا تو میں خود ان افسانوں کو رسالوں تک پہنچانے

کا بندوبست کر دوں گا۔ یوں محکمۂ ڈاک کے کام میں "ناقابلِ اشاعت" افسانوں کے ذریعہ اضافہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟
یہ تو صرف افسانوں کی بات ہوئی مگر ہم اس وقت بڑے خائف رہتے ہیں جب ہمارا پوسٹ مین ہمارے والد محترم کا خط لیکر آتا ہے۔ ہم نے والد بزرگوار سے ہزار بار بذریعہ ڈاک خواہش کی کہ "مربی! ہمیں پوسٹ کارڈ پر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی زحمت نہ کیجئے اگر گالیاں دینی ہوں تو بذریعہ لفافہ روانہ کر دی جائیں۔ آپ ادھر پوسٹ کارڈ پر گالیاں دیتے ہیں اور ادھر پوسٹ مین ان گالیوں کو سن لیتا ہے آخر ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ پھر پوسٹ کارڈ پر گالیاں دینا تو سربازار گالیاں دینے کے مترادف ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی آپ کا پوسٹ کارڈ آتا ہے تو پوسٹ مین آپ کا خط دیکر اپنی موچھوں پر تاؤ دینے لگتا ہے۔ گویا کہہ رہا ہو "تو یہ ہیں آپ کے کرتوت؟ قبلہ اس خط میں جھانک کر اپنی شخصیت کو پہچان لیجئے" اور ہمیں چار و ناچار اس پوسٹ مین کو ہوٹل میں لے جا کر چائے پلانی پڑتی ہے منت سماجت کرنی پڑتی ہے کہ "میرے رازداں! خدا کے لئے کسی سے ان گالیوں کا تذکرہ مت کرنا جو میرے والد نے مجھے "بذریعہ ڈاک" دی ہیں" پوسٹ مین وعدہ تو کر لیتا ہے مگر جب کبھی راستے میں ملتا ہے تو یوں اکڑ کر چلتا ہے جیسے ہم اس کے زرخرید غلام ہیں مگر پوسٹ مینوں سے ہم دست بستہ عرض کریں گے کہ جناب والا ہمارے سارے راز معلوم کر لیجئے لیکن ہماری ڈاک بروقت پہنچایا کیجئے کیوں کہ ڈاک بروقت نہ پہنچے تو کئی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے آج سے پانچ سال پہلے ہماری شادی پر مبارکباد کا تار روانہ کیا تھا جسے پرسوں ہمارے پوسٹ مین نے عین اس وقت ہمارے حوالے کیا جبکہ ہم سو رہے تھے اس نے رات کے پچھلے پہر ہمارے مکان پر دستک دی۔ ہم نے نیند سے جاگ کر پوچھا "کون ہے؟" وہ بولا "پوسٹ مین" ہمارا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہماری بیوی بستر سے اٹھ کر دیوانوں کی طرح دروازے کی طرف بھاگی۔ اس نے ٹیلی گرام کھول کر پڑھا اور اس بات پر دنگ رہ گئی کہ ٹیلی گرام میں اس کے شوہر کی شادی کی مبارکباد دی جا رہی ہے۔ پوسٹ مین تو ٹیلیگرام دیکر چلا گیا مگر ہماری بیوی آج تک اس شک میں مبتلا ہے کہ ہم نے ضرور خفیہ طور پر دوسری شادی رچالی ہے اگر نہیں رچائی ہے تو پھر یہ ٹیلیگرام کس خوشی میں آیا ہے۔

پھر اسی طرح ہمارے ایک اور دوست کا واقعہ ہے کہ ان کی پہلی بیوی دو سال پہلے انتقال فرما چکی ہیں اور انہوں نے بفضل تعالیٰ دوسری شادی رچا کر غلطی کا اعادہ بھی کر لیا ہے۔ مگر پرسوں انہیں اپنی پہلی بیوی کا ایک خط ملا ہے کہ وہ بہت جلد اپنے میکے سے سسرال آنے والی ہیں۔ اب یہ صاحب پریشان ہیں کہ جب پہلی بیوی دوسری دنیا سے ان کے گھر واپس آئے گی تو وہ اسے کیا منہ دکھائیں گے۔ اور دوسری بیوی سے کس طرح نجات پائیں گے۔

اگر اس عید کے موقع پر بھیجا ہوا عید کارڈ اگلی عید کے موقع پر تقسیم کیا جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں پھر اگر محکمۂ ڈاک کسی کی پہلی شادی پر بھیجا ہوا مبارکباد کا ٹیلیگرام ان کی دوسری شادی کے موقع پر تقسیم کرتا ہے تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ اگر کسی کی پیدائش کے موقع پر بھیجا ہوا ٹیلی گرام اس کی وفات کے موقع پر تقسیم کیا جائے تو یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ مگر جب وہ گڑے مردے "بذریعہ ڈاک" اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور مردہ جسموں میں روح پھونک دیتا ہے تو ہماری روح قفس عنصری سے پرواز کرنے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے اور ہم بھوتوں اور جنوں کے وجود پر ایمان لے آتے ہیں۔

ان حالات میں وہ صاحب کوئی غلطی نہیں کرتے جو اپنے ایک ہی خط کی تین تین نقلیں محفوظ رکھتے ہیں پہلے اصل خط روانہ کرتے ہیں اور اس کے بعد مثنیٰ روانہ کرتے ہیں پھر دوسرے خط کے مرحلے پر ایک اور خط لکھ کر استفسار فرماتے ہیں کہ آپ کو پچھلے دو خطوط ملے بھی یا نہیں اگر نہیں ملے ہیں تو بہ واپسی پتہ مطلع کیجئے تاکہ میں اس خط کی تیسری نقل بھی آپ کو بھیج دوں۔

یوں تو محکمۂ ڈاک کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں مگر ہم یہاں صرف اس کے "ادبی پہلو" پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس کا یہی

پہلو کافی تاریک ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ محکمۂ ڈاک نے ادب پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ اگر ان پوسٹ مینوں نے جنہوں نے غالب کے خطوط تقسیم کئے تھے اگر ان خطوط کی تقسیم میں ادبی بد دیانتی کی ہوتی تو اردو ادب میں کتنا بڑا خلا رہ جاتا یہ اور بات ہے کہ ڈیڈ لیٹر آفس کا خلا بڑی حد تک پورا ہو جاتا۔ پھر اگر ڈاک کا بندوبست نہ ہوتا تو آنجہانی نہرو کی "گلمپس آف ورلڈ ہسٹری" کا کیا حشر ہوتا۔ صفیہ اختر کے خطوط کا کیا بنتا۔ اور پھر ان ادیبوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا جو خط صرف اس مقصد کے لئے لکھتے ہیں کہ یہ خط ان کے انتقال کے بعد رسالوں میں حاشیہ کے ساتھ ان کے عکسی تحریر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔

خطوط کی تقسیم سے ہٹ کر ان دنوں منوں اور ٹنوں کے حساب سے ادب بذریعہ ڈاک ادھر سے ادھر روانہ کیا جاتا ہے۔ ناقابل اشاعت افسانے واپس آتے ہیں، "آزاد نظمیں" بذریعہ ڈاک ضائع کی جاتی ہیں۔ غزلیں بذریعہ ڈاک سنائی جاتی ہیں۔ رسالے بذریعہ ڈاک روانہ کئے جاتے ہیں اور ان ساری سرگرمیوں کے نتیجے میں خواہ مخواہ ادب کی ترقی ہوتی جا رہی ہے ہم نے ڈاک خانوں میں کام کرنے والے ایسے کئی ملازم دیکھے ہیں جنہیں ادب سے بلا وجہ لگاؤ پیدا ہو گیا ہے یہ لگاؤ پیدا بھی کیونکر نہ ہوتا کہ سارا ادب ان ہی کے ہاتھوں پروان چڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ہماری اس "چشم گنہگار" نے کئی پوسٹ مینوں کو ادیب بنتے اور کئی ادیبوں کو پوسٹ مین بنتے دیکھا ہے حوالے کے لئے ملاحظہ ہوں۔ راجندر سنگھ بیدی جنہوں نے کئی سال تک ڈاک خانے میں ملازمت کی تھی اور غالباً ڈاکخانہ کی اسی ملازمت نے انہیں ادیب بننے پر اکسایا تھا بھی جہاں سارے رسالے اور کتابیں آتی ہوں وہاں ایک آدمی ادیب نہیں بنے گا تو کیا جوہری بنے گا۔ مگر ابھی تک ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ لوگ ادیب بننے کے لئے ڈاکخانہ میں ملازم ہوتے ہیں یا ڈاک خانے میں ملازم ہونے کی وجہ سے ادیب بن جاتے ہیں۔ ہمیں تو موخرالذکر بات زیادہ امکانی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہم ایک پوسٹ مین کی داستان سے شخصی طور پر واقف ہیں۔ جو پہلے تو صرف رسالے تقسیم کیا کرتے تھے مگر بعد میں رسالوں کی تقسیم کے ساتھ اپنی غزلیں بھی تقسیم کرنے لگے۔ چنانچہ اب وہ آتے ہیں اور ہمارا خط ہمارے حوالے کرنے سے پہلے کہتے ہیں "اگر آپ کو اپنے خط کی ضرورت ہو تو آپ کو میری تازہ غزل سماعت کرنی ہوگی اور ہمیں اپنا خط حاصل کرنے کے لئے چار و ناچار ان کی غزل سننی پڑتی ہے۔ اگر کبھی ہمارے نام منی آرڈر آجائے تو سمجھئے کہ وہ دن ہمارے لئے "روز قیامت" سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ انہوں نے منی آرڈر کی رقم کے تناسب سے غزلیں سنانے کی شرح مقرر کر رکھی ہے۔ اگر دس روپے کا منی آرڈر آئے تو پانچ روپے فی غزل کی شرح سے ہمیں دو غزلیں سننی پڑتی ہیں ایک بار تو ہمیں ۳۰۰ روپے بذریعہ منی آرڈر ملے تھے اور آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مجموعہ ساٹھ غزلوں کی سماعت تک ہماری قوت سماعت کا کیا حال نہ ہوا ہوگا۔ ہم صرف اتنا لکھ دیتے ہیں کہ جب ان پوسٹ مین نما شاعر صاحب نے نو غزلیں ختم کیں تو ہمارے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور کئی دنوں تک ہمارے کانوں میں صرف غزلوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اب تو ہم نے ان پوسٹ مین نما شاعر صاحب سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنے اعزا و اقارب اور دوست احباب کو لکھا ہے کہ وہ خط نہ لکھا کریں۔ اگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر بھی دینی ہو تو اس کی اطلاع ہمارے کسی دوست کو دیدی جائے کیونکہ ہمیں اپنے عزیز کا بلا علم و اطلاع مرنا پسند ہے مگر پوسٹ مین نما شاعر کی غزلیں سننا پسند نہیں اور کسے معلوم کہ یہی غزلیں ایک دن ہماری موت کا سبب بن جائیں۔

یہ تو پوسٹ مین نما شاعر کی داستان تھی۔ ہم ایک افسانہ نگار پوسٹ مین سے واقف ہیں جن کے یہاں ملک کے سارے رسالوں کا اسٹاک یوں جمع رہتا ہے جیسے یہ واقعی ان ہی کے نام روانہ کئے گئے تھے۔ جب سے یہ صاحب ہمارے حلقے پر آتے ہیں ہم نے سارے معیاری رسالے منگوانے ترک کر دیئے ہیں کیونکہ معیاری رسالوں کو بذریعہ ڈاک منگوانا ایک معیاری غلطی ہے پھر جب یہ صاحب غیر معیاری رسالے بھی تقسیم کرتے ہیں تو ان کی تقسیم کا انداز بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ ہمارے ہاتھوں میں اچھی طرح پیک کیا ہو

رسالہ تھما دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں ”صاحب! اس میں کرشن چندر کا افسانہ ضرور پڑھئے۔ فلاں صفحہ پر موجود ہے۔ ظالم نے اتنا خوبصورت افسانہ لکھا ہے کہ میری نیت ڈانواں ڈول ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مگر سوچا کہ گذشتہ مہینہ بھی راجندر سنگھ بیدی کے افسانے کی وجہ سے آپ کو گذشتہ شمارہ نہیں مل سکا تھا اسی لئے یہ شمارہ بحالت مجبوری آپ کو دے رہا ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہ شمارہ پڑھنے کے بعد مجھے دیدیجئے“ اس پر ہم صرف اپنے دانت پیس کر رہ جاتے ہیں اور ابھی ہم اچھی طرح دانتوں کو پیسنے بھی نہیں پاتے کہ ان صاحب کا ارشاد ہوتا ہے ”ارے ہاں! اس شمارے میں ایک برہنہ تصویر بھی شامل تھی جسے میں نے رسالے سے جدا کر دیا ہے۔ کیوں کہ یہ تصویر اتنی برہنہ تھی کہ آپ کے اخلاق پر برا اثر پڑ سکتا تھا اسی لئے یہ تصویر میں نے اپنے پاس رکھ لی ہے آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں“ اور ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ”بھئی ہمیں اعتراض تو اس بات پر ہے کہ آپ نے سارا رسالہ ہی اپنے پاس کیوں نہ رکھ لیا۔ اب ہم اس بچے کچھے اور پڑھے پڑھائے رسالے کو لیکر کیا کریں گے“ پھر جب ہم اس رسالے کو کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شدت مطالعہ کے باعث اس کی سطریں تک مٹ چکی ہیں اور اس کے ہر صفحہ کے حاشیے پر پوسٹ مین صاحب کی رائے کے جنگل بکھرے پڑے ہیں۔

ایسے ہی پوسٹ مینوں کی حرکت کے باعث محکمہ ڈاک کی وہ تعریف ہمیں نہایت درست معلوم ہوتی ہے۔ جس کے بموجب محکمہ ڈاک وہ محکمہ ہے جہاں دوسروں کے رسالوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔

ہم ضمنی طور پر یہاں یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اکثر رسالے نہیں ملتے مگر وہ رسالے بڑی پابندی سے مل جاتے ہیں جن میں ہمارے افسانہ نگار پوسٹ مین صاحب کے افسانے شائع ہوتے ہیں۔ بلکہ ہمیں تو ایسے رسالوں کی دو دو کاپیاں تک مل ہیں۔ مگر ایسے افسانوں کو پڑھکر ہم کیا کریں گے جس میں سارا محکمہ ڈاک ٹھاٹھیں مار رہا ہو۔ چنانچہ ان افسانہ نگار پوسٹ مین صاحب کے افسانے کا ایک پیراگراف ہمیں اب تک یاد ہے جو یوں شروع ہوتا ہے۔

”اور نجمہ اپنے بچے کو ایک کونے میں دھکیل کر یوں پیٹنے لگی جیسے کوئی پوسٹ مین خطوں پر مہریں لگا رہا ہو۔ اس کا بچہ زار و قطار رونے لگا۔ نجمہ کا شوہر خالد دور کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ نجمہ کے غصّے کے آگے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ نجمہ بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ اپنے ساتھ جہیز لے آئی تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ اس کے گھر ”انڈر دی سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ“ آئی تھی۔ خالد کی حیثیت تو ایک ”بیرنگ لفافہ“ کی سی تھی کہ جو پیسہ دے وہی اسے حاصل کرے۔ نجمہ کے ہاں گذشتہ مہینے ہی چوتھی ڈلیوری ہوئی تھی۔ خالد ان ”ایکسپریس ڈلیوریوں“ سے تنگ آچکا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں اس کے دل کے نہاں خانے میں یوں دبی پڑی تھیں جیسے ”ڈیڈ لیٹر آفس“ میں خطوط پڑے رہتے ہیں۔ خالد سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ لیٹر بکس کے رنگ کی طرح سرخ ہونے لگا۔ پھر اس نے اپنے حواس درست کئے اور ہمت سے بولا ”نجمہ! اگر تم میرے بچوں کو اسی طرح پیٹتی رہیں تو میں تمہیں تمہارے میکے ”ری ڈائریکٹ“ کر دوں گا“

لیکن ان ساری شکایتوں سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہمیں پوسٹ مینوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ تو صرف مذاق کی باتیں تھیں ورنہ اگر پوسٹ مین تاخیر سے ڈاک تقسیم کرتا ہے تو کچھ وجہ تاخیر بھی ہوتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس پوسٹ مین کی حالت پر غور کیا ہے جو لوگوں میں تو شادیوں کے رقعے بانٹتا ہے مگر خود اس کے گھر میں بیٹیاں اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ کوئی آئے اور انہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے۔ اس پوسٹ مین کے صبر و استقلال کی داد دیجئے جو لوگوں کی شادیوں کے رقعے تو بانٹ دیتا ہے مگر وہ خود اپنی بیٹیوں کی شادی کے رقعے بانٹنے کی حسرت سینے میں لئے پھر رہا ہے۔ پھر پوسٹ مین کے قبضہ میں ہزاروں روپے موجود ہوتے ہیں مگر وہ خود ایک بیڑی تک نہیں خرید سکتا۔ اور جب سمندر سے پیاسے کو شبنم بھی نہیں ملتی تو ہمیں پوسٹ مین سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ لوگوں میں خوشیاں بانٹنے کے لئے اپنی کتنی خوشیاں قربان کر ڈالتا ہے۔ اب اگر وہ چوری چھپے ہمارا رسالہ پڑھ لیتا ہے تو کونسا جرم کرتا ہے۔ وہ صبر و ضبط کی ایک بھاری

اپنے بیٹے پر کھڑ کر گلی گلی گھومتا ہے۔ دروازوں پہ آواز یہ لگاتا ہے کہ "پوسٹ مین! حضور اپنا منی آرڈر لے جائیے" مگر کوئی اس کے دروازے پہ دستک نہیں دیتا۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ "پوسٹ مین صاحب! یہ روپے لے جائیے اور اس سے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کیجئے" مگر پوسٹ مین کو دوسروں کی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرانے کے کام سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ وہ تو ایک ایسا "بیرنگ لفافہ" ہے جو کہ "ڈیڈ لیٹر آفس" میں برسوں سے پڑا اس بات کا منتظر ہے کہ کوئی اس "بیرنگ لفافہ" کو حاصل کرے۔ اسے کھولے۔ اور پڑھے کہ اس لفافہ کا مضمون کتنا الم انگیز اور حیرت انگیز ہے پھر اب وہ لوگ کہاں باقی رہے جو صرف لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے۔

بقیہ :- اوٹ پٹانگ

ترچھی، آڑی لکیریں کھنچ جاتی ہیں کہ یوں لگتا ہے، یہ بچہ نہیں ہے ایک جنگل ہے جس پر ناناپرکار کی جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔

اور پھر سلیٹ کی یوں مرمت کر کے ہم بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ایک موذی کو مار ڈالا اور پھر ہمارا ڈر ختم ہو جاتا ہے۔ بچہ ہماری طرح گنجلک اور اوٹ پٹانگ ہو جاتا ہے۔ صاف دل اور مقدس دماغ کا بچہ اپنی توتلی اور معصوم باتوں سے ہمیں ننگا کرتا ہے، ہمارے راز فاش کر دیتا ہے، ہمیں شرمندہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہم اس کی معصومیت سے بچنے کے لئے اسے تعلیم یافتہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ بڑی بڑی بھاری بھرکم مشینیں اس کے لئے کتابیں چھاپتی ہیں۔ ہم بڑی بڑی عالیشان بلڈنگوں میں اس کے لئے اسکول اور کالج کھولتے ہیں۔ اس کے لئے کئی بار بڑے بڑے دکتی بار عجیب و غریب مذہب ایجاد کرتے ہیں۔ پولٹیکل سائنس پر اسے لیکچر دیتے ہیں۔ آرڈیننس فیکٹریوں میں اس کے لئے بم اور زہریلی گیسیں اور ٹینک تیار کرتے ہیں اور یہ سب کچھ ہم صرف اس لئے کرتے ہیں تاکہ بچہ بھی ہماری طرح عقلمند بن جائے، ہماری طرح مکار، فراڈ، جھوٹا اور کرپٹ بن جائے۔ وہ معصوم نہ رہے، سادہ نہ رہے، صاف گو نہ رہے، بے وقوف نہ رہے۔

اور جو بچہ اس ساری عاقلانہ اور دور اندیشانہ کاروائی کے باوجود سادہ اور کھرا اور راست باز رہتا ہے تو ہم اس کے متعلق محلے بھر میں یہ غلیظ افواہ اڑا دیتے ہیں کہ بچارا پاگل ہو گیا ہے، اس کے اندر کسی سنت کی روح حلول کر گئی ہے اور امید ہے جلد ہی سادھو بن کر جنگل کی طرف نکل جائے گا

ایک بچے کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا ہو کر عقلمند ہو گیا یعنی کروڑ پتی ہو گیا۔ اس نے پچھتاتا ب کے لئے فیصلہ کیا کہ وہ ایک بار پھر بچہ یعنی سادھو بن کر باقی وقت یاد خدا میں بسر کرے گا۔ لیکن خدا نے اسے رات کو وارننگ دی کہ ہمارے ساتھ فراڈ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اب تم دوبارہ بچے نہیں بن سکتے۔ نیچر کے اصولوں کی خلاف ورزی کرو گے تو کوڑھ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

"تو میں کیا کروں اے خدا؟" وہ شاید کوڑھ سے ڈر کر پوچھنے لگا۔

"اسی طرح کروڑ پتی کی زندگی گذارتے ہوئے مرو"

"چنانچہ گذشتہ چار سال سے ایک شاندار اسپتال میں غلیظ کوڑھ کے مرض میں پڑا بدستور کروڑ پتی کی زندگی گذار رہا ہے۔

Tibet
سردیوں میں جلد اور چہرے کو
پھولوں کی طرح شاداب رکھئے!
تبت سنو و کولڈ کریم
صرف چند یوم تبت سنو اور تبت کولڈ کریم استعمال کرنے سے چہرے پر ایک نئی تازگی
اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جاڑوں کی سرد اور خشک … وں کے باوجود آپ کی جلد محفوظ
اور ملائم رہتی ہے بلکہ رنگت اور بھی نکھر آتی ہے